روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سورۃ ملک

تا

سورۃ المرسلت

جلد ۱۹

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی
خطیب جامع مسجد نور، گوجرانوالہ

چودھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ ملک تا سورہ مرسلات) جلد ۱۹

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... ۱۸۰/- ایک سو اسی روپے

تاریخ چودھواں ایڈیشن .... رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ بمطابق اکتوبر ۲۰۰۷ء

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

پیش لفظ (طبع دوم)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ اَمَّا بَعْدُ

زیرِ نظر "معالم العرفان فی دروس القرآن" سورۃ ملک تا سورۃ مرسلٰت یعنی پورے انتیسویں ۲۹ پارہ پر مشتمل ہے۔ پہلی اشاعت میں اس کو دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ سورۃ ملک تا سورۃ نوح اور دوسرا حصہ سورۃ جن تا سورۃ مرسلٰت تھا، لیکن اب طبع دوم میں بہت سے احباب کے تقاضا پر ان دونوں جلدوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اور دونوں جلدوں کی فہرستوں کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ فہرستیں اور پیش لفظ وغیرہ کو شروع میں ہی رکھ دیا گیا ہے۔ اور صفحات کے نمبروں کو بھی مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس ایڈیشن میں زیرِ درس آیت کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے اور بقایا آیات کو قوسین " " میں رکھا گیا ہے تاکہ زیرِ درس آیت کا دوسری آیات سے اور قرآن پاک کا احادیث سے امتیاز عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجائے۔

اغلاط کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے۔ طباعت اور کاغذ جلد بندی وغیرہ کا معیار بھی انشاء اللہ پہلے سے زیادہ بہتر ہو گا۔ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِیْنُ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیرِ خلقہٖ محمدٍ وَّاٰلِہٖ واصحابہٖ وَاَزْوَاجِہٖ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَتْبَاعِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

احقر عبد الحمید سواتی

خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۷ھ

فہرست مضامین معالم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۱۹

نوٹ

یہ تفسیر بحمد اللہ تعالیٰ ــــ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں
بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پہ آچکی ہے

فیاض

حصہ اوّل

سورۃ ملک تا نوح

پیش لفظ

طبع اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ، وَعَمَّ الْاِحْسَانَ عَلٰی نَوْعِ الْاِنْسَانِ ، لَاسِیَّمَا عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ اَھْلِ الْاِیْمَانِ ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفْضَلِ الْاَنَامِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ

قرآن کریم خدا تعالیٰ کے نور و حکمت کا خزانہ ہے۔ جو شخص بھی اس سے جس قدر فیضیاب ہوگا۔ اسی قدر اس کو خدا تعالیٰ کا تقرب ، اور آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی معیت و رفاقت نصیب ہوگی۔ اسی خیال سے قرآن کریم کی تعلیمات اور فیض کو عام کرنے کے لیے قرآن کریم کا درس ، ترجمہ اور مطلب عوام کے سامنے بھی بیان کیا جاتا ہے تاکہ عام لوگ بھی اس کے فیض سے محروم نہ رہیں ، ہماری حقیر کوشش بھی یہی رہی ہے کہ ہمارا تعلق اور رشتہ آخر دم تک قرآن کریم کے ساتھ قائم رہے۔ اور اس کی اشاعت و تعلیم میں ہماری حقیر کوششیں بھی شامل ہوں۔ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں جامع مسجد نور میں متعدد بار قرآن کریم کا درس ، ترجمہ ، مسائل ، احکام بیان ہوتے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ سال سے ایک نیک بخت نوجوان بلال احمد صاحب ناگی کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ خیال ڈال دیا کہ اس نے احقر کے درس قرآن کو ٹیپ کے ذریعہ کیسٹ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سورۃ حشر سے آخر تک یہ مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الحاج لعل دین صاحب (مالک اسلامیات) جیسے نیک اور اہل دل کو اس کی توفیق بخشی کہ انہوں نے اپنی حسن عقیدت اور قرآن کریم کے ساتھ گہرے لگاؤ اور محبت سے اس کو کیسٹ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کیا ، نہ صرف یہی کیا بلکہ مناسب سرخیاں اور موزوں عنوان لگانے کی توفیق ارزانی بھی ہوئی ، چنانچہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ کا حصہ شائع ہو کر عام و خاص سے خراج عقیدت

وصول کر چکا ہے۔ اب پارہ ۲۹ سورۃ ملک سے سورۃ نوح تک پانچ سورتوں کے دروس کا حصہ پیش خدمت ہے۔ تاکہ قرآن کریم سے استفادہ کرنے والے عوام وخواص اس سے مستفید ہوں۔

اللہ تعالیٰ الحاج بابو غلام حیدر صاحب اور الحاج منیر احمد ناروصاحب اور ان کے رفقاء کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ اس سلسلہ کی اشاعت کے لیے تگ و دو فرما رہے ہیں۔

قرآن کریم کی آسان تفہیم اور عام فہم اردو زبان میں مختصر تشریح اور ضروری تفسیر کا بیان۔ اور سلف صالحین اور اکابر مفسرین کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں وضاحت۔ باطل اور گمراہ فرقوں۔ اور آزاد خیال خود رو مفسرین کی تفاسیر سے اجتناب وگریز اس کا خاص امتیاز ہوگا۔ اور ولی اللّٰہی فکر کی چھاپ اس پر نمایاں ہوگی۔ ضروریات وقت پر خاص نظر۔ اور اکابر علماء حق کی علمی تحقیقات کی روشنی میں بقدر ضرورت تفصیل خاص نمایاں ہوگی۔

اس خیال سے کہ عوام بھی قرآن کے فیضان سے محروم نہ رہیں۔ اور قرآنی فکر کو سمجھ کر اپنا دستور العمل بنائیں اور قرآن کی تفسیر یعنی سنت خیر الانام سے بھی مانوس ہوں۔ اور صحابہ کرامؓ اور اہل بیتؓ جو قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ مبارکہ اور آپ کے طور طریقوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ ان سے اور ان کے علوم ومعارف سے بھی باخبر ہوں اور ان کو اپنا پیشوا ومقتداء خیال کریں۔

قرآن کریم چونکہ تمام دینی اصولوں کا مجموعہ ہے خیر کثیر اور حکمت کا مکمل کورس ہے۔ انسانیت کے لیے ایسا کمال کہ اس سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں۔ ایسا پروگرام کہ اس سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ہوسکتا۔ اس کی تعلیم واشاعت کا انتظام انسانیت کا ہر دور میں سب سے اہم ترین تقاضا ہے۔ جو قوم بھی قرآن کریم کے پروگرام کو نہیں اپنائے گی اس کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوسکتی۔

اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فَاتَّخِذُوْهُ ذُخْرًا وَّزَادًا (الحدیث) کہ قرآن کریم کو ہی ذخیرہ آخرت اور زاد راہ بنالو۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لیے بھی ذریعہ نجات وفلاح بنائے اور خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ کا مصداق بنادے۔ اور جو حضرات بھی اس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا وآخرت میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ

احقر عبد الحمید سواتی خادم مدرسہ نصرۃ العلوم وجامع مسجد نور

نزد گھنٹہ گھر شہر گوجرانوالہ (پاکستان) (۳۰ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ - ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

پیش لفظ (طبع اول)

(از ۔ محترم الحاج لعل دین صاحب ایم اے علوم اسلامیہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ

قرآن پاک کی تفسیر و تشریح اور توضیح گذشتہ چودہ صدیوں سے پیش کی جا رہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت پر نبوت کا دروازہ بند ہونے کے بعد اشاعت قرآن و سنت کا کام اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ کے مصداق ہر زمان و مکان کے علماء و فقہاء سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ تا قیام قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

قرآن حکیم کا خود اپنا بیان ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ یعنی ہر خشک و تر چیز کا بیان اصولی طور پر مقدس کتاب میں موجود ہے۔ اب یہ متلاشیان حق کا کام ہے کہ حسب ضرورت اس باغ کی خوشہ چینی کرتے رہیں اور اپنے دلوں کو قرآن پاک کے علوم سے منور کرتے رہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ ۔۔۔ تَقَاصٰی عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

تمام علوم کا ذخیرہ قرآن پاک میں موجود ہے ۔۔۔ مگر عام لوگوں کے ذہنوں کی اس تک رسائی نہیں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عام طالبان علم کو دعوت دی ہے کہ اگر انہوں نے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو قرآن کریم میں غور و فکر کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر علم صحیح کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ فرماتے ہیں "مَنْ اَرَادَ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ فَلْیَتَدَبَّرْ فِی الْقُرْاٰنِ" (یعنی جو شخص اولین و آخرین کے علم سے واقف ہونا چاہتا ہے وہ قرآن میں تدبر کرے)

الغرض قرآن پاک علم و حکمت کا وہ خزینہ ہے جس میں غور و تدبر کرنے والے کو ہر وہ چیز میسر آتی ہے جس کا وہ متلاشی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کو چھوڑ کر نوع انسانی کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ۔۔۔ نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

ایک مسلمان کی زندگی محض قرآن سے وابستہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی زندگی نہیں۔ اگر اسے کامیابی کی ضرورت ہے تو اسے قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ورنہ راہ ہدایت کی اساس و بنیاد سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گا۔

اس بنیادی اصول کے پیش نظر مفسرین کرام اپنے اپنے زمانے میں قرآن پاک میں تدبر کرتے رہے ہیں اور پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتے رہے ہیں۔ جب بھی ضرورت پیش آئی قرآن حکیم سے ہی راہنمائی حاصل ہوئی۔

اب قرآن پاک کی ہزاروں تفسیریں مختلف زبانوں میں لکھی جاچکی ہیں۔ روزانہ درس قرآن کا سلسلہ بھی آجکل عام ہے شہروں اور قصبوں سے نکل کر دیہات تک پہنچ چکا ہے۔ بہت سے علماء کرام اپنے اپنے حلقہ اثر میں علم و عرفان کے موتی بکھیر رہے ہیں۔ اور راہ حق کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

"معالم العرفان فی دروس القرآن" کا زیر نظر نسخہ بھی اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی عبدالحمید سواتی کی عمر دراز کرے اور انہیں صحت و تندرستی سے نوازے جو عرصہ اکتیس ۳۱ سال سے جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں درس قرآن و حدیث دے رہے ہیں اور موجودہ زمانے میں نت نئے ابھرنے والے مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرکے تشنگان علم کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اگر کوئی متلاشی حق خالی الذہن ہو کر ان دروس کا مطالعہ کرے گا تو امید واثق ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی اس کو نظر آئے گی اور خدا تعالیٰ کے قرآن پاک کا مقصد و مدعا اس کو سمجھ آنے لگے گا ــــــ

دروس القرآن کی غرض اصلی بھی یہی ہے۔ کلام پاک کے ساتھ ہر ایک مسلمان کا تعلق قائم ہو جائے۔ کسی انسان کی سعادت کی سب سے بڑی علامت یہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کو صحیح خطوط پر سمجھ کر اس کے مطابق اپنے فکر و عمل کی اصلاح کا پروگرام اخذ کر سکے اور اپنی ترقی و فلاح کا سروسامان مہیا کر سکے۔ ماحول کی آلودگی اور مختلف افکار و آراء کا تضاد اور گمراہ فرقوں کی کثرت۔ تعصب و عناد کی فراوانی۔ مغربیت کی زہر آلود عریاں ذہنیت اور اشتراکی الحاد کی تباہ کاریوں کا سیلاب جہاں ہر طرف پھیلا ہوا ہو تو انسانی افکار و آراء کے اندر استقرار و سکون کی کیفیت کب پیدا ہو سکے گی۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی اسکی تفسیر و توضیح اور کلام پاک کے اولین سامعین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین عظام رحمہم اللہ کا عمل و بیان سامنے ہو تو فلاح و سعادت کی راہ متعین ہو سکے گی۔ اسی لیے دروس القرآن میں ان سب باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اور ان سب حضرات کی جو ان دروس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں نجات کا ذریعہ بنائے اور سب کو سعادت دارین سے ہمکنار ہونا اور فائز المرام ہونا نصیب فرمائے۔ آمین

لعل دین (ایم اے علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سخنہائے گفتنی

(طبع اول) (حصہ دوم سورۃ جن تا مرسلت)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

معالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد سورۃ جن تا مرسلت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دروس کا یہ سلسلہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کی حفاظت کا ایک پاکیزہ سلسلہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے پیش آمدہ جدید مسائل کا قرآن و سنت کے مطابق بہترین حل۔

دروس القرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے وہ دروس ہیں جو وہ نماز فجر کے بعد جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں ارشاد فرماتے ہیں جس میں عوام بھی شریک ہوتے ہیں اور خواص یعنی تعلیم یافتہ حضرات بھی۔

حضرت صوفی صاحب دامت برکاتہم ہندوستان کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الفقہ والادب حضرت مولانا مفتی اعزاز علیؒ۔ شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور امام اہلسنت مناظر اسلام حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ وغیرہم اکابر و اساطین علم و حکمت کے تلامذہ میں سے ہیں۔ تلمذ کے علاوہ حضرت شیخ مدنیؒ سے سلسلہ بیعت و نسبت بھی ہے۔ اسی لیے ظاہری علوم کی طرح باطنی علوم سے بھی آپ کو مناسبت ہے۔

عرصہ اکتیس ۳۱ سال سے مدرسہ نصرت العلوم کے اہتمام کے ساتھ تدریس کے فرائض بھی برابر سرانجام دے رہے ہیں۔ درس نظامی میں پڑھائے جانے والے دیگر علوم و فنون کی مختلف کتابوں کے علاوہ حدیث شریف کی متعدد کتابیں سینکڑوں علماء و طلباء کو بار بار پڑھا چکے ہیں اور عرصہ اکتیس ۳۱ سال سے جامع مسجد نور میں خطابت کے علاوہ صبح کی نماز کے بعد درس بھی دیتے ہیں۔ اس مرتبہ سے قبل تقریباً چار پانچ دفعہ قرآن پاک صبح کے درس عام میں ختم ہو چکا ہے۔ فجر کی نماز کے بعد ہونے والے اس درس میں چار دن قرآن پاک اور دو دن حدیث شریف کا درس ہوتا ہے۔ تمام صحاح ستہ، مشارق الانوار، الترغیب والترہیب، مؤطا امام مالک درس میں مکمل ختم ہونے کے بعد اب

مسند احمد جلد اوّل کا درس شروع ہے حضرت صوفی صاحب دامت برکاتہم کی دیگر علوم وفنون کے علاوہ حدیث تفسیر پر بھی گہری نظر ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ ولی اللٰہی سے آپ کو خصوصی لگاؤ ہے۔ مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں خلوص و سچی ہمدردی اور ان کی زبوں حالی اور پستی پر درد دل اور تڑپ رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ کے مقاصد عظیم، اور فکر بلند ہے۔ ماضی کی تاریخ میں مسلمانوں کے عروج وزوال اور عصر حاضر میں مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل وحوادثات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو دروس القرآن میں جہاں تفسیری نکات، فقہی مسائل اور غیر اسلامی نظامات حکومت سرمایہ داری سوشلزم کیمونزم وغیرہ باطل نظامات پر بے لاگ تبصرہ ملے گا اور ان کی بنیادی خرابیوں کی نشاندھی اور اسلام کے بنیادی عقائد کی توضیح، کفر وشرک وبدعات کا نہایت اچھے اور عام فہم انداز میں رد، اور عصر حاضر میں مسلمانوں کی معاشی، سیاسی۔ اقتصادی تعلیمی اور اخلاقی طور پر پستی اور تنزل اور اس کے اصلی اسباب ومحرکات کی واضح نشاندہی بھی ملے گی،

بڑی بڑی ضخیم تفسیروں کے متعدد صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کو مختصر مگر انتہائی عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں جہاں واقعات اور قصص بیان ہوئے ہیں ان میں سے اکثر شروع سے آخر تک ایک جگہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ایک واقعہ کو مختلف جگہوں سے تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ اور ذہن مشوش نہیں ہوتا۔ گویا قصص کا سلسلہ بھی مربوط ہے اور قصص کی غرض اصلی کو پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔

خطباء۔ علماء، طلباء، اور دیگر صاحب علم حضرات کے لیے جس طرح یہ دروس مفید ہیں اسی طرح عدیم الفرصت کاروباری وملازمت پیشہ حضرات کے لیے بھی ان کا مطالعہ انتہائی ضروری اور بے حد مفید ہوگا۔ یہ چونکہ عوامی دروس ہیں اس لیے ان میں لفظی بحثیں اور صرف ونحو کے قواعد کی بحث کم ملے گی بایں ہمہ کمزور طبقات کو اٹھا کر بلندی پہ پہنچانے کے لیے یہ دروس مرہم دلہائے ریش کا کام دیں گے۔

دروس القرآن کا مطالعہ وقت کا ایک اہم ترین تقاضا بھی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ زمانہ میں جہاں مسلمان اخلاقی اور عملی طور پر تباہ ہو رہے ہیں ______ وہاں علمی طور پر بھی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عوام کی بات چھوڑیے ایسے خطباء کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے جن کو تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ علوم سے دور کا بھی واسطہ نہیں جن میں استعداد ہے ہی نہیں۔ عالمانہ وضع قطع جبہ قبہ، سریلی آواز چند غیر مستند حکایات اور نظموں کے کچھ مجموعوں کے علاوہ علم نام کی کوئی چیز بھی ان کے پاس

نہیں لیکن ممبر رسول پر بیٹھ کر قوم کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، اور وعظ و نصیحت کے نام پر توحید و سنت سے دور کرنے، رسومات و بدعات و شرک کی ترویج کے درپے ہیں۔ جو تحریر و تقریر میں قرآن و سنت و سلف صالحین کے مزاج و طریق کی پابندی کرنے پر کسی طرح تیار نہیں، تفریق بین المسلمین، گروہ بندی، تعصب، مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف منافرت پھیلانا جن کا مشن ہے اور مسلمانوں کی تکفیر جن کا محبوب مشغلہ ہے۔

مسلمانوں کی رہی سہی عقیدے کی دولت جس پر نجات آخرت کی مدار ہے کہ دنیوی زندگی نہ سہی چلو بالآخر آخرت ہی بہتر ہو جائے۔ مشائخ طریقت اور بزرگان دین کے نام کی آڑ لے کر وہ بھی ان سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ مشائخ طریقت یا بزرگان دین و سلف صالحین نے ہمیشہ ان باطل عقائد سے براءت ظاہر کی ہے لیکن عوام چونکہ سادہ لوح اور سطحی ذہن کے مالک ہوتے ہیں، اپنی اس سادگی کی وجہ ان کی عالمانہ وضع قطع آواز کا اتار و چڑھاؤ اور غلط پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر رسومات و بدعات کو کار خیر سمجھنے لگتے ہیں ایسے دور کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

يُوشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَّهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَّنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔ (بیہقی شعب الایمان)

قریب ہے کہ لوگوں پر ایسا زمانہ آجائے گا کہ اسلام کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن کے نقوش ہی رہ جائیں گے ان کی مساجد آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہونگی ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے سب سے برے لوگ ہونگے ان میں سے فتنے نکلیں گے اور ان میں ہی لوٹ کر آئینگے

لہذا قرآن و سنت کی صحیح تعلیمات سے آگاہ ہونے کے لیے بھی دروس القرآن کا ہر گھر اور لائبریری میں موجود ہونا وقت کا ایک اہم ترین تقاضا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا تمام مواد سلف صالحین اور علمائے محققین کے فہم و مزاج کے موافق ہے۔

اس کے مطالعہ سے انشاء اللہ ان لوگوں کی خود بخود تردید ہو جائے گی۔ جو مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ یا اس کے پراپیگنڈے سے مرعوب ہیں یا اپنے کسی بھی حقیر جذبے کو تسکین دینے کے لیے جدت اور تحقیق کے نام پہ قرآن پاک کے معانی و مطالب میں تحریف کی کوششیں کرتے ہیں اور سلف صالحین کے طریق سے ہٹ کر اسلام

کی نئی نئی تعبیریں کرتے ہیں۔ جیسا کہ آجکل کے خود رو مفسرین کا شیوہ ہے اور ان کی تفسیروں میں دیکھنے میں آرہا ہے۔ جن کو نہ قرآن وسنت سے گہرا لگاؤ ہے اور نہ ہی ماہر اساتذہ کے سامنے زانوِ تلمذ طے کئے ہیں۔ نہ حصول علم کے لیے کچھ عرق ریزی کی ہے۔ محض ادیب ہیں یا صرف مغربی طرز تعلیم کے کالجوں، یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہے ہیں اور اب قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کرنے پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح طور پر فرمان موجود ہے۔

فَافْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا — کہ وہ بغیر علم کے مسائل بتائیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری ص — مسلم ص —)

حسب سابق اس حصہ میں بھی دروس القرآن کو کیسٹ سے کاغذ پہ منتقل کرنے کا کام محترمی و مکرمی جناب الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ نے کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ عنوانات پہ نہایت مفید سرخیاں بھی قائم کی ہیں سرخیوں کو ایک جانب حاشیے پر لکھا گیا ہے تاکہ دروس کا تسلسل اور اصل دروس سے امتیاز قائم رہے۔

دروس القرآن چونکہ مستقل تصنیف تو ہے نہیں بلکہ دروس کو کیسٹ سے کاغذ پہ منتقل کیا گیا ہے اس لیے اس میں کتابوں کے حوالجات اور صفحات لکھنا تو ضروری نہیں۔ تاہم اہل علم حضرات کی سہولت کے لیے راقم الحروف نے اکثر و بیشتر مقامات پر نیچے حاشیے میں کتابوں کا نام اور صفحہ نمبر لکھ دیا ہے تاکہ اگر کوئی اصل کتاب اور ماخذ کی طرف رجوع کرنا چاہے اسے آسانی رہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ سلسلہ مفید ثابت ہو گا۔

دروس کے شروع میں آیات کے بعد درج شدہ ترجمہ حضرت صوفی صاحب مدظلہ کا اپنا ترجمہ ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے جملہ حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین :-

---

فقط محمد اشرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

(۱۷ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ ۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

سورۃ

الملک

(مکّی)

درس اوّل ا
آیت ا تا ۵

سُوْرَۃُ الْمُلْکِ مَکِّیَّۃٌ وَّہِیَ ثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْہَا رُکُوْعَانِ

سورۃ ملک مکی ہے اور تیس آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالے کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ ﴿۴﴾ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰھَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ﴿۵﴾

ترجمہ: وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے۔ جس کے قبضے میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱﴾ جس ذات نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے اعمال کون کرتا ہے۔ اور وہ کمال قوت کا مالک بہت بخشش کرنے والا ہے ﴿۲﴾ وہ اللہ تعالیٰ جس نے سات آسمانوں کو تہ بر تہ پیدا کیا ہے۔ رحمٰن کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اندر تم کوئی تفاوت (بے ضابطگی) نہیں دیکھ پاؤ گے، پھر نگاہ اٹھا کر دیکھو کیا تمہیں کوئی شگاف یا دراڑ نظر آتی ہے؟ ﴿۳﴾ پھر دوبار (یعنی بار بار) نگاہ اٹھا کر دیکھو (تمہیں کوئی دراڑ یا شگاف نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ تمہاری) نگاہ تمہاری ہی طرف لوٹ آئے گی ذلیل ہو کر اس حالت میں کہ وہ تھکی ہوئی ہوگی ﴿۴﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) کے ساتھ زینت دی ہے اور ہم نے ان ستاروں کو شیطانوں کو مارنے والا بنایا ہے۔ اور ہم نے ان شیاطین کے لیے دوزخ کی سزا بھی تیار کی ہے ﴿۵﴾

وجہ تسمیہ اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ ملک ہے۔ اس کی پہلی آیت میں لفظ "ملک" آیا ہے۔ اسی لفظ سے اس سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ ملک سے مراد اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور حکومت ہے۔

حدیث میں اس سورۃ کے اور بھی نام آئے ہیں۔ اس کا ایک نام سورۃ واقیہ ہے یعنی نجات دلانے والی سورۃ اور بچانے والی۔ اور ایک نام سورۃ مانعہ یعنی اللہ کے عذاب سے روکنے والی ہے۔ اس کا ایک نام سورۃ مُنجیہ ہے عذاب سے نجات دلانے والی، اور سورۃ ملک بھی ہے۔

یہ مکی سورۃ ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں تیس ۳۰ آیات دو رکوع، ۳۳۵ الفاظ اور ۱۳۱۳ حروف ہیں۔

دیگر سورتوں سے مناسبت (ربط)

یہ سورۃ اور اس کے بعد والی سورۃ مکی سورتیں ہیں۔ اس سے پہلی سورۃ تحریم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا ذکر تھا۔ آپ کی ازواج مطہرات سے معمولی سی لغزش ہو گئی تھی، اس پر اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ فرمائی۔ اور نبی علیہ السلام کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم دیا، اور دیگر باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے حقوق کا ذکر ہے۔ تو گویا اس طریقے سے ان سورتوں کو آپس میں مناسبت ہے۔

فضائل سورۃ

اس سورۃ مبارکہ کی فضیلت کے سلسلہ میں حضور نبی کریم ؐ نے فرمایا کہ ایک سورۃ تیس آیات پر مشتمل ہے۔ اور اس سورۃ نے کسی شخص کے لیے اللہ کے ہاں سفارش کی (شَفَّعَتْ) تو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو نجات دی۔ اور اس کی سفارش کو قبول فرمایا۔ وہ تیس آیتیں اسی سورۃ مبارکہ کی ہیں۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام کسی سفر پر تھے۔ انہوں نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ اور خیمہ لگایا۔ اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ جس جگہ خیمہ لگائے ہیں، اس کے نیچے قبر ہے۔ تو اس صحابی نے اس قبر والے کو اس سورۃ مبارکہ کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ صحابی کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس صحابی نے اس واقعہ کا ذکر جب نبی علیہ السلام کے سامنے کیا۔ تو آپ نے فرمایا هِیَ الْمُنْجِیَةُ هِیَ الْمَانِعَةُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ یعنی یہ سورۃ انسان کو نجات دلانے والی ہے اور عذاب قبر سے بچانے والی ہے۔ تو اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتلا دیا۔ کہ اس سورۃ کے پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی کو کوئی بات سنا دے۔ اس لیے اس سورۃ کا نام منجیہ اور مانعہ ہے۔

یعنی اللہ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے بچانے والی سورۃ۔
امام باقرؒ امام زین العابدینؒ کے فرزند اور امام ابوحنیفہؒ کے استاذ اور پیر ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اور ان میں اس سورۃ مبارکہ کو تلاوت فرماتے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضور نبی کریمؐ سونے سے پہلے سورۃ تَبٰرَكَ الَّذِي اور سورۃ السجدۃ ضرور تلاوت فرماتے تھے۔

موضوع سورۃ

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور توحید کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ آیات قدرت یعنی اس کی نشانیوں کا بیان ہے۔ اور اس کے بعد سزا کی منزل اور قیامت کا حال بھی مذکور ہے۔ لیکن مرکزی مضمون اس کا توحید ہے۔

برکت کا مفہوم

اس سورۃ کی ابتدا برکت کے لفظ سے ہوئی ہے تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ برکت اُس زیادتی کو کہتے ہیں جس میں پاکیزگی، طہارت اور تقدس کا مفہوم پایا جائے۔ اور جن اذکار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے اسی بہت سی صورتیں ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللهِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ، سُبْحَانَ اللهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اور انہیں اذکار میں ایک تَبٰرَكَ اللهُ ہے۔ تَبٰرَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ" ایسے ہی اور بھی کئی اذکار ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے، کہ برکت دینے والا صرف خدا ہے۔ مگر مشرک لوگ دوسروں سے برکت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تو اس کا رد ہے یہ مضمون اور بھی کئی سورتوں اور آیات کے اندر آیا ہے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے۔ جَعَلَنِي مُبٰرَكًا یعنی اللہ تعالےٰ نے مجھ کو بابرکت بنایا یعنی برکت اللہ تعالےٰ نے عطا کی۔ اسی طرح تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ یعنی وہ ذات بڑی برکت والی ہے۔ جس نے اپنے بندہ کامل پر قرآن حکیم نازل فرمایا۔ اس سورۃ میں ارشاد ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ یعنی وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے۔ جس کے قبضے میں بادشاہی ہے۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور سب اختیارات اسی کے پاس ہیں۔ ساری سلطنت اسی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی کام کرنا چاہے، تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ نہ اس کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ اس کے ارادے اور مشیت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ وہ قادر مطلق ہے۔

فلسفہ موت و حیات

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ جس ذات نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ اور پھر یہ بھی فرمایا یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وہ زندہ کرتا اور موت دیتا ہے۔ ان کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔

موت کی حقیقت کے متعلق دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اسے عدمی چیز مانتے ہیں جب کہ بعض دوسرے اسے وجودی تسلیم کرتے ہیں۔

موت کے ساتھ چونکہ تخلیق کا ذکر آیا ہے اس لیے ظاہر ہے۔ کہ یہ ایک وجودی چیز ہے نہ کہ عدمی۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ اُتِیَ بِالْمَوْتِ کَالْکَبْشِ الْاَمْلَحِ یعنی قیامت کے روز حساب کتاب ہو جانے کے بعد موت کو لایا جائے گا۔ اس کی شکل و صورت سیاہ رنگ کے مینڈھے کی ہوگی پھر اسے جنت اور دوزخ کے درمیان ایسی جگہ لا کر کھڑا کیا جائیگا۔ جہاں سب لوگ اسے دیکھیں گے اور پھر ہر ایک سے پوچھا جائے گا، یہ کیا ہے؟ سب کہیں گے یہ موت ہے۔ پھر سب کے سامنے اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا خُلُوْدٌ وَلَا مَوْتٌ یعنی اب تم ہمیشہ ہمیشہ اسی میں ہوگے تمہیں موت نہیں آئے گی۔ اسی طرح اہلِ دوزخ بھی ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے، انہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ یہ ایسے لوگ جن کے متعلق قرآن پاک میں قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور قرآن پاک نے انہیں دوزخ میں روک دیا ہے حَبَسَہُ الْقُرْاٰنُ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ یہ دن مومنوں کے لیے بڑی خوشی کا، کافروں کے لیے بڑی حسرت کا دن ہوگا، یہ سارا ذکر صحیح احادیث میں موجود ہے۔

موت و حیات کی تخلیق کا مقصد

موت و حیات کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے اعمال کون کرتا ہے۔ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو کوئی شخص نیکی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ یہ موت کا تصور ہی ہے۔ جو انسان کو نیکی کرنے پہ آمادہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ ایک نہ ایک دن اُسے مرنا ہے۔ اور یہ دنیا فانی ہے۔ یہی تصور انسان کو اچھے اعمال پر آمادہ کرتا ہے۔ تاکہ دوسرے جہان پہنچ کر اُسے پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ تو گویا موت نیکی کے لیے بمنزلہ شرط ہے۔ اور حیات تو خود ایک ظرف ہے۔ جس کے اندر رہ کر انسان کام کرتا ہے۔ اور نیکی کی طرف راغب کرنے والی چیز صرف موت ہی ہے۔

متنبی کہتا ہے وَلَا فَضْلَ فِیْھَا لِلشَّجَاعَۃِ وَالنَّدٰی وَصَبْرِ الْفَتٰی لَوْلَا لِقَاءُ شَعُوْبٍ

یعنی اگر موت سے ملاقات نہ ہوتی تو کسی نوجوان کے صبر اور کسی سخی کی سخاوت کو کوئی فضیلت حاصل نہ ہوتی۔ موت سے ملاقات ہی ان چیزوں کی قدر و قیمت سے روشناس کراتی ہے۔ اعمال صالحہ کو اپنانے اور دولت ایمان کے حصول کے لیے موت ایک بڑی حقیقت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

تو گویا موت اور حیات کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا۔ کہ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کہ تم میں سے اعمال صالحہ کون کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اچھا انسان وہ ہے جس نے لمبی عمر پائی اور اچھے اعمال کر کے لمبی عمر سے فائدہ اٹھایا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اچھا انسان وہ انسان ہو سکتا ہے۔ جو اچھی عقل رکھنے والا، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے والا، اور اللہ کی اطاعت میں سبقت حاصل کرنے والا ہو۔

تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے۔ جو برکتیں دینے والا ہے۔ قادر مطلق ہے، اس نے موت و حیات کو پیدا کیا۔ تاکہ انسان کی آزمائش ہو کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔

صفات الٰہی

اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ یعنی خدا تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے وہ عزیز ہے، غالب ہے۔ اور عزت دینے والا ہے اور الغفور ہے یعنی لغزشوں کو معاف کرتا ہے۔ اگرچہ وہ نافرمانی پر گرفت کرتا ہے، مگر لغزشوں اور غلطیوں کو معاف بھی کرتا ہے۔ بسا اوقات مجرموں کو سنبھلنے کا وقت دیتا ہے۔ یہ بھی اس کی بخشش کا ایک ذریعہ ہے۔

سات آسمان

موت و حیات کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا بیان ہے ارشاد ربانی ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا یعنی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو تہ بر تہ پیدا کیا حدیث میں ایسا ہی ذکر آتا ہے کہ آسمانوں کو تہ بر تہ یعنی اوپر نیچے پیدا کیا۔ پھر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اتنا ہی فاصلہ ہے۔ جتنا زمین سے پہلے آسمان تک۔ اس کے بعد بہشت آتی ہے۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام کے واقعہ معراج میں مذکور ہے۔ تو گویا سارے آسمانوں کو طے کرنے کے بعد جنت آتی ہے۔ جیسے فرمایا عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی۔ اور اسی جگہ سدرۃ المنتہیٰ والا مقام بھی آتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ آسمانوں کی یہ تہیں کیسی ہیں تو اس جگہ ہمارا تصور کام نہیں کرتا۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ آسمان سات ہیں اور اوپر نیچے ہیں۔

ایک مقام پر سَبْعًا شِدَادًا کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہ آسمان بڑے مضبوط ہیں۔ پھر ان آسمانوں

میں دروازوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جیسا کہ معراج والی حدیث میں دروازے کھولنے کا ذکر ہے۔ اور آپ کا وہاں سے گذر کر آگے جانا معلوم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء نقص سے پاک ہیں

موت و حیات اور سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ یعنی رحمان کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اندر تم کوئی فرق نہیں دیکھ پاؤ گے۔ یہاں پر تفاوت سے مراد چھوٹا بڑا ہونا نہیں، بلکہ نقص مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی نقص نہیں ہے اُس نے ہر چیز کو اپنی حکمت کے ساتھ کمال درجے پر پیدا کیا۔ آسمان ہوں یا کرّے، زمین ہو یا اُس کی کوئی چیز، کسی میں تم کوئی نقص نہیں پاؤ گے۔

اسی طرح انسان کی پیدائش، حیوانات اور نباتات اور دیگر عناصر کو اللہ تعالیٰ نے کمال حکمت اور بصیرت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان میں تم کوئی نقص نہیں پاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو خود دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں کہ ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھو فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ کیا تمہیں کوئی شگاف یا دراڑ نظر آتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کی دلیل ہے۔ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھو ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ دو بار یعنی بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو تمہیں کوئی دراڑ یا شگاف نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ تمہاری ہی طرف لوٹ آئیگی ذلیل ہو کر اس حالت میں کہ تھکی ہوئی ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہیں کر سکیگی۔

اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک اور شاہکار آسمانِ دنیا کو ستاروں سے زینت دینا ہے۔

ستارے آسمان دنیا کی زینت

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں کے ساتھ زینت دی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آسمان بالکل بے رونق دکھائی دیتا۔ اب رات کے وقت جب فضا صاف ہوتی ہے۔ تو آسمان میں کمال درجہ کی رونق معلوم ہوتی ہے۔ جگہ جگہ چراغ جل رہے ہیں۔ کوئی چھوٹا، کوئی بڑا، عجیب و غریب قسم کی زینت اور رونق ہے

ستاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ آسمان دنیا کی زینت ہیں۔ دوسری یہ کہ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ یعنی شیطانوں کو مارنے کے آلات ہیں۔ شیطان فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے جب اوپر جاتے ہیں تو اوپر سے شہاب پڑتے ہیں۔

شہاب ثاقب

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام سے کہانت کی حقیقت دریافت کی گئی۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اوپر جاکر فرشتوں کی گفتگو سنتے ہیں۔ اور کوئی ایک آدھ بات اُن کے کان میں پڑجاتی ہے تو وہ اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور آگے سے اُن پر شہاب ثاقب پڑتے ہیں۔

جو کلمہ وہ فرشتوں سے سُن پاتے ہیں اُسے وہ اپنے کاہن کے کان میں پھونک دیتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ سینکڑوں جھوٹ ملا کر آگے چلا دیتا ہے۔ یہی کہانت کی حقیقت ہے۔

کاہن سے واقعات اور خبریں معلوم کرنا شرک میں شمار کیا گیا ہے وہ غیب دان تو ہیں نہیں۔ عالم الغیب تو صرف خدا ہے۔ لہٰذا کاہن کے پاس نہیں جانا چاہیئے۔

یہ ستارے تو ابتدائے آفرینش سے ہی ٹوٹا کرتے تھے۔ مگر جیسا کہ سورۃ جن میں مذکور ہے حضور کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ بہت زیادہ ہوگیا۔ کیونکہ نزول قرآن کے بعد جو شیطان گفتگو سننے کے لیے اوپر جاتے ہیں، انہیں مارنے کے لیے ستاروں کے ٹوٹنے کا عمل بھی تیز تر ہوگیا ہے۔

ستاروں کے ذریعے راہنمائی

ستاروں کے متعلق تیسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی۔ کہ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (پارہ ۱۴۔ سورۃ نحل) یعنی انسان ستاروں کے ذریعے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں میلوں پر پھیلے ہوئے سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں میں سفر کے دوران صحیح سمت کی طرف صحیح راہنمائی ستاروں کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ چودہ کروڑ مربع میل میں پھیلے ہوئے سمندروں، بڑے بڑے صحراؤں اور جنگلوں میں سفر کے دوران بھٹک جانا معمولی بات ہے۔ ایسے میں رستے کے تعین کے لیے یہ ستارے ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں، اور مسافر اپنی منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

حاصل کلام

فرمان خداوندی ہے۔ کہ ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی۔ اور ان ستاروں کو شیطانوں کو مارنے والا بنایا۔ اور پھر وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ان شیاطین کے لیے دوزخ کی سزا بھی مقرر کی کہ اس میں انہیں ڈالا جائے گا۔

تبٰرک الذی ۲۹ — الملک - ۶۷

درس دوم ۲ — آیت ۶ تا ۱۴

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِىَ تَفُوْرُ ۝۷ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝۸ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڏ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ښ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۳ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۴

ترجمہ :: اور جو لوگ اپنے رب کے منکر ہوئے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور بہت برا ٹھکانا ہے (۶) جب ان لوگوں کو اس دوزخ کے اندر ڈالا جائے گا تو اس کی خوفناک آواز سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی (۷) قریب ہے کہ غصے کی وجہ سے پھٹ پڑے۔ جب کوئی گروہ دوزخ میں ڈالا جائے گا تو اس کے داروغے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا (۸) وہ جواب دیں گے کیوں نہیں تحقیق ہمارے پاس ڈر سنانے والا آیا مگر ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور ہم نے کہہ دیا اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو (۹) اور وہ کہیں گے کاش ہم سنتے یا ہم سمجھتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے (۱۰) وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے پس جہنم والوں کے لیے دوری ہے۔ (۱۱) بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں بن دیکھے ان کے لیے مغفرت ہے اور (ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں) بہت بڑا اجر ہے (۱۲) اور تم اپنی بات

کو چھپاؤ یا ظاہر کرو بیشک خدا سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے (۱۳) کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خود پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ بہت باریک بین ہر ایک کی خبر رکھنے والا ہے (۱۴)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور حکومت کا ذکر ہوا۔ کہ تمام برکات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ قادر مطلق بھی وہی ہے۔ جس نے موت وحیات کو انسانوں کی آزمائش کے لیے پیدا کیا۔ تاکہ اس بات کو ظاہر کرے کہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ عزیز اور غفور ہے۔ اُس نے سات آسمانوں کو تہ بر تہ پیدا کیا۔ اس کی پیدا کی ہوئی چیز میں تم کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے، تم بار بار اپنی نگاہ اٹھا کر دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں کوئی دراڑ، شگاف یا نقص نظر نہیں آئے گا۔ نگاہ تھکی ہوئی واپس لوٹ آئے گی۔ دیکھو! آسمان دنیا کو ہم نے زینت بخشی ہے ستاروں کے چراغوں کے ساتھ اور ان ستاروں سے دوسرا کام یہ لیا جاتا ہے۔ کہ یہ شیاطین کو مارنے کا ذریعہ ہیں۔ جو شیطان ملاء اعلیٰ یا ملائکہ کی گفتگو سننے کے لیے اوپر جاتے ہیں۔ ان کو آگے سے شہاب مارتے ہیں۔ شیاطین دوزخ کی سزا کے مستحق ہیں۔ یہ اغوا اور اضلال کرتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور برے راستے پر ڈالتے ہیں۔ اس لیے وہ جہنم کے سزاوار ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے عذاب سعیر یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔

شیاطین اور کفار جہنم کے سزاوار ہیں

جو لوگ شیاطین کے اغواء اور وسوسوں میں آئیں گے، اُن کی باتوں پر عمل کریں گے، اُن کا اثر قبول کریں گے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کے نازل کردہ احکام اور شرائع کا انکار کریں گے، وہ بھی جہنم کے سزاوار بنیں گے۔ شیطین تو ظاہر ہے۔ کہ اپنے اغواء اور گمراہ کرنے کے فعل کی وجہ سے دوزخ کے سزاوار ہیں، مگر جو لوگ کفر کا راستہ اختیار کریں گے اور شیطانوں کے اغواء میں آئیں گے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یعنی جو لوگ اپنے رب کے منکر ہوئے یعنی خدا کی توحید، یا صفت یا اُس کے احکام یا شرائع یا اُس کے فرشتے یا رسول کسی کا بھی انکار کریں گے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کریں گے۔ اور ربوبیت کا انکار الوہیت کا انکار ہے۔ یہ ساری چیزیں آپس میں مربوط ہیں۔ تو فرمایا۔ جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا عَذَابُ جَهَنَّمَ اُن کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ اور بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ یعنی جس جگہ یہ گمراہ کرنے والے شیطان جائیں گے اُسی جگہ اُن کا اثر قبول کرنے والے لوگ بھی جائیں گے۔ اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

دوزخ کا غیظ وغضب

اس کی تھوڑی سی کیفیت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ اِذَآ اُلْقُوْا فِیْھَا جب ان لوگوں کو اُس دوزخ کے اندر ڈالا جائے گا۔ سَمِعُوْا لَھَا شَھِیْقًا تو اُس کی خوفناک آواز سنیں گے شہیق گدھے کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ وہ ابتدائی حصے میں زور کی آواز نکالتا ہے۔ تو اس سے مراد ہے جوش کی آواز۔ وَھِیَ تَفُوْرُ اور وہ اچھل رہی ہوگی۔ تفور کا معنیٰ جوش مارنا۔ ابلنا۔ اس میں انتہا کا جوش ہوگا۔ تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ قریب ہے کہ غصے کی وجہ سے پھٹ پڑے۔ دوزخ کا یہ حال ہو گا۔ اس کی آواز نہایت کریہہ اور خوفناک ہوگی۔

دوزخ والوں سے سوال وجواب

کُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْھَا فَوْجٌ جب کوئی گروہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ سَاَلَھُمْ خَزَنَتُھَآ تو وہاں پر مقرر داروغے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہاں انتظام و انصرام کرتے ہیں وہ پوچھیں گے اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا، تنبیہ کرنے والا، سمجھانے والا نہیں آیا تھا۔ جو تمہیں بتاتا۔ کہ جس کفر وشرک کے راستے پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ خراب ہوگا، خطرناک ہوگا، اس راستے پر مت چلو۔ نذیر کا معنیٰ ڈرانے والا، سمجھانے والا۔ تنبیہ کرنے والا ہے۔

قَالُوْا بَلٰی وہ جواب دیں گے کیوں نہیں۔ قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ تحقیق ہمارے پاس ڈرسنانے والے آئے۔ فَکَذَّبْنَا مگر ہم نے اُن کو جھٹلا دیا۔ اُن کی بات نہیں مانی۔ اور انہیں کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو کہ دوزخ ہوگا۔ سزا میں مبتلا ہوں گے اور پکڑ ہوگی۔ ہم نے ان کی تکذیب کر دی وَقُلْنَا اور ہم نے کہہ دیا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کوئی وحی نازل کی ہے، نہ کتاب نازل کی ہے۔ اے ڈرانے والو! تم جھوٹ کہتے ہو۔ جیسے عام طور پر مشرک کہتے تھے۔ اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا۔ خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔ کہاں خدا نے وحی نازل کی ہے۔ "مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ" خدا تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی وحی یا کتاب نازل نہیں کی۔ یہ اپنے پاس سے بنا کر لاتا ہے۔ محض چوہدری بننے کے لیے، بڑا بننے کے لیے خدا پر افترا کرتا ہے۔ تو وہاں کہیں گے کہ ہم نے تو کہا تھا "وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ" خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ سب کا انکار کیا اور ہم نے نذیروں کو جھٹلا دیا اور یوں کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ

اسکا تعلق ان کافروں سے بھی ہو سکتا ہے اور الگ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر پہلے کلام کے ساتھ جوڑا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ دوزخ میں جانیوالے لوگ اقرار کریں گے کہ ہمارے پاس ڈرانیوالے آئے ہم نے ان کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی تم جھوٹ کہتے ہو۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ یعنی تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو، جو لوگوں کو پھنسانے اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہو۔ تو گویا انہوں نے نبیوں کو ڈرانے والوں کو کہا کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ جو لوگوں کو کہتے ہو کہ ہم پر وحی آتی ہے۔ خدا نے حکم نازل کیا ہے۔ یا کتاب نازل کی ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہو۔ تو یہ قَدْ جَآءَ نَا نَذِیْرٌ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ — کے ساتھ مربوط ہے۔

اور بعض مفسرین کہتے ہیں۔ کہ مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ پر مشرکین کی بات ختم ہوگئی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ آگے اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ نہیں ہو تم مگر کھلی گمراہی میں۔ جو ایسی باتیں کرتے ہو۔ یہ فرشتوں کا کلام بھی ہو سکتا ہے۔ جو باز پرس کر رہے ہوں گے۔ وہی کہیں گے اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، تمہارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والے بھی آئے۔ شریعت بھی آئی، دین بھی آیا۔ وحی الٰہی بھی آئی۔ مگر تم نے کسی چیز کو نہیں مانا۔ لہٰذا تم ہی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

کفار کا اظہار افسوس

تو کفر کرنے والے افسوس، حسرت اور ندامت کا اظہار کریں گے وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ کاش ہم سنتے اَوْ نَعْقِلُ یا ہم سمجھتے مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ افسوس! نہ ہم نے سنا، نہ عقل سے سوچا۔ دوسری جگہ ہے۔ غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَکُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ۔ افسوس کہ ہم پر ہماری بدبختی غالب آئی اور ہم گمراہ ثابت ہوئے۔ رسول آئے۔ ڈرانے والے آئے۔ سمجھانے والے آئے مگر افسوس کہ ہماری بدبختی غالب آئی۔ یہاں اس مقام پر ہے۔ کہ کاش ہم نصیحت کرنے والوں کی بات کو سنتے۔

نجات کے دو ذرائع

انسان کی فلاح کے لیے دو چیزیں ہیں۔ یا تو خیر خواہ کی بات سن کر (نَسْمَعُ) آدمی اس پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس کی نجات ہے۔ اَوْ نَعْقِلُ یا عقل سے خود غور و فکر کرے یا یہ دو ہی چیزیں ہیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ یہ کافر بہرے، اندھے اور گونگے ہیں۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (انفال) یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل جیسا کمال درجے کا جوہر عطا کیا ہے۔ مگر یہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۃ آل عمران میں الفرقان کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد جوہر عقل ہے۔ قرآن کا الگ ذکر ہے۔ تورات اور انجیل کا الگ اور فرقان کا الگ

ایک درجے تک یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اچھائی اور برائی میں امتیاز صرف عقل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

بے عقل مکلف نہیں

حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا اَقْبِلْ آگے آ۔ وہ آگے آ گئی۔ فرمایا پیچھے ہٹ جاؤ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر ارشاد فرمایا بِكَ اُعْطِيْ وَبِكَ اَمْنَعُ یعنی تیری وجہ سے میں دوں گا اور تیری وجہ سے روکوں گا۔ تمہارے استعمال پر ہی سارا دارومدار ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل نہیں دی، اُس کو مکلف بھی نہیں بنایا۔ تمام پاگل لوگ غیر مکلف ہیں۔ بہائم بے عقل ہیں، اس لیے غیر مکلف ہیں۔ بچے بھی جب تک اُن میں عقل نہیں آتی مکلف نہیں ہوتے تو گو اللہ تعالیٰ نے نجات کا مدار دو ہی چیزوں پر رکھا یعنی خیر خواہ کی بات کو سن کر اس پر عمل کرنا یا خود اپنی عقل سے کام لے کر اچھائی اور برائی میں تمیز پیدا کرنا۔

اجتہاد اور تقلید

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ ایک اجتہاد ہے اور ایک تقلید۔ تقلید اسی کو کہتے ہیں۔ کہ کسی اچھے شخص سے بات سن کر اس کو مان لیا جائے۔ تقلید سے لوگ بدکتے ہیں، اس کو غلط معنی پہنائے ہیں۔ یہاں جاہلوں کی تقلید مراد نہیں ہے۔ اس کی تو اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے۔ مشرک اور کافر اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرتے تھے۔ غلط اور شرکیہ رسوم میں اپنے بڑوں کی تقلید کرتے تھے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بے عقلی کی بات فرمایا۔ ہاں اگر کوئی اچھی بات سن کر اُس پر عمل کرتا ہے۔ تو یہ تقلید ہی ہے۔ اس پر بھی نجات ہے۔ یا انسان خود بحیثیت مجتہد عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرے۔ غور کرے اور پھر نتیجے پر پہنچے۔ یہ دونوں باتیں ہیں۔

کافر لوگ افسوس کا اظہار کریں گے اور کہیں گے ہم نے دونوں باتیں ہی نہیں کیں۔ خیر خواہ کی بات سن کر بھی عمل نہیں کیا۔ اور عقل کو بھی ٹھیک ٹھیک استعمال نہیں کیا۔ غلط ہی استعمال کیا۔ اگر ہم دونوں میں سے ایک بات پر بھی عمل کرتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔

کفارۂ اعتراف معصیت

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے حکم ہوگا فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ پس جہنم والوں کیلیے دوری ہے۔ دفع ہو جاؤ، دُور ہو جاؤ۔ سحق کا معنیٰ دوری اور بعد ہوتا ہے بعض فرماتے ہیں کہ دوزخ میں سحق کا نام بھی ہے جیسے ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے صعود ایک پہاڑ کا نام ہے جب پہ کافروں کو چڑھایا جائے گا۔ اور نیچے اتارا جائے گا۔ ایسا ہی سحق بیابان ہے اسمیں کافروں کو دوڑایا

[1] مشکوٰۃ ص ۳۰ بحوالہ بیہقی ب الایمان

جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں سحق کا معنی دوری ہے جیسے مَکَانٍ سَحِیقٍ۔ تو گویا جہنم والوں کے لیے دوری ہے خدا کی رحمت اور مہربانی سے۔ اب اس جہنم میں جلتے رہو۔

ایمان بالغیب والوں کیلئے انعام

یہ تو تھا کافروں کا حال اور ان کا انجام۔ اب ترہیب کے ساتھ ترغیب بھی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ۔ بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں بن دیکھے ہوئے۔ یہ ہے ایمان بالغیب۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ بالغیب کے معنی بغیر دیکھے ہوئے۔ نہ دوزخ دیکھا ہے، نہ جنت، نہ اس کی وحی اترتے دیکھی ہے۔ نہ خدا کی ذات۔ تو جنت بھی برحق ہے۔ دوزخ بھی برحق ہے احساب بھی برحق ہے۔ یہ ساری چیزیں برحق ہیں۔ باطل کوئی نہیں، کفر کا بڑا انجام سامنے آئے گا۔ اور ایمان کا اچھا انجام بھی سامنے ہوگا۔ ان تمام چیزوں پر بن دیکھے ایمان لانا ایمان بالغیب ہے۔

سورۃ بقرہ کی ابتدا میں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ اور اخیر میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ اُس وحی پر جو خدا نے اتاری ہے اس پہ رسول بھی ایمان رکھتا ہے اور مومن بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب پہ، خدا کے رسولوں پہ، بعث بعد الموت پہ، تقدیر پہ، ملائکہ پہ، تمام نبیوں پہ، اور جو آگے حالات پیش آنے والے ہیں، اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔

خوف خدا مدار حکمت ہے

تو جو لوگ اللہ تعالیٰ پہ، اس کی صفات پہ بن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ اس سے لرزتے ہیں ان پر خوف طاری رہتا ہے، ایسے لوگوں کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحِکْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ یعنی حکمت کی جڑ اور بنیاد ہی اللہ کا خوف ہے۔ اللہ کا خوف مشاہدے سے نہیں آیا بلکہ رسولوں کے بتلانے اور کتاب کو پڑھنے سے یقین آیا ہے۔ تو بڑا حکیم وہی ہوگا جس میں خوف خدا زیادہ ہوگا۔

فرمایا جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں لَھُمْ مَّغْفِرَةٌ ان کیلئے بخشش اور مغفرت ہے۔ انکی خطائیں اور گناہ ڈھانپ دیے جائیں گے وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ اور اُن کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ کہ وہ ایمان لائے۔ بن دیکھے خدا سے ڈرتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں، کفر و شرک سے بیزار ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے بہت بڑا ثواب تیار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے

آگے فرمایا وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْھَرُوْا بِهٖ اور تم اپنی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، آہستہ

کہو یا بلند کہو، ہر حالت میں اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ خدا سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ کفر، شرک، نفاق کی بات کو پوشیدہ رکھو گے یا ظاہر کرو گے۔ برائی ادنیٰ سے ادنیٰ یا بڑی سے بڑی، چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حالت میں خدا تو سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے

فرمایا کیوں نہیں جانے گا۔ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خود پیدا کیا وہ نہیں جانے گا تو اور کون جانے گا وہ تو خالق ہے اور خالق ہونیکے علاوہ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ اسکی صفات لطیف و خبیر بھی ہیں۔ لطیف یعنی بہت باریک بین۔ لطیف کا معنیٰ مہربان بھی ہوتا ہے اَللّٰهُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِهٖ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑی مہربانی کرتا ہے۔ اور۔ اَلۡخَبِیۡرُ یعنی ہر ایک کی حالت سے واقف اور ہر ایک کی خبر رکھنے والا ہے۔

لہٰذا کوئی بھی چیز خواہ نیکی کی ہو یا برائی کی۔ تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حالت میں اللہ تعالےٰ جانتا ہے۔ اور اسی کے مطابق آگے چل کر انسان کو اس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿١٥﴾ ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾ أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنائی ہے۔ زمین تابع، چلو اس کے اطراف میں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور (ایک دن) خدا کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے ﴿۱۵﴾ کیا تم نڈر ہو گئے ہو اس ذات سے جو آسمان میں ہے کہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور زمین لرزنے لگے ﴿۱۶﴾ کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو اس ذات سے جو آسمانوں میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے پس عنقریب جان لو گے تم کہ میرا ڈرانا کیسا تھا ﴿۱۷﴾ اور البتہ تحقیق جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پھر ان پر میری گرفت کیسی ہوئی ﴿۱۸﴾ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا اپنے اوپر (کیسے) صف بستہ پر کھولے ہوئے ہیں اور سکیڑتے بھی ہیں ان (پرندوں) کو سوائے رحمان کے اور کوئی نہیں روکتا۔ بیشک وہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے ﴿۱۹﴾ بھلا خدائے رحمان کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکے۔ کافر لوگ محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۲۰﴾ اگر خدا تعالیٰ اپنی روزی کو روک دے تو تمہیں روزی پہنچانے والا کون ہے؟ بلکہ (یہ کافر لوگ) اصرار کرتے ہیں سرکشی میں، اور بدکنے میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۲۱﴾ بھلا وہ آدمی زیادہ ہدایت والا ہے جو اوندھے منہ چل رہا ہے یا وہ جو سیدھا چلتا ہے

صراطِ مستقیم پر (۲۲)

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

پہلے توحید، قیامت، رسالت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہوا، پھر آگے جزائے عمل کا ذکر تھا۔ مجرمین کی سزا کا ذکر ہوا۔ قدرت کی نشانیاں ذکر فرمائیں۔ اب اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے چند دلائل اور نشان بیان فرماتے ہیں۔ البتہ زیادہ تر مضمون توحید اور معاد کا ہے۔ پہلے رسالت کا بیان بھی ہو گیا جیسے۔ "قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ" دوزخ کی سزا میں مبتلا ہونے پر جب فرشتے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ لوگ اقرار کریں گے کہ ہمارے پاس ڈرانے والے ضرور آئے مگر ہم نے ان کی تکذیب کی۔ اور پھر افسوس کا اظہار کریں گے۔ "لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ" اگر ہم خیر خواہوں کی بات کو سنتے یا عقل سے کام لیتے تو کبھی دوزخ میں داخل ہونے والے نہ ہوتے۔ مگر ہم نے یہ دونوں باتیں نہ کیں۔ نہ ہم نے خیر خواہوں کی بات کو سنا اور نہ عقل سے کام لیا۔

دلائل قدرت تسخیر الارض

اب یہاں دلائل قدرت کا بیان ہے۔ جن سے دو چیزوں کا اثبات ہوتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور دوسری طرف قیامت، کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے۔ "هُوَ الَّذِیْ" اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے "جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ" جس نے تمہارے لیے بنائی ہے زمین "ذَلُوْلًا" یعنی تابع۔ ذلول کا معنیٰ تابع اور ہموار۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے تصرف کے لیے زمین کو تمہارے تابع بنا دیا ہے۔ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ کہ ہر قسم کے کام زمین میں کر سکو۔ اگر اللہ تعالےٰ زمین کو ایسا نہ بناتا تو سخت دشواری ہوتی۔ دلدلی بنا دیتا یا پانی جیسی ہوتی یا لوہے اور پتھر جیسی سخت ہوتی تو زراعت مشکل ہو جاتی۔ مکان بنانا دشوار ہوتا۔ زمین کو کھود کر اس میں سے چیزیں نکالنا ناممکن ہوتا۔ نہریں چلانا مشکل ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسا مسخر کر دیا کہ ہر قسم کا کام آسانی سے ہو سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یہی چیز اللہ تعالیٰ سمجھانا چاہتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا" کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ ہم نے زمین کو سمیٹنے والی بنایا زندوں کو بھی سمیٹتی ہے، مُردوں کو بھی سمیٹتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ "وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا" زمین پر اتراتے ہوئے مت چلو۔ یہ اللہ کو پسند نہیں زمین میں عاجزی ہے کہ ہر چیز اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ تم زمین پر چلتے ہو۔ کام کرتے ہو

زمین کو کھودتے ہو اس پر نجاست پھینکتے ہو، اللہ تعالیٰ نے اسکو کیسا منقاد اور مسخر بنا دیا ہے خدا کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسی لیے فرمایا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا منکب کندھے کو کہتے ہیں۔ یعنی زمین کے کندھوں پر چلو۔ کندھوں سے مراد اطراف زمین ہیں۔ بعض اس سے پہاڑ مراد لیتے ہیں۔ جیسے کندھے اونچے ہوتے ہیں اسی طرح پہاڑ بھی اونچے ہوتے ہیں تو اونچی جگہ پر چلو۔ اونچی جگہ پہ چلنے کا سامان بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا۔ پہاڑوں پہ جانے کے لیے راستے مقرر کر دیے وہاں بھی کاروبار سرانجام دیتے ہو۔

ہموار زمین پر چلنا آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے قوم ثمود سے فرمایا، دیکھو! اللہ نے زمین بنائی ہے۔ پہاڑ بنائے ہیں۔ پہاڑوں کو کرید کر مکان بنا لیتے ہو۔ ہموار زمین پہ بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے ہو۔ تو فرمایا چلو اس کے اطراف میں وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ اور کھاؤ اس کی دی ہوئی روزی۔ یہ زمین بھی اللہ نے پیدا کی اور اسے تمہارے لیے مسخر بنا دیا۔ اس میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔ ذرا سوچو اگر زمین میں دشواریاں ہوتیں تو سب کاروبار رک جاتے اللہ تعالیٰ نے زمین کو مسخر کر کے کتنا احسان فرمایا ہے۔

خدا نے روزی کے اسباب بھی مہیا کیے ہیں۔ یہ چلنا پھرنا بسا اوقات روزی حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ "انسان چل پھر کر رزق حلال تلاش کرتا ہے۔ انسان کیلیے یہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ رزق حلال تلاش کرنا فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔

آگے معاد کا ذکر ہے۔ اس میں دونوں باتیں سمجھا دیں۔ زمین کو خدا نے تمہارے فائدے کے لیے بنایا۔ تاکہ تم زمین میں کاروبار کر سکو۔ "جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا" اور پھر اللہ کی پیدا کی ہوئی روزی میں سے کھاؤ۔ جو بھی تمہارے حصے میں آئے گی۔

روزی بھی اللہ نے دی، زمین کو بھی اللہ نے پیدا کیا۔ کوئی روزی دینے والا نہیں ہے۔ فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ رزق خدا کے ہاں سے تلاش کرو۔ اللہ ہی رزق کے اسباب

ذ نعلے ہی رزا۔ ہے

مہیا کرتا ہے۔ تمام جانداروں کو روزی کی ضرورت ہے۔ جو اللہ ہی مہیا کرتا ہے۔ تمام اسباب انہی کے تصرف میں ہیں۔ اس کے سوا کوئی روزی نہیں دیتا۔ کوئی کسی کو ایک حبہ بھی نہیں دے سکتا۔ اب وہ انسان کس قدر بیوقوف اور احمق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس کے تابع بنایا ہے۔ اس کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر وہ زمین کو ہی اپنا معبود بناتے۔ دنیا میں ایسے مشرک لوگ بھی ہیں۔ جو زمین کو معبود مانتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا دوسروں کے ہاں سے روزی تلاش کرتے ہیں، یہاں دونوں باتوں کی نفی کی گئی ہے۔

قیامت کی آمد

پھر فرمایا، زمین پر چلتے ہوئے، کاروبار کرتے ہوئے، خدا کی روزی کھاتے ہوئے یہ نہ سمجھو کہ ہم آزاد ہیں۔ وَاِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ ایک دن خدا کی طرف اٹھنا بھی ہوتا ہے۔ جزائے اعمال بھی لازم ہے اور معاد کا آنا بھی ضروری ہے۔ انسان اٹھائے جائیں گے اور خدا کے حضور پیش کیے جائیں گے انہیں اپنے اپنے اعمال کا محاسبہ پیش کرنا پڑے گا یہ بات نہیں ہے کہ زمین پرست ہو جاؤ قیامت بھی کوئی نہیں آئے گی۔ بلکہ قیامت تو آنے والی ہے۔ تو اس طرح گویا توحید کا مسئلہ بھی سمجھا دیا اور معاد کا مسئلہ بھی سمجھا دیا۔

نڈر نہ ہو

آگے تخویف ہے۔ انسانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ فرمایا: ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ کیا تم نڈر ہو گئے ہو بے فکر ہو گئے ہو اس سے جو آسمانوں میں ہے اَنۡ یَّخۡسِفَ بِكُمُ الۡاَرۡضَ کہ تم کو زمین میں دھنسا دے۔ انسان مغرور ہوتا ہے اترا کر زمین پر چلتا ہے۔ فرمایا اگر آسمان والا تم کو زمین میں دھنسا دے۔ جیسا کہ کئی واقعات پیش آتے ہیں فَاِذَا هِیَ تَمُوۡرُ زمین لرزنے لگے۔ جیسے زلزلہ ہوتا ہے بعض اوقات ہزاروں انسان زلزلے میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ شہر اور بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ بزرتہ (جو الجزائر میں ہے) کی بارہ ہزار کی آبادی یکدم فنا ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی دس پندرہ سال کی بات ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔

۱۹۲۳ء میں جاپان میں جو زلزلہ آیا تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی فنا ہو گئے تھے۔ زمین میں ہزاروں گڑھے نظر آتے تھے۔ دراڑیں پیدا ہو گئیں تھیں۔

تو فرمایا کیا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو، جو آسمانوں میں ہے۔

فی السماء سے مراد بلندی ہے

فی السماء سے کیا مراد ہے۔ یہ مشکل لفظ ہے۔ خدا کی ذات آسمان میں نہیں ہے، نہ ہی زمین

پر ہے۔ یہ اعتقاد درست نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ تو مکان و زمان سے مبرا ہے۔ فی السماء سے مراد آسمانوں سے اوپر ہے۔ کہ آسمانوں کے اوپر بھی اسی کی حکومت اور تسلط ہے کسی اور کا نہیں۔ اور اس سے بلندی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ایک صحابی نے معمولی غلطی پر ایک لونڈی کو تھپڑ مار دیا۔ حضور علیہ السلام ناراض ہوئے۔ آپ نے لونڈی کو بلایا۔ اس سے پوچھا، اللہ کہاں ہے، اس نے کہا آسمانوں میں۔ پھر فرمایا، میں کون ہوں عرض کیا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور نے فرمایا یہ مومنہ ہے۔ اس کو آزاد کر دو۔ آسمان کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ عام آدمی کی عقل آسمان تک پہنچتی ہے۔ تو اس سے مراد بلندی ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ مگر عام لوگوں سے اللہ تعالیٰ ان کے فہم کے مطابق مواخذہ کرے گا۔

خوف خدا کی مثال

بخاری شریف میں اس شخص کا حال ذکر کیا گیا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ میں نے نیکی تو کوئی بھی نہیں کی۔ تو اس نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا تم کو وراثت تب دوں گا کہ تم میری ایک بات پوری کرو۔ پوچھا کیا شرط ہے۔ کہا کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو جلا کر راکھ بنا دینا پھر اس آدھی راکھ کو خشکی میں اڑا دینا اور آدھی پانی میں بہا دینا۔ بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرنے والے کو برزخ میں اٹھا کر پوچھا تم نے یہ کام کیوں کیا تھا۔ کہنے لگا پروردگار! میں نے ایسا کام تیرے خوف کی وجہ سے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کو بخش دو، معاف کر دو۔ اب اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ راکھ اڑا دینے سے وہ معدوم ہو جائے گا، اور خدا اس پر قادر نہیں ہوگا۔ مگر خدا تو پھر بھی قادر ہے۔ اس کا فہم ہی اس قدر تھا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی گرفت کی اور اسی پر اس کا فیصلہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے

الغرض اللہ تعالیٰ آسمان میں تو ہے نہیں۔ مگر آسمانوں میں بھی اس کا تصرف ہے۔ ورنہ اس سے مکانیت لازم آئے گی۔ اور مطلقاً انکار بھی اچھا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں اگر کوئی آدمی یوں کہے۔ میں تو نہیں جانتا کہ میرا خدا آسمان میں ہے یا زمین میں تو وہ آدمی کافر ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یعنی خدا عرش پر مستوی ہے۔ عرش تو ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔ آسمانوں کے اوپر بہشت ہے اور پھر عرش الٰہی ہے۔ اس پر استویٰ کیسا ہے۔ یہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ شاہ ولی اللہؒ آسان بات کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں استوٰی علی العرش

سے مراد یہ ہے کہ عرش الٰہی پر اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم پڑتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات بہت بلند اور برتر ہے۔ جب اُس کی تجلی اعظم عرش پر پڑتی ہے۔ تو وہ سارا رنگین ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات سارے جہاں پر چھا جاتے ہیں پھر دوبارہ اس کے اثرات واپس لوٹتے ہیں۔ اس طرح اس پہ تجلی اعظم پڑتی رہتی ہے۔

زمین کا دھنس جانا

تو فرمایا کیا تم بے فکر ہو اُس ذات سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ۔ اور وہ لرزنے لگے۔ ضلع فیروزپور کا ۱۹۴۹ء کا واقعہ اخبار میں پڑھا تھا۔ کہ کسی سکول میں بچے پڑھ رہے تھے۔ کہ اچانک سارا سکول زمین میں دھنس گیا اسی طرح آخیر زمانہ میں بھی دھنسنے والے واقعات آئیں گے حضورؐ نے فرمایا کہ کعبے کو گرانے والا جو لشکر آئے گا، اللہ تعالےٰ اس کو بھی زمین میں دھنسا دے گا۔ اُن کا کوئی اکا دُکا آدمی ہی بھاگ کر بچ سکے گا۔ ورنہ اول آخر سارے کے سارے ہی دھنسائے جائیں گے۔ ایسا ہی قارون کے بارے میں بھی ذکر ہے۔ بخاری شریف میں اُس آدمی کا حال بھی موجود ہے جو رنگین تہ بند پہن کر زمین پر اکڑ کر چلتا تھا ——— اُس کی گردن بھی اکڑی ہوئی تھی۔ خدا نے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہے۔ جب قیامت کا بگل بجے گا تو وہ کہیں رُکے گا۔

چنانچہ فرمایا کیا تم بے فکر ہو گئے ہو۔ انسان کو غرور نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ نے زمین کو تابع بنایا ہے۔ اکڑ کر مت چلو۔ بے فکر مت ہو۔ کہیں خدا تم کو زمین میں نہ دھنسا دے۔ زمین لرزنے لگے۔

پتھروں کے ذریعے عذاب الٰہی

اس کے بعد فرمایا اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا یعنی کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ وہ خدا تعالےٰ جس کا تصرف آسمانوں اور زمین میں ہر جگہ ہے، تم پہ پتھروں کا مینہ برسا دے۔ اللہ تعالےٰ نے سابقہ ادوار میں مجرمین کے ساتھ ایسا بھی کیا۔ شرق اردن کے رہنے والوں پر اللہ تعالےٰ نے پتھروں کا مینہ برسایا۔ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ۔ تہ بہ تہ پتھر برس رہے تھے اور پھر یہ بھی کہ مُسَوَّمَةً جس کے سر پر وہ پتھر پڑتا اس پہ اس کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ مُسَوَّمَةً کے معنی نشان لگے ہوئے۔ جس قوم کو اللہ تعالےٰ نے یہ سزا دی تھی، زمین کو بھی الٹ دیا تھا کیونکہ وہ اُلٹے کام کرتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔

ابرہہ کے لشکر پر بھی اللہ تعالےٰ نے پتھر ہی برسائے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر پرندوں کے ذریعے

برسائے تھے۔ اور ان کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ چھوٹے سنگریزے پرندوں کے ہاتھوں میں ایٹم بم سے زیادہ خطرناک تھے جس کے سر پہ لگا ہلاک ہوگیا۔ اور جس کی سائڈ پر لگا، ایسی بیماری لگی کہ وہ کبھی تندرست ہی نہ ہوا۔ ایسا چیچک سا لاحق ہوگیا۔ یا اللہ تعالیٰ بڑے پتھر برسائے، جیسے قوم لوط پہ برسائے تھے۔ فَسَتَعْلَمُونَ پس تم جان لوگے۔ كَيْفَ نَذِيرِ کہ میرا ڈر سنانے والا کیسا ہے۔ یا وہ عذاب کیسا ہے جس کے بارے میں تم کو ڈرا دیا گیا تھا خبردار کر دیا گیا تھا۔

جھٹلانے والوں کا حشر

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ان سے پہلے لوگوں کو دیکھ لو جنہوں نے جھٹلایا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ میری گرفت کیسی ہوئی۔ سابقہ جھٹلانے والوں کی تاریخ بھی تم قرآن پاک میں پڑھتے ہو۔ کہ جھٹلانے والوں کا کیا حشر ہوا۔ آج بھی اگر جھٹلاؤ گے تو تمہیں محسوس کرنا چاہیئے کہ ہمارا بھی ایسا ہی حال نہ ہو۔ یہ دلائل قدرت اور انذار ہے۔

پرندوں کی مثال

اس کے بعد فرمایا أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ کیا یہ شرک کرنے والے لوگ نہیں دیکھتے۔ معاد کے منکر خدا تعالیٰ کی صفت کو نہیں سمجھتے، ایمان نہیں لاتے، توحید کو قبول نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا۔ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ ان کے اوپر کیسے پر پھیلائے ہوئے ہیں وَيَقْبِضْنَ اور سکیڑتے بھی ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پرندوں کو فضا میں کس طریقے سے روکتی ہے۔ ان کا پروں کو پھیلانا اور سکیڑنا اللہ کی قدرت سے ہے۔ خدا تعالیٰ نے پرندوں کے پروں میں یہ طاقت دی ہوئی ہے۔ کہ وہ اڑتے ہیں۔ اُن پرندوں کو فضا میں کون روکتا ہے۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ۔ سوائے رحمان کے اور کون روکتا ہے۔ اللہ ہی نے یہ چیز پرندوں کے اندر رکھی ہے۔ یعنی طاقت رکھی ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ پروں کو سکیڑتے ہیں۔

چنانچہ انسانوں نے بھی پرندوں کے نمونے پر اڑنے والی چیزیں اور آلات بنا لئے ہیں۔ اس میں بڑی محنت اور مشقت کی ہے۔ آٹھ سو سال کے بعد اڑان کا مسئلہ طے ہوا۔ پہلا آدمی تو ہلاک ہوگیا تھا جس نے اپنے بازوؤں کے ساتھ گدھ کے پر باندھ کر ایک محل سے دوسرے محل تک اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ ہلاک ہوگیا مگر ایک راستہ بنا گیا۔ اس کے آٹھ سو سال بعد ۱۹۰۴ء میں یہ اڑان شروع ہوئی۔ یہ وہی پرندوں کا نمونہ تھا۔ دیکھو! پرندوں کو فضا میں سوائے رحمان کے کون روکتا ہے۔ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔ ہر چیز اس کے سامنے ہے

عذاب الٰہی کو کوئی ٹال نہیں سکتا

فرمایا، اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اگر اللہ تعالیٰ تم پر اپنی گرفت ڈال دے تو تمہارا کونسا لشکر ہے جو خدا تعالیٰ کے سامنے تمہاری حفاظت کرسکے فرمایا اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ کافر لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں محض غرور میں پڑے ہوتے ہیں کہ انکار کرتے ہیں سمجھتے نہیں اور معبودان باطلہ کی پرستش کرتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ فرضی دیوتا بنائے ہوئے ہیں۔ اگر خدا کا عذاب آجائے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہے۔ یہ لوگ آنے والی مصیبت سے اپنا بچاو نہیں کر رہے ہیں۔

رازق صرف خدا ہے

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ اگر خدا تعالیٰ تمہاری روزی کو روک دے تو روزی پہنچانے والا کون ہے۔ کیا کوئی ہے؟ ایک جو بھی نصیب نہ ہو۔ خدا تعالیٰ بسا اوقات قحط ڈال دیتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جب قحط پڑتا ہے تو دس دینار میں ایک روٹی بھی نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ اسباب میں تغیر پیدا کردے، روزی کو روک دے تو کوئی ہے تمہارے لیے روزی لانے والا؟

فرمایا حقیقت یہ ہے بَلۡ لَّجُّوۡا یعنی اصرار کرتے ہیں فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ سرکشی اور بدکنے میں پڑے ہوئے ہیں۔ محض شرارت اور سرکشی کی وجہ سے خدا کی وحدانیت کو نہیں مانتے۔ اور اس کی صفت پر ایمان نہیں لاتے۔ اگر اللہ چاہے تو سب دروازے بند کردے، روزی کو روک دے تو کوئی کسی کو ایک دانہ بھی نہیں پہنچا سکتا۔

یہ سب دلائل توحید ہیں۔ ساتھ ساتھ معاد کا مسئلہ بھی سمجھایا گیا۔

الٹا اور سیدھا

اس کے بعد فرمایا اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُكِبًّا عَلٰی وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ بھلا وہ آدمی اچھا ہے جو اوندھے منہ چل رہا ہے یا وہ جو سیدھا چلتا ہے۔ سیدھا چلنے والا آدمی مومن ہے۔ اس کا اعتقاد صحیح ہے اور وہ اعمال بھی اچھے کرتا چلا جارہا ہے۔ اور جو آدمی اوندھے منہ جاتا ہے، اس کا عقیدہ فاسد ہے، شرک اور کفر والا ہے اس نے ضرور گڑھے میں گرنا ہے۔ ایسا شخص کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ سیدھا چلنے والا ہی صراط مستقیم پر ہے۔ تو یہ گویا مومن اور کافر کی مثال بیان کی گئی ہے۔ جو لوگ آج ہدایت کی طرف سے اوندھے منہ چل رہے ہیں کل قیامت کے دن دوزخ میں اوندھے منہ جائیں گے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا، قیامت والے دن اللہ تعالےٰ کافروں کو منہ کے بل دوڑائیں گے
لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ کہ منہ کے بل کس طرح دوڑیں گے، فرمایا اِنَّ الَّذِیْ اَمْشٰی عَلَی الْاَقْدَامِ
یعنی جو خدا تعالےٰ پاؤں پہ دوڑا سکتا ہے، وہ سر کے بل بھی دوڑائے گا۔ سر کے بل دوڑتے ہوئے جہنم میں
جا گریں گے۔

توحید اور معاد دونوں کا بیان اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ اور مزید قدرت کی بہت سی نشانیاں بیان فرمائیں
گویا توحید، معاد اور رسالت تینوں مسائل سمجھا دیئے۔

درس چہارم ۴ آیت ۲۳ تا ۲۴

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تم کو بنایا ہے اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو ﴿۲۳﴾ آپ فرمایا دیجئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا، تم سب اس کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ﴿۲۴﴾

انسانی وجود کی نعمت

اللہ تعالےٰ کی قدرت کی چند نشانیاں بیان کی گئی ہیں اور ان کو توحید اور قیامت پر دلیل بنایا گیا ہے اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر اور بھی کئی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ ساتھ ساتھ انسان سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے۔ فرمایا قُلْ اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیجئے ھُوَ الَّذِیْ اللہ کی ذات وہ ہے اَنْشَاَکُمْ جس نے تم کو بنایا ہے۔ انشاء کا معنیٰ ایجاد کرنا، بنا کر کھڑا کر دینا یعنی وجود کی نعمت عطا فرمائی۔ تمہارا وجود ذاتی نہیں ہے۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ تمہارا وجود اور جسم اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اسی نے بنایا ہے۔

کان، آنکھ اور دل

وجود کی نعمت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ تمہارے لیے کان آنکھ اور دل بنائے۔ ان تین چیزوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کیا۔ انسان کے جسم میں یہ تینوں چیزیں بڑی نعمت ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ہیں۔ کہ وجود کے بعد انسان کو کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے۔

حواس خمسہ

حواس خمسہ تو پانچ ہیں مگر اس مقام پر ان میں سے صرف دو کا ذکر کیا۔ حواس خمسہ میں سننے دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور ٹٹولنے کی طاقت شامل ہے۔ چھونے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے جسم کے سارے حصوں میں رکھی ہے۔ جسم کے جس حصے کے ساتھ چاہے، انسان چھو کر، ٹٹول کر معلوم کر سکتا ہے۔ اور سختی اور نرمی کا پتہ چلا سکتا ہے۔ چکھنے کی طاقت اللہ تعالےٰ نے صرف زبان

میں رکھی ہے کہ منہ اور زبان کے ذریعے انسان چکھ کر کسی چیز کا ذائقہ معلوم کر سکتا ہے۔ کہ کڑوا ہے یا میٹھا ہے۔ اسی طرح ناک کے ذریعے انسان سونگھ کر خوشبو یا بدبو والی چیز معلوم کر سکتا ہے۔ یہ قوت اللہ تعالیٰ نے صرف ناک میں رکھی ہے۔

حصول علم کے ذرائع

تو حواس خمسہ میں سے مذکورہ تین چیزیں چھوڑ کر یہاں صرف کان اور آنکھ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں چیزیں حصول علم کا ذریعہ ہیں۔ حواس خمسہ میں سے یہ کان اور آنکھیں ہی ہیں جو حصول علم کا بڑا ذریعہ ہیں، انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ کان اور آنکھوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔

قلب جسم کا مرکز ہے

باقی رہا دل، تو اس میں اللہ تعالیٰ نے بڑے کمالات اور حکمتیں رکھی ہیں۔ یہ حصہ جسم انسانی کا مرکز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کی شراکت دماغ کے ساتھ جوڑی ہے۔ لیکن بہرحال قوت اور اخلاق کا مرکز قلب ہے۔ انسان جو بھی اعمال سرانجام دیتا ہے۔ اسی میں قلب کے عزائم، ارادے اور نیت کارفرما ہوتی ہے۔

حضور علیہ السلام نے قلب کو تمام انسانی جسم کا مرکز قرار دیا، فرمایا کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اِذَا فَسَدَ فَسَدَ کُلُّہٗ وَاِذَا صَلَحَ صَلَحَ کُلُّہٗ جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے۔ اگر وہ بگڑا ہوا ہو تو سارا جسم بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ وہ لوتھڑا قلب ہے اگر قلب کے اندر فساد ہو تو سارا جسم فاسد ہوگا جسم کا کوئی حصہ صحیح نہیں رہیگا اور اگر قلب کی حالت صحیح ہے تو سارا جسم درست ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قلب کو مرکز قرار دیا ہے۔ انسان جو بھی اعمال کرتا ہے تمام قوتوں کا مرکز قلب ہے۔

تو یہ دو چیزیں یعنی کان اور آنکھ حصول علم کا ظاہری ذریعہ ہیں۔ اور قلب بحیثیت مرکز کے ہے ایمان اور محبت بھی اس میں ہوتی ہے، اور کفر، شرک اور نفاق بھی اسی میں ہوگا۔ اسی طرح نفرت اور عداوت بھی دل میں ہوگی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں سزا کا ذکر فرمایا وہاں یہ فرمایا کہ جہنم کی آگ بڑی سخت ہوگی۔ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ یعنی سب سے پہلے وہ دلوں پر چڑھے گی۔ کیونکہ مرکز تو دل ہے۔ اور اسی دل میں انسان نے کفر، شرک، نفاق یا بُرے عقیدے کو جگہ دی ہوئی ہے۔ تو سب سے پہلے آگ کا اثر دل پر ہوگا۔ اس کے بعد جسم پہ ہوگا۔ تو قلب مرکز اخلاق اور مرکز اعمال ہے۔ اور کان اور آنکھ حصول علم کے

ذرائع ہیں۔ ان کے ذریعے جو چیز حاصل ہوتی ہے۔ وہ مرکز کے اندر پہنچتی ہے۔ مرکز اس کے مطابق سوچتا ہے اور پھر اعمال اور اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔

کان اور آنکھ کی اہمیت

تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا اَنْشَاَکُمْ یعنی تم کو پیدا کیا، تم کو جسم عطا کیا، یہ خدا کا کتنا کرم اور احسان ہے اور پھر وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ" تمہیں کان اور آنکھیں دیں۔ سمع کو مقدم بیان فرمانے میں بھی مصلحت ہے۔ کہ انسان آنکھ کی نسبت کان کے ذریعے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اکثر و بیشتر معلومات سماعت کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اس کی زیادہ اہمیت کی بنا پر اسے پہلے بیان فرمایا۔

حواس ظاہرہ کے اعتبار سے دوسری اہم ترین چیز انسان کے جسم میں آنکھیں ہیں، ترمذی شریف کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[ا] ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَنْ سَلَبْتُ کَرِیْمَتَیْہِ فَصَبَرَ فَلَمْ اَرْضَ لَہٗ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّۃِ یعنی جب آدمی کے جسم سے یہ دو چیزیں یعنی آنکھیں میں نے اٹھا لیں اور اس نے صبر کیا تو اس کو بہشت تک پہنچانے کے بغیر کسی چیز پر اکتفا نہیں کروں گا۔ میں ضرور اس کو جنت تک پہنچاؤں گا۔ آنکھیں انسان کے جسم میں نہایت ہی عزت والی چیزیں ہیں۔

اور ہدایت کے سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے جہاں یہ بیان فرمایا کہ تم نے گمراہی کیوں اختیار کی ہے۔ وہاں یہ بھی فرمایا اَلَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ عَیْنَیْنِ" کیا ہم نے تمہیں آنکھیں نہیں دی تھیں۔ اگر تمہارے پاس علم نہیں تھا۔ "وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ" تو ہم نے تمہیں زبان اور ہونٹ عطا کیے تھے۔ تم کسی سے پوچھ لیتے جیسے عام قانون ہے۔ "فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی اگر نہیں جانتے تو خود مفتی، قاضی بن کر مت بیٹھو، علم والوں سے دریافت کرو۔ وہ تم کو صحیح چیز بتلائیں گے۔ صحیح چیز پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہوگی۔ تو وہاں بھی اللہ تعالےٰ نے آنکھوں کی نعمت کا ذکر فرمایا۔ "اَلَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ عَیْنَیْنِ" ہم نے تمہیں دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں دی تھیں کہ ان کے ذریعے نشیب و فراز کو دیکھ لو۔ اور اس سے بڑھ کر حصول علم کا ذریعہ کان ہیں۔ ان کے ذریعے انسان علم حاصل کر سکتا ہے۔

لہٰذا قلب تو مرکز ہے۔ اور کان اور آنکھ دو اہم چیزیں ہیں۔ باقی تین چیزیں حصول علم کے

[ا] ترمذی ص ۳۴۶ (فیاض)

اعتبار سے کمزور ہیں، لہٰذا اُن کا ذکر نہیں فرمایا اور اپنی جگہ وہ بھی خدا کی بڑی نعمتیں ہیں۔
جس کے جسم سے لمس کی حس ختم ہو جائے۔ اس کے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہو گا۔ کیونکہ اُس سے ٹٹولنے کی طاقت ہی سلب ہو گئی۔ خدا تعالیٰ بعض لوگوں کے اعصاب اس طرح خراب کر دیتے ہیں کہ اُن کو ناک میں بدبو ہی آتی ہے۔ خوشبو نہیں آتی یہ بھی عذاب ہے۔ اسی طرح جس کے آواز کے اعصاب خراب ہو جائیں وہ بول نہیں سکتا۔ تو انسان میں کتنا نقص معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت تامہ کے ساتھ کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور یہ بڑے بڑے انعامات ہیں۔

شکر گذاری اور ناشکری

ان انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ کہ تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطا کیں تاکہ تم اس کا شکریہ کرو مگر ایسا کرنے والے بہت ہی تھوڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ کس طرح ادا ہو، اس سلسلہ میں امام رازیؒ، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے ——— کہ اُس نعمت کو رضائے الٰہی میں صرف کرے اگر ایسا نہیں کرے گا تو ناشکری ہو گی۔ تو مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھ، کان، زبان اور جسم کو خدا تعالیٰ کی رضا کے کام میں لگاؤ، ناراضگی کے کام میں مت لگاؤ۔ علماء عام طور پر یہی تعریف کرتے ہیں۔ کہ نعمت کو اُس کام میں لگاؤ جس مقصد کے لیے وہ دی گئی ہے۔ مگر آنکھ، کان اور دل جیسی نعمت پر بہت تھوڑے لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں ——— اکثر و بیشتر ان نعمتوں کو خدا کی ناراضگی کے کام میں صرف کرتے ہیں۔ اگر انسان کے کان فحش باتیں، لغو گانے، کفر کی باتیں اور بیہودہ باتیں سنیں گے تو اس سے بڑھ کر اور کیا ناشکری ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ آنکھ جیسی نعمت کو ناجائز باتوں پر لگاتے ہیں۔ کسی اجنبی عورت کی طرف نگاہ اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ پہلی نگاہ اچانک ہوتی ہے۔ یہ معاف ہے۔ دوسری نگاہ معاف نہیں ہے۔ دوسری نگاہ کا مطلب یہ ہے کہ تم عمداً ایک غیر محرم عورت کو دیکھ رہے ہو، جس کی اجازت نہیں۔ اسی لیے ارشادِ خداوندی ہے۔ قُل

لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ" مومن مردوں کو حکم ہے کہ اپنی نگاہ پست رکھیں اور عورتوں کو بھی حکم ہے یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ" کہ وہ اپنی نگاہیں پست رکھیں۔

اگر آنکھ ان کاموں میں صرف ہوگی تو یہ ناشکرگذاری ہوگی۔ افسوس ہے کہ آنکھ ناراضگی کے کاموں میں لگ رہی ہے۔ کان کے ذریعہ فحش گانے اور بیہودہ باتیں سنی جارہی ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول کا کلام نصیحت کی بات، اچھی بات کان میں نہیں آرہی ہے۔ تو یہ ناشکری ہی تو ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ تم ان نعمتوں کو صحیح مصرف میں نہیں لاتے لہذا تم بہت کم ہی شکریہ ادا کرتے ہو۔

زمین انسان کیلئے قرار گاہ ہے

اس کے بعد پیغمبر علیہ السلام کو خطاب ہے۔ قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ کہ آپ فرمادیجئے۔ خدا کی ذات وہ ہے جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا کہیں یَذْرَؤُکُمْ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان ہوا پر نہیں رہ سکتا۔ انسان جسم رکھتا ہے اس کو مکان کی ضرورت ہے، جگہ کی ضرورت ہے۔ "وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ" یعنی قیامت تک تمہارے لیے زمین ہی ٹھکانا اور قرار گاہ ہے۔ انسان ہوا پر زندگی بسر نہیں کر سکتا اگر وہاں جائے گا بھی تو عارضی طور پر۔ اصل قرار گاہ زمین ہی ہے۔ تو فرمایا کہ پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالٰے نے تمہیں زمین پر بکھیر دیا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو جگہ کی ضرورت ہے۔

انسان کے بنیادی حقوق

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے چار چیزوں کو خاص طور پر انسان کے بنیادی حقوق میں شمار فرمایا ہے۔ یعنی کھانے کے لیے خوراک کہ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ پینے کا پانی کہ یہ بھی انسان کے لیے ضروری ہے، جسم ڈھانپنے کے لیے لباس اور رہنے کے لیے جگہ۔

اس کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں جو آج بھی دنیا میں بنیادی حقوق کے طور پر تسلیم کی جاتی ہیں ان میں سے ایک صحت ہے کہ یہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ تندرستی کے بغیر نہ عبادت ہو سکتی ہے اور نہ محنت مزدوری اور نہ ہی جہاد ہو سکتا ہے۔ دوسری چیز علم ہے۔ یہ بھی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان نہ فرائض ادا کر سکتا ہے۔ اور نہ خالق اور مخلوق کے حقوق ادا کر سکتا ہے۔

تو گویا یہ چھ چیزیں ہیں۔ جنہیں آج بھی دنیا کی متمدن قومیں انسان کے بنیادی حقوق (Basic Rights) میں شمار کرتی ہیں۔ یونیسکو (UNESCO) اور دیگر عالمی ادارے سب ان کو

تسلیم کرتے ہیں۔

یہ بنیادی حقوق تو قرآن نے بتائے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بنیادی چیزیں ہر آدمی کو اپنے اپنے درجے میں ضرور ملنی چاہئیں۔ سر چھپانے اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے اگر عالیشان بلڈنگ نہ بھی ہو تو چھوٹا موٹا مکان تو ضرور ہونا چاہیے۔ بالکل کھلی جگہ تو نہیں ہونی چاہیے اسی طرح خوراک کیسی بھی ہو مگر میسر تو ہو۔ اسی طرح کپڑا بھی ایسا تو ہونا چاہیے۔ جو جسم کو ڈھانپ لے اور گرمی سردی سے بچائے۔

دینی تعلیم کی اہمیت

انسان کے لیے تعلیم بھی ضروری ہے۔ خصوصاً ایسی تعلیم جس کے بغیر انسان فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ آج کل تعلیم عام ہے مگر بہت قلیل حد تک۔ ہمارے ملک میں چونکہ تعلیم لازمی نہیں ہے۔ اس لیے تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بیس پچیس فیصد سے زیادہ نہیں۔ ستر پچھتر فیصد لوگ آج بھی بغیر تعلیم کے ہیں۔ اور یہ جو پچیس فیصد تعلیم ہے بھی، یہ بھی دنیاوی تعلیم ہے بس لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب۔ دینی تعلیم تو ایک فیصدی بھی مشکل ہوگی۔ جس کے ذریعے انسان فرائض ادا کر سکتا ہے۔ انسانی دماغ کی صحیح ضرورت دینی تعلیم ہے لہذا یہ مقدم ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے تعلیم پہ تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہماری عورتوں کو پہلے دینی تعلیم دلانی چاہیے اس کے بعد ایسی تعلیم جو ان کو امور خانہ داری میں مفید ہو۔ اس کے بعد تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم دلاؤ۔ الغرض دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اصل بنیاد تو موجود نہیں۔ لہذا لوگوں کو اصل فرائض کا علم نہیں۔ اس لیے دینی تعلیم کو اولیت حاصل ہونی چاہیے تاکہ انسان اپنے اصل فرائض کو سمجھ کر ان پہ عمل پیرا ہو سکے۔

خلاصہ کلام

تو بہر حال ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ خدا کی ذات وہ ہے جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا، اور یہ انسان کے لوازمات ہیں۔ جیسا ابتدا میں فرمایا "الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ" یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا لِيَبْلُوَكُمْ تاکہ تمہیں آزمائے أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا کہ تم میں اچھا عمل کون کرتا ہے۔ یعنی موت و حیات کو انسان کے امتحان کے لیے پیدا فرمایا۔ یہاں فرمایا دیکھو! انسان کو اللہ نے پیدا کیا علم کے ذرائع عطا کیے، کان آنکھیں اور قلب دیا، اور پھر زمین میں بکھیر دیا۔ انسان کو ٹھکانا مہیا کیا۔

خدا کے حضور پیش ہونا پڑے گا

ان تمام انعامات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان اس بات کو مت بھولنا کہ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ہ تمہیں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ معاد برحق ہے۔ قیامت برحق ہے۔ ایک نہ ایک دن خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ اچھا کام کون کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ میں نے یہ سب ذرائع تم کو دیئے ہیں کہیں ان میں منہمک ہو کر معاد کو ہی نہ بھول بیٹھنا بلکہ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ تم سب اسی کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ایک نہ ایک دن امتحان ہو کر رہے گا۔ اور جزائے عمل ضرور واقع ہوگی۔

درس پنجم ۵ آیت ۲۵ تا ۳۰

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيٓـَٔتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدَّعُونَ ﴿٢٧﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ أَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيرُ الْكٰفِرِينَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيكُمْ بِمَآءٍ مَّعِينٍ ﴿٣٠﴾ ع

ترجمہ :- اور وہ کہتے ہیں کہ قیامت والا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، ﴿٢٥﴾ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے بیشک یہ علم اللہ تعالےٰ کے پاس ہے اور تحقیق میں تو صرف کھولکر ڈر سنانے والا ہوں ﴿٢٦﴾ پس جب وہ (منکرین معاد) قیامت کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھیں گے، اس دن کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے، اور کہا جائیگا یہ وہی چیز ہے جسے تم خود طلب کرتے تھے ﴿٢٧﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) ان سے فرما دیجئے کہ فرض کرو اگر اللہ تعالےٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا وہ ہم پر رحم کر دے تو کافروں کو عذاب الیم سے کون بچائے گا ﴿٢٨﴾ اے نبی (علیہ السلام) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ ہی (اللہ تعالیٰ کی ذات) رحمان ہے ہم اس پہ ایمان لائے ہیں اور اس پر ہمارا بھروسہ ہے پس تمہیں جلدی پتہ چل جائیگا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے ﴿٢٩﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) ان سے فرما دیجئے فرض کرو کہ وہی ذات خداوندی اس پانی کو اگر زیادہ گہرائی میں لیجائے تو کون ہے جو تمہیں صاف وشفاف پانی مہیا کرے ﴿٣٠﴾

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو انسانوں پر کئے۔ انسان کو وجود بخشا اور اس وجود میں تین بڑی نعمتیں کان، آنکھ اور دل عطا کئے۔ کان سے سن کر انسان معلومات حاصل کرتا ہے۔ یہ علم کا بہت بڑا ذریعہ ہے، آنکھوں کے ذریعے انسان دیکھتا ہے اور اسے بہت سی

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دل اخلاق اور تمام عزائم کا مرکز ہے قوت عملیہ یہیں سے اٹھتی ہے اور ایمان یہاں ہی ہوتا ہے۔ کفر و شرک کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے۔

یہ نعمتیں عطا کرکے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ تم بہت تھوڑا شکریہ ادا کرتے ہو۔ شکریہ تو تب ادا ہو جب ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں صرف کرتے۔ ان کاموں میں لگاتے جن سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اور ان کاموں سے بچاتے جن میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔

فرمایا دیکھو! اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تم کو ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ زمین میں بکھیر دیا ہے۔ پہلے فرمایا أَنشَأَكُمْ یعنی تم کو پیدا کیا۔ اور پھر ذَرَأَكُمْ تم کو بکھیر دیا۔ پراگندہ کر دیا۔ مشرق، مغرب شمال، جنوب میں نسل انسانی کو پھیلا دیا۔ تمہیں زمین پر رہائش اور دیگر ضروریات اللہ تعالیٰ نے مہیا کیں۔ لہٰذا اس بات کو مت بھولنا وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ کہ اسی کے سامنے اکٹھے کئے جاؤ گے یہاں سے ابتدا ہوئی اور ادھر انتہا ہوگی۔ جس خدا نے تم کو پیدا کیا، اسی کے سامنے تمہارا حشر ہوگا۔

پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ موت و حیات کی پیدائش اس لیے کی کہ انسان کو اس کے اعمال کے اعتبار سے آزمایا جائے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے اور برے کون۔ تو اس طرح گویا جزائے عمل واقع ہو۔ جس طرح انسان کی پیدائش یقینی امر ہے اسی طرح جزائے عمل کا واقع ہونا بھی لازمی ہے۔ جس کا موقع اور محل قیامت ہے۔ جزائے عمل حشر کے بعد واقع ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ہوگا تو وہ صرف تمہیدی اور ابتدائی طور پر اس کا نمونہ ہوگا۔ حقیقی طور پر جزا و سزا تو حشر کے بعد ہی ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ توحید پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہے۔ اسی طرح رسالت کا ذکر بھی فرما دیا۔ کہ رسول کے بتلائے بغیر قوانین معلوم نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا رسالت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ایمان کے اجزا میں قیامت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت اور قیامت ایمان کے اہم ترین اجزا ہیں۔ اس کے علاوہ آسمانی کتب، ملائکہ اور صفات الٰہی جن میں تقدیر بھی شامل ہے، ان پر ایمان لانا بھی اسی درجہ کا ضروری ہے۔ البتہ وہ باتیں سب سے زیادہ ضروری ہیں جن کا تصور انسان ہر وقت اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اور رکھنا بھی چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ تم سب اسی ذات خداوندی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔

قیامت کب آئے گی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منکرین قیامت کا حال بیان فرمایا۔ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ وہ کہتے ہیں کہ قیامت والا وعدہ کب پورا ہوگا۔ اے اہل ایمان اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اگر یہ وعدہ سچا ہے تو پورا کیوں نہیں ہوتا۔ قیامت کیوں نہیں آتی۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو قیامت کو لاکر دکھاؤ قرآن پاک میں دیگر مقامات پر بھی کفار کا یہ اعتراض مذکور ہے کہ اگر یہ وعدہ سچا ہے تو اسے پورا ہونا چاہیئے۔ آخر یہ کب پورا ہوگا۔

وقوع قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے

جواب میں ارشاد ہوا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ یہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مجھے وقوع قیامت کا علم نہیں ہے مجھے تو اللہ نے صرف اتنا علم دیا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ میں اس کے متعلق تم کو ڈراتا ہوں، خبردار کرتا ہوں۔ رہا وقت کا تعین تو وہ میرے علم میں نہیں۔ وہ اللہ کے پاس ہے اور اس نے کسی کو نہیں بتایا۔ ہمارے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ قیامت آنے والی ہے جس کی ہمیں فکر کرنی چاہیئے۔

قیامت اچانک وارد ہوگی

دوسری جگہ فرمایا ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ایک بڑی بھاری اور بوجھل خبر ہے اور یہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔ لوگ غفلت میں پڑے ہوں گے اور قیامت اچانک (بغتۃً) آجائے گی۔ ایک اور جگہ فرمایا هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ بہت عظیم خبر ہے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو، تمہیں غفلت میں نہیں پڑنا چاہیئے۔

اور کہیں ارشاد ہوتا ہے۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ایک بڑی خبر کے متعلق۔ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ جس کے متعلق یہ اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ قیامت کوئی نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے، شاید آجائے۔ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی اور بربادی ہے۔

حدیث جبرائیل

حدیث جبرائیل میں آتا ہے۔ کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے تینوں سوالوں کا جواب دیا۔ پھر چوتھا سوال کیا مَتَى السَّاعَةُ۔ حضور! یہ فرمایئے قیامت کب آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ یعنی یہ بات جیسا سائل کو معلوم نہیں ایسے ہی مسؤل کو بھی معلوم نہیں اس کا علم نہ تیرے پاس ہے، نہ میرے پاس، بلکہ صرف اللہ کے پاس ہے اور اس نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ عِنْدَهٗ

عِلْمُ السَّاعَةِ" قیامت کا علم صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہ خاص چیزوں میں سے ہے۔ اس کے وقوع کی گھڑی کسی کو نہیں بتائی۔

قیامت کی نشانیاں

ہاں قیامت کی بعض نشانیاں بتا دیں جو قیامت سے پہلے واقع ہوں گی۔ خود پیغمبر علیہ السلام کا وجود مبارک قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اَنَا وَالسَّاعَةُ کَهَاتَیْنِ میں اور قیامت اس طرح آگے پیچھے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ایک تھوڑی سی آگے بڑھی ہوئی ہے اور ایک ذرا پیچھے ہے۔ مراد یہ ہے اب کوئی اور شریعت نہیں آئیگی بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ آپ فرما دیجئے میں نہیں جانتا" اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ" مجھے معلوم نہیں کہ وہ وعدہ قریب ہے یا بعید، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے کہ وہ یقیناً آنے والی ہے۔

الغرض نبی علیہ السلام کو ارشاد ہے۔ آپ فرما دیجئے قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ کہ وقوع قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے۔ اور اس سلسلے میں وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ میں تو صرف کھول کر ڈرسنانے والا ہوں میرا فریضہ اتنا ہی ہے کہ قیامت کے آنے کی خبر دے دوں، اس کے وقت کا تعین میرے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ اللہ کے پاس ہے۔ وہی اس کو جانتا ہے۔

قیامت میں ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً" منکرین معاد جب قیامت کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھیں گے۔ سِیْٓئَتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اس دن کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔ نیز فرمایا وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ" اس دن چہرے غبار آلود ہوں گے۔ "تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ" ان پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ اور بعض چہرے بڑے خوش خوش ہوں گے "مُّسْتَبْشِرَةٌ" نورانی ہوں گے سفید ہوں گے چمکدار ہوں گے اور خوشی کرنے والے ہوں گے۔ بعض دوسرے چہروں پر کفر کی سیاہی نمایاں ہوگی اور ان پر خوف طاری ہو گا۔

اس دن اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا

وَقِیْلَ اور کہا جائے گا۔ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝ یہ وہی چیز ہے جسے تم خود طلب کرتے تھے۔ لو! یہ قیامت آگئی ہے تو اس طرح قیامت کے روز اللہ کا وعدہ پورا ہو جائیگا

الغرض اللہ تعالےٰ نے توحید کا ذکر کیا۔ صفات الٰہی کو بیان فرمایا، بنیادی عقائد بجملہ رسالت اور قیامت کا بیان فرمایا۔ اور پھر اعتراض کرنے والے لوگوں کا جواب دیا اور ان کے انجام کو واضح کیا

ان کی گندی ذہنیت کا تجزیہ بھی کیا۔ اب کفار الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔

قیامت کیلئے تیاری

حضور نبی کریم ؐ سے ایک دیہاتی نے سوال کیا کہ حضرت یہ فرمائیں مَتَی السَّاعَةُ قیامت کب آئے گی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا وَیحَكَ مَا اَعْدَدْتَ لَهَا افسوس ہے تو نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ کہ اُس کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ عرض کیا حضور! میں نے کوئی زیادہ سامان تو تیار نہیں کیا، صرف فرائض وغیرہ ہی ادا کرتا ہوں۔ عبادت و ریاضت کا کوئی اور سامان تو میرے پاس نہیں ہے یعنی میرے نامہ اعمال میں نفلی عبادت اور نفلی روزے وغیرہ کا ذخیرہ تو نہیں ہے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ اِنِّی اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت ضرور رکھتا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تم بے فکر ہو جاؤ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ جن کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔ تمہارا حشر انہیں کے ساتھ ہوگا۔ خصوصی اعمال میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت بڑی خوشی کی بات ہے۔

کفار عذاب سے نہیں بچ سکیں گے

توحید، رسالت اور معاد پر ایمان لانے کی بجائے کفار کہتے تھے۔ کہ یہ محض شور و غوغا ہے۔ چند دن بعد یہ سب ہلاک ہو جائیں گے، مزید کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ان کی موت کے ساتھ ان کا دھندا بھی ختم ہو جائے گا۔ قیامت وغیرہ کچھ نہیں آئے گی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ اے پیغمبر علیہ السلام ان سے فرما دیجئے فرض کرو اگر اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے جیسا کہ تمہارا خیال ہے اَوْ رَحِمَنَا یا وہ ہم پر رحم کرے جیسا کہ ہمارا اعتقاد ہے۔ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ تو کافروں کو عذاب الیم سے کون بچائے گا۔

کفار کہتے تھے شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ "شاعری کرتے ہیں ہم چند دن اور انتظار کریں گے جیسے پہلے شاعر مر کھپ گئے۔ اور ان کا مشن چلانے والا کوئی نہیں ہے اسی طرح یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور ان کا مشن کامیاب نہیں ہوگا۔ جواب میں فرمایا کہ فرض کرو اگر ایسا بھی ہو جائے تو اس سے کافروں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہمارے ہلاک ہو جانے سے یا ہم پر رحم کئے جانے سے کفار کے عذاب میں کوئی فرق نہ پڑے گا بہرحال انہیں عذاب سے چھڑانے والا اور پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

گمراہ کون ہیں

آگے ارشاد فرمایا، اے نبی علیہ السلام! قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ
ذات ہی ہے جو رحمان ہے۔ وہ ہم پہ رحم کرے گا۔ کیونکہ اٰمَنَّا بِهٖ ہم اس پر ایمان لائے ہیں،
اسکی صفات، اور اسکی وحدانیت پہ ہمارا ایمان ہے وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا اس پہ ہمارا بھروسہ ہے، اسی کے ہاتھ میں
کامیابی ہے۔ وہ یقیناً ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ پس تمہیں جلدی ہی پتہ چل جائیگا۔
مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ کہ کھلی گمراہی میں کون ہے۔ کیا ہم ہیں جو ایمان لائے یا تم ہو جنہوں نے
کفر کا راستہ اختیار کیا اور توحید و معاد کا انکار کیا۔ عنقریب اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ایمان مدار نجات، مدار سعادت اور مدار فلاح ہے۔ ہم تو خدا کی ذات
پر ایمان لائے ہیں، اُسی پر توکل اور بھروسہ ہے۔ اہل ایمان کو اسی اعتقاد کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

شفاف پانی کی بہم رسانی نعمت عظمیٰ

اس کے بعد اللہ جل جلالہ، نے دلائل قدرت میں سے ایک اور دلیل کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا
کہ وہ اللہ تعالیٰ جس نے تمہیں وجود بخشا، زمین بخشی، جگہ دی، تمام ضروریات مہیا کیں، وہ اگر اس پانی
کو جس پہ تمہاری زندگی کا دارومدار ہے" زمین کی گہرائی میں لے جائے قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ
مَآؤُكُمْ غَوْرًا حالانکہ اس نے اپنی کمال قدرت اور حکمت تامہ کے ساتھ اس پانی کو بارش کی
صورت میں برسا کر زمین کے اندر چلا دیا ہے۔ اور انسان تھوڑی سی محنت کر کے زمین کھود کر پانی حاصل
کر لیتا ہے۔ کہیں کنواں ہے۔ کہیں نلکا ہے کہیں تالاب ہیں۔ نہریں جاری کر دیں۔ کہیں چشمے پھوٹ
پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی جیسی نعمت کو بغیر پائپ لائن کے زمین کے اندر جال کی صورت میں پھیلا
دیا کہ انسان جہاں سے چاہے کھود کر پانی حاصل کرے۔ یہی نہیں بلکہ "فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ"
زمین میں چشمے جاری کر دیئے، اسے گلنے سڑنے سے محفوظ کر دیا۔ تو فرض کرو کہ وہی ذات خداوندی
اس پانی کو اگر وہ زیادہ گہرائی میں لیجائے جو تمہاری دسترس سے باہر ہو تو بتلاؤ فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ
بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝ تو کون ہے جو تمہیں صاف و شفاف پانی مہیا کرے۔

تجربات شاہد ہیں کہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں پانی حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ کھدائی
کرنی پڑتی ہے۔ عرب کے بعض خطوں میں پانی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت اور بہت زیادہ صرفہ کرنا
پڑتا ہے۔ یہاں بھی کئی مقامات ایسے ہیں جہاں پانی کئی کئی سو فٹ گہرا ہے۔ ہمارے ہاں تو دس بیس
فٹ پہ پانی مل جاتا ہے۔ زمین بھی نرم ہے۔ مگر جہاں زمین پتھریلی اور پانی دور ہو وہاں بہت زیادہ

محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ صاف وشفاف پانی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو اس نے فری عطا کی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں چار پانچ میل کی گہرائی تک دھنسا دے تو تمہارے معبودوں میں سے کون ہے۔ جو تمہیں پانی مہیا کر دے۔ دوسری جگہ پہ اللہ تعالےٰ نے روشنی کا بھی اسی طرح ذکر فرمایا کہ اگر وہ سورج کو روک دے تو تمہارے پاس کوئی ہے جو روشنی کو لے آئے۔

ایک فلسفی کا انجام

تفسیر جلالین دو بزرگوں نے لکھی ہے۔ پندرہ پارے جلال الدین سیوطیؒ نے اور پندرہ پارے جلال الدین محلیؒ نے۔ جناب محلیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک فلسفی سائنس دان کا واقعہ نقل کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کون پانی لائے گا تو اس فلسفی نے کہا کہ ہم کہتے ہیں، ہمارا کدال پانی لائے گا، یہ بیلچہ پانی لائے گا۔ ہم ان کی مدد سے زمین کھود کر پانی حاصل کر لیں گے۔ تو مولانا جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس فلسفی کو اندھا کر دیا اور اس کی قوت ظاہری سلب کر لی کیونکہ اس نے غرور وتکبر کیا تھا۔ اگرچہ سزا کا اصل موقع تو حشر ہے مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ عبرت کے طور پہ دنیا میں بھی ایسے مغروروں کو نمونہ کے طور پر سزا کا کچھ حصہ دے دیتا ہے۔

اختتام آیت پر اللہ رب العلمین

حدیث شریف میں آتا ہے۔ جب یہ آیت پڑھی جائے فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ تو اس کے بعد کہنا چاہیے اَللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اگر آدمی نماز کی حالت میں ہو تب بھی آہستہ سے یہ الفاظ کہہ لے اَللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ آیت کے اختتام پہ پڑھنا مستحب ہے گویا یہ اس آیت پاک کا جواب ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔ کہ کون ہے جو تمہارے پاس پانی لے آئے تو پڑھنے والا یا سننے والا یوں کہے کہ وہ اللہ رب العلمین ہی ہے۔ جو پانی جیسی نعمت عظمیٰ کو مہیا کر سکتا ہے۔

(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

سورة

القلم

(مکمل)

درس اوّل ١

آیت ١ تا ٧

سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ قلم مکی ہے۔ یہ باون آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ⑦

ترجمہ :- قسم ہے قلم کی اور جو کچھ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں ① اے نبی (علیہ السلام) آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں ② اور بیشک آپکے لیے انتہا اور کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے ③ اور بے شک آپ بہت بڑے اخلاق پر ہیں ④ آپ بھی عنقریب دیکھ لیں گے اور یہ معترضین بھی دیکھ لیں گے ⑤ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا گیا ہے ⑥ بیشک تیرا رب خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بہک گیا اور وہ خوب جانتا ہے ان لوگوں کو بھی جو ہدایت کے راستے پر چل رہے ہیں ⑦

وجہ تسمیہ اور کوائف

اِس سورۃ کی پہلی آیت میں قلم کا لفظ مذکور ہے۔ اور اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام سورۃ قلم ہے۔ اس سورۃ کی باون آیات، تین سو الفاظ اور ایک ہزار دو سو چھپن حروف ہیں۔ اس سے پہلی سورۃ "ملک" کی تیس آیات تھیں اور اس کی باون آیتیں ہیں۔

مضامین سورۃ (ربط)

اس سے پہلی سورۃ میں توحید ذات خداوندی، دلائل توحید، جزائے اعمال اور ضمناً رسالت کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں زیادہ تر رسالت کا تذکرہ ہے۔ جزائے اعمال اور قیامت کا ذکر بھی ہے۔ پہلی سورۃ میں توحید کے دلائل زیادہ تھے، اس میں نبوت اور رسالت پر اعتراضات کے جواب

دیئے گئے ہیں۔ اُن کا رد کیا گیا ہے اور تنبیہ کی گئی ہے۔ خاص طور پر مکے کے خوشحال لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک خوشحال باغ والوں کا ذکر ہے جن کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عطا کردہ نعمت اُن سے چھین لی۔

دوسری طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ طعن کرنے والوں کی وجہ سے زیادہ پریشان نہ ہوں، بلکہ صبر کریں اور برداشت سے کام لیں۔ آخر میں مچھلی والے نبی کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا تھا لہذا وہ آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اس مثال سے نبی علیہ السلام کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قیامت اور اس میں پیش آنے والے بعض حالات کا بیان بھی ہے۔

زمانہ نزول

یہ سورۃ اُن سورتوں میں سے ہے، جو ابتدائے نبوت میں نازل ہوئیں بعض فرماتے ہیں کہ نزول کے لحاظ سے اس کا تیسرا نمبر ہے۔ پہلے نمبر پر سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس کے متصل بعد سورۃ فاتحہ نازل ہوئی، اور جبرائیل علیہ السلام نے آپؐ کو وضو کا طریقہ بتایا۔ اور آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ مزمّل کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد تیسرا نمبر اس سورۃ مبارکہ کا ہے اگر سورۃ فاتحہ کو الگ شمار کریں تو اس کا چوتھا نمبر ہوگا۔

نماز کی ابتداء

پہلی وحی کے بعد دوسرے روز آپ نے نماز ادا کی۔ اس نماز میں آپ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ، حضورؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ اور آزاد کردہ لونڈی ام ایمنؓ تھے۔ یہ آپ کے والد ماجد کی لونڈی تھی جسے آپؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ اس نے آپ کو گود میں کھلایا تھا اور آپ کے لیے بمنزلہ ماں کے تھی۔ آپؐ اس کا بڑا احترام فرماتے تھے۔ بچوں میں حضرت علیؓ بھی حضور کے ساتھ نماز میں شریک تھے۔

کفار کا اعتراض

مکہ کے اکثر و بیشتر لوگ جاہل تھے۔ حضور علیہ السلام کا نماز پڑھنا ان کے لیے عجیب بات تھی وہ اسے عجیب و غریب حرکات خیال کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے شروع میں ہی یہ طعنہ دیا کہ یہ لوگ پاگل اور مجنون ہو گئے ہیں جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ آپؐ کو مجنون کا خطاب اِسی دور میں دیا گیا۔

عقیدہ توحید سے انحراف

شاہ ولی اللہؒ اپنی مشہور کتاب "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں، اگرچہ نماز اور طہارت کا طریقہ عربوں میں معروف تھا۔ مگر عام لوگ جاہل تھے۔ ان کا عقیدہ بگڑ چکا تھا حضور علیہ السلام کی بعثت

سے چار سو سال پہلے تک لوگ مؤحد تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے۔ یہ قریش کے جد امجد قصی ابن کلاب کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد عربوں کے ایک شخص عمرو بن لحی نے بت پرستی سیکھی اور یہاں آکر رائج کی۔ اور پھر عقیدہ توحید میں ایسا بگاڑ پیدا ہوا کہ سارے عرب میں توحید پرست کوئی اکا دکا آدمی ہی نظر آتا تھا۔

توحید کی رمق

مکہ کی اتنی بڑی آبادی میں صرف ایک شخص ورقہ بن نوفل کا نام ملتا تھا۔ اس نے پہلی کتابوں کا علم سیکھا تھا اس لیے کسی حد تک توحید پرست تھا۔ اس کے علاوہ زید بن عمرو بن نفیل کا نام ملتا ہے۔ زید حضرت سعیدؓ کے والد تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام نے دس آدمیوں کو ایک ہی مجلس میں بہشتی ہونے کی بشارت دی تھی۔

یہ زید ابن عمرو بن نفیل خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ ہر طرف بت ہی بت تھے۔ بتوں کا طواف ہو رہا ہے، صفا مروہ کے درمیان بت رکھے ہیں، مشلل کے مقام پر بڑے بڑے بت تھے۔ کعبے کی دیواروں پر، چھت پر، مقام ابراہیم پر، الغرض چاروں طرف بت ہی بت تھے۔ اس حالت میں زید بن عمرو حقیقت سے تو بے خبر تھے۔ مگر کہتے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہے۔ شرک ہو رہا ہے۔ مگر وہ شرک سے بیزار تھے۔ مشرکوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا بھی نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے یہ غیر اللہ کے نام پر، لات وعزیٰ کے نام پر کاٹتے ہیں، لہٰذا میں اسے نہیں کھاؤں گا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام بھی مشرکین کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ ہاں اگر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو تو استعمال کر لیتے تھے۔

تو گویا اس گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے اکا دکا آدمی نظر آتے تھے۔ جن میں توحید کی رمق کسی حد تک باقی تھی، ورنہ ۹۹۹ آدمی مشرک ہی تھے

کفار کے طعن کا جواب

ان حالات میں جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو وضو کرتے، کھڑے ہوتے، رکوع کرتے، سجدہ کرتے دیکھتے تھے تو کہتے تھے فلاں آدمی پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہو گئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفار مکہ اور مخالفین کے اعتراض کا رد فرمایا ہے۔

حروف ن کے مختلف معانی

اس سورۃ کو "ن" کے حرف سے شروع کیا۔ جیسے الٓمٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ بعض سورتوں کی ابتدا میں یہ حروف آتے ہیں، اور حروف مقطعات کہلاتے ہیں اس مقام پر ن سے دو معانی مراد

سیپے لئے ہیں۔ ن کا ایک معنیٰ مچھلی ہے اور اس سورۃ کے آخر میں مچھلی والے پیغمبر کا ذکر ہے۔ اور ان کے حال کو سامنے رکھ کر تسلی دی گئی ہے کہ بے صبری نہ کرو وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ "۔ اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں صبر و اطمینان سے کام لیں یہ کفار طعن کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے آپ اپنا کام کرتے رہیں۔

دوسری جگہ سورۃ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا" اور مچھلی والے پیغمبر کا حال بھی سنو جب وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم گرفت نہیں کریں گے مگر ہم نے ان کو آزمائش میں ڈال دیا۔ پھر ان کے ساتھ مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کا جو واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا۔ اس سورۃ میں آگے چونکہ مچھلی والے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔ لہٰذا حرف نٓ کو شروع میں لانے میں شاید اسی واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو

نٓ کا دوسرا معنیٰ اس مقام پر دوات بھی ہو سکتا ہے۔ عربوں میں نٓ کا اطلاق دوات پر بھی کیا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں ؎

اِذَا مَا الشَّوْقُ بَرَّحَ بِيْ اِلَيْهِمْ اَلْقَتِ النُّوْنُ بِالدَّمْعِ السَّجُوْمِ

جس وقت مجھے شوق ان کی طرف ستاتا ہے۔ تو پھر دوات اپنے آنسو مسلسل بہانے لگتی ہے یعنی جب میں قلم لے کر خط لکھتا ہوں تو دوات اپنے آنسو مسلسل بہاتی ہے۔ تو گویا قلم کے کناروں سے جو سیاہی گرتی ہے اُسے آنسوؤں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تو گویا اس نٓ سے مراد دوات بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ قلم کا قریبی رابطہ دوات سے ہی ہوتا ہے۔

قلم عام و خاص معانی میں

نٓ وَالْقَلَمِ قسم ہے قلم کی وَمَا يَسْطُرُوْنَ اور جو کچھ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس جگہ قلم کا معنیٰ عام بھی ہو سکتا ہے اور خاص بھی اگر اس سے خاص قلم مراد لیا جائے تو وہ تقدیر کا قلم ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور حکم دیا اُكْتُبْ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ یعنی جو واقعات ہونے والے ہیں، سب لکھ دو، یہ قلم تقدیر ہے۔

عام قلم وہ ہے جسے لاکھوں، کروڑوں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ قلم بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے لوگوں کو علم سکھایا۔ اس لحاظ سے قلم کو بڑی حیثیت حاصل ہے حکومت کا مدار دو چیزوں پر ہے یعنی قلم اور تلوار۔ اور ان دونوں میں

قلم کو غلبہ حاصل ہے۔ قلم جو کچھ تحریر کرتی ہے، تلوار اس کے مطابق عمل کرتی ہے یعنی طاقت کا استعمال قلم کے حکم کے تابع ہے۔ اسی طرح دفتروں کے دفتر قلم سے لکھے جاتے ہیں علوم و معارف اور فنون وغیرہ سب قلم ہی سے احاطہ تحریر میں آتے ہیں۔

تو یہاں پر وَمَا يَسْطُرُوْنَ سے وہ تحریر مراد ہے، جو عام لوگ لکھتے ہیں۔ اور جس کے ذریعے لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں یعنی عام قلم۔ یہاں پر قلم سے مراد خاص قلم یعنی تقدیر کا قلم مراد نہیں ہے،

قسم اور اس کا جواب

پہلی آیت میں قلم اور اُس کے ذریعے جو لکھا جاتا ہے اُس کی قسم کا ذکر ہے۔ اگلی آیت میں اِس قسم کا جواب ہے مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ یعنی اے نبی علیہ السلام! آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔ قلم اور اس سے لکھی جانے والی ہر چیز اور ساری مخلوق اس بات پر گواہ ہے کہ آپ دیوانے نہیں ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جس نے جو بھی قلم سے لکھا ہے۔ اُسے ایک طرف رکھ دیں اور خاتم النبیین کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ایک طرف رکھ دیا جائے تو یہ ایک جملہ ہر چیز پر بھاری ہو گا، اور پتہ چل جائے گا کہ کیا یہ پاگلوں کا کلام ہے؟

حضور علیہ السلام کا ہر فرمان علم و حکمت کا خزانہ ہے

ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے ایک بچے کے ساتھ دل لگی کے لیے بطور مزاح ایک جملہ فرمایا تھا، تو اس ایک ازراہِ مزاح فرمودہ جملے سے محدثین اور فقہائے کرام نے ایک سو مسائل کا استنباط کیا۔ سوچو تو سہی کہ ایک بچے کا دِل خوش کرنے کے لیے فرمائے گئے ایک جملے سے اگر اس قدر مسائل اخذ ہو سکتے ہیں تو کیا حضور علیہ السلام کا کوئی بھی فرمان بھلا پاگلوں کی باتیں ہو سکتی ہیں؟ یہ حیثیت تو نبی علیہ السلام کے اپنے کلام کی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن پاک اپنی زبان سے ادا فرماتے ہیں، اس کا مقام کیا ہو گا۔ بھلا ایسی باتیں پاگلوں کی زبان سے نکلا کرتی ہیں؟

پھر فرمایا کہ مجنون آدمی تو کوئی صحیح کام نہیں کر سکتا۔ مگر آپ کے افعال ایسے ہیں۔ کہ دوست اور دشمن سب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس وقت تک آپ کو نبوت نہیں ملی تھی، اس وقت بھی آپ کے حالات اتنے مستقیم تھے۔ اور آپ کی ذاتِ اقدس کو اس قدر حکمت و دانائی عطا کی تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حجر اسود کی تنصیب کا کارنامہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ابھی پینتیس (۳۵) سال کی تھی، نبوت عطا ہونے

ہیں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ کعبہ کی تعمیر میں تنازعہ پیدا ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ حجرِ اسود کو اپنے مقام پر کون رکھے ہر قبیلے کا سردار اس سعادت کے حصول کا خواہشمند تھا۔ آپس میں جھگڑا فساد شروع ہو گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ دنگا فساد ٹھیک نہیں ہے اس معاملہ میں کسی کو اپنا فیصل مقرر لو اور اس کے فیصلے کو سارے تسلیم کر لو۔ چنانچہ طے پایا کہ جو شخص کل صبح سب سے پہلے حرم شریف میں داخل ہو، وہی فیصل ہو گا دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ حرم پاک میں سب سے پہلے داخل ہونے والے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ سب نے آپ کو اس تنازعہ میں فیصل تسلیم کر لیا۔

حضور علیہ السلام نے بطور فیصل ایسا فیصلہ صادر فرمایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب حجرِ اسود کی تنصیب کا وقت آیا تو آپ نے اپنی چادر مبارک بچھائی، اپنے ہاتھ سے حجرِ اسود اس میں رکھا اور تمام قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ لیں اور اسے تنصیب کی جگہ تک لے جائیں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچے تو حضور علیہ السلام نے اپنے دستِ مبارک سے پتھر کو اٹھا کر تنصیب کی جگہ پر رکھ دیا۔

اس فیصلے سے سب لوگ راضی ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے کمال کر دیا یعنی کمال درجے کا فیصلہ کیا۔ حکمت و دانائی سے چادر کے کونے سارے سرداروں کو پکڑا دیے اور کسی کو اعتراض کا موقع نہیں دیا۔ سب کہنے لگے رَضِینَا رَضِینَا ہم راضی ہیں، ہم خوش ہیں، یہ خوب فیصلہ ہے

حضور علیہ السلام کے لیے بے انتہا اجر

تو فرمایا کہ اے نبی علیہ السلام! یہ پاگلوں کے کام نہیں ہیں بلکہ وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ یعنی آپ کے لیے بے انتہا اور کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ آپ کے اپنے اعمال اور آپ سے علم سیکھ کر آگے سر انجام دیے جانے والے سب اعمال کا اجر آپ کو ملتا چلا جائے گا۔ پیغمبر کے اجر کی کوئی انتہا نہیں۔ تمام لوگ پیغمبر کے واسطے سے جو بھی اچھی بات سیکھیں گے اس کا اجر پیغمبر علیہ السلام کو برابر ملتا رہے گا۔ تو گویا اس طرح پیغمبر کا اجر بے انتہا ہے۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔

آپ کا خلقِ عظیم

اس پس منظر میں کہ کفار آپ کو مجنوں اور پاگل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ معاذ اللہ آپ دیوانے نہیں ہیں بلکہ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ بیشک آپ بہت بڑے اخلاق پر ہیں۔ آپ کا اخلاق بہت عظیم ہے۔ یہ کفار و مشرکین حماقت، جہالت اور تعصب کی بنا پر آپ کی ذات پر اعتراض کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آپ سب سے بڑے اخلاق پر ہیں۔ کائنات میں آپ سے

بڑا اخلاق ہے ہی نہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو سب سے بڑا اخلاق اس لیے کہا گیا لَمْ تَکُنْ لَهٗ هِمَّتُهٗ سِوَى اللّٰهِ یعنی آپؐ کے دل میں رضائے الٰہی کے سوا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں ہے۔ اور مخلوق کے ساتھ آپ کمال درجے کے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔

اب ظاہر میں آپ مخلوق کے ساتھ ہیں اور باطن میں اللہ کے ساتھ۔ اسی لیے لوگوں کے ساتھ کمال درجے کا معاملہ کرتے ہوئے بھی بے گانہ ہی ہیں، کیونکہ اندر کا معاملہ اللہ کے ساتھ چل رہا ہے خدا تعالےٰ کے سوا آپ کا کوئی مقصود نہیں۔ تو ظاہر آپ کا مخلوق کے ساتھ تھا اور باطن حق کے ساتھ اسی لیے آپ کا اخلاق، خلق عظیم یعنی سب سے بڑا اخلاق ہے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی خدا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کر دوں۔ حضور کے اخلاق کی کوئی مثال نہیں۔ تمام نبیوں اور انسانوں میں آپ کا اخلاق سب سے بلند ہے۔ اور اسی اخلاق کو معیار مقرر کیا گیا ہے۔

حضور علیہ السلام سے قرب کا مدار اچھے اخلاق پر ہے

حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، قیامت کے دن تم میں سے مجھ سے زیادہ قریب وہ ہوگا جس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ اور فرمایا جنت میں بھی وہ لوگ کثیر تعداد میں جائیں جن کے اخلاق اچھے ہونگے منافق کے بارے میں فرمایا۔ اس کا اخلاق کبھی اچھا نہیں ہوگا، اور اسے دین کی سمجھ کبھی حاصل نہیں ہوگی

امت محمدیہ کا فتنہ مال ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "ہر امت کا کوئی فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یہ مال میں تباہ ہوگی۔ اور ہر امت کا کوئی خاص اخلاق ہوتا ہے۔ اور میری امت کا خاص اخلاق حیا ہے۔ جب تک ان کے اندر حیا موجود رہے گی، یہ بالکل ٹھیک رہیں گے۔ جب حیا کا خلق ضائع ہوگیا، خرابی آجائے گی۔ بے حیائی پیدا ہو جائے گی۔"

مفتون کون ہے

اخلاق محمدی کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ربانی ہے، فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ یعنی آپ بھی عنقریب دیکھ لیں گے اور یہ معترضین بھی دیکھ لیں گے بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا گیا ہے۔ یہ خود پاگل ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ تیرا رب خوب جانتا ہے۔ جو اس کے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور وہ خوب جانتا

سے ان لوگوں کو بھی جو ہدایت کے راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ آپ ان لوگوں کے اعتراض سے نہ گھبرائیں۔

آگے مزید تسلی اور بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں۔

درس دوم ۲ آیت ۸ تا ۱۶

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾

پس آپ ان مکذبین کی بات تسلیم نہ کریں ﴿۸﴾ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (اپنے مشن میں) ڈھیلے ہو جائیں تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں ﴿۹﴾ اور (بات بات پر جھوٹی قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کا کہنا مانیں ﴿۱۰﴾ طعنہ دینے والا چغلیاں کرنیوالا ﴿۱۱﴾ نیکی کے کاموں سے روکنے والا تعدی کرنیوالا گنہگار ﴿۱۲﴾ اکڑ والا علاوہ ازیں (نسب میں) متہم بھی ہے ﴿۱۳﴾ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال اور بیٹے دے رکھے ہیں؟ ﴿۱۴﴾ جب اس پر ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پرانے زمانے کے قصے کہانیاں ہیں ﴿۱۵﴾ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے ﴿۱۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت اور رسالت عطا فرمائی اور آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے وضو کرنا شروع کیا، نماز پڑھنا شروع کیا، تو مکہ کے مشرک سرداروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ العیاذ باللہ یہ لوگ مجنون ہو گئے ہیں، پاگلوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان مشرکین میں ولید بن مغیرہ، ابوجہل، اخنس بن شریق وغیرہ زیادہ پیش پیش تھے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مجنون کا لفظ استعمال کرتے تھے کہ انکے دماغ ٹھکانے نہیں رہے، عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں۔

شروع سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس الزام کا جواب دیا اور ثابت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فضل و احسان سے دیوانے نہیں ہیں۔ بلکہ آپ تو بلند سے بلند اخلاق پر ہیں۔ اور ضمناً بات سمجھا دی کہ دیوانے اور مجنون حضرات کی حرکات اور ان کے کام مشوش ہوتے ہیں۔

اور حضور نبی کریم تو لوگوں کے سامنے علم، حکمت اور معرفت کی بلند ترین باتیں پیش کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں جن کا مقابلہ کرنے سے انسان عاجز ہے۔ آپ کا اخلاق بھی بہت عالی ہے تو ایسے شخص کو دیوانہ کہنا انتہائی تعصب کو ظاہر کرتا ہے۔

مشرکین کی پیش کش

نبی علیہ السلام کو اپنے مشن سے ہٹانے کے لیے کئی پیش کشیں کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ اگر آپ پسند کریں تو ہم آپ کے لیے اچھی سے اچھی اور حسین سے حسین عورت پیش کر سکتے ہیں۔ اگر آپ مال و دولت کے خواہشمند ہوں، تو مال مہیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپؐ عمدہ خوراک اور عمدہ لباس پسند فرمائیں، تو یہ سب چیزیں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر آپ سردار بنا پسند کریں تو ہم سب آپ کے بھائی بند ہیں، آپکے خاندان کے لوگ ہیں، ہم آپؐ کو اپنا سردار تسلیم کرنے کو تیار ہیں، بشرطیکہ آپؐ اپنے مشن سے ہٹ جائیں۔ آپ بیشک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں، ہم اس میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ جن معبودوں کی ہم عبادت کرتے ہیں، آپ ان کو بُرا بھلا نہ کہیں، ہمیں ان کی عبادت سے نہ روکیں، ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے اور اس کے بدلے ہم آپؐ کو تمام مراعات دینے کو تیار ہیں۔

مداہنت حرام ہے

مشرکین کے مذکورہ بے ہودہ خیالات اور فضول پیش کش کے جواب میں یہ آیات نازل فرمائیں ارشاد ہوا، فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ یعنی آپ اِن مکذبین کی بات کو تسلیم نہ کریں۔ یہ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت، قیامت اور رسالت کو جھٹلانے والے ہیں، ان کی بات نہ مانیں، کیونکہ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے مشن میں ڈھیلے ہو جائیں تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے۔ یہ لوگ آپؐ سے مداہنت چاہتے ہیں۔ جو کہ قطعی حرام ہے۔ لہذا آپ اِن کی بات نہ مانیں۔

حسن اخلاق اور مداہنت میں فرق

حسنِ اخلاق اور مدارات الگ چیز ہے، جبکہ مداہنت الگ۔ اول الذکر بہت اچھی چیز ہے اور مؤخر الذکر حرام ہے۔ حسنِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر موافق اور مخالف کے ساتھ مدارات اور حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ یعنی لوگوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ میل جول رکھو۔ تو گویا مدارات اور حسنِ اخلاق مطلوب ہے اور اس پر کامیابی کا مدار ہے۔ قیامت کے روز حسنِ اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَقْرَبُكُمْ اِلَیَّ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا قیامت والے دن میرے قریب وہ لوگ ہوں گے، جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ یہاں پر آپؐ کو

صاف فرما دیا کہ مکذبین کی بات نہ مانیں۔ یہ آپ کو ورغلانا چاہتے ہیں — مشن سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ مداہنت پہ آمادہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ حرام ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دی کہ مداہنت دین کے حقوق میں ہوتی ہے۔ جب کہ حسنِ اخلاق انسان کے اپنے حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کی عزت نہیں کرتا، اکرام نہیں کرتا تو یہ درگذر کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا تعلق انسان کے اپنے حقوق سے ہے۔ برخلاف اس کے کہ اگر کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے روکنا چاہتا ہے، تو یہ دین کا معاملہ ہے اور یہی مداہنت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی نے مارا، بُرا بھلا کہا، گالی دی، ملامت کی، آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا سوائے جہاد کے کہ امیہ بن خلف کو اس کی گردن پر نیزہ مارا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوئی، اور نہ آپؐ نے اپنی کسی بیوی کو اور کسی خادم کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہ آپ کا حسنِ اخلاق ہے

ہاں اگر دین کے معاملہ میں کوئی شخص خلل انداز ہوتا تھا۔ تو آپؐ ناراض ہو جاتے تھے۔ اور ایسے ناراض ہوتے تھے۔ کہ آپؐ کے غصے کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکتی تھی۔ جب تک کہ اس چیز کو پورا نہ کر دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی چیز کی بے ادبی ہو رہی ہے، یا شریعت اور دین کے خلاف کوئی بات ہو رہی ہے، تو آپ سخت غصے میں ہوتے تھے۔ تو گویا حسنِ اخلاق اور مداہنت میں یہی فرق ہے۔

دین کے معاملہ میں سودے بازی نہیں ہو سکتی

تو فرمایا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں۔ کہ آپؐ مشرکین کے شرک اور ان کے معبودانِ باطلہ کا رد نہ کریں، یہی تو مداہنت ہے۔ جو کہ حرام ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا بلکہ لوگوں کو بتایا جائے گا کہ شرک قبیح چیز ہے، اس سے بچو۔ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپؐ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں اور یہ اپنے معبودان باطلہ کی۔ اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ نہیں یہ سودے بازی نہیں ہو سکتی یہ دین کا معاملہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں وَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ

یعنی اے نبی علیہ السلام ان مکذبین کی بات ہرگز نہ مانیں۔ منکرات کے خلاف سینہ سپر رہیں۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کوئی کہے کہ بدعات اور دیگر برائیوں سے نہ روکو، جیسے کوئی کرتا ہے کرنے دو۔ کوئی سینما دیکھتا ہے، دیکھنے دو، کوئی جوا کھیلتا ہے، کھیلنے دو، کسی کو کچھ نہ کہو نہیں یہ درست نہیں ہے۔ منکرات منہیات اور ممنوعات کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔ اسی طرح اچھی باتوں کی طرف رغبت دلانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ مداہنت ہوگی، جو کہ دین میں حرام ہے۔

مجنوں کہنے والے کی مذمت

ولید بن مغیرہ جس نے نبی علیہ السلام کو مجنوں کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ایک لفظ کے بدلے دس الفاظ سے اس کی مذمت بیان کی۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمت نازل فرماتا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے جس شخص نے حضور کو ایک لفظ مجنون کا خطاب دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت میں دس الفاظ استعمال کیئے۔

جھوٹی قسمیں کھانے والا اور ذلیل

فرمایا وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ یعنی بات بات پر جھوٹی قسمیں کھانے والے اور ذلیل شخص کا کہنا مانیں۔ زیادہ قسمیں اٹھانا ویسے بھی مکروہ ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر قسم کھانا ضروری ہی ہو تو اللہ کے نام کی قسم کھانا چاہیئے "وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ" یعنی خدا کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ ہی نہ بنا رکھو۔ یہ بھی قبیح فعل ہے۔ ہاں جب بعض حالات میں انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ گواہ موجود نہیں ہوتا اور دوسرے کو یقین دلانے کے لیے قسم اٹھانا ہی پڑے تو اللہ کے نام کی ہی اٹھانا چاہیئے۔ تو فرمایا یہ شخص حلاف ہے یعنی جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے مَهِينٍ یعنی ذلیل بھی ہے۔

طعنہ باز، عیب جو اور چغل خور

یہ شخص هَمَّازٍ یعنی طعنہ دینے والا ہے، ہمز کے معنی توڑنا اور طعنہ دینا جیسے "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ"، ہماز طعنہ دینے والا اور لماز عیب جوئی کرنے والا۔ طعنہ بھی کسی کو نہیں دینا چاہیئے۔ یہ بھی ممنوع ہے اور مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ۔ یعنی چغلیاں کرتا ہے۔ نمیمہ کے معنے چغلی کھانا ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا تاکہ آپس میں جھگڑا ہو۔ اس کو قتات بھی فرمایا لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ یعنی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ فساد برپا کرنے کے لیے بات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے دو قبر والوں کا حال حضور علیہ السلام پر منکشف فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا ان کو سزا ہو رہی ہے۔ ان میں سے ایک آدمی پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔ خواہ کپڑوں پر چھینٹے پڑ جائیں یا جسم پر مگر یہ پروا نہیں کرتا تھا۔ اس جرم میں سزا ہو رہی ہے۔ اور دوسرا شخص چغلی کیا کرتا تھا۔ ان دونوں عیبوں سے بچنا ضروری ہے۔ انسان چغلی سے بچ سکتا ہے۔ اور پیشاب کی نجاست سے بھی محتاط رہ سکتا ہے، کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

نیکی سے روکنے والا اور تعدی کرنے والا گنہگار

اس شخص کی دوسری صفات یہ بیان فرمائیں کہ یہ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ یعنی نیکی کے کاموں سے روکتا ہے اور مُعْتَدٍ یعنی تعدی کرتا ہے لوگوں کے حق ضائع کرتا ہے نیز اَثِيمٍ یعنی گنہگار ہے۔ شراب بھی پی لی بدکاری بھی کر لی۔ اور جو کچھ بھی آیا کرتا چلا گیا۔

اکڑ فوں اور متہم

یہ شخص عُتُلٍّ یعنی اکڑ والا بھی ہے۔ مغرور ہے۔ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ اور متہم بھی ہے نسل کے اعتبار سے بھی اس پر اتہام ہے۔ کہ صحیح النسل نہیں ہے۔

مال اور اولاد پر فخر

آگے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص اس لیے اکڑ دکھاتا ہے کہ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ کہ اللہ تعالےٰ نے اسے مال اور بیٹے دے رکھے ہیں۔ اس کے دس بیٹے تھے۔ ان میں سے تین نے اسلام قبول کیا، خالدؓ، عمارہؓ، اور ہشامؓ جب یہ مجلس میں آتے تھے بڑی رونق ہوتی تھی۔ دس جوان بیٹے اور مال کی فراوانی تھی۔ مال تجارت میں لگا ہوا تھا۔ ایک لاکھ اشرفیاں تجارت میں لگی ہوئی تھیں۔ جانوروں میں اونٹ اور بکریاں بھی بہت تھیں۔ جب اللہ تعالےٰ نے اس قسم کے انعامات فرمائے تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ شخص الٹا اکڑ دکھاتا تھا۔

پہلے لوگوں کی کہانیاں

اس شخص کی ایک مزید صفت یہ بیان کی کہ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ تو کہتا ہے یہ پرانے زمانے کے قصے کہانیاں ہیں، کبھی کہتا تھا کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں پرانے زمانے کے عاد اور ثمود کی کہانیاں سناتا ہے ——— آؤ میں تمہیں بہمن و اسفندیار کے قصے سناؤں۔ جیسے بہمن اور اسفندیار کے قصے مشہور ہیں یعنی ایرانیوں کے قصے۔ اسطورہ یونانی لفظ ہے۔ عربی میں بطور جمع اساطیر استعمال ہوا۔ قصے کہانیاں، جسے انگریزی میں سٹوری (STORY) کہتے ہیں۔

اس دشمنِ دین کی تمام تر مذمت بیان کرنے کے بعد سزا کے طور پہ فرمایا سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے۔ یہ اونچی ناک یعنی سونڈھ والا اور بڑا باعزت بنا پھرتا ہے۔ ہم اس کو ذلیل و خوار کر دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ اور دوسرے مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ میدان بدر میں انصار کے ایک شخص نے اس کی ناک پہ زخم لگایا تھا۔ یہ بچ کر بھاگ نکلا۔ واپس مکہ میں آکر علاج کرتا رہا۔ زخم ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ آکلہ بن گیا۔ جیسا غانغرانہ (jANgRIN) ہوتا ہے۔ اور پھر اسی تکلیف سے مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو خرطوم یعنی ہاتھی سے تشبیہ دی۔ خرطوم کا اطلاق خنزیر پر بھی ہوتا ہے تو اس شخص کا یہ انجام ہوا۔

دشم
قوا

درس سوئم ۳ آیت ۱۷ تا ۳۳

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْآ اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ ع

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے ان کو آزمایا ہے، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا۔ جب انہوں نے قسم اٹھائی کہ ضرور باغ کے پھل کو علی الصبح کاٹیں گے ﴿۱۷﴾ اور انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا ﴿۱۸﴾ پس پھر گیا اس باغ پر پھرنے والا تیرے رب کی طرف سے اور وہ سوئے ہوئے تھے ﴿۱۹﴾ صبح تک ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو ﴿۲۰﴾ پس وہ صبح سویرے ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے ﴿۲۱﴾ کہ سویرے چلو اپنی کھیتی کی طرف چلیں اگر تمہیں پھل توڑنا ہے ﴿۲۲﴾ پس وہ چلے آپس میں چپکے چپکے کہتے تھے ﴿۲۳﴾ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے پائے ﴿۲۴﴾ وہ صبح سویرے چلے کہ (بزعم خویش) نہ دینے پر قادر ہیں ﴿۲۵﴾ پس جب انہوں نے (موقع پر پہنچ کر) اس کو دیکھا تو کہنے لگے ہم راستہ بھول گئے ہیں ﴿۲۶﴾ بلکہ ہم محروم ہو گئے ﴿۲۷﴾ منجھلے بھائی نے کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ

کی تسبیح کیوں نہیں کرتے (۲۸) پکار اٹھے پاک ہے ہمارا رب بیشک ہم ہی تھے ظالم (۲۹) پھر متوجہ ہوئے، بعض بعض پر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (۳۰) ساتھ یہ بھی کہنے لگے، افسوس! بیشک ہم ہی سرکشی کرنے والے ہیں (۳۱) امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب اب ہمارے لیے اس سے بہتر باغ تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ ہم اپنے رب کی طرف راغب ہوتے ہیں (۳۲) سزا اسی طرح ہوا کرتی ہے، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے اگر یہ لوگ سمجھ جاتے (۳۳)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالٰے نے اُن انعامات کا ذکر فرمایا، جو پیغمبر علیہ السلام پر کئے اور توحیدِ الٰہی، رسالت اور معاد کے مکذبین کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کی کسی بات کو تسلیم نہ کریں کیونکہ ان بے ہودہ لوگوں نے نبی جیسے عقل مند، ذہین اور سب سے بلند اخلاق والی ہستی کو العیاذ باللہ مجنون کا خطاب دیا۔ یہ مشرکین آپؐ کو مداہنت پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالٰے نے ایسے لوگوں کی دس الفاظ کے ساتھ مذمت بیان کی۔ پھر فرمایا کہ یہ اس لیے غرور و تکبر کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالٰے نے مال و اولاد سے نوازا ہے۔ یہ انعامات تو شکر گذاری کا سبب بننا چاہئیں نہ کہ تکذیب و نافرمانی کا۔ ان کے غرور کا حال بیان فرماتے ہوئے کہا کہ جب اِن کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں، اِن میں کیا دھرا ہے، یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ تو اللہ تعالٰے نے سزا کے طور پر فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں کو ذلیل کریں گے۔ ان کی ناک پر ذلت کا نشان لگا دیں گے۔

مال کی فراوانی مقبولیت کی علامت نہیں

اِس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالٰی نے جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، عیب جو، چغل خور، نیکی سے روکنے والے، حد سے بڑھنے والے، پاپی اور متکبر جیسے بُرے الفاظ سے یاد کیا، اور فرمایا کہ یہ صحیح النسب بھی نہیں ہیں، ان پر یہ انعامات کیوں کئے۔ مال و دولت اور اولاد کی نعمت سے مالا مال کیوں کیا۔ یہ تو اس اچھے سلوک کے لائق نہ تھے، پھر اِن کو ریاست اور سرداری کیوں عطا کی۔

اِس سوال کے جواب میں اللہ تعالٰے نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ یعنی ہم نے اُن کو محض آزمایا ہے۔ مال و اولاد کی فراوانی ان کی محبوبیت اور مقبولیت کی علامت ہرگز نہیں ہے

مال و اولاد ذریعہ آزمائش ہیں

اللہ تعالٰے کے نزدیک مقبولیت اور محبوبیت کی نشانی ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں نہ کہ مال و دولت۔ اکثر و بیشتر انبیائے کرام کے حالات دنیا میں کیسے رہے۔ کیا اُن کے پاس مال و دولت

یا خزانوں کی فراوانی تھی ؛ بیشک بعض کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور خلافت بھی عطا کی ، مگر اکثریت کی دنیوی حالت کمزور ہی رہی ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب اور محبوب رسول اور نبی ہیں اور پھر اُن کے ساتھ ملنے والے لوگ ۔

تو یہ مال و دولت اور جاہ و جلال اُن کے اچھا ہونے کی علامت نہیں بلکہ یہ اقتدار اور ریاست اور نعمتیں محض امتحان کے لیے ہیں ۔ اُن کی آزمائش کا ذریعہ ہیں ۔

باغ والوں کی مثال

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ہم نے یہ مال و دولت اِن لوگوں کو دے کر اُسی طرح آزمائش میں مبتلا کیا ہے کَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا ۔ جنت کا معنیٰ بہشت بھی ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں نصیب ہوگی ، ویسے جنت کا عام معنیٰ باغ ہے یہاں پر جنت سے مراد دنیوی باغ ہے ۔ جس باغ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن باغ والوں کو آزمایا تھا ۔

یہ باغ کہاں تھا ۔ اس ضمن میں مفسرین کرام کی مختلف رائیں ہیں ۔ حضور علیہ السلام کے ارشاد گرامی میں کوئی صحیح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے ۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ حبشہ میں تھا ، یا یمن کے مرکزی شہر صنعا سے چند میل کے فاصلے پر یہ باغ وادی ضروان میں تھا ۔

باغ کے مالک کی فیاضی

باغ کا مالک مومن اور ایماندار آدمی تھا ۔ باغ کی پیداوار میں سے اپنی ضروریات کے علاوہ غریب پروری بھی کرتا تھا ۔ چنانچہ فصل کی کٹائی کے موقع پر غربا اور مساکین جمع ہو جاتے تھے ۔ اور باغ کا مالک انہیں کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرتا تھا ۔ اسی طرح جب کھلیان تیار ہو جاتا تھا ۔ تو اس کے ناپنے کے موقع پر بھی مستحقین کو اُن کا حصہ دیتا تھا پھر جب آٹا پسوا کر روٹی تیار ہوتی تھی ، جب بھی وہ مساکین کا حق ادا کرتا تھا ۔

حضرت جعفر طیار رض

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ایسا کوئی سوار کسی سواری پر سوار نہیں ہوا ، اور کسی نے جوتا نہیں سلوایا ، اور پہنا ، جو حضور ؐ کے بعد حضرت جعفر رض کے برابر ہو ۔ وجہ یہ ہے کہ آپ بڑے مسکین پرور تھے ۔ اوّل تو یہ کہ غربا اور مساکین کے پاس خود بیٹھتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ کبھی سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے ، جب تک کوئی مسکین بھی سوار نہ ہو ۔ اسی طرح جب اپنے لیے جوتا بنواتے تھے تو کسی غریب کے لیے بھی تیار کرواتے تھے ۔ آپ اُس وقت تک جوتا نہیں پہنتے تھے ، جب تک کسی مسکین کو بھی

ساتھ شریک نہ کرلیں، اسی لیے حضور علیہ السلام نے آپ کا لقب ابوالمساکین رکھ دیا تھا "مسکینوں کا باپ" یعنی بڑا شفیق۔ یہ حضور کے چچازاد یعنی حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے۔ جنگ موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے بہشت میں دیکھا کہ جعفرؓ فرشتوں کے ہمراہ پروں کے ساتھ پرواز کر رہا ہے۔ آپ کے دونوں بازو جنگ موتہ میں کٹ گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے جھنڈا دانتوں کے ساتھ تھامے رکھا۔ حضورؐ نے آپ کا نام جعفر طیارؓ رکھ دیا۔

باغ والے کے بیٹوں کا بخل

جیسا کہ مذکور ہے باغ کا مالک مسلمان مومن اور غریب پرور تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے بعض روایات میں تین کا ذکر آتا ہے۔ یہ بیٹے باپ کی طرح فیاض نہیں تھے۔ جب باپ فوت ہوگیا اور باغ بیٹوں کی ملکیت میں آگیا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمارا باپ تو ہر موقع پر غرباء اور مساکین کو دے دیتا تھا جس کی وجہ سے ——— ہماری بہت سی آمدنی چلی جاتی تھی۔ ہمارا باپ کوئی عقلمند آدمی نہ تھا جو اپنی آمدن کو اس طرح ضائع کرتا تھا۔ ہم بال بچے دار ہیں، ہمیں اپنی ضروریات کے لیے سب کچھ خود رکھ لینا چاہیے۔ کسی غریب مسکین کو دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہاں کا رواج اور دستور یہ تھا کہ پھل توڑنے کے وقت، فصل کی کٹائی کے وقت اور گہائی وغیرہ کے موقع پر مساکین وہاں پہنچ جاتے تھے تو کھیت کا مالک کسی کو مایوس نہیں کرتا تھا۔

بیٹوں کا منصوبہ

اپنی فصل کو غرباء اور مساکین میں تقسیم سے بچانے کے لیے بیٹوں نے یہ منصوبہ تیار کیا۔ کہ پھل ایسے وقت اتارا جائے جس وقت کسی کو پتہ نہ چلے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ صبح بہت سویرے جا کر پھل اتارنا چاہیے جب کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ نہ کسی کو معلوم ہوگا۔ نہ کوئی موقع پر پہنچے گا اور نہ ہمیں کسی کو کچھ دینا پڑے گا۔

پانچ بھائیوں میں سے درمیانے بھائی کی رائے مختلف تھی۔ وہ کہتا تھا کہ مساکین کا حق نہ مارو، اُن کا حق انہیں ملنا چاہیے۔ مگر دوسرے بھائی اُسے ڈانٹ پلا کر خاموش کر دیتے تھے۔ اور وہ بیچارہ بھی مجبوراً اُن کے ساتھ شریک ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہی مثال مکے والوں کی بیان کی۔ کہ جس طرح باغ والے کے بیٹے تھے اسی طرح مکے والے بھی نافرمان ہوگئے۔

الغرض انہوں نے اِذْ اَقْسَمُوْا قسم اٹھائی لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ کہ باغ کے پھل کو

علی الصبح کاٹیں گے۔ تاکہ اس وقت کوئی غریب مسکین وہاں موجود نہ ہو۔

انشاء اللہ کی اہمیت

یہ فیصلہ کرتے وقت وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا۔ حالانکہ کسی کام کا ارادہ کرتے وقت اگر ساتھ انشاء اللہ کہہ دیا جائے تو کام کے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے کی صورت میں بھی آدمی گنہگار نہیں ہوگا۔ کیونکہ انشاء اللہ کہنے سے اس کام کو اللہ تعالیٰ کی مشیت پہ چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح نہ تو آدمی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی قسم اٹھانے کی صورت میں حانث (قسم کو توڑنے والا) ہوتا ہے یہ کلمہ کہنے والا وعدہ خلاف بھی نہیں ہوتا۔ الغرض انشاء اللہ کہہ کر اپنا کام کو اللہ تعالےٰ کو سونپنے والی بات ہے اور ایمان کی نشانی ہے۔

غریبوں کی حق تلفی

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یَسْتَثْنُوْنَ کا معنیٰ انشاء اللہ نہیں بلکہ اس سے مراد استثنیٰ کرنا ہے۔ کہ مثلاً غریبوں کا حق مستثنیٰ کر دیا جائے الگ کر کے ان کو دے دیا جائے۔ مگر انہوں نے تو ارادہ کیا وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ کہ غریبوں کو ہرگز نہیں دیں گے۔ اگر باپ دیتا تھا تو اب ہم کسی کو نہیں دیں گے۔ پھل کا ایک ایک دانہ خود کاٹیں گے۔

عذاب الٰہی

اُدھر وہ اپنا منصوبہ بنا رہے تھے اور ہوا یہ کہ فَطَافَ عَلَیْهَا طَآئِفٌ پس پھر گیا اس باغ پہ پھرنے والا مِنْ رَّبِّكَ تیرے رب کی طرف سے وَهُمْ نَآئِمُوْنَ اور وہ تو گھروں میں سوئے ہوئے تھے۔ یعنی بیٹے تو رات کو منصوبہ بنا کر سوگئے کہ صبح سویرے اٹھ کر پھل توڑ لیں گے مگر راتوں رات عذاب الٰہی پہنچ گیا اس حالت میں کہ وہ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

عذاب الٰہی کس صورت میں نازل ہوا مفسرین کرام دو روائیتیں بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ راتوں رات ڈاکو آئے اور پکا پکا یا پھل توڑ کر لے گئے اور درختوں کو کاٹ دیا اور جلا دیا۔ اور باقی کوئی چیز نہ رہنے دی۔ دوسری روایت یہ ہے۔ کہ کوئی آسمانی آفت نازل ہوئی جس نے سارے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، نہ کوئی درخت رہا نہ پھل، اناج کا ایک دانہ تک باقی نہ بچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ صبح تک ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ سارا باغ ایسا ہو گیا جیسا کہ گھاس کاٹ دی گئی ہو اور ساری جگہ ویران ہو گئی

ادھر باغ کی حالت تو راتوں رات یہ ہو گئی اور دوسری طرف فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ بیٹے صبح سویرے اٹھ کر ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے، اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ

چلو اپنی کھیتی کی طرف چلیں، اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ اگر تمہیں پھل توڑنا ہے۔ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ یَتَخَافَتُوْنَ پس وہ چپکے چپکے سے چل دیے۔ اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّهَا الْیَوْمَ عَلَیْکُمْ مِّسْکِیْنٌ تاکہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے پائے۔ اور نہ کسی کو کچھ دینا پڑے۔

بیٹوں کی محرومی

وَّغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ۝ عَلٰی حَرْدٍ کے دو معنی ہو سکتے ہیں یعنی تیز تیز چلنا اور منع کرنا، روک دینا۔ تو اس مقام پر دونوں معانی لگ سکتے ہیں۔ یعنی وہ صبح سویرے تیز تیز چلے یا وہ اس ارادہ سے چلے کہ کسی کو کچھ نہیں دینا ہے۔ نیز وہ سمجھتے تھے کہ وہ قٰدِرِیْنَ ہیں۔ یعنی وہ اس بات پر قادر ہیں کہ پروگرام کے مطابق صبح سویرے جا کر پھل توڑ سکیں گے۔ اور کسی غریب مسکین کو کچھ نہیں دیں گے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا پس جب انہوں نے موقع پر پہنچ کر دیکھا، تو سمجھے قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ کہ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ ہمارا باغ تو نہیں ہے، ہم کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔ کیونکہ وہاں پر تو ان کے باغ کی کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔ پھر جب انہوں نے اچھی طرح غور کیا اور معلوم ہو گیا کہ ہم راستہ نہیں بھولے بلکہ اپنے ہی باغ میں آئے ہیں۔ تو پکار اٹھے بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ہم محروم ہو گئے، ہماری قسمت پھوٹ گئی، ہمارا تو باغ ہی تباہ ہو گیا ہے۔

جب ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے باغ سے محروم ہو گئے ہیں، تو قَالَ اَوْسَطُهُمْ درمیانے یا منجھلے بھائی نے کہا اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ تم نے تو انشاء اللہ بھی نہ کہا۔ اور خدا تعالیٰ کی مشیت پر نہ چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تم باغ سے بالکل محروم ہو گئے۔ اگر مساکین کا حق ادا کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔

درمیانی اشیاء کی افضلیت

ان بھائیوں میں سے صحیح مشورہ دینے والا درمیانہ بھائی تھا۔ اس نے پہلے بھی کہا تھا۔ کہ غرباء مساکین کا حق تلف نہ کرو، مگر دوسرے بھائیوں نے اسے ڈانٹ پلا کر اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ تو گویا ان سب میں سے درمیانہ بھائی افضل تھا کہ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا یعنی درمیانی چیز بہتر ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کی امت کو اُمَّةً وَّسَطًا کہا گیا یعنی یہ امت باقی امتوں سے افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ فراخی اور تنگی رزق پر قادر ہے

رزق کی فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ چاہے تو کسی کو بے حد و شمار

عطا کرے، اور چاہے تو تنگی مسلط کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا تو ایسا دور بھی آئے گا، کہ صدقہ قبول کرنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ اس قدر مال کی فراوانی ہوگی۔ زمین سونا اگلے گی مگر کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔ صدقہ دینے والا جا کر کہے گا کہ لو بھئی یہ زکواۃ یا صدقہ ہے اسے قبول کر لو۔ آگے سے جواب آئے گا، اگر کل لے آتے تو میں قبول کر لیتا کل تک میں محتاج تھا، مگر آج مجھے ضرورت نہیں ہے۔ مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی۔ اللہ تعالےٰ چاہے تو رزق میں ایسی فراخی پیدا کر سکتا ہے۔

مگر یہ قانونِ قدرت ہے کہ اللہ تعالےٰ دنیا میں سب کو ایک جیسا نہیں رکھتا۔ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ یعنی اللہ نے بعض کو بعض پر فوقیت دی۔ کسی کو مال دے کر آزمائش میں ڈال دیا۔ مال عطا کر کے حکم دیا کہ اس مال سے زکواۃ دو، حج کرو، صدقہ و خیرات بھی کرو۔ اس میں عزیز و اقربار کا حق بھی ہے۔ ان تمام حقوق کو پورا کرو۔ جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ مال کوئی عذاب تو نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ساتھی ہے مگر اس کے لیے لِمَنْ اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا کرنے کے بعد کوئی شخص سرمایہ دار نہیں رہ سکتا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ سارے حقوق ادا کرنے کے بعد دیکھیں کسی کے پاس دو درہم بھی بچتے ہیں؟

اسلام کا نظام معیشت

اس وقت دنیا کے بیشتر حصے پر سرمایہ داری نظام کی لعنت پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا ردِ عمل اشتراکیت ہے، اور وہ غیر فطری ہے۔ لہٰذا یہ دونوں نظام لعنتی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کیا ہے جس طریقے سے چاہو دولت جمع کرو، اور جس طریقے سے چاہو خرچ کرو۔ نہ جمع کرنے پر کوئی پابندی ہے اور نہ خرچ کرنے میں۔ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، فرانس اور ان کے حواری ممالک میں یہی نظام رائج ہے۔ مال جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف لائسنس ہونا چاہیئے۔ خنزیر اور شراب کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس کے ذریعے زنا کا کاروبار ہوتا ہے۔ الغرض جس طرح بھی ہو سکے، دولت جمع کر لو، کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح خرچ کرنے میں بھی آزاد ہیں، کسی بلڈنگ پر لگا دو، سینما بنا ڈالو، جوا خانہ تیار کر لو۔ غرض کوئی بھی کام کر لو، سرمایہ داری نظام میں کوئی پابندی نہیں۔

ہاں! اسلام کا نظام معیشت ہی پاکیزہ نظام ہے۔ اسلام کہتا ہے۔ فَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ

یعنی روزی طلب کرنے میں اچھا راستہ اختیار کرو۔ حرام ذرائع سے روزی کمانا جائز نہیں ہے اور پھر "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ خرچ کی ساری مدّیں درست ہیں۔ کوئی فرائض ہیں، کوئی واجب ہیں، کوئی سنت اور مستحب ہیں ان سب پہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ برخلاف اس کے ناجائز، حرام اور مشتبہ جگہ پہ مال خرچ کرنا منع ہے۔ مسلمان کسی حرام جگہ اور ناجائز رسوم پہ دولت نہیں لٹاتا، یہ حرام ہے۔ تو یہ ہے اسلام کا نظامِ معیشت۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بنیادی خامی یہ ہے۔ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مال کے مالک ہم ہیں۔ جیساکہ قارون نے کہا "اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ" یعنی مجھ پر کسی کا کیا احسان ہے؟ میں تو فن جانتا ہوں۔ ماہر ہوں، اس ٹیکنیک سے واقف ہوں جس کے ذریعے مال کمایا گیا ہے یہ تمام کارخانہ دار، بڑے بڑے دکاندار سب اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے دماغ کی کمائی ہے۔ اپنے ہنر اور کمال کا عطیہ ہے من جانب اللہ نہیں ہے۔ دنیا کو چکر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سارا مال اللہ تعالیٰ نے عطا کرکے ساتھ حکم دیا ہے کہ اس میں سے خرچ بھی کرو "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ" یعنی قرابت داروں، ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرو، مساکین اور مسافروں کی خبر گیری کرو، نادار اور مفلس لوگوں کی مدد کرو "وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا" اور فضول خرچی نہ کرو۔ مال دے کر تمہیں آزمایا گیا ہے۔ اس پر امین بنایا گیا ہے۔ مالک حقیقی تم نہیں ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اُس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ "اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیکر تم پر احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی اس کے حکم کے مطابق خرچ کرکے مخلوق کے ساتھ احسان کرو۔

غریب پروری سے مجتنب سوسائٹی ذلیل ہوگی

مسلمان سوسائٹی میں غرباء مساکین اور نادار اسی سوسائٹی کا جز وہیں اور سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ ان حاجت مندوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ جو سوسائٹی اپنے نادار بھائیوں کے لیے روزگار کا بندوبست نہیں کرتی، ان کا ہاتھ پکڑ کر اُن کی معیشت کو سہارا نہیں دیتی، وہ باعزت سوسائٹی نہیں بلکہ لعنتی ہے ایسی سوسائٹی کو عزت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وہ ذلیل ہو کر رہے گی۔ انہیں ذرہ احساس نہیں کہ ان کے بھائی بھوکوں مر رہے ہیں اور وہ ٹس سے مس تک نہیں ہوتے سورۂ یٰسین میں ایسی ہی مثال بیان کی گئی ہے کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ

کے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرو، تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ کیا ہم اُن لوگوں کو کھلائیں کہ اگر اللہ چاہتا تو خود اُن کو کھلا دیتا۔ فرمایا یہی حال اس سوسائٹی کا ہے جو محتاج کی خبر گیری نہیں کرتی۔ یہ بھی — کہتے کہ جب خدا نے انہیں محتاج رکھا ہے تو ہم ان کی مدد کیوں کریں۔ فرمایا یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ خدا نے تمہیں حکم دیا ہے۔ کہ ان پر خرچ کرو، کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ اگر غربا و مساکین تمہارے سامنے ذلیل ہوتے رہے تو یاد رکھو، تم کو بھی عزت نصیب نہیں ہوگی، ساری سوسائٹی ذلیل ہو جائے گی غریبوں سے چشم پوشی برتی تو دنیا میں بھی عزت حاصل نہیں ہوگی۔

غیر مسلم اقوام کی غریب پروری

عیسائی ممالک میں برطانیہ کو دیکھو۔ اتنے بڑے زوال کے بعد بھی اُس کی ساکھ قائم ہے۔ برطانیہ میں کوئی شخص بے روزگار نہیں ہے حکومت ہر شخص کے روزگار کی ذمہ دار ہے اور جب تک کسی کو روزگار نہیں ملتا، حکومت اُسے گذارہ الاؤنس دیتی ہے۔ کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو اس کا فری علاج کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ عیسائی قومیں جلدی ترقی کرتی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ اپنے غربا و مساکین کا خیال رکھتی ہیں۔ انہوں نے طرح طرح کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن سے غربا کی مدد کرتے ہیں۔

مسلمان قوم کی غفلت

برخلاف اس کے مسلمان ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہاں دولت کی کمی ہے یا وسائل کی کمی ہے۔ نہیں بلکہ یہاں صرف ایمان، دین اور فہم کی کمی ہے۔ مسلمان قوم کی گراوٹ اُن کے گندے نظام اور جہالت کی وجہ سے ہے۔ یہ اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھ بیٹھے ہیں یہ اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ رسم و رواج میں چاہے لاکھوں روپے خرچ کر ڈالیں مگر غربا و مساکین اور صرف کرنے کے دیگر کاموں پر دو پیسے بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں

باغ والوں کا اعتراف معصیت

الغرض جب بیٹوں کو اپنے باغ کی تباہی کا یقین ہو گیا، تو پکار اُٹھے قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ پاک ہے ہمارا رب، بیشک، ہم ہی ظالم ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ہم پر بہت انعام کیا تھا مگر ہم ہی ظالم ثابت ہوئے کہ اس کے عطا کردہ مال میں سے غربا کا حق ادا نہ کیا۔ ہم مسکینوں کا حق مارنا چاہتے تھے جس کی سزا ہمیں مل گئی۔ کیونکہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ "فِيۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ" یعنی تمہارے مال میں سائلوں اور محروموں کا حق ہے، یہ بھی ادا کرو۔ یہ آیت قرآن پاک میں متعدد جگہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال میں

مساکین کا حق رکھا ہے۔ یہ حق ادا کرنا اُن پر احسان کرنا نہیں ہے یہ مال تو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دیا ہے۔

اعترافِ معصیت کے بعد ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ اور ساتھ یہ بھی کہنے لگے قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ۔ افسوس! بیشک ہم سرکشی کرنے والے ہیں۔ غربا کا حق مارنا سرکشی ہی تو ہے۔ یہ حد سے بڑھنا ہے۔ لیکن اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے لیے بہتر باغ تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ ہم خدا کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ یعنی توبہ کرتے ہیں۔

باغ کا نعم البدل

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو باغ والوں کی یہ ادا پسند آگئی۔ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ ہم جھوٹے ہیں اور سرکشی سے تائب ہوگئے اور اقرار کیا کہ مالک حقیقی خدا ہی ہے، تو اللہ تعالےٰ نے انہیں باغ کا بہتر نعم البدل عطا کر دیا اور وہ اس طرح کہ اس وقت کے بادشاہ کو پتہ چلا کہ اِن لوگوں کا باغ ضائع ہو گیا۔ تو اُس نے اپنا ذاتی باغ اُن کو دے دیا۔ اس باغ میں کمال درجے کا پھل آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اِس باغ کے انگور کی ایک بیل کے ساتھ ایک گچھا اتنا بڑا ہوتا تھا۔ جس کو ایک جانور پہ لاد کر لے جاتے تھے۔ یہ تفصیل تفسیری روایات میں آتی ہے، کسی مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔

حاصل کلام

باغ والوں کی مثال بیان کر کے مکے والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ مال و دولت پر اکڑ کر حضور نبی کریمؐ کو العیاذ باللہ، پاگل اور دیوانہ کا خطاب دینے والو یاد رکھو تمہارا بھی وہی حشر ہو سکتا ہے جو باغ والوں کا ہوا۔ اور ایسی صورت میں پھر کَذٰلِکَ الْعَذَابُ سزا اسی طرح ہوا کرتی ہے۔ کہ کس طرح دنیا کا مال و دولت تباہ کر دیا گیا۔ یہ تو دنیا کا عذاب ہے، مگر آخرت میں جو عذاب ملنے والا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ جو شخص اس دنیا سے کفر و شرک، توحید، رسالت اور معاد سے انکار کی لعنت لے جائیگا اُس کے لیے بہت بڑا عذاب آخرت میں ہوگا۔ فرمایا لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ اگر یہ لوگ سمجھ جائیں۔ اور بے ہودہ باتوں سے باز آجائیں۔

درس چہارم ۴

آیت ۳۴ تا ۴۱

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ قف كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لا اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ج فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ:۔ بیشک متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمتوں کے باغ ہیں ﴿۳۴﴾ کیا (تم خیال کرتے ہو کہ) ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے ساتھ برابر کر دیں گے؟ ﴿۳۵﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ ﴿۳۶﴾ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو ﴿۳۷﴾ بیشک تمہارے لیے اس کتاب میں وہی کچھ ہے جو تم چاہتے ہو ﴿۳۸﴾ یا (پھر کیا ایسا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیامت تک قسمیں اٹھا رکھی ہیں کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہو گا جو تم فیصلہ کرو گے ﴿۳۹﴾ آپ ان سے پوچھیں کہ اس کے لیے ان کا کون ذمہ دار ہے ﴿۴۰﴾ کیا ان کے کوئی شریک ہیں تو لائیں اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں ﴿۴۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

گذشتہ آیات میں مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی۔ اُن کو مال و دولت، اقتدار، ریاست پر بڑا فخر تھا اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعہ اُن کو سمجھایا کہ یہ سب چیزیں اللہ نے ان کو امتحان کی خاطر دی ہیں۔ یہ چیزیں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پسندیدہ اور اس کے محبوب ہیں، بلکہ یہ تو مکذب اور بری خصلتوں کے مالک ہیں۔ ان میں تکبر، گناہ، حدود کو توڑنا، چغلی کرنا، قسمیں کھانا، حق کی مخالفت، رسالت سے انکار، اللہ کی وحدانیت سے انکار، جزائے عمل اور معاد کا انکار پایا جاتا ہے۔ تو باغ والوں کی مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے سمجھایا کہ اُن کو نعمتیں عطا کی گئی تھیں مگر انہوں نے ظلم اور سرکشی کی تو اللہ نے وہ نعمت چھین لی۔ ان باغ والوں کو تو توبہ کی توفیق نصیب ہو گئی اور اللہ نے انہیں بہتر نعم البدل عطا کر دیا۔ اسی طرح مکے والے بھی اگر ظلم و زیادتی سے

تائب ہو جائیں تو اللہ اُن پہ اسی طرح مہربانی فرمائے گا جیسی باغ والوں پر کی تھی۔

مشرکین کی خوش فہمی

مشرکین مکہ مختلف قسم کی بیہودہ باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ ابتدائی دور کے غریب مسلمانوں کے ساتھ ٹھٹا اور تمسخر کیا کرتے تھے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ جس طرح آج ہم تم سے اچھے ہیں اسی طرح اگر بالفرض کل کو قیامت بھی آگئی تو وہاں بھی ہم ہی اچھے ہوں گے۔ آج مسلمان کہتے ہیں۔ کہ ہم اللہ کی عبادت کرنے والے اور صعوبتیں برداشت کرنے والے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں قیامت کو ہماری حالت اچھی ہوگی، یہ غلط ہے بلکہ وہاں بھی ہم ہی اقتصادی طور پر بہتر ہوں گے اور یہ مسلمان وہاں بھی ایسے ہی رہیں گے۔ ان کی اقتصادی حالت وہاں بھی خراب ہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ مشرکوں اور کافروں کا حال بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ بھی مشرکین مکہ کی طرح کہا کرتے تھے۔ کہ ہم قیامت کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر بالفرض قیامت آ بھی گئی تو ہماری حالت وہاں بھی اچھی ہوگی جس طرح اس دنیا میں اچھی ہے۔

حضرت خبابؓ کا واقعہ

حضرت خبابؓ ابن ارتؓ کاریگر تھے۔ انہوں نے مشرکین مکہ میں سے ایک شخص عاص بن وائل کے لیے تلوار یا زرہ بنائی۔ جب آپ اس مشرک سے مزدوری طلب کرنے کے لئے گئے تو وہ کہنے لگا میں تمہیں مزدوری اس وقت دوں گا جب تم تَكْفُرُ بِمُحَمَّدٍ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرو گے۔ حضرت خبابؓ نے کہا کہ میں تو ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ حَتّٰى تَمُوْتَ ثُمَّ تُبْعَثَ یہاں تک کہ تم مر جاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاؤ۔ میں تو اپنے ایمان کو ترک نہیں کروں گا۔ تو مشرک کہنے لگا کہ اچھا! اگر ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو میں تمہاری مزدوری اس دوسری زندگی میں ہی ادا کروں گا۔ یہاں تمہاری اجرت ادا نہیں کروں گا۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ بدبخت ایسا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ "يَأْتِيْنَا فَرْدًا" قیامت کے روز یہ اکیلا ہمارے روبرو پیش ہوگا۔ اس کے پاس نہ مال و دولت ہوگی اور نہ اولاد، پھر یہ اس دنیا کی مزدوری قیامت کے روز کیسے ادا کرے گا۔

تو یہاں پہ اللہ تعالےٰ نے مشرکین اور کفار کے اس قسم کے بیہودہ خیالات کا رد فرمایا ہے۔ کہ اگر بالفرض مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے گئے تو وہاں بھی ہم ان مسلمانوں سے اچھے ہوں گے۔

عذابِ آخرت

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کی مثال بیان فرما کر ارشاد فرمایا

= کَذٰلِکَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ" یہ دنیا کی سزا تھی جو باغ والوں کو ملی۔ وہ اچھے تھے جو تائب ہو گئے۔ اور فرمایا کہ سزا اسی طرح ہوتی ہے۔ اور آخرت کی سزا تو بہت بڑی ہے اور دائمی ہے تو گویا مشرکین اور کافرین کو سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم اسی طرح جرائم کا ارتکاب کرتے رہے تو تم بڑے عذاب میں مبتلا ہو گے اور وہ عذاب آگے آ رہا ہے۔ اس عذاب کی اطلاع سارے انبیاء نے دی ہے "اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ" خدا کی وحدانیت اور قیامت کو جھٹلانے والو بڑے دن کی سزا آنے والی ہے جس میں تم مبتلا ہو گے۔ اس سے ڈر جاؤ۔

متقین کیلئے انعامات

اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں مجرمین کی سزا کا حال بیان فرمایا، اس کے ساتھ ہی متقین کی جزا کا حال بھی بیان فرما دیا۔ گویا جس جگہ ترہیب ذکر کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ترغیب بھی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کافروں کی سزا کا حال بیان ہوا تو ساتھ ہی اہل ایمان کی جزا کا حال بھی بیان کر دیا۔

اس مقام پر بھی مشرکین کے لیے عذاب آخرت کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ بیشک متقیوں کے لیے اُن کے رب کے پاس نعمتوں کے باغ ہیں۔ اللہ نے، ان کے لیے بڑی نعمتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ یہاں تو دنیا کے باغ کا ذکر ہوا مگر اللہ کے ہاں جو نعمتوں کے باغات ہیں۔ اُن کے مقابلے میں دنیا کے باغوں کی کیا حیثیت ہے۔

متقی کون ہیں

متقین کی تعریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے اَلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ الشِّرْکَ وَالْکُفْرَ وَالْمَعَاصِیَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو کفر، شرک اور معاصی سے بچتے ہیں۔ پہلے شرک، کفر اور الحاد سے بچنا تو قطعی اور لازمی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی انسان میں پائی جائے گی تو متقی نہیں ہو گا بلکہ کافر، مشرک، منافق، ملحد یا تردد والا ہو گا۔ کیونکہ یہ چیزیں تقوے کے بالکل منافی ہیں۔ سورۃ فتح میں ہے "اَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی" یعنی تقویٰ کا حکم اہل ایمان کے ذمہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ تقوے کا کلمہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی نفاق، شرک وکفر کی آمیزش نہ ہو جو کہ تقوے کے منافی ہے۔ اس کے بعد معاصی کا درجہ ہے۔ بڑے اور چھوٹے گناہ سب سے بچے گا تو کامل درجے کا متقی ہو گا۔ اگر معاصی سرزد ہو رہے ہیں۔ تو صرف ایک درجے کا متقی ہے، کامل متقی نہیں ہے۔ اس کی نجات اس کے ایمان کی بدولت ہو گی

تقوے کا مفہوم

تقوے کا لغوی معنیٰ بچاؤ ہے یعنی برائیوں سے بچاؤ۔ پھر برائیوں میں پہلے نمبر پر اعتقادی برائیاں

ہیں اور یہ مہلک ہیں۔ سخت خطرناک بیماریاں ہیں۔ اِن روحانی بیماریوں سے بچنا نہایت ضروری ہے اس کے بعد گناہ کبائر و صغائر آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب "الطاف القدس" میں فرماتے ہیں "تقویٰ محافظت بر حدودِ شرع است" یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت کے جو حدود مقرر کیے ہیں۔ ان کی حفاظت کا نام تقویٰ ہے۔

سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی سات صفات بیان کی ہیں۔ ان میں آخری صفت یہ ہے وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ "یعنی اہلِ ایمان وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ مگر آج حالت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑنے والے سب سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کی ایک ارب کی آبادی میں اللہ کی حدود کو توڑنے والے مسلمان ہی ہیں۔ اور ان میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ ہم ریڈیو پر سُن رہے ہیں۔ ہمارے صدر صاحب چین گئے ہوئے ہیں ماؤزے تنگ کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گے۔ کیا یہ شرک نہیں ہے۔ کافروں کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا مسلمانوں کا شیوہ ہے؟

اسی طرح جب بیرونی ممالک کے لوگ یہاں آتے ہیں تو مسٹر جناح مرحوم کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں کیا یہ شرکیہ باتیں نہیں ہیں۔ جب بڑے آدمی ایسی حرکتیں کریں گے تو چھوٹے کیوں نہیں کریں گے۔ پھر یہیں بات ختم نہیں ہوتی، ثقافتی شو میں شرکت بھی پروگرام میں داخل ہوتا ہے۔ ان تمام امور میں حدود اللہ کو پامال کیا جاتا ہے۔

تجارت کے معاملے میں دیکھ لیں، عقیدے کے معاملے میں ملاحظہ کر لیں۔ کس قدر قبر پرستی ہے۔ ہمارے ملک میں اور ساری دنیا میں قبروں کی کیسی تعظیم کی جاتی ہے۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں وہاں پر سجدے کئے جا رہے ہیں۔ آج دنیا میں اعتقادی عنوان میں اسقدر شرک ہے، جس کا کوئی حد و شمار نہیں۔ یہ سب کفر، شرک اور حدودِ شریعت کو توڑنا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ ظریفانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ بھائی ہمارے زمانے کے مسلمانوں کا تقویٰ صرف پانی میں ہے۔ باقی کسی چیز میں نہیں۔ اگر کنوئیں میں چوہا گر جائے تو محلے کے سارے مسلمان دوڑ کر مولوی صاحب کے پاس آتے ہیں۔ کہ مولوی جی! کیا کریں۔ مگر کھانے کے بارے میں کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کھانا کہاں سے لائے ہو، یہ جوئے کی کمائی ہے یا سینما کی۔ کس قسم کے مال سے

لائے ہو۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ تقویٰ صرف پانی کا ہے اور کسی چیز کا نہیں۔

ورع کے برابر کوئی چیز نہیں

تقوے کی بنیاد اعتقاد پر ہے جب کہ اعتقاد حق ہو۔ اور اس کے بعد اعمال میں ورع کو فوقیت حاصل ہے۔ کسی شخص نے نبی علیہ السلام سے پوچھا حضور! دو بھائی ہیں، ایک نفل نماز وغیرہ زیادہ پڑھتا ہے اور دوسرا بھائی ورع زیادہ کرتا ہے۔ مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے زیادہ بچتا ہے حضورؐ نے فرمایا لَا يَعْدِلُ بِالرِّعَةِ شَيْءٌ یعنی ورع کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ سب سے کمال چیز یہی ہے۔ حرام اور مشتبہ چیزوں سے بچاؤ اور تقویٰ اسی کو کہا جاتا ہے۔ یہ بچاؤ سب سے پہلے اعتقاد میں شرکیہ اور کفریہ باتوں اور بدعات سے ہونا چاہیئے۔ بدعات تو رگ و ریشہ میں رس بس گئے ہیں۔ کوئی کام رسم و رواج اور بدعات کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ ورع کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ خالی عبادت کرنے والوں کو جان لینا چاہیئے کہ ورع بہت بڑی بات ہے۔

جزا کا مدار تقوے پر ہے

تو اس مقام پر فرمایا اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے ہاں نعمتوں کے باغ متقیوں کے لیے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ انعامات دانشوروں مفتیوں، حاجیوں یا نمازیوں کے لیے ہیں، بلکہ یہ متقیوں کے لیے ہیں۔ اصل چیز تقویٰ ہے۔ اور اسی پر جزا کا مدار ہے۔ حضرت ابو درداءؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دو رکعت مقبول ہے۔ تو میرے لیے یہ تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا، کیونکہ اللہ جل جلالہ، کا فرمان ہے "اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ" یعنی خدا تعالےٰ متقیوں سے قبول فرماتا ہے۔ جو متقی نہیں ہیں۔ ان کی کوئی چیز قبول نہیں فرماتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں جو متقی تھا، اُسی کی قربانی قبول ہوئی۔ دوسرے کی مردود رہی۔ تو گویا قبولیت کا مدار تقوے پر ہے، دانشمندی پر نہیں۔ اسی لیے فرمایا اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ بیشک متقیوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمتوں کے باغ ہیں۔ اور اس طرح متقین کے لیے جزا بیان فرما دی۔

مسلمین اور مجرمین برابر نہیں

یہاں پھر مشرکین کے اس بیہودہ خیال کا رد فرمایا کہ اگر ایماندار اس دنیا میں کمزور رہیں تو کل کو اگلی دنیا میں بھی کمزور ہی ہوں گے۔ ارشاد ہوا۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے ساتھ برابر کر دیں گے؟ کیا قیامت کے دن ان

میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ تم آخرت کو اس دنیا کی زندگی پر محمول کرتے ہو۔ کہ جو آج یہاں کمزور ہیں۔ کل وہاں بھی کمزور ہوں گے۔ کیا مسلمان اور مجرم برابر ہوں گے۔ تمہارا یہ گمان عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ اگر مومن آج تکلیف برداشت کرتے ہیں، تو یہ ایمانداروں کے حق میں عبادت ہے۔ یہ تو ریاضت ہے جس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ کل قیامت میں یہ حالت نہیں ہوگی بلکہ اس کے برعکس ہوگی۔ آج کے آسودہ حال کل سخت سزا میں مبتلا ہوں گے جو آج کفر، شرک اور بدعات میں مبتلا ہیں، وہ کل بری حالت میں ہوں گے یہ ناممکن ہے کہ مسلمان اور مجرم ایک جیسے ہوں۔ وہاں اندھیر نگری نہیں ہوگی۔ قیامت میں مسلمان کا نتیجہ اچھا اور شائستہ سامنے آئے گا۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو، جو عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی۔ یہ اس مسئلے کی تشریح ہے۔

مشرکین سے دلائل کا مطالبہ

اس کے بعد مشرکین سے دلائل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ۔ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس کو تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور جس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ۔ کیا تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا، جو تم چاہو گے۔ کیا کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ آج تم کفر کر رہے ہو۔ انکار رسالت کر رہے ہو اور چاہتے یہ ہو کہ کل بھی ہم اچھے ہوں گے، کیا کوئی آسمانی کتاب تمہارے پاس ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ جو تم چاہو گے۔ وہی کچھ ہوگا۔ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لا اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ یا پھر کیا ایسا ہے۔ کہ اللہ نے تمہارے لیے قیامت تک قسم اٹھا رکھی ہے کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا، جو تم فیصلہ کرتے ہو۔ جیسا کہ یہود کے بیان میں فرمایا، تم کیا خیال کرتے ہو کہ خدا نے کوئی عہد کر رکھا ہے۔ کہ نجات صرف یہودیوں کو ملے گی، "هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ" لاؤ اس سلسلہ میں کوئی دلیل، اگر تمہارے پاس ہے۔ یہاں بھی فرمایا کہ کیا خدا تعالےٰ نے قسم اٹھا رکھی ہے۔ کہ سب بہتری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کفار کے مقدر میں ہی ہوگی۔ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ۔ آپ ان سے پوچھیں کہ اس کے لیے ان کا کوئی ذمہ دار ہے۔ کیا کوئی نقلی دلیل ہے جس کی رو سے کافروں کی حالت ہمیشہ اچھی رہے گی۔ یہاں بھی اچھی ہوگی اور قیامت میں بھی۔ گویا جیسا یہ چاہیں گے۔ ویسا ہی ہوگا۔ لاؤ کس کتاب میں لکھا ہے۔

مشرکین کے لیے شرکاء کی امداد

اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ یہاں مشرکوں کے ایک دوسرے خیال کی نشاندھی کی جس میں یہودی بھی مبتلا تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے معبود بڑے مقرب ہیں۔ وہ ہمیں خدا سے بہتری دلا دیں گے۔ یہ عام یہودیوں کا تصور ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے اور کسی اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے جس نے ختنہ کیا ہوا ہوگا۔ شیعہ بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں کہ سال بھر میں ایک دن ماتم کرلو، امام حسینؓ کا نام لے لو۔ بیڑا پار ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی بہت سے بت پرست، قبر پرست ہیں جو کہتے ہیں کہ پیر صاحب کے سالانہ عرس میں شرکت کر لینا کافی ہے، نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔

مشرکین کا یہی تصور تھا۔ کہ لات وعزیٰ وغیرہ جن کی ہم پوجا کرتے ہیں یہ اللہ کے بڑے مقرب ہیں۔ یہ ہم کو مصیبت کے وقت چھڑا لیں گے۔ اور خدا کے قریب کر دیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ نہایت لغویات ہے۔ ان کو کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ خدا کے مقابلے میں اگر انکا کوئی شریک ہے تو لاؤ جو خدا کے مقابلے میں کسی کو چھڑا سکتا ہے یا پناہ دے سکتا ہے وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ خدا پناہ دیتا ہے، کوئی اور پناہ نہیں دے سکتا۔ جب گرفت آتی ہے تو کوئی کسی کو نہیں چھڑا سکتا۔

دنیا میں بھی قحط، زلزلے، وبائیں آتی ہیں، اُس وقت یہ قبروں والے، یہ خود ساختہ معبود کہاں ہوتے ہیں۔ یہ جنگ کی تباہیوں میں کیوں نہیں بچاتے۔ تو یہ عقیدہ ہی باطل ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جو بچانے کا سامان پیدا کرے کیا ان کے شریک ہیں؟ اگر ہیں تو لائیں۔

علامہ زمخشریؒ کی تفسیر

مفسر قرآن علامہ زمخشریؒ نے اس کا دوسرا معنی بیان کیا ہے۔ کفار کے اس دعوے کے جواب میں کہ جو اِس دنیا میں اچھے ہیں وہ قیامت میں بھی اچھے ہوں گے، علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ کیا اِس بات کو دنیا میں کوئی عقلمند آدمی بھی مانتا ہے۔ لاؤ عقلمند آدمی کی بات بھی معتبر ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی عقلمند آدمی بھی اس بات کو نہیں مانتا کہ آج کا بُرا کل اچھا ہوگا۔ ہر صاحب عقل یہی کہتا ہے۔ کہ آج کا بُرا کل بھی بُرا ہوگا۔

تو فرمایا کہ اپنے اس دعوے کی دلیل میں کہ آج مشرکوں کی حالت اچھی ہے تو کل بھی

اچھی ہوگی اگر تمہارے پاس کوئی شریک ہیں تو لاؤ۔ علامہ زمخشریؒ نے شرکا سے یہ مراد لیا ہے کہ
تمہاری اس بات کو ماننے میں اگر تمہارا کوئی شریک ہے تو لاؤ۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ مشرکوں
کا خیال عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

درس پنجم ۵ آیت ۴۲ تا ۴۷

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ط وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ط سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَأُمْلِيْ لَهُمْ ط إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ:- جس دن کھولی جائیگی پنڈلی اور یہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے پس یہ سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے ﴿۴۲﴾ ان کی آنکھیں پست ہوں گی ان کے اوپر ذلت چڑھی ہوئی ہوگی اور تحقیق ان کو دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ بالکل صحیح سلامت تھے ﴿۴۳﴾ پس چھوڑ دیں مجھے اور اس کو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے، ہم ان کو بتدریج عذاب کے قریب کریں گے۔ جہاں سے ان کو پتہ بھی نہیں ہوگا ﴿۴۴﴾ اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں بیشک میری تدبیر بہت مضبوط ہے ﴿۴۵﴾ کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ طلب کرتے ہیں کہ یہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہو رہے ہیں ﴿۴۶﴾ کیا اُن کے پاس غیب ہے پس وہ اس کو لکھتے ہیں۔ ﴿۴۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک کرنے والوں کا رد فرمایا۔ کافروں کے اس خیال کی تردید فرمائی جس کے مطابق وہ کہتے تھے کہ چونکہ ہم دنیا میں برتر ہیں لہٰذا آگے بھی ہم ہی برتر ہونگے فرمایا کہ فرمانبردار اور مجرم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ بات عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ پھر مطالبہ کیا کہ تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو پیش کرو۔ دنیا کا کوئی عقلمند اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ مجرم اور فرمانبردار ایک جیسے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے مقرر کردہ نعمتوں اور اُن کی کامیابی کا حال بیان کیا۔

عبادت کا اثر اس کی صحت پر منحصر ہے۔

اِن آیتوں میں شرک اور کفر کرنے والوں کا حال بیان ہوا ہے۔ وہ اپنے شرک کو اس طرح

صحیح قرار دیتے ہیں، کہ جن کی عبادت ہم کرتے ہیں، اس سے مقصود عبادت نہیں بلکہ یہ تو صرف واسطہ ہیں۔ اور ان کی عبادت کرنا گویا خدا کی عبادت کرنا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کو مبرا اور منزہ سمجھ کر خالص اُسی کی عبادت کرتا ہے تو یہی عبادت صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اور آگے چل کر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ مگر ان غلط عقیدہ رکھنے والوں کی بیہودہ باتوں کا الٹا اثر ظاہر ہوگا۔ یہ لوگ اپنے غلط عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح عبادت کرنے والے ہوتے تو اس کا اثر صحیح طریقے پر ظاہر ہوتا۔

عبادت کے صحیح یا غلط اثر کا ظہور کب ہوگا۔ تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر کیا اور اُن لوگوں کا ردّ فرمایا، جن کی عبادت غلط ہے۔ ارشاد ہوا **یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ** جس دن کھولی جائیگی پنڈلی **وَیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ** اور یہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے۔ **فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ**۔ پس یہ سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ **خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ** اُن کی آنکھیں پست ہوں گی **تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ** اُن کے اوپر ذلت چڑھی ہوئی ہوگی۔ **وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ** اور تحقیق ان کو دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا **وَهُمْ سَالِمُوْنَ** اور وہ بالکل صحیح سلامت تھے۔ وہاں پر یہ صحیح سجدہ نہیں کرتے تھے۔ تو اصل مقصد یہی ہے کہ مشرکین اور کفار کی عبادت غلط ہے۔ اس کا اثر صحیح نہیں نکلے گا، مگر تعبیر ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

ساق کے حقیقی معنے

یہ قرآن پاک کی مشکل آیتوں میں سے ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے ساق پنڈلی کو کہتے ہیں۔ اس لیے مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں مختلف طریقے استعمال کیے ہیں تاکہ آیت کا مفہوم قریب الفہم ہو۔ پنڈلی سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیر کے دو طریقے تو عام ہیں۔ بعض مفسرین اس سے حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ اور بعض مفسرین مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ حقیقی معنی یہ ہے۔ کہ ساق سے پنڈلی ہی مراد لی جائے، جیسا کہ انسان کے جسم میں پنڈلی، ٹانگیں اور دیگر اعضاء ہوتے ہیں۔ پنڈلی پر جسم کھڑا ہے ایسے ہی پنڈلی کا اطلاق خدا کی ذات پر کریں تو یہ حقیقی معنیٰ ہوگا، مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے جسمیت ثابت ہوتی ہے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ اعضاء سے بالکل پاک ہے۔ یہ تنزیہہ کے خلاف ہے۔

ساق کے مجازی معنے

بعض مفسرین جن میں ابن جریر طبریؒ۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ شامل ہیں ان سے منقول ہے کہ یہاں حقیقی معنے مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ تمثیل ہے۔ تمثیل اس طرح کہ کشفِ ساق کنایہ ہوتا ہے سختی سے یعنی شدت اور سختی مراد ہے۔ عربی محاورے میں کشفِ ساق شدت، بے چینی اور سختی کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہتے ہیں کَشَفَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا لڑائی نے اپنی پنڈلی کھول دی ہے۔ یعنی لڑائی سخت ہو گئی ہے۔ شدت اختیار کر گئی ہے۔

فرمایا جس دن قیامت کی سختی برپا ہوگی، اُس وقت کافروں کی عبادت صحیح نہیں ہوگی۔ اس کا اثر صحیح ثابت نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے اور شرک کا اثر بُرا اور اُلٹا نکلے گا۔ بات یہ سمجھانا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ قیامت کی سختی سے بڑی سختی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اولاً قیامت کا واقع ہونا اور حیرت انگیز حالات کا ظاہر ہونا، پھر تمام انسانوں کا جمع ہونا، اس کے بعد محاسبے کی منزل وغیرہ بہت ہی تلخ ہوں گے، جیسا کہ فرمایا وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ قیامت بڑی سخت ہے اور بڑی تلخ ہے۔ تو کشفِ ساق سے مراد یہ ہے کہ جس دن سختی واقع ہوگی۔ اُس دن ان کی عبادت ٹھکانے نہیں لگے گی۔ غلط ہوگی۔ تو یہ گویا ساق کے مجازی معنے ہیں۔

خدا کی ذات پر پنڈلی کا اطلاق

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر ساق کا حقیقی معنیٰ یعنی پنڈلی بھی لیا جائے تو درست ہے مگر پنڈلی کا اطلاق خدا کی ذات پر کیسے کیا جائے۔ قرآن پاک میں اور بھی کئی متشابہات ہیں مثلاً چہرہ، ہاتھ حدیث میں اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کا ذکر بھی آتا ہے اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرح چاہتا ہے پلٹ دیتا ہے۔ یہ سب چیزیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ حدیث میں کمر کا ذکر بھی آتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رحم، رشتے اور قرابت کو پیدا کیا تو اس نے رحمان کی کمر کو پکڑ لیا۔ اسی طرح قدم کا ذکر بھی حدیث میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا قدم ڈالیں گے۔ جس سے وہ پُر ہو جائے گی اور کہے گی بس اب پُر ہو گئی ہوں۔

لہٰذا ــــ سلف صالحین بزرگ اور آئمہ کرام ــــ کہتے ہیں کہ ان سب الفاظ پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اسی طرح پنڈلی پر بھی۔ حدیث میں چادر اور تہ بند کا ذکر بھی آتا ہے اَلْکِبْرُ رِدَائِیْ وَالْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ یعنی تکبر میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند ہے جو ان

کو اپنے اوپر اوڑھنا چاہے گا میں اُسے ذلیل کروں گا۔

امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے ائمہ کرام کا مسلک یہ ہے۔ کہ جس طرح یہ الفاظ وارد ہوتے ہیں، ان پر ایمان رکھنا چاہیئے یہ صحیح ہیں مگر ان کی کیفیت کو خدا کے سپرد کرنا چاہیئے۔ کہ ان اعضاء کی کیفیت کیسی ہے۔ مثلاً یہ پنڈلی ایسی نہیں ہے جیسی انسان یا حیوان کی ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کا فرمان ہے۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" خدا کی مانند کوئی چیز نہیں۔ پنڈلی ہے۔ ہاتھ ہے مگر جیسا اُس کی شان کے لائق ہے۔ آنکھ اور کان ہیں کیونکہ وہ "سَمِيعٌ بَصِيرٌ" ہے۔ مگر ایسی آنکھ اور ایسے کان نہیں جیسے مخلوق کے ہوتے ہیں، بلکہ ایسے جیسے اس کی شان کے ساتھ لائق ہیں۔

اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا بھی یہی معنیٰ کرتے ہیں۔ خدا عرش پر مستوی ہے مگر ایسا نہیں جیسا انسان تخت پر بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس طرح جس طرح اُس کی شان کے لائق ہے۔ یہ سبحان اللہ کا کلمہ کیا ہے یہی تنزیہہ ہے، خدا کی ذات پاک ہے، ان تمام تشبیہات، کمزوریوں اور زمان و مکان سے۔ تو پنڈلی کو مانتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیئے۔ جیسے اُس کی شان کے ساتھ لائق ہے اس کی کیفیت میں بحث نہ کرو کہ یہ انسان کی فہم سے بالا ہے۔ اور تشبیہ دے گا تو کفر و شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح مادیت ثابت ہوگی۔ جو خدا کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کی ذات کے بارے میں اپنی عقل، وہم اور خیال کے ساتھ جو تم انتہائی تصور کر سکتے ہو، وہاں جاکر رک جاؤ اور کہہ دو کہ جو کچھ میرے تصور میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے خلاف ہے۔ خدا کی ذات بلند و برتر ہے: "تَعَالَى اللهُ" خدا کی ذات بہت عالی ہے۔ "وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى" خدا کی شان بہت اونچی ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" خدا کے مثل کوئی چیز نہیں، وہ بے مثل ہے۔ تو گویا یہاں معنیٰ یہ کرنا پڑے گا جیسا اُس کی شان کے ساتھ لائق ہے بحث کی ضرورت نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خدا کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے۔ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" مگر کیفیت مجہول ہے۔ کیفیت کو مخلوق میں کوئی نہیں جانتا۔ کہ وہ کس طرح مستوی ہے۔ کرید کرو گے تو گمراہی میں پڑ جاؤ گے، ایمان لاؤ اور یہی کہو جیسا اس کی شان کے ساتھ لائق ہے۔ ہماری عقل ناقص ہے۔ ہمارا فہم نارسا ہے اور وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ عام سلف صالحین نے کلام کیا ہے۔

ساق خدا کے کمال کی ایک جہت ہے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں، خدا کی ایک ذات ہے۔ اور اُس کی صفات ہیں۔ اُس کے اسماء، اور صفات پہ ایمان لانا ضروری ہے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ خدا رحمان، اور رحیم ہے۔ ستار اور غفار ہے، یہ اس کی ساری صفات ہیں اور ننانوے نام ہیں۔ صفات ذات سے الگ نہیں ہوا کرتیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ساق یا دیگر اعضاء کا جو ذکر ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے کمالات کی جہتیں ہیں اور وہ صفات سے الگ ہیں ان کمالات کی جہتوں میں ایک ساق بھی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ انسان کی پنڈلی بنیاد ہوتی ہے اور دوسرا اعضاء اُس پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح ساق ایک حقیقت کو بیان کر رہی ہے۔ اس سے مراد ایسی پنڈلی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور خدا تعالیٰ کے کمال کی جہت کو بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات کی بہت سی جہتوں میں سے دو جہتیں یعنی پنڈلی اور قدم ادنیٰ درجے کی ہیں۔ پنڈلی کا ظہور حشر میں ہوگا۔ اور قدم کا دوزخ میں۔ مگر کافر اور مشرک ان ادنیٰ جہتوں کو سمجھنے کے بھی قابل نہیں ہوں گے کیونکہ انھوں نے اپنی استعداد کو خراب کیا ہوا ہے۔ باقی جہات تو بہت بلند ہیں مثلاً وجہ، سمع وغیرہ ان کو یہ لوگ کیسے سمجھ سکیں گے تو یہاں پنڈلی سے مراد وہ تشبیہ والی پنڈلی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک جہت کو بیان کرنا ہے، جس کا ظہور ہوگا۔

کشف ساق سے مراد تجلی کا ظہور ہے

احادیث میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ پنڈلی کو کھولے گا یعنی کشف ساق ہوگا۔ شاہ ولی اللہؒ بڑے حکیمانہ طریقے پر فرماتے ہیں کہ اُس وقت ایک خاص قسم کی تجلی کا ظہور ہوگا۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہر مومن مرد اور ہر مومنہ عورت جب اس سمت کو دیکھیں گے تو سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ البتہ جس شخص نے دنیا میں اخلاص اور توحید کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ نہیں کیا، وہ وہاں پہ سجدہ نہیں کر سکے گا۔ اس تجلی کے ظہور پہ ایسے لوگوں کی پشتیں تختے کی مانند ہو جائیں گی، جس کی وجہ سے وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کو دوزخ میں پھینکا جائے گا۔ ریاکار، مشرک، کافر سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ سجدہ صرف وہ لوگ کر سکیں گے جنہوں نے ایمان، توحید اور اخلاص کے ساتھ دنیا میں سجدہ کیا ہوگا۔

مومن سجدہ ریز ہو جائیں گے

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ اور دیگر صحابہؓ نے کشف ساق کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے یُکْشَفُ عَنْ نُوْرٍ عَظِیْمٍ ایک بہت بڑے نور کا انکشاف

ہوگا۔ اس کو دیکھ کر تمام ایماندار سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں یوں آتا ہے کہ روزِ حشر ہر اُس معبود کو سامنے متمکن کیا جائے گا جس کی لوگ دنیا میں پوجا کرتے تھے۔ سورج پرست سورج کی طرف چلے جائیں گے اور چاند کے پجاری چاند کے پیچھے جائیں گے۔ اور آخر میں اس امت کے منافق اور مومن رہ جائیں گے۔ اُن کی بھی ابتلا ہوگی۔ اُن کے سامنے ایک خاص تجلی رکھی جائیگی مومن انکار کر دیں گے کہ یہ ہمارا رب نہیں ہے۔ ہم اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے۔ انکار کر دیں گے، کہیں گے ہم دنیا میں کفر و شرک سے بچتے رہے ہیں، ہم سجدہ نہیں کریں گے۔ پھر اُن کے سامنے وہ تجلی ظاہر کی جائے گی جس میں وہ اپنے رب کو پہچانتے ہیں۔ تو فوراً سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ مگر منافق سجدہ نہیں کر سکیں گے، اُن کی بات وہیں ختم ہوگئی۔ لہٰذا دوزخ میں جائیں گے۔ تو گویا نورِ عظیم کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کشفِ ساق سے مراد انکشافِ حقیقت ہے

اس لفظ کی ایک تیسری تعبیر بھی کی گئی ہے۔ حضرت ابوسعید ضریرؒ کہتے ہیں کشفِ ساق کا معنیٰ حقیقت کا کھل جانا ہے۔ یعنی جس دن حقیقت کو کھول دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں سورۃ طارق میں "یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ" جس دن سینے کے راز بھی کھل جائیں گے۔ جو حقیقتیں آج پوشیدہ ہیں، قیامت کے دن کھول دی جائینگی۔ عبادت کی حقیقت بھی کھول دی جائیگی۔ تو کشفِ ساق کا مطلب ہے حقیقت کا کھولنا۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ قسم جن کی عبادت حقیقت پر قائم ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو عبادت اور ریاضت کرتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر ان کی یہ عبادت صحیح حقیقت پر قائم نہیں۔ قیامت کے دن عبادت کی اصلیت کا پتہ چلے گا جب "عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً" دنیا میں بڑی عبادت و ریاضت کی مگر سب بیکار گئی، وہ محض تھکاوٹ ہی تھی، کیونکہ صحیح حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

صحت عبادت کا انحصار معرفت الٰہی پر ہے۔

حقیقی عبادت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے رب کی پہچان کی جائے "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ"۔ رب کی پہچان اس کی صفت سے ہوتی ہے۔ رب کون ہے، پہلے اُس کی صفت کو پہچانو۔ یہودیوں کے متعلق فرمایا "مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" انہوں نے خدا تعالیٰ کو صحیح نہیں پہچانا۔ معاذ بن جبلؓ کی حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا۔ اے معاذ! یمن میں جاؤ۔ وہاں اہل کتاب بھی ہیں، سب سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دو شہادۃ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ توحید ورسالت کا سبق پڑھاؤ۔ فَاِذَا عَرَفُوْا ذٰالِكَ جب وہ پہچان لیں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اپنی صفات کے ساتھ، پھر اُن کو کہنا کہ اللہ تعالےٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کئے ہیں، مال ہے تو زکوٰۃ فرض ہے حج فرض ہے۔ اگر رب کی پہچان نہیں ہے۔ تو نہ نماز کسی ٹھکانے لگے گی نہ روزہ۔ اِسی لیے فرمایا کہ یہود نے خدا کو صحیح نہیں پہچانا۔ اور یہ پہچان ہی ضروری ہے جو انسان اللہ تعالےٰ کو صحیح پہچان کر عبادت کرے گا اُس کی عبادت صحیح اصول پر ہوگی۔ اور اُس کا اثر ظاہر ہوگا۔ اسی طرح جو انسان خدا تعالےٰ کو اور اُس کی صفت کو صحیح طور پر نہیں پہچانے گا۔ اُس کی عبادت رائیگاں جائیگی اور آدمی جہنمی ہوگا، مردود ہوگا۔ اللہ تعالےٰ کو جانتے تو سب ہیں، مشرک، جوگی، پادری سب جانتے ہیں مگر صحیح طور پر نہیں پہچانتے۔ دنیا میں اکثر لوگ حجاب سوءِ معرفت میں مبتلا ہیں۔

فرمایا جس دن ساق کھولی جائیگی اور اُن کو سجدے کی طرف بلایا جائے گا تو وہ سجدے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ ان کی آنکھیں پست ہوں گی۔ سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ دنیا میں ان لوگوں کو اللہ کی عبادت کے لیے بلایا جاتا تھا۔ "یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ" اے لوگو! رب کے سامنے سجدہ کرو۔ اس کی پہچان کے بعد اور عقیدہ درست کرنے کے بعد اُس کی عبادت کرو۔ انسانو! تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارا خالق، مالک، رازق، مدبر، متصرف وہی ہے ان صفات کو جاننے کے بعد ہی انسان کو پہچان ہوتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ منزہ اور مبرا ہے، وہ لم یلد ولم یولد ہے۔ "لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ" ہے۔ اُس کی اولاد نہیں، وہ کھاتا پیتا نہیں، پاک ہے منزہ اور مبرّا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا" اُس کا ند کوئی نہیں ہے۔ یہ ساری پہچان ہی ہے۔ جب یہ صحیح ہو جائے تو اُس کی عبادت کرو۔ اس طرح سے کی ہوئی عبادت ہی ٹھکانے لگے گی۔

عقیدہ تشبیہ اور شرک

جنہوں نے دنیا میں خدا تعالےٰ کو صحیح طور پر نہیں پہچانا، اُن میں تشبیہ والے بھی ہیں۔ جیسے ابنیت والے جو خدا کی اولاد مانتے ہیں "اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" یہ لوگ تشبیہ کے عقیدے میں مبتلا ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کو مخلوق کے مشابہ بنایا۔ بیوی بچے ہونا مخلوق کی شان ہے، انہوں نے مخلوق کی یہ

صفت اللہ تعالےٰ کے لیے ثابت کی۔ تو وہ عقیدہ تشبیہ میں مبتلا ہو گئے۔

اسی طرح جن لوگوں نے خدا کی صفت خاصہ مخلوق میں ثابت کی وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ کے سوا مدبر کوئی نہیں، مگر انہوں نے قبروں والوں کو بھی مدبر جانا۔ لات و عزیٰ کو مدبر جانا۔ نبیوں کو مدبر جانا۔ مافوق الاسباب کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا مگر انہوں نے یہ بھی مانا تو شرک کے مرتکب ہوئے۔ خدا کی صفت علیم کل ہے، انہوں نے کہا کہ ولی بھی جانتے ہیں۔ ہماری ضرورتوں کو غائبانہ طور پر جانتے ہیں۔ خدا تعالےٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہی صفت وہ دوسروں میں بھی مانتے ہیں۔ حالانکہ علیم کل اور حاضر ناظر سوائے خدا کے اور کوئی نہیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی مدبر ہے، نہ خالق ہے، نہ معبود ہے مگر انہوں نے کہا کہ نہیں اور بھی ہیں، اُن کی عبادت کے بغیر خدا کی عبادت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تمام چیزیں شرک کے اندر آتی ہیں۔ تو اس طرح گویا شرک ہے یا تشبیہ۔

حجاب سوء معرفت

شاہ ولی اللہؒ اسے حجاب سوءِ معرفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان یا تو حجاب طبع میں مبتلا ہے یا حجاب رسم میں۔ طبعی ضروریات مثلاً کھانا، پینا، مکان، دکان وغیرہ حجاب طبع میں آتے ہیں جب کہ رسم و رواج کو ادا کرنے والے لوگ حجاب رسم میں مبتلا ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ حجاب سوءِ معرفت میں مبتلا ہیں۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان حجابات سے آگے نکل کر خدا تعالےٰ کی وحدانیت کو مانتے ہیں۔ اور خدا کی صحیح عبادت کرتے ہیں۔

تو فرمایا وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ یعنی دنیا میں ان کو سجدہ کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ صحیح سلامت تھے۔ تندرست تھے۔ اُن کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کہ خدا کے سامنے سجدہ کرو آج تمہیں اس کا اختیار ہے، یہ کل سلب ہو جائے گا۔ مگر انہوں نے اُس وقت دنیا میں سجدہ نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ قیامت کے دن اُن کی پشت تختہ بن جائے گی۔ اور وہ سجدہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے۔

استدراج کیا ہے

رسالت اور جزائے عمل کے بارے میں فرمایا فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ یعنی چھوڑ دیں مجھے اور اُن کو جو اس بات کو جھٹلاتے ہیں کہ عبادت صرف خدا کی ہی صحیح اصول پر ہونی چاہیئے اور نیز یہ کہ نبی برحق ہے اور قیامت ضرور آنے والی ہے۔ کیوں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ۔ اس لیے کہ ہم ان کو آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھائیں گے۔ جہاں سے

ان کو پتہ بھی نہیں ہوگا۔ استدراج آہستہ آہستہ چڑھانے کو کہتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب تم دیکھو ایک شخص کو نافرمانی کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں تو جان لو کہ یہ شخص استدراج میں مبتلا ہے۔ یعنی یہ شخص خدا کی دی ہوئی مہلت سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں یہ الفاظ اس طرح آتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَیُمْلِیْ لِلظَّالِمِ خدا ظالم کو مہلت دیتا ہے۔ حَتّٰی اِذَا اَخَذَہٗ لَمْ یُفْلِتْہُ پھر جب پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ اسے سزا کے شکنجے میں جکڑ دیتا ہے یہی استدراج ہے کہ معاصی اور نافرمانی کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کو دیکھ کر شبہ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کہ شاید یہ آدمی اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاُمْلِیْ لَہُمْ میں ان کو مہلت دیتا ہوں۔ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ میری تدبیر مضبوط ہے اور یہ لوگ میری تدبیر سے باہر کہاں جا سکتے ہیں۔

خیر خواہوں کی نصیحت سے اعراض

رسالت ہی کے بیان میں آگے فرمایا۔ کہ جب آپ ان کو حقائق سے آگاہ کرتے ہیں تو کیا یہ اس لیے انکار کرتے ہیں کہ آپ ان سے کچھ مزدوری طلب کرتے ہیں، معاوضہ یا فیس مانگتے ہیں۔ اَمْ تَسْئَلُہُمْ اَجْرًا فَہُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ کیا یہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ کوئی معاوضہ طلب کرتا ہے تو گراں گذرتا ہے۔ کہ یہ تو اپنا مطلب پورا کر رہا ہے۔ فرمایا یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام لوگوں کو صاف بتلاتے ہیں مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ ہم اپنی تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔ تم اپنے ذہن صاف رکھو اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی ہمارا بدلہ تو رب العٰلمین کے ذمہ ہے۔ وہی ہمیں دے گا۔ ہم کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ ہم تو خیر خواہی کرتے ہیں نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ہم خیر خواہ ہیں۔ تمام نبی یہی کہتے رہے اَنْصَحُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ" ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں مگر افسوس کہ تم خیر خواہوں کی بات کو نہیں مانتے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے سچے اور مخلص خیر خواہوں کی بات کو نہیں مانا۔ خود غرضوں کے پیچھے اور باطل پرستوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، چوہدریوں اور غلط کار لوگوں کے پیچھے لگے ہیں۔ مخلص اور خیر خواہوں کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔

آج کے دولتمند کل کے قلاش

یہ جو کہتے ہیں کہ آج ہم آسودہ حال ہیں تو کل کو اگر قیامت آ بھی گئی تو بھی ہم ہی اچھے ہونگے اور مسلمان جو یہاں مادی اعتبار سے کمزور ہیں قیامت کو بھی ان کی حالت اچھی نہیں ہوگی تو اس

سلسلے میں ارشاد ہوا اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ کیا اِن کے پاس غیب ہے کیا وہ اس بات کو جانتے ہیں، بلکہ فرمایا یہ غلط ہے۔ جھوٹ کہتے ہیں، یہ ضروری نہیں ہے، کہ جو آج اچھا ہے، کل بھی اچھا ہو گا، جو آج دولت مند ہے، کل بھی دولت مند ہو گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اَلۡاَكۡثَرُوۡنَ هُمُ الۡاَقَلُّوۡنَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ یعنی جو آج زیادہ دولت مند ہیں کل قیامت کے دن بڑے ہی محتاج ہوں گے۔

ابو جحیفہؓ اس حالت میں حضور علیہ السلام کے پاس آئے۔ کہ گوشت روٹی سے پیٹ خوب بھرا ہوا تھا۔ اور ڈکار مار رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اپنے ڈکاروں کو روکو۔ جو آج دنیا میں پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، کل قیامت کے دن زیادہ بھوکے ہوں گے۔ اس کے بعد ابو جحیفہؓ جب تک زندہ رہے، دن میں کبھی پیٹ بھر کر دو مرتبہ روٹی نہیں کھائی۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے، آج کے زیادہ دولت مند کل زیادہ محتاج ہوں گے، کیونکہ دولت مند حقوق ادا نہیں کرتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ تھوڑے لوگ جو دولت کو صحیح طور پہ استعمال کرتے ہیں، اُسکے فرض اور واجب تمام حقوق ادا کرتے ہیں، وہ آج بھی دولت مند ہیں، کل بھی دولت مند ہوں گے ورنہ آج کے دولت مند کل کے قلاش اور آج کے بھرے ہوئے پیٹ والے کل کے بھوکے ہوں گے۔ تو فرمایا کیا ان کے پاس کوئی غیب کی خبر ہے۔ کہ جو آج اچھے ہیں۔ کل بھی اچھے ہوں گے۔ یہ تو کافر اور مجرمین ہیں۔ کل ان کا بُرا حال ہو گا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿٥٢﴾

ترجمہ:- پس اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کریں۔ اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیں جب اس نے دعا کی تو وہ غم سے بھرا ہوا تھا ﴿٤٨﴾ اگر اس کے رب کی نعمت اس کا تدارک نہ کرتی تو البتہ پھینک دیا جاتا اس کو چٹیل میدان میں اس حالت میں کہ وہ بدحال ہوتا ﴿٤٩﴾ پھر اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ بنایا اور اسے صالحین میں بنایا ﴿٥٠﴾ قریب ہے کہ کافر لوگ آپ کو پھسلا دیں اپنی آنکھوں سے (گھور گھور کر) جب وہ قرآن پاک کو سنتے ہیں۔ اور یوں کہتے ہیں کہ بیشک یہ تو پاگل ہے ﴿٥١﴾ اور یہ قرآن تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے ﴿٥٢﴾

گذشتہ سے پیوستہ (ربط)

پہلی آیتوں میں توحید و رسالت کے منکرین کا بیان تھا۔ قیامت میں پیش آنے والے حالات کا ذکر تھا۔ ابتدائی آیات میں کفر کرنے والوں کی بدگوئی کا حال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرتے تھے اور العیاذ باللہ آپ کو دیوانہ اور پاگل قرار دیتے تھے۔ اس کے بعد مشرکین کے اس رویہ کا ذکر تھا۔ کہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ مداہنت کریں، تو اس طرح ایک دوسرے سے اتفاق ہو سکے گا مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ۔ اس کے بعد بیان ہوا کہ اللہ نے جو مال و دولت دے رکھا ہے، وہ محض آزمائش کے لیے ہے۔ باغ والوں کا حال بیان ہوا اُن کو اللہ تعالیٰ نے آزمایا، پھر اُن کا مال و دولت ہلاک کر دیا، اسی طرح فرمایا کہ مکے کے مشرکین کو مال و دولت دے کر آزمایا گیا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کے محبوب ہیں، بلکہ یہ تو آزمائش ہے۔ آگے قیامت کا حال بیان فرمایا کہ وہاں پر یہ لوگ پچھتائیں گے۔

صبر کی تلقین

آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلائی ہے کافر لوگ آپ کو

بڑی تکلیف دیتے تھے، العیاذ باللہ آپ کو دیوانہ کہتے تھے حالانکہ اللہ کا نبی جو اخلاق عالیہ پر فائز ہوتا ہے، بڑا ہی دانا اور عقلمند ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ حسد کی بنا پر آپ کو پاگل کہتے تھے۔ جس سے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی، توحید و رسالت اور قیامت کے انکار سے بھی آپ دل برداشتہ ہوتے تھے۔ تو اس سلسلہ میں ان آیات کے اندر اللہ نے تسلی کا مضمون بیان فرمایا۔

قرآن کریم میں تسلی کا مضمون کثرت سے بیان ہوا ہے۔ بعض اوقات کوئی پہلا نمونہ بیان کر کے تسلی دی جاتی ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ انہوں نے بھی جب نصیحت کی تو قوم کہنے لگی "قَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ" یہ تو پاگل ہے۔ انہوں نے ڈانٹ دیا کہ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں، کبھی دوسروں کو کہہ دیا، یہ بیوقوف آدمی ہے۔ اس کی بات نہ سننا، تو انہوں نے صبر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کا نمونہ بھی بیان فرمایا۔

یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور نبی کا حال ذکر کیا ہے۔ کہ ان سے ایک معمولی سی لغزش ہوگئی تھی۔ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور کتنی بڑی آزمائش میں پڑ گئے۔ اے نبی علیہ السلام! آپ ایسا نہ کریں، بلکہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کریں۔ جو حکم آئے، اس کے مطابق عمل کریں، جلد بازی نہ کریں اور ان لوگوں کی باتوں پر، تکلیفوں اور ایذاؤں پہ صبر کریں۔ کہیں دل برداشتہ ہو کر ان کے لیے جلدی عذاب نہ طلب کر لیں۔ انتقام میں جلدی نہ کریں، یہ مناسب نہیں ہے۔ اپنے رب کے حکم کا انتظار کریں اور مشرکین کی تکلیف دہ باتوں پر استقلال سے کام لیں۔

صبر و طاعت لازم و ملزوم ہیں

صبر ملتِ ابراہیمی کا ایک بہت بڑا اصول ہے۔ جس طرح ذکر، نماز اور شکر وغیرہ ہیں اسی طرح صبر بھی ہے۔ صبر کا مادہ اطاعت کے لیے ہوتا ہے، جو شخص صبر نہیں کر سکتا، وہ اطاعت نہیں کر سکتا۔ اطاعت میں صبر کرنا پڑتا ہے۔ روزہ، حج، جہاد، نماز کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے صبر کے بغیر اطاعت نہیں ہو سکتی۔ برداشت کرنا، نفس کو اس پر جمانا، طہارت وغیرہ یہ سب پابندیاں ہیں بڑے صبر کا کام ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ "آپ صبر کریں اور آپ کا صبر اللہ کی توفیق سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے خدا تعالیٰ سے توفیق بھی طلب کریں۔ جس طرح ذکر فکر اور نماز ہے اسی طرح صبر ہے۔ جب تکلیف آئے تو

من جانب اللہ سمجھ کر برداشت کریں ۔ تکالیف کو لانا اور رفع کرنا اللہ تعالےٰ ہی کا کام ہے لہٰذا جب تکلیف آئے تو بے صبری کا اظہار نہ کریں۔

صبر و صلوٰۃ کے ذریعے استعانت

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ "جب تم کو تکلیف پہنچے تو اس کا مقابلہ صبر اور نماز کے ساتھ کرو۔ اللہ تعالےٰ سے مدد طلب کرو۔ نماز پڑھو کہ نماز توجہ الی اللہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دوسرے صبر کرو، برداشت کرو، بے صبری سے کام نہ لو۔ انسان کا مزاج عموماً بے صبری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ "انسان بے صبر، تنگ دل پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ قَتُوْرًا کا لفظ فرمایا کہ انسان بڑا تنگ دل ہے۔ لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ اطاعت پر اور مصیبت کے آنے پہ صبر کرو۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنا صبر ہے۔ اس مقام پہ وہ تکالیف مراد ہیں جو مشرکین کی طرف سے پہنچائی جا رہی ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیں، جنہوں نے بے صبری سے کام لیا تھا۔ مچھلی والے سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ یہ شام اور فلسطین کے علاقہ میں رہتے تھے۔ جہاں بنی اسرائیل آباد تھے۔ اُن کے دور میں حزقیل بادشاہ تھا۔ اُس وقت کے بڑے نبی حضرت شعیا علیہ السلام تھے۔

اُس بادشاہی میں بیک وقت اللہ کے پانچ نبی تھے، جن میں حضرت یونس علیہ السلام بھی شامل تھے۔ بادشاہ مومن، مطیع اور منقاد تھا۔ اللہ کے نبیوں کی اطاعت کرتا تھا۔ یہ موصل اور نینوی شام اور عراق کے درمیان ہیں۔ موصل اب عراق کا ایک صوبہ ہے نینوی بھی وہاں کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے کچھ تعدی کی تھی اُنکے علاقے میں آدمی ملے گئے۔ اور غلام بنا کر لے گئے، تو بادشاہ نے خیال کیا کہ ان کو سمجھانا چاہیئے کہ قیدیوں کو واپس کر دیں اور زیادتی نہ کریں۔

اس کا ذکر حضرت شعیا علیہ السلام سے کیا گیا کہ اس طرح زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت اللہ کے پانچ نبی موجود ہیں، مناسب ہے کہ اُن میں سے ایک کو وہاں بھیج دیں۔ تجویز یہ ہوئی کہ حضرت یونس علیہ السلام جو بڑے نیک اور عبادت گذار ہیں، اُن کو وہاں بھیج دیں۔ اگرچہ اُن کے مزاج میں غصہ تنگی ہے۔ تاہم اُن کے زہد و تقوی کی بنا پر اُن کا جانا ہی زیادہ مناسب ہے

حضرت شعیا علیہ السلام نے حضرت یونس علیہ السلام کو مامور کیا۔ کہ وہاں جاکر نیکی کی تلقین کریں۔ انہوں نے نینوی جاکر خدا کا پیغام سنایا لوگوں کو سمجھایا کہ زیادتی نہ کریں۔ آپ نے وہاں کافی عرصہ تک تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا مگر لوگوں نے اُن کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ تو حضرت یونس علیہ السلام نے اُن لوگوں کو عذاب کی وعید سنائی کہ اُن کی نافرمانی کی وجہ سے خدا کی جانب سے اُن پر عذاب آئے گا۔

یہ اتنی بات تو اللہ کے حکم سے ہوئی تھی، لیکن اس موقع پر یونس علیہ السلام سے لغزش یہ ہوئی کہ وحی الٰہی کا انتظار کرنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے۔ سمجھے کہ اب مجھ پر کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعات قرآنِ پاک کی مختلف سورتوں مثلاً سورۃ انبیاء، سورۃ یونس سورۃ صٰفّٰت وغیرہ میں مذکور ہیں اور اس سورۃ میں ایک حصہ بیان ہوا ہے۔ قرآن پاک کوئی تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں، جو ہر واقعہ کو مسلسل ایک جگہ بیان کر دے یہ تو ایک نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق نصیحت کے لیے جتنی بات جس جگہ موزوں ہوتی ہے، بیان کر دی جاتی ہے۔

الغرض حضرت یونس علیہ السلام بے صبری کی بنا پر حکم الٰہی کا انتظار کیے بغیر وہاں سے نکل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتلا میں مبتلا ہو گئے۔ سورۃ انبیاء میں ہے "اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا" بغیر الٰہی کی وجہ سے قوم پر غصے کی حالت میں نکل گئے۔ قوم کو کافی عرصہ سمجھاتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی تو مُغَاضِباً لِلّٰہِ اللہ کے لیے قوم پر ناراض ہوتے ہوئے نکل گئے۔

حوت سے مراد مچھلی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا" یعنی نون والے جب غصے کی حالت میں نکل گئے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں بھی نٓ کا ذکر ہے "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ"۔ نٓ کو کئی باتوں سے مناسبت ہے جیسا کہ ابتدائی آیتوں میں عرض کیا۔ نٓ سے مراد دوات ہے۔ تو قلم کے ساتھ ذکر کیا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ نٓ سے مراد مچھلی ہے کیونکہ ذی النون مچھلی والے کو کہا گیا ہے۔

یہاں پر حُوت کا لفظ آیا ہے حوت، سمک اور نٓ کا اطلاق مچھلی پر ہوتا ہے۔

انبیاء کی معمولی سی لغزش پر بھی گرفت ہوتی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی یہ لغزش کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ نہ تھا بلکہ ایک معمولی غلطی تھی چونکہ وہ اللہ کے نبی تھے، بڑے آدمی تھے، اس لیے اُن کی معمولی سی لغزش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے حضرت

آدم علیہ السلام سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ قرآن پاک میں موجود ہے "فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" لیکن معمولی غلطی پر بڑی گرفت آئی۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ نبیوں کی تربیت زیادہ مقصود ہوتی ہے۔ وہاں خلاف اولیٰ بات پر بھی بڑی گرفت ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ لوگ ڈرتے رہتے ہیں۔ ان میں اللہ کے جلال اور عظمت کا بہت اثر ہوتا ہے۔

قیامت والی حدیث میں آتا ہے۔ کہ لوگ سفارش کے لیے انبیاء کے پاس جائیں گے مگر تھرتھرائیں گے۔ وجہ کیا ہے غَضِبَ غَضَبًا لَّمْ یَغْضَبْ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ کہیں گے آج تو خدا تعالےٰ غصے میں ہے، پتہ نہیں ہم پر گرفت کرے، ہم یہ کام نہیں کر سکتے، لہٰذا دوسرے کے پاس جاؤ۔ خدا کی عظمت و جلال کے سامنے معمولی بات پر بڑی گرفت ہوتی ہے حالانکہ اُن سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

"عَبَسَ وَتَوَلّٰی" بہت معمولی سی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو تنبیہ فرمائی۔ آپؐ ترش رو ہو گئے محض اس وجہ سے کہ ایک اندھا آیا ہے۔ اور خیال کیا کہ یہ بڑے لوگ ہیں شاید یہ ہدایت قبول کر لیں۔ اللہ نے بڑی سختی سے فرمایا جو طلبگار بن کر آتا ہے اُس کی طرف زیادہ توجہ کریں، جو اعراض کرتا ہے، اس کے درپے نہ ہوں، آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔

اسی طرح مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام سے ہوا۔ کہ وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر وہاں سے نکل پڑے اور گرفت ہو گئی۔ سورۃ انبیاء میں موجود ہے "فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ" اُس نے گمان کیا کہ ہم سختی نہیں کریں گے۔ حالانکہ وہ لغزش تھی اور ہم نے سخت ابتلاء میں ڈال دیا۔ یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ گویا قید خانے میں ڈال دیا۔

مچھلی کا واقعہ مشہور ہے۔ دریا کے کنارے پر پہنچے۔ جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز میں پھینکے جانے کے لیے ہر بار قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلتا ہے جہاز والے انکا نورانی چہرہ دیکھ کر ان کو دریا میں پھینکنے سے ہچکچاتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر قرعہ انہیں کے نام نکلتا ہے۔ آخر انہیں دریا میں پھینک دیا گیا اور آپ سیدھے مچھلی کے منہ میں پہنچ گئے۔

پھر کیا ہوا۔ یونس علیہ السلام نے دریا اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکیوں میں اپنے رب کو پکارا "فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" چالیس دن، دس دن یا تین دن، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کتنا عرصہ مچھلی [illegible] میں رہے

اللہ کا حکم تھا کہ مچھلی کا پیٹ قید خانہ ہے، یونس علیہ السلام مچھلی کی خوراک نہیں ہیں۔ تو ان اندھیروں میں رب کو پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خطا کار تو میں ہی تھا۔

دفع مصیبت کا بہترین وظیفہ

ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[1] دَعْوَةُ الْمَكْرُوْبِ دَعْوَةُ ذِي النُّوْنِ یعنی مصیبت زدہ آدمی کی دعا یہی حضرت یونس علیہ السلام والی دعا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ”اگر کوئی مصیبت زدہ یہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ مشائخ اور بزرگان دین نے اپنے تجربات کی بنا پر آیت کریمہ کے پڑھنے کے طریقے دریافت کئے ہیں۔

اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سو پچاس آدمی جمع ہوں اور ایک ہی مجلس میں سوالاکھ مرتبہ آیت کریمہ پڑھی جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے۔ کہ انسان تنہائی میں بیٹھ کر پڑھے۔ عشاء کے بعد اندھیرے میں بیٹھ جائے اور پانی کا پیالہ پاس رکھ لے۔ ہر روز تین سو مرتبہ یہ دعا پڑھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیالے میں ہاتھ ڈال کر پانی اپنے چہرے اور جسم پر ملتا ہے۔ یہ عمل تین دن، سات دن یا چالیس دن کرے گا، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کریں گے اور پریشانی دور فرما دیں گے۔ بہر حال یہ طریقہ حدیث میں نہیں ہے، حدیث میں اتنا ہی ہے کہ مصیبت زدہ کی دعا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ“۔ صرف یونس علیہ السلام کے لیے ہی نہیں بلکہ جو بھی مصیبت زدہ اسے پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی دور کریں گے۔

یونس علیہ السلام کی پریشانی

بہر حال حضور علیہ السلام کو تلقین کی جا رہی ہے۔ کہ آپ مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر کریں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں کہ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ کہ سخت آزمائش میں مبتلا ہونے پر جب انہوں نے دعا کی تو غم سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف مچھلی کے پیٹ میں تاریکیوں کے اندر جو دم گھٹنے والی جگہ تھی۔ دوسری طرف لوگوں کا آپ کی بات کو نہ ماننا، تمسخر کرنا اور پھر عذاب الٰہی کا سلسلہ، یونس علیہ السلام کا بغیر انتظار حکم خداوندی چلے جانا اور گرفت میں آجانا۔ یہ ساری باتیں تھیں جن کی وجہ سے یونس علیہ السلام غم سے بھرے ہوئے تھے یعنی مکظوم تھے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ان حالات میں لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اگر ان کے رب

[1] ترمذی صفحہ ۵۰۴ (فیاض)

کی نعمت یعنی احسان اور مہربانی ان کا تدارک نہ کرتی اور نہ سنبھالتی تو لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ البتہ پھینک دیا جاتا انہیں چٹیل میدان میں اس حالت میں کہ وہ ہارے ہوئے ہوتے۔ مگر اللہ کی مہربانی شامل حال رہی تو یونس علیہ السلام کو کسی حال میں نقصان نہیں پہنچنے دیا سوائے اس کے کہ ان کے جسم پر کھال میں حبس کی وجہ سے نرمی آگئی تھی۔ کھال بالکل نرم ہوگئی تھی۔ تو اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی کہ دریائے دجلہ کے کنارے اُس چٹیل میدان میں مچھلی نے آپ کو ریت کے اوپر اگل دیا۔ اور اس طرح آپ کے نہایت نرم جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پھر جیسا کہ سورۃ صٰفّٰت میں آتا ہے "اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ" اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر ان پر کدو کا درخت اُگا دیا۔

کدّو کے خواص

حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو کدو بہت پسند تھا۔ آپؐ کو اس سے طبعی محبت تھی، آپؐ نے فرمایا اِنَّهٗ شَجَرَةُ اَخِیْ یُوْنُسَ۔ یہ میرے بھائی یونس کا درخت ہے۔ کدو بہت اچھی سبزی ہے۔ اطباّ نے بھی اس پر تجربات کئے ہیں۔ گھیا گول ہو یا لمبا، اللہ تعالیٰ نے اس میں قوت حافظہ کی تاثیر رکھی ہے۔ تاثیر کے لحاظ سے مرطوب اور ٹھنڈا ہے۔ تاہم اس میں قوت حافظہ کو قوی کرنے کا مادہ ہے، عجیب چیز ہے۔

فرماتے ہیں کہ کدو کے پتے پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں۔ شاید اللہ تعالیٰ کی یہ خاص حکمت تھی کہ وہاں کدو کی بیل اُگا دی کہ اس کے پتوں کا سایہ ہو اور یونس علیہ السلام کے نہایت نرم و نازک جسم پر مکھیاں بھی نہ بیٹھیں۔ اس صحرا کے اندر کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہرنی کو بھیج کر یونس علیہ السلام کے لیے دودھ کی غذا مہیا کی۔ آپ وہاں چالیس روز تک رہے۔

یونس علیہ السلام کی واپسی

یونس علیہ السلام کے متعلق حکم ہوا کہ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ہم نے یونس علیہ السلام کو دوبارہ ایک لاکھ یا زیادہ جو کہ غالباً ایک لاکھ بیس ہزار تھے ان کی طرف بھیجا وہ اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو وہاں حالات ہی بدل چکے تھے۔ وہ تمام لوگ تائب ہو چکے تھے اور اپنے پیغمبر کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ وہ اللہ کا بندہ کدھر گیا۔ وہ لوگ عذاب الٰہی کو آتا ہوا دیکھ کر تائب ہو چکے تھے۔

یونس علیہ السلام کی بزرگی

فرمایا فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو برگزیدہ

بنایا اور اُسے صالحین میں بنایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی ۔ کہ میں یونس علیہ السلام سے بہتر ہوں۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے بارے میں بھی نہ کہو۔ اُن سے لغزش ہوئی تھی تو اللہ نے گرفت کی۔ وہ خدا کے نبی اور رسول تھے۔ اور نبیوں سے معمولی لغزش ہی ہو سکتی ہے، صغیرہ یا کبیرہ گناہ تو سرزد ہوتا نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو ان سے بہتر نہ کہو یا کسی طریقے سے اُن کی توہین کر بیٹھو۔ کہ ایسا کرنے سے کفر کا خطرہ ہے۔

تو فرمایا فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ اللہ نے انہیں برگزیدہ بنایا اور یہ ہی آدم علیہ السلام کے متعلق بھی فرمایا فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ اور اُسے صالحین میں سے بنایا۔ یونس علیہ السلام کی یہ معمولی سی لغزش بے صبری کا نتیجہ تھا۔ لہذا اے نبی علیہ السلام آپ ایسا نہ کریں بلکہ ایذا کو برداشت کریں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کہتے ہیں۔ کہ نبیوں کی لغزش کا بلاوجہ ذکر کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔[1]

---

[1] حضرت یونس علیہ السلام کا باوجود عصمت کے گناہ کو اپنی طرف منسوب کرنا (اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) یہ مجاز پر محمول ہے۔ جیسا کہ بعض اہل طریقت باوجود ایمان کے کفر کو اپنی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اعتراف (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتراف (رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ) بھی اسی قبیل سے ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے کوئی گناہ نہیں سرزد ہوا تھا۔ صرف خطائے اجتہادی ہوئی تھی۔ کہ انہوں نے چلے جانے کو اجتہاد سے جائز سمجھا اور انتظار وحی نہ کیا۔ حالانکہ امید وحی تک انبیاء علیہم السلام کو انتظار کرنا مناسب ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اس واقعہ میں کسی امر کی مخالفت نہیں ہوئی صرف اجتہاد میں خطاء ہوئی۔ یہ خطاء امت کے لوگوں کے حق میں تو معاف ہوتی ہے مگر انبیاء علیہم السلام کی تربیت اور تہذیب زائد مقصود ہوتی ہے اس لیے یہ ابتلاء میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ یونس علیہ السلام کو بھی اجتہادی غلطی پر یہ ابتلا ہوا۔ ؎ نزدیکاں را بیش بود حیرانی۔ انبیاء علیہم السلام کو صرف جسمانی تکلیف دی جاتی ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام حقیقی گناہ اور حقیقی عقوبت سے پاک ہوتے ہیں۔ (حضرت تھانویؒ)

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام "و در امتثال امر الٰہی ہیچ وجہ تقصیر نہ کردہ اند" کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں کسی طرح کوتاہی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ آپ پہنچا دیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اگر آپ نے ذرہ بھر کوتاہی کی تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے حق رسالت

آدم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام یا یونس علیہ السلام کی لغزش کا ذکر محض لاپرواہی کے ساتھ کرنا مکروہ ہے۔ ہاں قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلہ میں جہاں بات سمجھانی مقصود ہو۔ تشریح کرنا ہو تو جائز ہے ورنہ بلاوجہ لغزش کا ذکر کرنا اپنی بڑائی بیان کرنا ہے اور نبی کی توہین کا ارتکاب ہے اور ایسا کرنے سے کفر لازم آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

تبلیغ جاری رکھنے کا حکم

فرمایا وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ قریب ہے۔ کہ کافر لوگ آپؐ کو اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھیں۔ جیسے تجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں یا آپؐ پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ ان کی ترشروئی سے تنگ آکر تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔ فرمایا قریب ہے کہ یہ لوگ پھسلا دیں لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ اور جب وہ قرآن پاک کو سنتے ہیں۔ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۔ تو کہتے ہیں کہ یہ تو پاگل ہے۔ پھر اسی پہلی آیت والے جملے کو دہرایا۔ تو ظاہر ہے ان حرکات سے آپؐ کو سخت تکلیف پہنچی تھی۔ اور گھور گھور کر دیکھنے سے مراد ہے کہ گویا نگاہوں

(بقیہ صفحہ ۱۱۷ کا) نہیں ادا کیا۔

مسئلہ :- حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ تفسیر مظہری سورۃ صافات کی تفسیر میں لکھتے ہیں

لَا یَجُوْزُ ذِکْرُ زَلَّةِ الْاَنْبِیَاءِ فَاِنَّ زَلَّتَهُمْ تُوْجِبُ کَمَالَ الْاِنَابَةِ اِلَی اللّٰهِ وَرَفْعَ دَرَجَاتِهِمْ وَمَنِ اعْتَرَضَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنَ الْاَنْبِیَاءِ فَقَدْ کَفَرَ۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَحَدِیْثُ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ مَرْفُوْعًا مَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُّوْنُسَ بْنِ مَتّٰی۔ (متفق علیہ)

ترجمہ :- انبیاء علیہم السلام کی لغزش کا ذکر کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ انکی لغزشیں کمال انابت الی اللہ اور ان کے رفع درجات کو واجب کرتی ہیں۔ اور جس شخص نے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک پر بھی اعتراض کیا تو اس نے کفر کیا۔ تمام نبیوں کے بارہ میں ایک جیسا حکم ہے کیونکہ یہ آیت کہ "ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے" بالکل واضح ہے اور بخاری و مسلم کی یہ حدیث بھی ہے۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ کسی شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں۔ ۱۲۔ عبدالحمید سواتی۔

سے کھائے ہیں ، پھسلاتے ہیں تاکہ آپ مرعوب ہوکر تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔

نظر بد برحق

بعض فرماتے ہیں نظر بد لگ جاتی ہے اَلْعَیْنُ حَقٌّ نظر بد برحق ہے حدیث میں آتا ہے ۔ کہ بعض آدمیوں میں نظر بد کا مادہ ہوتا ہے ۔ اُن کی نگاہوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے ۔ کہ دیکھتے ہی استعجاب پیدا ہوتا ہے اور اُس کا اثر ہو جاتا ہے ۔ بعض احادیث میں یہ الفاظ ہیں کہ نظر بد انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں پہنچا دیتی ہے ۔ اس کا اثر فوری ہوتا ہے ۔ آدمی بیمار ہو جاتا ہے یا ہلاک ہو جاتا ہے ۔

حضور کے صحابہؓ میں سے بعض کی نظر لگ جاتی تھی ۔ کوئی شخص حوض کے کنارے تہ بند باندھے نہا رہا تھا ۔ دوسرے نے دیکھا کہ جسم بڑا خوبصورت ہے ۔ کہنے لگا ، کمال جسم ہے ، ایسا پہلے نہیں دیکھا ۔ اس کا فوری اثر ہوا ، بخار آیا اور آدمی تڑپنے لگا ۔ حضورؐ کو پتہ چلا تو اُس کو بلا کر کہا کہ تم میں سے کیوں کوئی اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے ۔ اَلَّا بَرَّکْتَ عَلَیْہِ تم نے اُس کے لیے برکت کی دعا کیوں نہ کی ۔ لہٰذا اگر کسی کی نگاہ میں ایسی تاثیر ہو تو اُسے کہنا چاہیئے ۔ اللہ برکت دے ۔ برکت کی دعا کرنی چاہیئے تاکہ نظر بد کا اثر نہ ہو ۔

یہ بھی فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کی نظر بد لگتی ہو تو نظر بد والے شخص کا وضو یا غسل کا مستعمل پانی اگر مریض کے جسم پر ڈال دیا جائے تو اللہ شفا دے دیتا ہے ۔ یہ حکمتِ خداوندی ہے ۔ کہ جس جسم میں بیماری رکھی ہے ۔ اس میں شفا بھی رکھی ہے ۔ جیسے مکھی کے متعلق فرمایا کہ مکھی کے ایک پَر میں بیماری اور دوسرے میں شفا کا مادہ ہوتا ہے ۔ وہ بیماری والا پَر پہلے ڈبوتی ہے ۔ اسی لیے مناسب ہے کہ اگر کوئی گرم چیز نہ ہو ، پانی وغیرہ ہو تو جب مکھی ایک پَر کو ڈبوئے تو تم دوسرا بھی ڈبو دو ، مکھی کو پھینک دو اور چیز کو استعمال کر لو ۔ اس طرح بیماری کا اثر زائل ہو جائے گا ۔ اسی طرح نظر بد والے کے جسم میں بھی بیماری اور شفا دونوں چیزیں ہوتی ہیں ۔ اگر اُس کے غسل کا پانی مریض کے سر پہ ڈال دیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا دے دیتے ہیں ۔

قرآن پاک نصیحت ہے

الغرض کفار و مشرکین جب قرآن پاک سنتے تھے تو حضور علیہ السلام کو پاگل کہتے تھے جس سے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی ۔ اس پہ اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین فرمائی ۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ یہ قرآن پاک پاگلوں کا کلام نہیں ہے بلکہ وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ یہ تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے ۔

سورۃ الحاقۃ

(مکمّل)

درسِ اوّل ۱

آیت ۱ تا ۱۲

سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورۃ الحاقہ مکی ہے یہ باون آیتیں اور اس میں دو رکوع ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلْحَآقَّۃُ ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّۃُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّۃُ ﴿۳﴾ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَۃِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُھْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ ﴿۵﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ ﴿۶﴾ سَخَّرَھَا عَلَیْھِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْھَا صَرْعٰی کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ ﴿۷﴾ فَھَلْ تَرٰی لَھُمْ مِّنْ بَاقِیَۃٍ ﴿۸﴾ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَہٗ وَالْمُؤْتَفِکٰتُ بِالْخَاطِئَۃِ ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّھِمْ فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰکُمْ فِی الْجَارِیَۃِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَھَا لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّتَعِیَھَآ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: وہ ثابت ہونے والا واقعہ (حادثہ) ﴿۱﴾ وہ ثابت ہونیوالا واقعہ کیا ہے ﴿۲﴾ اور اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ ثابت ہونیوالا واقعہ کیا ہے ﴿۳﴾ قوم ثمود اور قوم عاد نے کھٹکھٹا دینے والی چیز کو جھٹلایا ﴿۴﴾ پس قوم ثمود کو ایک خوفناک چیخ کے ساتھ ہلاک کیا گیا ﴿۵﴾ اور قوم عاد کو تند و تیز ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا جو کہ حد سے بڑھنے والی تھی ﴿۶﴾ اللہ تعالیٰ نے ان پر تند ہوا کو مسلط کر دیا جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی، پس تم لوگوں کو اس کے اندر پچھاڑے ہوئے دیکھو گے گویا وہ کھجور کے تنے ہیں جو اکھاڑ کر پھینک دیے گئے ہوں ﴿۷﴾ پس کیا آپ دیکھتے ہیں ان میں سے کسی ایک فرد کو بھی بچا ہوا ﴿۸﴾ اور فرعون اور اس سے پہلے لوگوں اور الٹی بستیوں والوں نے گناہ کیے تھے ﴿۹﴾ انہوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ

نے پکڑا اُن کو بڑی چڑھتی ہوئی گرفت کے ساتھ (۱۰) جب پانی میں طغیانی آگئی تو (اے موجودہ زمانے کے لوگو) ہم نے تمہیں (تمہارے آباء و اجداد کو) کشتی میں لاد دیا (۱۱) تاکہ تمہارے لیے یادگار بنا دیں اس واقعہ کو اور یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں (۱۲)

کوائف سورۃ

اِس سورۃ کا نام سورۃ الحاقہ ہے۔ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی باون آیات اور دو رکوع ہیں۔ یہ سورۃ دو سو چھپن کلمات اور ایک ہزار چار سو اسّی حروف پر مشتمل ہے۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

سابقہ سورۃ میں رسالت کا ذکر تھا۔ اللہ کے نبی اور رسول کو مجنون کہنے والوں کا رد تھا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو دنیاوی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں یہ محض امتحان کے لیے ہیں، کسی کی مقبولیت کی نشانی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ باغ والوں کی مثال بیان فرمائی کہ اللہ نے اُن کا بھی امتحان لیا تھا۔ اس کے علاوہ منکرین قیامت کا رد فرمایا، اور اس کے ساتھ آخرت میں پیش آنے والے حالات کا ذکر فرمایا آخر میں پھر رسالت کے مضمون کو تازہ کیا۔ اور مشرکین کی ایذا کے مقابلے میں صبر کی تلقین کی۔ جلد بازی سے منع فرمایا۔ مچھلی والے رسول کی مثال بیان کی کہ انہوں نے جلد بازی کی تو ابتلا میں مبتلا ہو گئے۔ فرمایا آپ ایسا نہ کریں بلکہ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کرتے رہیں۔ اور مشرکین کی ایذاؤں کو برداشت کریں۔

مضامین سورۃ ہٰذا

اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ جزائے عمل یقیناً واقع ہو گا۔ اور مجرموں کو سزا مل کر رہے گی۔ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہر دو طریقوں سے جزائے عمل دیتے ہیں۔ تو گویا جزائے عمل سے سورۃ کو شروع کر کے آخر میں پھر رسالت کا ذکر فرمایا۔

پہلی سورۃ میں مشرکین کے اُس الزام کا رد تھا جس میں وہ حضورؐ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔ اور قرآن پاک کو کہانت اور شاعری سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس سورۃ کی ابتدا میں جزائے عمل کا بیان ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی مجرم کو چھوڑتے نہیں، اُسے دنیا میں بھی سزا ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔ دنیا کی سزا دنیوی اسباب کے دائرے کے اندر ملتی ہے۔ اور دنیا کا نظام معطل نہیں کیا جاتا۔ اور آخرت کی سزا مستقل طور پر ملے گی۔

الحاقہ کا مفہوم

الحاقہ حق سے مشتق ہے۔ اور حق کے معنی ثابت ہونا ہے حق ثابت شدہ چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک بھی ہے، هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ یعنی وہ ثابت اور قائم دائم ہے۔ جیسے حقوق

ہیں ، کوئی حق اللہ ہے کوئی حق العباد ہے یعنی اللہ کا حق بھی ہے اور بندوں کا حق بھی ہے ۔ تو گویا حق کا معنیٰ ثابت ہونا اور حَاقَّۃ کا معنیٰ وہ حادثہ ہے جو ثابت ہو گا یعنی ثابت ہونے والا حادثہ ۔

جزائے عمل کا معیّن وقت

جزائے عمل کے متعلق اللہ تعالےٰ نے اس سورۃ میں تین لفظ استعمال کیے ہیں یعنی اَلْحَاقَّۃُ ، اَلْقَارِعَۃُ اور اَلْوَاقِعَۃُ اور ان تینوں کا اطلاق قیامت پر کیا ہے ، جو کہ جزائے عمل کا اصلی وقت ہے ۔ اللہ تعالےٰ تمام لوگوں کو اس دن ان کے اعمال کی جزا دے گا ۔

یہاں پہلے صبر کی تلقین کی ، پھر الحاقہ کا ذکر کیا کہ وہ ثابت ہونے والا واقعہ یعنی قیامت ضرور برپا ہو گی مشرکین کہتے تھے لَا بَعْثَ وَلَا جَزَاءَ یعنی نہ کوئی بعث ہے اور نہ حساب کتاب کے لیے قیامت یہ سب غلط کہتے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے ۔ وہ توحید و رسالت کا بھی انکار کرتے تھے تو اللہ تعالےٰ نے اس موقع پر قیامت کا ذکر فرمایا کہ جزائے عمل کے لیے وہ دن مقرر ہے ۔ اس کے علاوہ تھوڑا سا توحید کا ذکر فرمایا اور دوسرے نمبر پہ رسالت کا ذکر اور منکرین رسالت کا ردّ فرمایا ۔

الحاقہ کیا ہے ؟

فرمایا اَلْحَاقَّۃُ وہ ثابت ہونے والا حادثہ مَا الْحَاقَّۃُ وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے ۔ کسی چیز کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ترکیب استعمال کی جاتی ہے ۔ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحَاقَّۃُ ۝ اور اے پیغمبر علیہ السلام آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے ۔ کسی چیز کی زیادہ تاکید کے لیے یا تفہیم کے لیے اس قسم کا عنوان اختیار کیا جاتا ہے ۔ پھر اللہ تعالےٰ خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہیں ۔ کیونکہ عام مخاطب ویسے ہی نہیں جانتے مگر جو اصلی مخاطب ہے اُسے بھی گویا اس کا علم نہیں ۔ تو اس جگہ چند دنیوی حادثے بیان کئے جو دنیوی سزا کے طور پر مجرمین پہ واقع ہوئے ۔ اور اس کے بعد پھر بڑے حادثے یعنی قیامت کا ذکر کیا ۔ اور اس کو حاقہ کے لفظ سے تعبیر کیا ۔ جو کہ جزائے عمل کی اصل گھڑی ہے یعنی اَلسَّاعَۃُ اَلْقِیَامَۃُ کے واقع ہونے کا ذکر کیا اور پوری تفصیل بیان کی ۔

قوم ثمود اور عاد کی سرکشی

الغرض یہاں چند حادثے بیان کئے جو ان مجرمین کو ملے جو جزائے عمل کا انکار کرتے تھے ۔ منجملہ ان کے قوم ثمود اور عاد کا ذکر کیا کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ قوم ثمود اور عاد نے قارعہ یعنی کھٹکھٹا دینے والی چیز کو جھٹلایا ۔ قرع کے معنی کھٹکھٹانا ، ہلا دینا کہ وہ ہر چیز کو ملا کر رکھ دے گی کوئی نظام قائم نہیں رہے گا اور اس سے مراد قیامت ہے ۔ تو گویا قوم ثمود اور عاد نے قیامت کے واقع ہونے کا انکار کر دیا ، جس کی وجہ سے وہ سزا کے مستوجب قرار پائے ۔

سزا کی دو قسمیں

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔ بعض سزائیں صرف تنبیہ کے لیے ہوتی ہیں۔ اور ان کو مسلسل نہیں رکھا جاتا۔ یہ سزا اس لیے دی جاتی ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔ تنبیہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ سزا اٹھالی جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ ہم بندوں کو تکلیف اور خوشحالی دے کر آزماتے ہیں۔ کبھی قحط، کبھی زلزلہ۔ مگر یہ سزا دائمی نہیں ہوتی بلکہ وقتی طور پر ہوتی ہے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

دوسری آیت مبارکہ میں ہے۔ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ بسا اوقات ہم دنیا میں بڑے عذاب سے پہلے سزا دے دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ خبردار ہو کر باز آجائیں، بڑا عذاب تو قیامت کو آئے گا مگر اس سے پہلے بھی ہم سزا دے دیتے ہیں۔ اس کو ابتلاء کہتے ہیں۔

عذاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ سزا آئی اور گرفتار ہو گیا۔ اب برزخ کا معاملہ شروع ہو گیا۔ جیسا کہ آگے فرعون، عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ جب خدا کی گرفت آئی أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا ادھر غرق کیا، اُدھر برزخ میں آگ پر پیش کر دیے گئے۔ اور یہ حالت تا قیام قیامت مسلسل قائم رہے گی، اگرچہ برزخ کی سزا مکمل سزا نہیں ہے۔ تاہم فی الجملہ سزا ہے۔ اصل سزا تو قیامت کو آئے گی جب تمام اعمال کا آخری اور قطعی فیصلہ ہوگا، مگر برزخ میں بھی سزا شروع ہو جاتی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ ملتی رہتی ہے اور پھر رعایت کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

سزا کی پہلی صورت ابتلا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے وقتی طور پر سزا دیتے ہیں تاکہ لوگ باز آجائیں۔ پھر اُس کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ مکے والوں پہ سات سال تک قحط نازل رہا۔ وہاں بھی یہی فرمایا "إِنَّكُمْ عَائِدُونَ" اس کے بعد جب ہم بڑی پکڑ میں پکڑیں گے پھر "إِنَّا مُنتَقِمُونَ" مجرموں سے انتقام لیں گے۔ بڑی گرفت وہاں بدر کی لڑائی کو کہا گیا ہے۔ پہلے قحط میں مبتلا کیا پھر بڑی گرفت میں تمام بڑے بڑے اکابر مجرمین ہلاک ہو گئے۔

قوم ثمود اور عاد کی ہلاکت

تو فرمایا كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ یعنی قوم عاد اور قوم ثمود نے کھٹکھٹا دینے والی چیز قیامت کو جھٹلا دیا۔ اس بات کی سزا یوں دی گئی کہ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ۔ قوم ثمود کو ایک چیخ اور زلزلے کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ طاغیہ کا معنی زلزلہ بھی ہوتا ہے اور چیخ بھی یعنی سخت آواز۔

ان دو چیزوں سے قوم ثمود کو ہلاک کیا گیا۔ وَاَمَّا عَادٌ اور جو قوم عاد تھی فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ انہیں تند ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا عَاتِيَةٍ جو کہ حد سے بڑھنے والی تھی۔

ہلاکت کے بیان میں تقدیم و تاخیر

اس مقام پر قوم ثمود کی ہلاکت کا پہلے بیان کیا گیا اور قوم عاد کا بعد میں حالانکہ تاریخی اعتبار سے ترتیب اس کے برعکس ہے۔ عاد پہلے گذرے ہیں۔ اور ثمود کا عروج عاد سے دو سو سال بعد ہوا۔ عاد یمن اور احقاف میں آباد تھے، جب کہ ثمود وادی القریٰ اور تبوک وغیرہ کے علاقے میں آباد تھے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام آئے جو انہیں کی قوم کے فرد تھے ——

—— اور قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اور یہ بعد میں آئے مگر یہاں سزا کے ذکر میں قوم ثمود کو پہلے لایا گیا اور قوم عاد کو بعد میں۔ اس کے بعد فرعون اور الٹی بستی والوں کا ذکر ہے۔ اور پھر قوم نوح کا حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پہلے غرق ہوئی، پھر عاد تباہ ہوئے اور پھر ثمود کی باری آئی۔ اس کے بعد الٹی بستی والے اور قوم شعیب کا نمبر آتا ہے اور سب سے آخر میں فرعون کی ہلاکت ہے۔

شاہ عبد العزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہلاکت کے بیان میں تقدیم و تاخیر میں ایک لطیف نکتہ پنہاں ہے فرماتے ہیں کہ یہاں پہ تاریخی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ بیان میں سزا کی نوعیت کا خیال رکھا گیا ہے یعنی پہلے اُس قوم کا ذکر کیا گیا جسے جلدی ہلاک کر دیا گیا۔ قوم ثمود پہ ایک چیخ آئی، ایک زلزلہ آیا اور وہ تباہ ہوگئی۔ مگر قوم عاد کے متعلق فرمایا وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ انہیں تند ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ان پر تند ہوا مسلط کر دی گئی جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی، آٹھ دن تک انہوں نے تکلیف اٹھائی اور پھر آخری دن بالکل ہی ہلاک کر دیئے گئے۔ تو گویا نوعیت کے اعتبار سے یہ سزا لمبی تھی جب کہ قوم ثمود کو یکدم ختم کر دیا گیا۔

مزید برآں سزا کی نوعیت کے لحاظ سے قوم ثمود کو ایک چیز سے ہلاک کیا گیا، چیخ ہوا کی کیفیت ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے ایک چیخ ماری، جگر پھٹ گئے، ہارٹ فیل ہوگئے اور ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ یہ ہوا کی کیفیت ہے۔ برخلاف اس سے قوم عاد ہوا کے جسم سے ہلاک ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسلط کیا اُس نے اکھاڑ پچھاڑ کیا۔ آدمیوں کو اِدھر اُدھر گرایا، اُن کو آپس میں ٹکرایا اور آخر میں ان کو بالکل ہی

ہلاک کر دیا۔ ہوا سات دن مسلسل چلتی رہی اور آٹھویں دن اُن کا کام تمام کر دیا۔ تو گویا یہ ہلاکت ہوا کے جسم کے ذریعے ہوئی۔

فرعون اور قوم لوط کی ہلاکت

فرعون کی ہلاکت کے اسباب میں پانی ہے، دریا ہے، ساتھ مٹی ہے، گویا اس سزا میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ یہی حال قوم لوط کا ہے۔ وہاں ہوا بھی ہے، طوفان بھی ہے، پانی کی موجیں اُٹھ رہی ہیں، بارش برس رہی ہے مٹی اور آگ بھی ہے۔ پتھر بھی ہیں۔ یہ ساری چیزیں سزا میں شریک ہیں۔ سزا نیچے سے بھی مل رہی ہے، اوپر سے بھی نازل ہو رہی ہے۔ لہٰذا قرآن پاک نے اس مقام پر اقوامِ عالم کی ہلاکت کو تاریخی اعتبار سے نہیں بلکہ سزا کی نوعیت کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قوم عاد کا حال

بہرحال قوم عاد کی سزا کی نوعیت یہ تھی کہ ان پر تند ہوا سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل مسلط رہی فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ تم لوگوں کو اس کے اندر پچھاڑے ہوئے دیکھو گے كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ جیسا کہ کھجور کے تنے اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیئے گئے ہوں۔ یہ لوگ بڑے جسیم اور قدآور تھے، اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی۔

یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں، مینار اور حوض بناتے تھے۔ بڑے طاقتور تھے اور اپنے جیسا طاقتور کسی دوسرے کو نہیں مانتے تھے۔ کہتے تھے "مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" ہم سے زیادہ کون طاقتور ہے۔ انہوں نے خدا کو بھی فراموش کر دیا اس قوم میں تین جرائم خاص طور پر پائے جاتے تھے۔ ایک کفر و شرک، دوسرا ظلم اور تیسرا تکبر۔

قوم ثمود کا حال

قریب قریب یہی حال قوم ثمود کا تھا۔ بڑے کاریگر، صناع اور انجینئر تھے۔ ان کے سترہ سو (۱۷۰۰) شہر اور بستیاں آباد تھیں۔ تبوک سے لے کر وادی القریٰ تک زرخیز زمین، گھنے باغات اور عالیشان عمارات تھیں۔ آج ان کے کھنڈرات دیکھ کر ہی آدمی حیران ہو جاتے ہیں۔ نوکیں پہاڑوں کے اندر ان کے مکانات کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔ کمال درجے کی عمارات اور دلکش نقش و نگار بناتے تھے۔ کمال درجے کے کاریگر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ عنکبوت میں ارشاد فرمایا کہ دنیا کے اعتبار سے یہ لوگ بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے مگر دین کے معاملے میں بالکل نادان اور بڑے بیوقوف تھے۔

دنیا کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام

آج دنیا کی ترقی یافتہ اقوام بڑی سوجھ بوجھ کی مالک ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور اقتصادیات کے مالک ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے مشرقی ممالک

پس ماندہ ہیں۔ غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہیں یعنی ابھی ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رہ کی زبان میں ترقی یافتہ اقوام میں عقلِ معاش کامل ہے۔ مگر عقلِ معاد بالکل نہیں۔ یہ لوگ عقلِ معاد سے بالکل خالی ہیں۔ انہیں عقلِ معاش مفید نہیں ہوگا۔ جونہی یہ معاش ختم ہوا یہ بھی ختم ہو گئے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔

الغرض قوم عاد کے متعلق فرمایا کہ انہیں ایسا پچھاڑ کے رکھ دیا کہ فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ ان کافروں میں سے کسی ایک فرد کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔ یہ لوگ ہود علیہ السلام کی نبوت اور قیامت کا انکار کرتے تھے ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا گیا۔

فرعون اور الٹی بستیوں والے

وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَن قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ۔ پھر فرعون کی باری آئی اور اس سے پہلے الٹی بستیوں والے جن کی بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا، ان پر پتھر برسائے گئے اور آگ برسائی گئی ان کے کام ہی الٹے تھے ان لوگوں نے گناہ کئے تھے، جرائم کے مرتکب ہوئے فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ انہوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی، رسول نے کہا اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو وہ کہتے تھے وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔ کیا تیرے جیسے بے وقوف آدمی کی وجہ سے ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ رسول کہتا تھا ظلم نہ کرو، قیامت آنے والی ہے، وہ کہتے تھے کوئی قیامت نہیں ہے۔ ڈھکوسلے مارتے تھے، بیہودہ باتیں کرتے تھے۔ رسول کے فرمان کو رد کرتے تھے فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِيَةً تو اللہ نے پکڑا ان کو بڑی چڑھی ہوئی گرفت کے ساتھ۔ رابیہ کا معنی چڑھی ہوئی گرفت جس طرح سیلاب اوپر چڑھتا ہے۔ یہ ابتلا نہیں تھی، بلکہ سزا تھی۔ اس میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے اکثر اور تکبر سارا ختم ہو گیا۔

طوفانِ نوح

اس کے بعد طوفانِ نوح کا ذکر فرمایا إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ جب پانی میں طغیانی آگئی، پانی چڑھ آیا، تو اے موجودہ زمانے کے لوگو! حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ۔ ہم نے تمہیں چلنے والی کشتی میں لاد دیا۔ یہ نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ آج اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے آباؤ اجداد نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار نہ ہوئے ہوں، وہی بچے تھے جو کشتی میں سوار ہو گئے۔ باقی سارے اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ تو گویا ہمارے آباؤ اجداد کا کشتیِ نوح میں سوار ہونا ہمارا ہی سوار ہونا ہے۔ اور پھر انہیں میں سے اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو آگے چلایا۔

اصل کلام

یہ تمام چیزیں اللہ کی گرفت تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے حاقے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑا

حاقہ یعنی قیامت ضرور واقع ہو کر رہے گا۔ اس میں قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ کا مفہوم بھی آگیا۔ جو آدمی مرگیا اس کی قیامت تو برپا ہوگئی مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ وہ تو عالمِ برزخ کی جزا و سزا میں مبتلا ہوگیا، اسی طرح بڑی قیامت تمام عالم پر یکبارگی آئے گی۔ جس طرح یہ قیامت صغریٰ برحق ہے، اسی طرح قیامتِ کبریٰ بھی برحق ہے، ضرور برپا ہوگی۔

یہ اُن قوموں کی قیامت تھی جن کا حال ذکر کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے مکانوں میں متمکن تھے قوم ثمود کی بڑی بڑی ستر سو بستیاں تھیں اور ان کی بلڈنگوں کے نشانات آج بھی موجود ہیں اسی طرح عمدان قوم عاد کا مکان چالیس منزلہ تھا، ہر منزل سے دوسری تک چالیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس کے کھنڈرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک موجود تھے۔ قوم عاد کی یہ یادگاریں پانچ ہزار سالہ پُرانی تھیں اور ان کی صنعت وحرفت اور کاریگری کی زندہ مثال تھیں۔ اہرامِ مصر بنانے والوں کی طاقت کا اندازہ لگائیں ایک ایک پتھر پچھتر من وزنی ایک دوسرے کے اوپر چڑھایا گیا تھا۔ یہ ہرم چار سو فٹ اونچا ہے۔ ان کا اُوپر چڑھانا اور آپس میں جوڑنا کتنی اعلیٰ صنعت تھی۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اس کشتی کو لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً تمہارے لیے یادگار بنادیا، کہ جو لوگ اس کشتی میں سوار ہوئے وہ بچ گئے اور انہیں کی نسل سے آئندہ دنیا کو قائم کیا۔ وَتَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ اس واقعہ کو یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں کہ دیکھو جب خدا کی سزا آتی ہے تو لوگ کس طریقے سے ہلاک ہوتے ہیں۔ تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ اور صرف وہی بچتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ بچانا چاہیں۔ یہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاقے بیان کیے اور اس کے بعد بڑے حاقے یعنی قیامت کا ذکر فرمایا

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: پس جب صور میں پھونکا جائے گا ایک ہی بار پھونکنا ﴿۱۳﴾ زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور ان کو کوٹ دیا جائے گا ایک ہی دفعہ کوٹ دیا جانا ﴿۱۴﴾ پس اس دن واقع ہو جائے گی واقع ہونے والی بات ﴿۱۵﴾ اور آسمان پھٹ جائے گا پس آسمان اس دن بہت کمزور ہو گا ﴿۱۶﴾ اور فرشتے اس کے اطراف پر ہوں گے اور اٹھائیں گے تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اس دن آٹھ فرشتے ﴿۱۷﴾ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی خفیہ سے خفیہ بات پوشیدہ نہ رہے گی ﴿۱۸﴾ پس جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ وہ لوگوں سے کہتا پھرے گا میرا اعمال نامہ پڑھ لو ﴿۱۹﴾ بیشک میں تو یقین رکھتا تھا کہ (ایک نہ ایک دن) مجھے میرا حساب پیش آنے والا ہے ﴿۲۰﴾ وہ بہت پسندیدہ زندگی کے اندر ہو گا ﴿۲۱﴾ بڑے اونچے باغ میں ہو گا ﴿۲۲﴾ اس کے پھل قریب ہوں گے ﴿۲۳﴾ خوشگواری سے کھاؤ پیو اس وجہ سے جو تم نے بھیجا گذرے ہوئے دنوں میں ﴿۲۴﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اِس سورۃ کا موضوع جزائے عمل ہے اور قیامت کا ذکر ہے۔ پہلی آیات میں اَلْحَاقَّةُ اور اَلْقَارِعَةُ کا ذکر فرمایا۔ چند گذشتہ اقوام کا ذکر کیا جو قیامت کو جھٹلاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حاقہ واقع

کیا اور یہ دو قسم سے وارد ہوتا ہے۔ ایک ابتلا ہوتی ہے، وقتی طور پر تکلیف آئی اور دُور ہو گئی۔ اس کے بعد پھر موقع مل گیا سزا کی دوسری قسم یہ ہوتی ہے کہ مذکورہ اقوام کو اس دنیا میں ہی سزا ملی اور پھر اٹھایا نہیں گیا۔ وہ لوگ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور عالم برزخ میں سزا پا رہے ہیں۔

ان اقوام میں شرک و کفر تھا اور انکار رسالت بھی، یہ لوگ قیامت کا بھی انکار کرتے تھے، تو یہ قیامت کے جھٹلانے کا نتیجہ تھا کہ وہ لوگ دنیا میں ہی سزا میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا میں آزمائش میں ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ "لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ" تاکہ انسان گڑگڑانے لگیں، عاجزی کریں اور گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ دوسری نوعیت سزا کی یہ ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قوم عاد، قوم ثمود، فرعون، قوم لوط اور قوم نوح پر مسلط کی۔ ان کا مؤاخذہ ہوا، سزا ملی اور ہلاک ہو گئے۔

صورِ اسرافیل

دنیا میں واقع ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اب محاسبے کا ذکر فرماتے ہیں۔ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک ہی بار پھونکنا۔ صور پھونکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتہ مقرر کیا ہوا ہے وہ مقررہ وقت پر صور پھونکے گا۔

ایک دیہاتی شخص نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور! صور کیا ہے۔ فرمایا[1] یہ سینگ کی مانند ایک طرف سے باریک اور دوسری طرف سے کشادہ ہے اور فرشتے نے منہ میں پکڑ رکھا ہے۔ سر جھکائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منتظر ہے۔ جب حکم ہوگا، صور پھونک دے گا۔ الغرض حضور نے فرمایا کہ صور بگل کی مانند، سینگ جیسا نوکدار ہے۔

شیخ ابن عربیؒ جو صاحب کشف تھے، فرماتے ہیں[2] کہ صور کا دہانہ اتنا بڑا ہے کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان اس کے دہانے میں پڑے ہوئے ہیں اور قرآن پاک سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی دفعہ نظام کائنات کو درہم برہم کرنے کے لیے دوسرا زندہ کرنے کیلئے۔

زمین و آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیں گے

جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو حالت یہ ہوگی کہ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ. زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً. تو ان کو کوٹ دیا جائے گا ایک ہی دفعہ کوٹ دیا جانا۔ یعنی زمین و آسمان کو بیچارگی ایسا باریک کر دیا جائے گا جیسا ہاون دستے میں کوئی چیز کوٹ کر باریک کر دی جاتی ہے۔ اور یہ گرد و غبار کی مانند ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ

[1] ترمذی ص۶۷ ، [2] عرف شذی ص۴۶۹ مکتبہ رحیمیہ دیوبند (فیاض)

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ٥" سورج اور ستاروں کا بیان فرمایا۔ جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے تو وہ سورۃ قارعۃ سورۃ شمس، سورۃ واقعہ اور سورۃ عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ" کو پڑھ لے۔ تو فرمایا جب قیامت برپا ہوگی تو پہاڑ جو سب سے مضبوط ہیں، ان کو کوٹ دیا جائے گا۔ اور وہ گرد و غبار کی مانند اڑنے لگیں گے۔ سمندر بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ کتنا خوفناک منظر ہوگا۔

قیامت برپا ہو جائیگی

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۔ پس اس دن واقع ہو جائے گی واقع ہونے والی۔ یہ واقعہ، قارعہ، طامہ وغیرہ قیامت ہی کے مختلف نام ہیں وہ حاقہ یعنی ثابت شدہ چیز ہے وہ تو ضرور ہو کر رہنے والی ہے اور واقعہ یعنی واقع ہو جائے گی۔

اس نام پر ایک مستقل سورۃ بھی ہے سورۃ واقعہ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ٥ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ٥" یعنی جب وہ واقع ہونے والی چیز واقع ہو جائے گی اور اس کے واقع ہونے کی بات غلط نہیں ہے اس سورۃ میں بھی یہی مضمون ہے کہ پہاڑ چلا دیے جائیں گے، ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور آسمان کا یہ حال نہیں رہے گا جو اب نظر آتا ہے۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ اور آسمان پھٹ جائے گا۔ سارا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا۔ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ آسمان اُس دن بڑا بکھرنے والا ہوگا۔ واھیۃ کا معنی کمزور۔ آج تو آسمان مضبوط چھت کی صورت میں نظر آتا ہے، اس کے اندر بڑے بڑے کرّے نظر آتے ہیں، مگر جس دن یہ واقعہ پیش آئے گا، اُس دن کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا اور فرشتے اس کے اطراف پر ہوں گے۔ فرشتوں پر بھی دہشت طاری ہوگی۔ کیونکہ ساری کائنات پر دہشت طاری ہوگی۔ جیسا کہ سورۃ انبیاء اور دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، کہ ہر طرف ایک مدہوشی طاری ہوگی۔ اور فرشتے اس کے اطراف واکناف پر ہوں گے۔

حاملین عرش فرشتے

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ اور اٹھائیں گے تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اُس دن آٹھ۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت حاملین عرش فرشتے چار ہیں۔ جب قیامت واقع ہوگی تو اُس وقت اُن کی تعداد آٹھ ہو جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ بات انسان کی تفہیم اور اُس کے ذہن کو قریب کرنے کے لیے بیان کی ہے۔ کیونکہ عرش کا نظام بھی ایسا ہی ہے جیسے نظام حکومت ہوتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے۔ کہ قیامت کے روز حاملین عرش آٹھ ہوں گے۔ باقی رہی فرشتوں کی کیفیت کہ وہ عرش

کو کس طرح اٹھائے ہوئے ہیں تو یہ باتیں انسانی عقل سے بالا ہیں۔ اِس پر ایمان ہی رکھنا چاہیئے۔ کہ جیسا بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، وہ صحیح ہے۔ مگر عقل انسانی سے بالا ہے۔ کہ انسانی فہم میں یہ کیفیت نہیں آ سکتی۔ باقی رہی یہ بات کہ فرشتوں کو عرش کو اٹھانے کی کیا ضرورت ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے وہ جس طرح چاہے کرے۔ اتنی بات محض سمجھانے کے لیئے کی ہے۔

فرشتوں کے متعلق بہت سی باتیں حدیث شریف میں آتی ہیں۔ یہ بڑی طاقت والے فرشتے ہیں۔ ابوداؤد شریف ابن ابی حاتم اور دوسری روایات میں ان فرشتوں کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے جسم کی کلائی ایسی ہے کہ کان کی لَو سے کندھے تک سات سو سال کی مسافت ہے، اتنی بڑی کلائی ہے۔ ان فرشتوں کی اتنی بڑی بڑی جسامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں ارض وسماء کی کوئی حیثیت نہیں قرآن پاک میں عرش الٰہی کو عرش عظیم کہا گیا ہے یعنی بہت بڑا عرش۔

فرمایا آج اس کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں، اُس دِن آٹھ ہو جائیں گے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کی وجہ یوں بیان کی ہے۔ کہ جب قیامت واقع ہوگی تو اُس دن خدا تعالےٰ کی قہری تجلی نازل ہوگی جس کی وجہ سے عرش الٰہی کا ثقل بہت بڑھ جائے گا۔ اُس دن کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور پھر محاسبے کی منزل آئے گی تو خدا تعالیٰ کی قہری تجلی پڑ رہی ہوگی۔ اس لیئے کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہے گی، سخت گھبراہٹ ہوگی۔ عرش کا ثقل بڑھ جائے گا۔ لہٰذا اُس دن اِسے اُٹھانے کے لیے آٹھ فرشتے مقرر ہوں گے۔

حضرت حسن بصریؒ کی روایت میں یوں آتا ہے کہ لَا اَدْرِیْ یعنی میں نہیں جانتا کہ آٹھ اشخاص مراد ہیں یا آٹھ صفیں یا آٹھ ہزار فرشتے۔ بہرحال اتنی بات واضح ہے کہ آج چار ہیں اُس دن آٹھ ہو جائیں گے۔

نظام کائنات کیلیئے اللہ کی آٹھ صفات

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ نظام کائنات کو چلانے کے لیے آج اللہ تعالیٰ کی چار صفات یعنی علم، قدرت، ارادہ اور حکمت کام کر رہی ہیں۔ قیامت کو چار مزید صفات کا ظہور ہوگا، اُن میں ایک صفت انکشاف ہے۔ آج جو چیزیں مخفی ہیں، اُس دِن کھل جائیں گی۔ ہر چیز ظاہر ہوگی یہ صفت انکشاف کا فیضان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت سبوغ وکمال کا ظہور ہوگا۔ اُس دن ہر چیز مکمل شکل میں ظاہر ہوگی۔ تیسری صفت طہارت اور تقدیس کام کرے گی۔ وہاں پر نجاست اور گندگی

نہیں ہوگی۔ نجاست صرف سزا کے طور پر دوزخیوں کو دی جائے گی جیسے پیپ، خون وغیرہ علم طور پر وہاں تقدیس کا ظہور ہوگا۔ اللہ تعالے کی چوتھی صفت عدل کا ظہور ہوگا۔ اور اس طرح گویا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی آٹھ صفات کا ظہور ہوگا۔

اسی لیے فرمایا کہ اُس دن ہر فرشتہ ایک صفت کے ساتھ اپنا فریضہ سرانجام دے گا۔ لیکن مفسّرین فرماتے ہیں۔ کہ چونکہ ایسی باتیں انسانی عقل میں نہیں آسکتیں لہٰذا ان پر صرف ایمان ہی رکھنا چاہیئے۔ اور ان کو متشابہات میں شمار کرنا چاہیئے۔

عرشِ الٰہی پر تجلی اعظم

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ساتوں زمین اور ساتوں آسمان طے کرنے کے بعد بہشت آتا ہے۔ اور بہشت کے بھی آٹھ طبقات ہیں۔ سب سے اوپر کا طبقہ جنت الفردوس ہے۔ نچلے طبقے سے لے کر بالائی طبقے تک پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش الٰہی ہے۔ عرش الٰہی بھی مخلوق ہے اللہ تعالے کی پیدا کردہ ہے۔ خدا کی ذات سب سے وراء الوریٰ ہے۔ اس عرش پر اللہ تعالیٰ کی جو تجلی پڑتی ہے، اس کو شاہ ولی اللہؒ تجلی اعظم کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ پڑتی ہے تو پہلے عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر ساری کائنات رنگین ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے نتائج پلٹ کر جاتے ہیں یہ تجلی کب سے پڑ رہی ہے اور کب تک پڑتی رہے گی، یہ انسانی عقل و فکر سے باہر ہے۔ جب انسان بہشت کے مقامات عالیہ میں پہنچیں گے تو سمجھ میں آئے گا۔ اس وقت انسانی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ حکومت کی بات ہے۔ اُس کے نظامِ حکومت کا ظہور اس طریقے سے ہوگا۔

مخلوق کی پیشی خالق کے روبرو

دنیا میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے حاقے ذکر کر کے بتلایا کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کرتے تھے مگر دیکھو ان پر کیسے حاقے پڑے۔ اور جب بڑا حاقہ واقع ہوگا یعنی قیامت برپا ہوگی تو پھر کیا ہوگا۔
يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ اُس دن تم پیش کیے جاؤ گے۔ جس طرح عدالت میں پیشی ہوتی ہے گواہ لائے جائیں گے، باز پرس ہوگی۔ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ تم میں سے کوئی نفس چھپے گا نہیں۔ دنیا میں تو کئی لوگ چھپ جاتے ہیں۔ عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔ حکومت ان کو تلاش کرتے ہوئے عاجز آجاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہاں کوئی نہیں چھپ سکیگا۔ یا خَافِيَة سے مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی بات اور کوئی خصلت چھپ نہیں سکے گی۔ دنیا میں تو ہزاروں کروڑوں باتیں چھپی رہتی ہیں مگر وہاں کوئی بات، کوئی خصلت چھپی نہیں رہیگی۔ سب ظاہر ہو جائینگی۔

یہ جو فرمایا کہ اُس دن پیشی ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اُس دن تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیاں ایسی ہوں گی فجدال و معاذیر یعنی کہ سوال و جواب اور جھگڑا وغیرہ ہوگا۔ جب تیسری پیشی ہوگی تو اعمالنامے اڑنے شروع ہو جائیں گے۔ فرمایا تیسری پیشی پر کسی کو دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا اور کسی کو بائیں ہاتھ میں۔

دائیں ہاتھ والے

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ جس کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا، فَیَقُوْلُ وہ کہتا پھرے گا ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ ۝ لو بھئی! میرا اعمالنامہ پڑھ لو، بڑا خوش ہوگا ھَآؤُمُ کے معنی خُذْ یعنی لے لو۔ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ۔ میرا اعمالنامہ پڑھ لو۔ مجھے اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں ملا ہے کامیاب ہو گیا ہوں۔

جنت کا پاسپورٹ

بعض دوسری احادیث میں آتا ہے۔ کہ دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ کیا ملے گا گویا جواز یعنی پاسپورٹ یا ویزا مل گیا۔ جس کے بغیر دوسری جگہ نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بہشت کا ویزا ہوگا خدا کی جانب سے فلاں بن فلاں کے لیے فرمایا کہ دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ وصول کرنے والوں کو جنت میں داخل کر دو وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ وہ مارے خوشی کے لوگوں کو اعمالنامہ دکھاتا پھرے گا اور کہے گا اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۝ میں تو یقین رکھتا تھا کہ ایک نہ ایک دن حساب کا آنے والا ہے اور باز پرس ضرور ہوگی۔

جنت کی نعم

تو دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ وصول کرنے والا آدمی فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝ بڑی پسندیدہ زندگی پائے گا۔ من مانی گزران کرے گا۔ وہ جس قسم کی خواہش کرے گا، وہاں اُس کو زندگی کے ویسے ہی لوازمات نصیب ہوں گے۔ رَاضِیَةٍ کے معنی بہت پسندیدہ زندگی کے اندر ہوگا۔ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۝ بڑے اونچے باغات میں ہوگا۔ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ اُن کے پھل قریب ہوں گے۔ درختوں کے اوپر چڑھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نہ سیڑھیاں لگانی پڑیں گی، نہ کمر سے رسہ باندھنے کی ضرورت ہوگی جیسے کھجوریں اتارنے کے لیے باندھنا پڑتا ہے بلکہ جب خواہش ہوگی مطلوبہ پھل خود بخود جھک کر منہ کے قریب آجائے گا تاکہ وہ اس کو آسانی سے لے لے۔ اس کے بعد اپنی جگہ واپس چلا جائے گا۔

جنت میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی

جنتیوں سے کہا جائے گا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا خوش گواری سے کھاؤ پیو۔ جتنا جی چاہے

کھاؤ، یہاں نہ بدہضمی ہوگی، نہ مروڑ لگیں گے۔ نہ کوئی پیٹ میں فضلہ پیدا ہوگا۔ غرض پیٹ والے جو چیز بھی کھائیں گے ایک خوشبودار ڈکار کے ساتھ سب کچھ ہضم ہوجائے گا۔ لَا یَبُوْلُوْنَ انہیں بول و براز کی حاجت بھی نہیں ہوگی۔ وہ پاک جگہ ہوگی، وہاں کوئی گندگی نہیں ہوگی نہ رینٹ ہوگا، نہ بلغم والی تھوک ہوگی نہ کوئی پیٹ میں تکلیف پیدا ہوگی۔ بلکہ ایک خوشبودار جشار یعنی ڈکار کے ساتھ ہر چیز ہضم ہوجائے گی۔

جزائے عمل

اور یہ ساری نعمتیں اس وجہ سے ہیں بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ جو تم نے بھیجا، گذرے ہوتے یا فراغت دنوں میں۔ یعنی مناس عقیدہ درست کیا انیک اعمال کئے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے۔ جو تم نے دنیا میں اختیار کئے اور اپنے لیے ذخیرہ آخرت آگے بھیجا۔ یہ سلوک تمہارے ساتھ اس وجہ سے کیا جارہا ہے:۔

درس سوم ۳

آیت ۲۵تا ۳۷

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ ﴿۲۶﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰى عَنِّیْ مَالِيَهْ ۚ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۙ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۭ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۭ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۧ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: اور بہر حال وہ انسان جس کو اس کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا کاش کہ میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا ﴿۲۵﴾ اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے ﴿۲۶﴾ کاش کہ یہ موت مجھے ختم ہی کر دیتی ﴿۲۷﴾ افسوس کہ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ﴿۲۸﴾ افسوس کہ آج میرا اقتدار بھی برباد ہو گیا ﴿۲۹﴾ (فرمائے گا) اس کو پکڑ لو اور اس کے گلے میں طوق ڈال دو ﴿۳۰﴾ پھر اسے جہنم کی آگ میں ڈال دو ﴿۳۱﴾ پھر اس کو ایسی زنجیر میں جسکی لمبائی ستر گز ہے جکڑ دو ﴿۳۲﴾ تحقیق وہ عظمتوں والے خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا ﴿۳۳﴾ اور مسکین کے کھانا کھلانے پر برانگیختہ بھی نہیں کرتا تھا ﴿۳۴﴾ پس آج اس کا یہاں کوئی دوست نہیں ﴿۳۵﴾ اور آج اسے غسلین (زخموں کے دھون) کے سوا کھانا بھی کوئی نہیں ملے گا ﴿۳۶﴾ اس کو صرف خطا کار ہی کھائیں گے ﴿۳۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ

قیامت واقع ہونے پر انسانوں کے دو گروہ ہو جائیں گے۔ پہلی آیتوں میں صور پھونکنے کا ذکر ہوا۔ نظام جہان کے درہم برہم ہو جانے اور زمین و آسمان کے تغیر و تبدل کا بیان ہوا۔ اس روز عرش الٰہی اور ملائکہ کی کیفیت کا حال بھی ذکر کیا گیا پچھلے درس میں اس گروہ کا ذکر ہوا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ جس کو اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ بڑا خوش ہو گا۔ اپنا اعمالنامہ لوگوں کو

دکھاتا پھرے گا۔ اِس گروہ کو ملنے والے انعام واکرام کا ذکر بھی پچھلے درس میں ہو چکا ہے۔

بائیں ہاتھ والے

اب ناکام ہونے والے گروہ کا بیان ہوتا ہے۔ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ بہرحال وہ انسان جس کو اُس کا اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ وہ کہے گا کاش کہ یہ اعمالنامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا۔ یہ اصحاب شمال ہیں۔ جیساکہ سورۃ واقعہ میں گذر چکا ہے "اَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ" اُس دن لوگوں کا بہت بُرا حال ہوگا۔ یہ اصحاب شمال ہیں۔ جن کا اعمال نامہ قیامت والے دن بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور سورۃ انشقاق میں "وَرَآءَ ظَهْرِهٖ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ایسے لوگوں کا اعمالنامہ پیچھے سے دیا جائے گا۔ یعنی سامنے نہیں دیا جائے گا۔ ان لوگوں کو نہایت ذلت کے ساتھ پیچھے کی طرف سے بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائے گا۔

دایاں ہاتھ برکت اور قوت والا ہوتا ہے جب کہ بایاں ہاتھ دائیں کی نسبت کمزور ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ عزت والے کام دائیں ہاتھ سے کرنے چاہئیں۔ کسی کو کوئی چیز دینا ہو، مصافحہ کرنا ہو، دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیئے۔ حقارت کے کام، گندگی صاف کرنا، استنجا پاک کرنا وغیرہ بائیں ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔

الغرض جس کا اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اعمال اس قدر کمزور ہیں کہ وہ خدا کے عذاب کو روک نہیں سکتے۔ لہٰذا یہ شخص عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اگر اس کے اعمال میں قوت ہوتی تو اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں ملتا۔ اور اس کے اعمال غضب الٰہی کو روک سکتے۔

اظہار افسوس

لہٰذا بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والا شخص افسوس اور حسرت کا اظہار کرے گا اور کہے گا یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ کاش! کیا اچھا ہوتا یہ اعمال نامہ مجھے ملتا ہی نہ۔ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۝ میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ مجھے علم ہی نہ ہوتا۔ یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ افسوس کہ یہ قیامت یا موت مجھے ختم ہی کر دیتی۔ میرا وجود ہی باقی نہ رہتا دوبارہ زندگی حاصل نہ ہوتی۔ سورۃ النبا میں ہے۔ "وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا" کاش میں مٹی ہوتا، بے جان ہوتا، عقل و شعور سے خالی ہوتا تو آج اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔ مگر اس کا اظہار افسوس کچھ کام نہیں آئے گا۔

مال کچھ کام نہیں آئیگا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن باتوں کا ذکر فرمایا جن کی وجہ سے لوگ غرور کرتے تھے اتراتے تھے۔ اور جن کی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَآ اَغۡنٰى عَنِّیۡ مَالِیَہۡ بائیں ہاتھ والے لوگ کف افسوس ملتے ہوئے کہیں گے کہ افسوس میرا مال آج میرے کچھ کام نہ آیا۔ وہ مال جسے دنیا میں سمیٹ سمیٹ کر رکھتے تھے اور اسے من مانے طریقے سے خرچ کرتے تھے، آج وہ ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔ گذشتہ سورۃ میں گذر چکا ہے۔ کہ وہ لوگ اس بات پر غرور کرتے تھے کہ اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ کہ اللہ نے انہیں مال اور اولاد دی ہے۔ حالانکہ آخرت میں یہ چیزیں کسی کام نہ آئیں گی۔ اسی طرح سورۃ ہُمَزَہ میں آتا ہے کہ دنیا میں مال جمع کرنے والا یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ سمجھتا تھا کہ میں ہمیشہ خوشحال رہوں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے عام طور پر انسان اسی مال کی وجہ سے مفتون ہوتا ہے۔ اور آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔

سورۃ والعٰدیٰت میں ہے " وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ " انسان مال کی محبت میں پکا بھی ہے۔ فطرت انسانی ہے کہ عام طور پر مال سے بڑی محبت ہوتی ہے اسی لیے شرائع الٰہیہ یعنی آسمانی شریعتیں لوگوں کو تہذیب سکھاتی ہیں۔ مال کی محبت بے شک فطری ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس میں مبتلا ہو کر انسان فرائض کو ترک کر بیٹھے۔ ایسی صورت میں یہی مال وبال بن جائے گا۔ اگر مال کو ہی معبود بنا لیا، حلال و حرام کی تمیز چھوڑ دی تو یہی مال فتنہ بن جائے گا۔ چنانچہ اس جگہ یہی بات بیان ہو رہی ہے۔ کہ بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والا آدمی کہے گا مَآ اَغۡنٰى عَنِّیۡ مَالِیَہۡ افسوس! میرے مال نے مجھے کچھ کام نہ دیا۔

ابولہب کا واقعہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ " مَآ اَغۡنٰى عَنۡہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ " ابولہب بڑا دولت مند آدمی تھا مگر جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئی تو اس کے مال نے اور جو کچھ اُس نے کمایا تھا، کچھ بھی کام نہ آیا۔

اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ آخرت میں جب دنیا کے دولت مند دیکھیں گے کہ غرباء و مساکین کو بڑے درجے اور فلاح نصیب ہو رہی ہے۔ تو تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں، ہم ایسی تکالیف وہاں برداشت کر لیتے اور اس کے بدلے آج ہمیں راحت نصیب ہوتی، درجہ ملتا، مگر اس وقت ان کا کفِ افسوس ملنا کسی کام نہ آئے گا۔

اقتدار بھی جاتا رہے گا

مال کے بعد اقتدار ایسی چیز ہے۔ جس پر انسان اتراتا ہے۔ جس کے پاس حکومت ہوتی ہے وہ ہمیشہ غرور کرتا ہے۔ ایسا انسان شاذ و نادر ہی ہوگا جو اقتدار پر فائز ہونے کے باوجود جامۂ انسانیت میں رہے۔ انصاف قائم کرے۔ مخلوق خدا پر ظلم نہ کرے، لوگوں کا استحصال نہ کرے۔ مگر قیامت کے روز یہ چیز بھی اس کے کام نہ آئے گی اور وہ کہے گا هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ افسوس کہ آج میرا اقتدار بھی برباد ہوگیا۔ حکومت بھی چھن گئی۔ آج نہ کوئی نوکر چاکر ہے، نہ فوج ہے، نہ پولیس ہے، نہ سیکورٹی والے ہیں، جو میرے کام آئیں۔ مگر وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ انسان بے یار و مددگار ہوگا۔ بلکہ یہی چیزیں اس کے لیے مہلک ثابت ہوں گی۔

امت محمدیہ کا فتنہ مال ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةٌ ہر امت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ اور میری امت کا فتنہ مال ہے فرمایا مجھے اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ تم فقر میں ہلاک ہو جاؤ گے۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم پر دنیا پھیلا دی جائے گی اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ پھر تم کو وہ اس طرح ہلاک کردے گی جسطرح پہلے لوگوں کو کیا۔ دنیا میں غرور و تکبر کیا۔ برائیوں میں پڑ گئے اور تباہ ہوئے۔ دنیا کا پھیلاؤ ہی سب کو تباہ کردے گا۔ اور ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ میری امت کا فتنہ مال ہے۔

مخصوص اخلاق حیا ہے

نبی علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہر امت کا کوئی مخصوص اخلاق ہوتا ہے۔ اور میری امت کا مخصوص اخلاق حیا ہے۔ جب تک امت میں حیا باقی رہے گی ٹھیک رہیں گے۔ جب حیا اٹھ جائے گی تو ناکام و نامراد ہوں گے، برباد ہو جائینگے۔

مال وجاہ کا غلط استعمال

تو فرمایا کہ مال اور اقتدار یہ دو چیزیں ہیں جن میں مبتلا ہو کر اکثر و بیشتر لوگ ناکام ہوتے ہیں کیونکہ ان دونوں چیزوں کو غلط استعمال کرتے ہیں۔ قیامت کے روز اُن کے پاس نہ مال ہوگا نہ اقتدار ہوگا بلکہ وہاں تو قلاش ہونگے۔ اور جیسا کہ آگے آخری آیت میں آرہا ہے، اس وقت انسان اسکا افسوس کریگا۔

مجرمین کا جہنم رسید ہونا

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ اس کو پکڑ لو اور اس کے گلے میں طوق ڈال دو۔ یہ مجرم ہے۔ جیسا کہ سورۃ یٰس میں آتا ہے فِيْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا اُن کے گلے میں طوق ہوں گے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ حکم ہوگا کہ طوق پہنا کر ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ اسے جہنم کی آگ میں ڈال دو۔ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ پھر ان کو زنجیروں میں جکڑ دو ان زنجیروں میں

ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فَاسْلُكُوْهُ یعنی لمبائی ستر ستر گز ہے ان میں جکڑ کر جہنم میں پھینک دو۔ بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ وصول کرنے والا شخص آج اسی سزا کا مستحق ہے۔ اسے زنجیروں میں جکڑ کر اور گلے میں طوق ڈال کر جہنم رسید کر دو۔

خدائے عظیم کا انکار

ایسے لوگوں کی جہنم رسیدگی کی دو وجوہات اللہ تعالٰی نے بیان فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وہ عظمتوں والے خدا پہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔ جب اللہ کے نبی کہتے تھے قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا یعنی اللہ پر ایمان لے آؤ، فلاح پا جاؤ گے، تو یہ اکڑتا تھا۔ خدا کی توحید کو نہیں مانتا تھا۔ بلکہ کہتا تھا کہ باپ دادا کے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو مان لیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الٹا اکڑتا تھا۔ کہتا تھا العیاذ باللہ اس بیوقوف آدمی کی بات کو کیسے مان لوں، "اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ" یہ تو پاگل ہے، دیوانہ ہے۔ اسے اس جرم کی پاداش میں جہنم رسید کیا جا رہا ہے۔ کہ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ کہ وہ خدائے برتر پہ ایمان نہیں لاتا تھا۔

اطعام مسکین سے اعراض

اس کا دوسرا جرم یہ ہے کہ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ مسکین کو کھانا کھلانے پہ برانگیختہ بھی نہیں کرتا تھا۔ نہ خود مساکین کو کھانا کھلاتا تھا، نہ دوسروں کو ہی ترغیب دیتا تھا۔ اللہ تعالٰی نے ان دو جرائم کا ذکر کیا جن کی پاداش میں اس کو ذلت و رسوائی کے ساتھ دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے

دین کا خلاصہ

امام رازیؒ جو چھٹی صدی کے آخر میں اور ساتویں صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔ آپ کا انتقال ۶۰۶ھ میں ہوا۔ آپ بڑے امام تھے۔ انہوں نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ کہ دین کا خلاصہ اور نچوڑ دو چیزیں ہیں اگر کوئی شخص دین کو سمجھنا چاہے تو اس کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفْقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے احکام کی تعظیم اور مخلوق خدا پہ شفقت۔ ان دو چیزوں کو پھیلایا جائے تو دین کے سارے قوانین انہیں میں آ جائیں گے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

عام متکلمین کے انداز میں اس کو یوں بیان کریں گے کہ دین نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ یا اللہ کے حقوق ہیں یا مخلوق کے، تیسری چیز کوئی نہیں۔ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ حقوق اللہ ہیں۔ جو شخص اللہ کے حقوق نہیں مانتا وہ دہریہ ہے یا کافر۔ لہٰذا ناکام ہوتا ہے۔ اور جو شخص مخلوق کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ مخلوق پر شفقت نہیں کرتا، وہ بھی ناکام اور مردود ہے۔ الغرض ان دو قوانین کو پھیلائیں گے تو ہر چیز اس میں آ جائے گی۔ ان سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ دین اسی

کا نام ہے۔

تو مطلب یہ ہے۔ کہ یہ شخص نہ تو اللہ کا حق ادا کرتا تھا، نہ مخلوق کا حق اور عنوان یہ ہے لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ خدائے عظیم کی توحید کو نہیں مانتا تھا۔ اور مسکین کے کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ خود کھلانا تو کجا، دوسرے کو بھی آمادہ نہیں کرتا تھا۔ اس میں یہ ادنےٰ درجے کی نیکی بھی نہیں تھی۔ جیسا کہ سورۃ دہر میں ہے وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنی خوشی سے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

باعزت روٹی انسان کا بنیادی حق ہے

مسکین کو روٹی کھلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھیک مانگنے والوں کو دے کر بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ محتاج کی روزی کا مستقل بندوبست کیا جائے۔ اس کے لیے باعزت روزگار مہیا کر کے باعزت روٹی کا انتظام کیا جائے۔ آج کی دنیا میں بھی اَلْخُبْزُ بِالْکَرَامَۃِ کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ ہر شخص کو باعزت روٹی ملنی چاہیے۔

در بدر بھیک مانگنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ صرف ہمارے ممالک کا ہی رواج ہے اور یہ ذلت ہمارے ہی مقدر میں ہے۔ ورنہ عیسائی ممالک میں کوئی بھیک نہیں مانگتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دین سے دور ہو گئے ہیں، مذہب سے بیگانہ ہو گئے۔ جہالت، تاریکی، شرک، بدعت وغیرہ تمام قباحتیں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔

حلبیؒ نے سیرت میں لکھا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں آدھی دنیا سے زیادہ پر مسلمانوں کی سلطنت تھی، جہاں جہاں مسلمان تھے کہیں ایک جگہ بھی کوئی قحبہ خانہ نہیں تھا۔ انگریز کے زمانہ میں لائسنس لے کر برائی کرنے والی پچھتر فی صد عورتیں مسلمان تھیں۔ یہی حال مصر، ایران اور ہندوستان میں تھا۔ مسلمانوں پر اس قدر ذلت مسلط ہو گئی تھی۔

گداگری حرام ہے

شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ ہمارے دین میں گداگری حرام ہے۔ یہ اسی طرح اکساب ضارہ میں شمار ہوتی ہے جیسے چوری، ڈاکہ، زنا وغیرہ۔ لیکن حکومتیں اس کا خاطر خواہ انتظام نہیں کرتیں، وہ اپنی عیاشی میں لگی ہوئی ہیں سکیمیں بن رہی ہیں، اعلان ہو رہے ہیں یہ ہو جائیگا، وہ ہو جائیگا اتنے کروڑ منظور ہوا مگر حال یہ ہے کہ لوگ بھیک مانگ رہے ہیں اور ان کی عیاشی چل رہی ہے۔ ٹی وی جیسی بری اور حرام چیزوں پر کیوں دولت خرچ کی جا رہی ہے۔ غیر ضروری چیزوں کی حکومت کیوں اجازت دے رہی ہے۔ عیاشی کے کاموں پر

اربوں روپیہ خرچ کرنیکی بجائے حکومت مساکین اور غربا پروری کا بندوبست کیوں نہیں کرتی مگر ہم جس نظام کا حصہ ہیں اس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ خود عیش کرو، دوسروں کی فکر نہ کرو۔ کوئی مرتا ہے مرنے دو۔ اسلام کا نام لیتے رہو، غریبوں اور مزدوروں کا نام لیتے رہو مگر ان کی خدمت کا کام مت کرو۔ محض نام لے کر زندگی گذارو۔

غربا کی دستگیری مسلمان سوسائٹی کا فریضہ ہے

الغرض لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ سے مراد یہ ہے کہ مسکین کو بھکاری نہ بناؤ۔ اُن کو باروزگار بناؤ۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلو۔ جو سوسائٹی اپنے غربا و مساکین کی دست گیری نہیں کرتی، وہ ذلیل سوسائٹی ہے۔ اللہ تعالےٰ کے ہاں باعزت نہیں ہے۔ صدقہ خیرات تو وقتی چیزیں ہیں ان سے وقتی طور پہ گذر اوقات ہو سکتی ہے۔ بھیک کا دروازہ نہیں کھل جانا چاہیئے۔ بھیک کی اجازت دینا انسانیت کی تذلیل ہے۔ اپنے غربا و مساکین کی مستقل بحالی کا بندوبست مسلمان سوسائٹی کا فریضہ ہے۔

دوزخی بے یارومددگار رہ جائیں گے

چونکہ بائیں ہاتھ والا شخص نہ حقوق اللہ ادا کرتا تھا، نہ حقوق العباد، اس لیے فرمایا کہ اسے ستر ستر گز لمبی زنجیروں میں جکڑ کر اور گلے میں طوق ڈال کر جہنم میں پھینک دو۔ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ آج اُس کا یہاں کوئی دوست نہیں ہے۔ دنیا میں اس کے بڑے دوست تھے جو برائی میں اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے، مگر آج وہ بے یار و مددگار ہے۔ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ۔ آج اُسے غسلین کے سوا کھانا بھی کوئی نہیں ملیگا۔ غسلین، زخموں کے دھوون یعنی پیپ اور خون ملے ہوئے زرد پانی کو کہتے ہیں۔ یہ اُسکی خوراک ہوگی۔

جب انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ یا غم میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک مخلص دوست جو دکھ درد میں اس کی غم خواری کرے، اس سے باتیں کرے اور دوسرا کھانا جو اسکی جسمانی قوت کی بحالی میں مدد دے۔ تو اس ضمن میں فرمایا کہ دوزخیوں کا نہ کوئی دوست ہوگا جو اُن سے ہمدردی کا اظہار کرے اُن کے دکھ درد میں شریک ہو، پیار و محبت کی بات کرے اور نہ انہیں کھانا ہی ایسا میسر ہوگا جو کمزوری کا مقابلہ کر سکے۔ سورۃ غاشیہ میں فرمایا "لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ" دوزخیوں کا کھانا نہ بھوک سے بچائے گا نہ جسم کو فائدہ دے گا۔

فرمایا اس قسم کا کھانا لَا يَأْكُلُهٗ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ صرف خطاکار ہی کھائیں گے۔ وہ خطاکار جو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے اعراض کرتے رہے، یہ کھانا ان کے لیے ہوگا۔ البتہ مومنوں

کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے اعزاز رکھے ہیں۔ ان کا ذکر پہلی آیات میں آچکا ہے۔ کہ ان کو حکم ہوگا۔
کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۝ تم ان اچھے کاموں کے بدلے میں
جو دنیا میں سرانجام دیتے رہے، خوب کھاؤ پیو، عیش و آرام کی زندگی بسر کرو۔

درسِ چہارم ۴ — آیت ۳۸ تا ۵۲

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۲ ۶

ترجمہ: پس قسم ہے مجھے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو ﴿۳۸﴾ اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے ﴿۳۹﴾ بیشک یہ قرآن پاک البتہ ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے ﴿۴۰﴾ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے بہت کم ہی تم ایمان لاتے ہو ﴿۴۱﴾ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، بہت ہی کم تم نصیحت پکڑتے ہو ﴿۴۲﴾ یہ تو پروردگارِ عالم کی طرف سے نازل کردہ ہے ﴿۴۳﴾ اور اگر یہ رسول ہمارے ذمہ کوئی بات جھوٹ بنا کر لائے ﴿۴۴﴾ تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے (قوت) سے پکڑتے ﴿۴۵﴾ پھر اس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے ﴿۴۶﴾ اور پھر تم میں سے کوئی بھی اس کو گرفت سے روکنے والا نہ ہوتا ﴿۴۷﴾ اور تحقیق یہ قرآن تو متقیوں کے لیے نصیحت ہے ﴿۴۸﴾ اور بیشک ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلانے والے بھی ہیں ﴿۴۹﴾ اور یہ (قرآن پاک) کافروں پر بڑے افسوس کا باعث ہوگا ﴿۵۰﴾ اور بیشک یہ قرآن پاک سراسر حق اور یقینی بات ہے ﴿۵۱﴾ پس آپ اپنے عظمتوں والے رب کے نام کی تسبیح بیان کریں ﴿۵۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ الحاقہ کے پہلے رکوع میں قیامت کا ذکر ہے۔ آخری آیتوں میں بنیادی عقائد کا بیان ہے منجملہ ان کے رسالت اور نبوت کا ذکر ہے۔ جس طرح کفار قیامت کا انکار کرتے تھے اسی طرح حضور علیہ السلام کی نبوت اور رسالت کے منکر تھے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی اس قسم کے واقعات

پیش آتے رہے ہیں جب کہ لوگ ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف پیغمبر کا انکار کرتے تھے، بلکہ وحی الٰہی اور اُس کے لانے والے فرشتے کا بھی انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ اپنے پاس سے باتیں گھڑ کر لایا ہے، خدا کا پیغام نہیں ہے۔ بعض شاعر اور کاہن کا خطاب دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ غیب کی خبریں بتاتے رہتے ہیں اور سچ کے ساتھ جھوٹ ملاتے ہیں۔ اپنی فیس لیتے ہیں مسجع عبارت بولتے ہیں۔ جنات کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں۔

پہلی سورۃ میں گزر چکا ہے۔ کہ بعض بدبخت لوگ حضور علیہ السلام کو مجنون کہہ کر رسالت کا انکار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نبوت اور رسالت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سورۃ کے پہلے رکوع میں قیامت اور سابقہ اقوام کا ذکر تھا۔ اُن سزاؤں کا اجمالی ذکر تھا جو اُن اقوام کو دی گئیں۔ پھر اس سے قیامت کے برحق ہونے کی دلیل قائم کی۔ جیسے ——— "اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" اس کے بعد انسانوں کے دو گروہوں یعنی اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کا ذکر ہوا۔ اصحاب شمال کو ملنے والی سزا کا بیان ہوا۔ اور اس کی بنیادی وجہ بیان کی کہ وہ لوگ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اور انسانی حقوق ضائع کرتے تھے۔

آیات زیر درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر ہے۔ قرآن پاک کا کلام الٰہی ہونا بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ قسم ہے اس چیز کی جو تم دیکھتے ہو۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ اور اُن چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔

لَا کی تفسیر مفسرین نے دو طریقوں سے کی ہے۔ اول یہ کہ لَا تاکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ "میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔ یا مثلاً فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ میں ستاروں کے ڈوبنے کی قسم کھاتا ہوں۔ ستارے ڈوبتے ہیں تو سورج نمایاں ہوتا ہے سابقہ انبیاء کی مثال ستاروں جیسی تھی اور خاتم النبیینؐ کو اللہ تعالیٰ نے سراجاً منیراً فرمایا۔ تو یہ لَا قسم کی تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ایک محاورہ بھی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ لَا نافیہ ہی ہے۔ کیونکہ مفہوم ایک ہی نکلتا ہے۔ فَلَآ اُقْسِمُ میں نہیں قسم کھاتا اُن چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔ قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بات بڑی واضح ہے۔ قسم اٹھانے کی تو وہاں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں کوئی بات

پوشیدہ ہو تو دوسرے کو یقین دلانا مقصود ہو۔ مگر قرآن پاک کا کلام الٰہی اور وحی الٰہی ہونا تو واضح ہے۔
حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم نبی برحق ہیں قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے
لانفی مراد ہے۔ مگر زیادہ تر اسے لا تاکیدی کے معنوں میں ہی لیا جاتا ہے۔

غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا شرک ہے

یہاں ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ نے غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھانے سے منع فرمایا ہے
جیسے مَنْ اَقْسَمَ بِغَیْرِ اللہِ فَقَدْ اَشْرَکَ جس نے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی قسم
کھائی، اُس نے شرک کیا۔ نیز یہ بھی ارشاد ہے لَا تُقْسِمُوْا بِاٰبَآءِ کُمْ وَلَا بِالطَّوَاغِیْتِ اپنے
باپوں اور طاغوت کے نام پر مت قسم اٹھاؤ۔ اگر قسم سے غیر اللہ کی تعظیم مراد ہے تو پھر واضح شرک
ہے۔ اور تعظیم مدنظر نہیں تو پھر بھی شرک کی صورت بنتی ہے۔ ہر حالت میں ناپسندیدہ ہے۔ قسم صرف
اللہ کے نام کی یا اُس کی صفت کی اٹھانی چاہیئے۔

اللہ تعالےٰ خود مخلوق کی قسم اٹھاتا ہے

اللہ تعالےٰ نے قرآن میں خود کئی چیزوں کی قسم اٹھائی ہے۔ جیسے "وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ" یا "اُقْسِمُ
بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ" یا فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ مفسرین کرام فرماتے ہیں
کہ غیر اللہ کی قسم نہ اٹھانے کا قانون صرف انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالےٰ بے نیاز ہے۔ اس کے
لیے یہ قانون نہیں ہے۔ انسان تو اللہ تعالیٰ کا نام یا اس کی صفت سامنے رکھ کر قسم اٹھاتا ہے اور
سمجھتا ہے کہ میں خدا کے نام کی تعظیم کر رہا ہوں اگر غلط بیانی کروں گا تو اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا
تو ایسی صورت میں دوسرے کو یقین آجاتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کے قسم اٹھانے کا یہ مطلب نہیں ہے
اللہ تو خود عظمت والا ہے۔ باقی جن چیزوں کی قسم اٹھائی گئی ہے، وہ تو مخلوق ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ کے
قسم اٹھانے میں قسم کا مفہوم نہیں پایا جاتا، بلکہ صرف ایک دلیل قائم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ
نے اس چیز کو بطور گواہ پیش کیا ہے اس پہ غور کر لو، بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس قسم سے مقسوم کی
تعظیم مراد نہیں ہوتی۔

حدیث شریف میں حضورؐ کی ایک دعا مذکور ہے۔ کہ اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں
کہ تو ملائکہ کو اور اپنی مخلوق کو ہماری اس بات پہ گواہ بنالے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ اَنَّکَ وَحْدَکَ
لَا شَرِیْکَ لَکَ تو اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مقدمات کے فیصلہ کے لیے بھی دو طریقے ہی ہیں۔ یا تو گواہ پیش

کیے جائیں یا قسم پر فیصلہ ہو۔ فرمایا قضی بیمین و شاہد۔ جہاں گواہ موجود نہ ہو وہاں فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مدعی کے ذمہ گواہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر گواہ نہیں ہیں تو مدعا علیہ قسم اٹھائے گا اور حاکم اس کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔

مبصرات اور غیر مبصرات

فرمایا فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ میں قسم اٹھاتا ہوں، اُن چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔ عالم شہادت میں زمین، آسمان، ستارے اور مخلوق نظر آنے والی چیزیں ہیں اور بعض چیزیں نظر نہیں آتیں مثلاً ملائکہ، جنات، جبرائیل۔ ایک دفعہ حضورؐ گھر میں تشریف فرما تھے، جبرائیل علیہ السلام آئے اور وحی لائے۔ آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف فرما تھے۔ آپ نے ان کو بتایا کہ عائشہؓ! جبریل علیہ السلام آئے ہیں اور تم کو سلام کہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے سلام کا جواب دیا وَعَلَیْہِ السَّلَامُ اور عرض کیا ترٰی مالا نریٰ کہ اے اللہ کے نبی آپ تو جبریل علیہ السلام کو دیکھ رہے ہیں مگر ہمیں وہ نظر نہیں آتا ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں پردہ غیب میں رکھا ہوا ہے۔

اسی طرح کعبہ نظر آتا ہے، بیت المعمور نہیں نظر آتا کہ وہ عالمِ بالا میں ہے۔ فرشتے بیت اللہ کے طواف کے لیے آتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ بیت اللہ شریف پر تجلی پڑ رہی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ ایسی ہی اور کتنی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ تو اس میں کفار کے لیے دلیل قائم کی جارہی ہے۔ کہ تم جبرائیل کا انکار کرتے ہو، وحی الٰہی کا انکار کرتے ہو، قرآن پاک کے منجانب اللہ ہونے کا انکار محض اس لیے کرتے ہو کہ یہ چیزیں تمہیں نظر نہیں آتیں حالانکہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کا تم بن دیکھے یقین کرتے ہو۔ بعض چیزیں تم دوسروں کی تقلید میں مانتے ہو، بعض دوسروں سے سن کر تسلیم کر لیتے ہو مگر جبریل کو، وحی الٰہی کو اور قرآن پاک کو تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہے انہیں بن دیکھے کیوں نہیں مانتے۔ اللہ کا نبی کہہ رہا ہے کہ جبریل آتے ہیں، اللہ کا پیغام لائے ہیں، مگر تم ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیا تم دنیا کی ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہی یقین کرتے ہو؟

بعض چیزیں انسانی عقل سے بالا ہیں، کئی چیزوں کو اللہ تعالےٰ نے پردۂ غیب میں رکھا ہے ایک وقت آئے گا، سب کو کھول دے گا۔ اس وقت سب چیزیں شہادت بن جائیں گی۔ اب پابند کیا گیا ہے۔ حکم ہوتا ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ غیب پر ایمان لاؤ فلاح پا جاؤ گے۔ اگر ایمان

نہیں لاؤ گے۔ نجات نہیں ہوگی۔ اسی لیے حضورؐ کی دعا کے الفاظ ہیں کہ اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں اَلْجَنَّۃُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ یعنی جنت اور دوزخ برحق ہیں۔ حالانکہ یہ نظر نہیں آتیں۔ اسی طرح جبریل کا آنا، وحی الٰہی کا نازل ہونا نظر نہیں آتا مگر برحق ہے۔ اس پر ایمان لانا ضروری ہے انہیں ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔

اسی طرح برزخ کا معاملہ ہے، قیامت کا معاملہ ہے، نظر نہیں آتا مگر انسان دوسروں سے سن کر یا ان کی تقلید میں ایمان لاتے ہیں۔ وہاں تو انکار نہیں کرتے۔ پھر یہاں انکار کی کیا وجہ ہے جب پیغمبر کو دیکھتے ہو تو اس کے پاس وحی لانے والے کو بھی مان لو۔

کلام الٰہی از زبانِ رسول

الغرض یہ تمام چیزیں بیان کرکے فرمایا کہ میں قسم اٹھاتا ہوں محسوسات کی اور غیر محسوسات کی، مبصرات کی اور غیر مبصرات کی یعنی ان سب چیزوں کو بطور گواہ اور بطور دلیل پیش کرتا ہوں کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ البتہ قرآن پاک ایک پیغام ہے بزرگ رسول کی زبان سے ادا کیا ہوا۔ لَقَوْل کے معنی اس کی زبان سے ادا کیا ہوا۔ اس کا ذاتی قول نہیں ہے۔ وہ رسول ہے، عزت والا ہے۔ قرآن پاک کو لانے والا فرشتہ بھی عزت والا ہے۔ دونوں کو کریم کے لفظ سے تعبیر کیا۔ یعنی رسول جسے دیکھتے ہو وہ بھی عزت والا ہے اور فرشتہ جو نظر نہیں آتا، وہ بھی عزت والا ہے بڑی شرافت والا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَا اَذِنَ اللّٰہُ لِشَیْءٍ اللہ تعالےٰ اتنی مہربانی اور شفقت سے توجہ نہیں فرماتا جتنا اس چیز پہ جو نبی کی زبان سے نکلتی ہے مَاخَرَجَ مِنْہُ۔ اللہ تعالیٰ اس کو بڑی مہربانی سے سنتا ہے۔ وہ کلام الٰہی ہے۔ نبی کا کلام نہیں مگر نبی کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔

قرآن پاک شاعر کا کلام نہیں

کفار کہتے تھے۔ کہ یہ کلام الٰہی نہیں بلکہ کسی شاعر کا کلام ہے، محض تک بندی ہے حالانکہ قرآن پاک کا شعر نہ ہونا ایک واضح بات ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ شعر و شاعری کا مدار تو تخیلات پہ ہوتا ہے۔ کسی کی مدح کر دی، کسی کی قدح کر دی۔ سورۃ شعراء میں ارشاد ربانی ہے۔ "وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ" شاعروں کے پیچھے چلنے والے گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ شعر جتنا جھوٹا ہوگا اتنا ہی زیادہ لذیذ ہوگا اور زیادہ داد وصول کریگا برخلاف اس کے قرآن پاک تو حقائق پہ مبنی ہے۔ اس کے سارے حقائق برحق ہیں۔ اس بات کو

تو سمجھدار عرب بھی جانتے تھے کہ قرآن پاک کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے سلسلے میں جو روایات آتی ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے جیسے آپ خود بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میں حضور علیہ السلام کو ایذا پہنچانے میں پیش پیش ہوا کرتا تھا بلکہ بسا اوقات آپ کو قتل کرنے کے درپے رہتا تھا۔ میں اپنے خیالات میں مگن خانہ کعبہ میں آیا اور دیکھا کہ حضورؐ پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ اور قرآن پاک پڑھ رہے ہیں۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ آپ شاعر ہیں مگر اُسی وقت آپ کی زبان مبارک سے یہ آیت پاک نکلی وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ حضرت عمرؓ کہتے ہیں۔ کہ میں سوچنے لگ گیا۔ کہ یہاں شاعری کی تو نفی کر دی گئی ہے۔

قرآن پاک کاہن کا کلام نہیں

فرماتے ہیں کہ اگر آپ شاعر نہیں ہیں تو کاہن ضرور ہیں۔ یہ خیال آ رہا تھا۔ تو آپ نے اگلی آیت تلاوت کر دی وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں پھر متذبذب ہو گیا کہ آپ نے تو کاہن ہونے کی بھی نفی کر دی۔ اتنی دیر میں حضورؐ سورۃ کو آخر تک پڑھ گئے۔ تو میرے دل میں قرآن پاک کی وقعت پیدا ہو گئی۔ یہ نہ تو شاعری ہے اور نہ کہانت۔ بلکہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ یہ تو رسول کریم کی زبان سے ادا کیا ہوا۔ اللہ تعالے کا کلام ہے۔

قرآن پاک اللہ تعالے کا نازل کردہ ہے

سورۃ قلم میں بیان ہوا۔ کہ قرآن پاک کسی مجنون کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسا کلام ہے جس کو قلم سے لکھنے والے لوگ عاجز ہیں۔ کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ فرمایا کہ آپ کو پاگل کہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ آپ تو بلند ترین اخلاق پہ ہیں۔ جس سے بلند اور کوئی اخلاق نہیں ہے۔ آپ تو عظمت والے ہیں۔

اسی طرح اس سورۃ میں ذکر ہوا کہ یہ شاعر کا کلام بھی نہیں شاعر تو معمولی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں، اُن کا دار و مدار تخیلاتی باتوں پہ ہوتا ہے۔ آپ کاہن بھی نہیں کہ کاہنوں کا اخلاق وہ نہیں ہوتا جو پیغمبر کا ہوتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ یہ تو رب العلمین کی طرف سے نازل کردہ وحی الٰہی ہے۔ خدا تعالےٰ کا کلام ہے اس کو لاتے والا بزرگ فرشتہ ہے جس ہستی کی زبان سے ادا کیا جا رہا ہے۔ وہ رسول کریم ہے اور بڑی عزت والا ہے۔

قرآن پاک کی مثل لانے کے لئے چیلنج

کفار کہتے تھے۔ کہ قرآن پاک اللہ کا کلام نہیں۔ بلکہ خود ساختہ ہے أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ

اس مضمون کو قرآن پاک نے کئی ایک طریقوں سے بیان کیا ہے۔ تاہم اللہ تعالےٰ نے چیلنج کیا کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ کلام من گھڑت ہے۔ "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" تم بھی اس جیسی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ جس میں قرآن پاک جیسے حقائق، علوم، فصاحت اور بلاغت ہو۔ یہ چیلنج چودہ صدیوں سے قائم ہے مگر آج تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا، جو اس چیلنج کو قبول کرے اور قرآن جیسی ایک آیت ہی بنا کر لائے۔

البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ جس کسی نے بھی اس معاملہ میں جرأت کی، اس نے منہ کی کھائی۔ مثلاً جب مسیلمہ کذاب نے کوشش کی تو حضرت عمرو بن العاصؓ جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، کہنے لگے کہ تم پر لعنت ہو کہ تم وَالْعَصْرِ کے مقابلے میں ایسا اُول فُول کلام پیش کرتے ہو۔ حالانکہ خود تیرا دل گواہی دیتا ہو گا۔ کہ تو جھوٹا ہے۔ غرضیکہ مخالفین اس بات کو خوب جانتے تھے۔ کہ وہ قرآن پاک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جس نے بھی کوشش کی، وہ جھوٹا ثابت ہوا۔

رسول خود کلام بنا کر اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی غیر تو کجا خود رسول بھی اپنی طرف سے کوئی کلام بنا کر اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ یعنی اگر رسول ایسا کرے۔ کوئی جھوٹ موٹ بنا کر لائے تو پھر سب سے پہلے خود اللہ تعالےٰ اُس کا محاسبہ کرے گا لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ہم اُسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیں گے۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ اور اس کی رگ گردن کاٹ دیں گے۔ وتین اُس رگ کو کہتے ہیں جو دل سے اوپر کی طرف آتی ہے۔ اور ایسی صورت میں فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ اور تم میں سے کوئی بھی روکنے والا نہیں ہو گا۔ اس قسم کا مضمون تورات میں بھی موجود ہے کہ کوئی سچا نبی خدا کی طرف غلط بات منسوب کرے گا۔ تو خدا اس کو ہلاک کر دے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ہاں البتہ جھوٹے نبیوں کے متعلق یہ بات نہیں ہے۔ اُن کو تو مہلت ملتی رہتی ہے۔ جیسے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی اور مرزا قادیانی وغیرہ۔ وہ اول فول باتیں کرتے رہتے ہیں۔ خود بنا کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر ذلیل ہوتے ہیں یا مارے جاتے ہیں۔ سچا نبی اللہ تعالےٰ کی طرف غلط بات منسوب نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا تو فرمایا ہم اس کا محاسبہ کریں گے اور تم میں سے کوئی بھی اُسے روکنے والا نہیں ہو گا۔

قرآن پاک متقین کے لیے نصیحت ہے

یہ قرآن پاک کیا ہے فرمایا وَاِنَّہٗ لَتَذْکِرَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ یہ تو متقیوں کے لیے تذکرہ اور نصیحت ہے۔ جیسے پہلی آیت میں فرمایا "تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یعنی قرآن پاک تو رب العلمین کا نازل کردہ ہے۔ مگر اس سے فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو متقی ہے۔ اس میں خوف خدا پایا جاتا ہے۔ قیامت کے محاسبے سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے سورۃ بقرہ میں فرمایا "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کہ قرآن پاک متقین کے لیے ہدایت ہے الغرض یہ کلام نصیحت اور یاد دہانی اُن لوگوں کے لیے ہے جو ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچتے ہیں۔

منکرین جھوٹے ہیں

یہ حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْکُمْ مُّکَذِّبِیْنَ اور بیشک ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلانے والے بھی ہیں جو قرآن پاک کو جھٹلاتے ہیں اور احکام الٰہی جیسے قیامت توحید اور رسالت کو جھٹلاتے ہیں نیز فرمایا کہ یاد رکھو وَاِنَّہٗ لَحَسْرَۃٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یہ کافروں پہ بڑے افسوس کا باعث ہوگا۔ آگے چل کر کفار بڑا افسوس کریں گے۔

قرآن پاک حق الیقین ہے

فرمایا وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ قرآن پاک حق یقین ہے۔ یہ کوئی مشکوک چیز نہیں ہے۔ کوئی بناوٹی چیز نہیں ہے بلکہ قرآن کا بیان حق ہے۔ یہ قطعی اور یقینی ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ نہ من گھڑت ہے نہ جھوٹا بلکہ خداوند قدوس کا سچا کلام ہے۔ اُس کی صفت ہے۔ اس نے وحی کے ذریعے اتارا ہے۔ لانے والا بزرگ فرشتہ ہے۔

وحی کے لانے میں بھی بڑا اہتمام ہوتا ہے "لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ" اس میں آگے یا پیچھے کسی شیطان یا مخلوق کا دخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب وحی نازل ہوتی ہے تو چاروں طرف پہرے لگ جاتے ہیں کہ کوئی اس میں دخیل نہ ہو سکے۔ یہ تو تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے

تسبیح بیان کرنے کا حکم

یہ تمام حقائق بیان کرنے کے بعد سورۃ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ اپنے رب کی تسبیح بیان کریں کہ اس نے ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لیے کلام پاک نازل فرمایا۔ وہ عظمتوں کا مالک ہے۔ اس نے ہم پر بڑی مہربانی کی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا اِجْعَلُوْھَا فِیْ رُکُوْعِکُمْ اسے اپنے رکوع میں داخل کر لو۔ اور کہو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ اسی طرح جب آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی نازل ہوئی تو فرمایا اِجْعَلُوْھَا فِیْ سُجُوْدِکُمْ اسے اپنے سجدے میں داخل کر لو یعنی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا

ہے۔ جو رکوع کرتا ہے اور تین دفعہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہتا ہے تو اس کا رکوع مکمل ہے۔
وَذَالِکَ اَدْنٰی اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ ورنہ نفلی عبادت میں پانچ دفعہ سات دفعہ اکیس دفعہ،
اکتالیس دفعہ بھی یہ تسبیح کہی جا سکتی ہے۔ حضورؐ بعض اوقات اتنا لمبا رکوع کرتے اور تسبیح پڑھتے
جتنی قرأت ہوتی۔ دو سیپارے کے برابر قرأت کی اور اتنی ہی لمبی تسبیح بیان کی لربی الحمد۔ سُبْحَانَ
رَبِّیَ الْعَظِیْمِ۔ اسی طرح سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے۔ تو فرمایا خدائے پاک کی ذات بے عیب ہے
اس نے ہماری ہدایت کے لیے قرآن نازل فرمایا یہ کفار غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔

سورۃ

المعارج

(مکّیّہ)

سُورَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ معارج مکی ہے یہ چوالیس ۴۴ آیتیں اور اس میں دو ۲ رکوع ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴿۹﴾ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۚۖ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۙ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ﴿۱۲﴾ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُـْٔوِيْهِ ۙ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ﴿۱۴﴾

ترجمہ :- مانگتا ہے ایک مانگنے والے نے ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہے ﴿۱﴾ کافروں پر۔ اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں ﴿۲﴾ وہ عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو سیڑھیوں والا ہے ﴿۳﴾ عروج کریں گے فرشتے اور جبریل امین اس کی طرف ایک دن میں جسکی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے ﴿۴﴾ پس آپ اچھا صبر کریں ﴿۵﴾ بیشک یہ لوگ اسے بعید خیال کرتے ہیں ﴿۶﴾ اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں ﴿۷﴾ جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا ﴿۸﴾ اور پہاڑ رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند ہو

جائیں گے ⑨ اور اس دن کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا ⑩ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے، مجرم خواہش کرے گا کہ کاش وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کا فدیہ دیدے ⑪ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو ⑫ اور اپنے اس قبیلہ کو جو اس کو پناہ دیتا تھا ⑬ اور سب زمین پر رہنے والوں کو بھی (فدیہ میں پیش کر دے) پھر اپنے آپ کو بچالے ⑭

کوائف اور مضامین

اِس سورۃ کا نام سورۃ المعارج ہے۔ اس کی تیسری آیت میں معارج کا لفظ ہے جس سے اس سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اِس کے دو رکوع چوالیس آیتیں، دو سو سولہ کلمات اور آٹھ سو اکسٹھ حروف ہیں۔ اس کے مضامین گذشتہ سورۃ الحاقہ سے ملتے ہیں۔ اُس سورۃ کے ابتدار میں قیامت کا ذکر ہے۔ آخر رکوع میں نبوت اور رسالت کا انکار کرنے والوں کا ردّ ہے۔ اس سورۃ میں بھی زیادہ تر قیامت کے بارے میں ارشادات ہیں۔

سابقہ سورۃ سے ربط

اس سے پہلی سورۃ میں بیان ہوا۔ کہ مشرکین جن کو قیامت کے روز بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا، وہ بڑا افسوس کریں گے۔ اور جہنم میں داخل ہونے کی وجہ یہ بیان کریں گے کہ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ٥ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ۔ یعنی خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکین کو کھانا کھلانے کا انتظام نہیں کرتے تھے، اِس سورۃ میں بھی اللہ تعالےٰ نے مشرکین کے اسی ذہن کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ یہ لوگ قیامت کے متعلق جلدی کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں۔ کہ عذاب الٰہی جلدی کیوں نہیں آتا۔ خود عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، مگر جب وہ قیامت کا دن آئے گا تو یہ لوگ آرزو کریں گے کہ بیوی، بھائی۔ قبیلہ، مال وغیرہ سب کچھ فدیہ میں دے کر نجات حاصل کرلیں مگر انہیں نجات حاصل نہیں ہوگی۔

عذاب کا مطالبہ

ارشاد ربانی ہے۔ سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ مانگا ہے ایک مانگنے والے نے ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہے۔ یہ مشرکین کے اس مطالبہ کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اپنے منہ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ قیامت جلدی کیوں نہیں آتی۔ اور جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں، وہ واقع کیوں نہیں ہوتا۔

سائل نکرہ ہے اور اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک معنیٰ پوچھنا یا استفسار کرنا ہے اور

دوسرا معنیٰ مانگنا یا طلب کرنا۔ اس جگہ سَالَ سے مراد طلب کرنا ہے۔

کیا سائل سے مراد پیغمبر خدا ہے

سائل سے کون مراد ہے۔ مفسرین نے اس کی دو تفسیریں کی ہیں۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے کہ سائل سے مراد خود پیغمبر خدا ہیں۔ بعض دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جب مشرکین ہٹ دھرمی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں کا انکار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی خود بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے تھے۔ "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ" یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ یعنی ان پر عذاب نازل فرما اور ان کو اپنی گرفت میں لے۔ اس لیے شاہ عبدالقادرؒ سائل سے پیغمبر خدا مراد لیتے ہیں یعنی پیغمبر خدا نے تمہارے لیے عذاب مانگا ہے۔ ایسا عذاب "لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ" جس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ وہ آکر رہے گا۔

اگر سائل کا یہ معنیٰ بھی کیا جائے تو درست ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے حالات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے عذاب کی درخواست کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا "رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا" یعنی اے ہمارے رب! روئے زمین پر کسی کافر کو بسنے والا نہ رہنے دے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ" یعنی اے اللہ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ زخرف کے آخر میں نبی کی زبان سے فرمایا "يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ" اے میرے پروردگار! یہ قوم تو ایمان نہیں لاتی۔ اب تو ہی فیصلہ کر۔

سائل سے مراد کافر اور مشرک ہیں

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جگہ سائل سے مراد پیغمبر علیہ السلام کی ذات نہیں بلکہ کفار و مشرکین ہیں، جو اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جس سزا سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اُسے لاتا کیوں نہیں۔ اسی طرح قیامت کے متعلق استفسار کرتے تھے "مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" یعنی اگر قیامت کا وعدہ برحق ہے تو کب پورا ہو گا۔ مشرکین میں سے ابوجہل اور نضر ابن حارث ابن کلدہ وغیرہ اس قسم کی بات کرتے تھے۔ جیسا سورۃ انفال میں ہے۔ "اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَا

اَلِیۡمٍ"۔ اگر محمد درست کہتے ہیں۔ تو اے اللہ! تو ہم پر پتھروں کی بارش کر دے یا سخت ترین عذاب نازل فرما۔ اس طرح گویا اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور یہ محض تعصب اور عناد کی وجہ سے ایسا مطالبہ کرتے تھے۔

الغرض فرمایا سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۔ ایک مانگنے والے نے ایسا عذاب مانگا ہے جو واقع ہو کر رہنے والا ہے کافروں پر۔ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ لَيۡسَ لَهٗ دَافِعٌ۔ اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں، وہ آکر رہیگا۔ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ وہ عذاب اللہ کی طرف سے ہے سیڑھیوں والا۔

لفظ معارج کی تشریح

معارج کے اسی لفظ سے سورۃ کا نام سورۃ المعارج ہے۔ معارج چڑھنے کی جگہ کو کہتے ہیں مفسرین نے اس کا معنیٰ بلندیوں والا، آسمانوں والا، درجوں والا۔ فضیلتوں والا، سیڑھیوں والا بھی کیا ہے۔ جب ملائکہ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں جاتے ہیں تو انہیں بڑی سیڑھیاں عروج کرنا پڑتا ہے۔ معراج بھی اسی لفظ سے ہے یعنی عروج کرنا معراج سیڑھی کو بھی کہتے ہیں جس پہ آدمی عروج کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ ایک موقع پہ جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حضور نے سوال کیا اَیُّ الۡبِقَاعِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ خطے کون سے ہیں؟ تو جبریل علیہ السلام نے فوراً عروج کیا۔ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آکر جواب دیا کہ خدا تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اَحَبُّ الۡبِقَاعِ اِلَی اللّٰہِ الۡمَسَاجِدُ اللہ تعالےٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ خطے مسجدیں ہیں۔ اور ناپسندیدہ خطے بازار ہیں جہاں ہر قسم کا جھوٹ، فریب، فراڈ جھوٹی قسمیں اور دغا وغیرہ ہوتا ہے۔ وہاں شیطان کا جھنڈا گڑا رہتا ہے۔ مسجدیں اللہ کے ذکر اور عبادت کا مقام ہیں لہذا یہ سب سے زیادہ پسندیدہ خطے ہیں۔ الغرض معارج کا معنیٰ عروج والا اور بلندیوں والا ہے۔

عروج ملائکہ

ارشاد ہوتا ہے تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ۔ عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبریل امین اُس کی طرف۔ جیسا سورۃ قدر میں فرمایا تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ" یعنی نازل ہوتے ہیں فرشتے اور خاص طور پہ روح الامین۔ یا نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ عَلٰى قَلۡبِكَ" یعنی قرآن پاک کو آپ کے دل پہ روح الامین لائے ہیں۔ سورۃ نبا میں ہے" يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا" جس دن فرشتے اور خاص طور پہ روح الامین صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ روح الامین سب

فرشتوں سے زیادہ مقرب ہیں، وحی لانے والے ہیں۔

تو فرمایا تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ۔ عروج کریں گے اس کی طرف ملائکہ اور روح فِیْ یَوْمٍ ایک دن میں كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

اُس دن کی تفسیر میں مفسرین کرام نے بہت سی باتیں بیان فرمائی ہیں سب سے مشہور بات یہ ہے۔ کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ عروج کریں گے فرشتے اور روح ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ جیساکہ دوسری جگہ فرمایا "اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ" تیرے رب کے پاس ایک دن ایسا ہے۔ جیسا تم ایک ہزار سال شمار کرتے ہو۔ یعنی اللہ تعالےٰ کی حکم اور اس کا فرمان اس کا حکم اتنی مقدار میں جاری ہوتا ہے۔

پچاس ہزار سال کا دن

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ابتدائے نفخ یعنی پہلا صور پھونکے جانے سے لے کر جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک کا عرصہ پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا عام طور پر مشہور تفسیر یہی ہے۔ کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ کہ اتنا لمبا ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس طرح بعض گذشتہ اقوام کی سزا کے لیے مختلف عرصہ مقرر کیا گیا، اسی طرح قیامت کے دن کا عرصہ پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ مثلاً بعض قوموں کو اس طرح سزا دی گئی کہ یکدم ختم ہوگئے۔ جبرائیل نے ایک چیخ ماری اور ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ بعض قوموں پر سزا کی کیفیت چند گھنٹوں تک اور بعض پر سارا دن قائم رہی۔ بعض قوموں کو تین دن تک سزا ہوتی رہی "ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ"۔ قوم فرعون چند گھنٹوں میں غرق ہوگئی۔ اسی طرح طوفان کا واقعہ چھ مہینے تک جاری رہا۔ بعض قوموں پر قحط نازل کر دیا۔ جو کئی سال پر محیط رہا۔ اعمال نامے کے متعلق آتا ہے کہ انسان کے اعمال دن کے وقت جاتے ہیں۔ یہ پورا دن ہوتا ہے کہیں فرمایا کہ ہفتے کے بعد ایک رپورٹ جاتی ہے۔ کہیں سالانہ رپورٹ ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے مختلف واقعات ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح سمجھ لیں کہ قیامت کا جو واقعہ ہوگا وہ پچاس ہزار سال کا ہوگا۔

مسلمانوں کا عروج و زوال

حضور علیہ السلام کے بعد دنیا میں مسلمانوں کو جو عروج حاصل ہوا۔ اُس کی مدت ایک ہزار سال بنتی ہے۔ پانچ سو سال تک اقتدار عربوں کے پاس رہا اور اگلے پانچ سو سال سلجوقی اور ترک برسر اقتدار رہے۔ اس کے بعد زوال شروع ہوا۔ ہنود کا غلبہ ہوگیا، انگریز غالب آگئے۔ مسلمانوں کا عروج ایک

ہزار سال تک قائم رہا۔ یہ غلبہ صرف دینی طور پر ہی نہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی مسلمان غالب ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ انحطاط جو کئی صدیوں پر محیط ہے، دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اب مسلمان اس قدر کمزور ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ اگرچہ اجلاس کر رہے ہیں۔ میٹنگیں بلا رہے ہیں اتفاق و اتحاد کے ریزولیوشن پاس کر رہے ہیں مگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اسلام آباد کانفرنس کا کیا نتیجہ مرتب ہوا۔ اس سے چار ماہ پہلے بھی کانفرنس ہوئی مگر اس کا بھی کیا اثر ہوا۔ اس لحاظ سے تو اچھا ہے کہ مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا بیٹھ کر بات چیت کا موقعہ تو مل رہا ہے۔ یہ بھی اچھی علامت ہے۔ اس سے پہلے تو یہ بھی محال تھا۔ کفار کو اس قدر غلبہ حاصل ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

غیر اقوام کی رخنہ اندازی

آیندہ بھی غیر اقوام مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں پھوٹ ڈالیں گی۔ یہ بڑی طاقتیں رخنے ڈالنے کی کوشش کریں گی۔ یہ نفاق کا ایسا بیج ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کو پتہ بھی نہیں چلتا اور انہیں آپس میں لڑا دیتے ہیں

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر سمندر میں دو مچھلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں تو میں یقین سے کہوں گا کہ اس میں بھی انگریز کا دخل ہے۔ تاہم یہ بات باعث اطمینان ہے۔ کہ مسلمانوں نے انحطاط کے اس زمانے میں مل بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دے کہ ان میں حیاتِ نو آجائے۔ ان کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ ہر مسلمان چاہتا تو یہی ہے کہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو عزت نصیب ہو، اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کریں مگر سلطنت اقوام غالب کی جادوگری ایسا ہونے نہیں دیتی۔ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا مزدور اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اصل بات یہ ہے۔ کہ ہماری یہ حالت اس مالک الملک سے انحراف کی وجہ سے ہے، جس کی حقیقی حکومت قائم ہے۔ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
سلطنت اس کی فقط باقی بتانِ آذری

مسلمانوں کے زوال کی وجہ

مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ دین اور خدا کی اطاعت سے برگشتہ ہیں پیچھے ہٹے ہوئے ہیں۔ حضرت نبی کریم کا ارشاد ہے کہ عزت و وقار اس وقت حاصل ہو گا جب دین کے مرکز

پر واپس پلٹ آؤ گے حَتّٰى تَرْجِعُوا اِلٰى دِیْنِکُمْ۔ اس کے بغیر عزت وناموس کا حصول ممکن نہیں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی صلاحیت والے ہوں تو سلطنت اُن کے گھر سے باہر نہیں جائے گی۔ معلوم ہوا کہ دو آدمی بھی با صلاحیت باقی نہ رہے، نہ عباسیوں میں رہے، نہ امویوں میں۔ ورنہ خلافت اُن سے باہر نہ جاتی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سلجوقیوں کو توفیق دی تو ترکوں نے چار سو سال تک یورپی طاقتوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ یہی ترک جن پر پچھلی جنگ میں انگریز نے کفر کا فتویٰ لگوایا۔ ہندوستان میں صرف ایک عالم دین مولانا شیخ الہندؒ کے علاوہ بیشتر پیروں اور مولویوں نے انگریز کی حمایت میں ترکوں پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ یہ شیخ الہندؒ ہی تھے جنہوں نے اس فتوے کے خلاف جہاد کیا۔ انہوں نے کہا کہ ترک گنہگار تو ہو سکتے ہیں مگر کافر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ان کے خلاف لڑائی کا جواز قطعی غلط ہے۔

بہر حال عام معمول کے مطابق ان پر بھی انحطاط آیا، عیاشی آئی، جیسا کہ سلطنت کا خاصا ہے کہ ابتدا شمشیر وسناں سے ہوتی ہے مگر اختتام طاؤس ورباب پر ہوتا ہے۔ یہاں پر مغلوں کا حال ہی دیکھ لیں کہ اُن کا اخیر شعر وشاعری اور ناچ گانے پر ہوا۔

مومن کے لیے لمبا عرصہ بھی مختصر ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کا وقت بڑا دراز ہے۔ شیخ ابن عربیؒ کا بھی قول ہے۔ کہ پل صراط کا سفر پندرہ ہزار سال میں طے ہوگا لوگ پانچ ہزار سال کے عرصہ میں پُل صراط پر چڑھیں گے، پانچ ہزار سال کا عرصہ اس پر سفر کریں گے اور پانچ ہزار سال میں نیچے اتر جائیں گے۔ یہ یہ روایت کشفی ہے حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے

ایک دوسری حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے۔ کہ عرصہ اگرچہ بہت طویل ہے مگر مومن پر یہ عرصہ اتنا مختصر ہوگا، جتنے عرصہ میں چار رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذہن کو اس قدر مطمئن رکھے گا کہ اتنا لمبا عرصہ اُسے اتنا مختصر معلوم ہوگا۔

صبر کی تلقین

فرمایا کہ کافر لوگ جلدی کرتے ہیں مگر فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا۔ آپ اچھا صبر کریں اضطراب اور بیقراری کا اظہار نہ کریں۔ بد دعا بھی نہ کریں۔ بلکہ صبر کریں، ہر چیز اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوگی قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کیا ہوا ہے۔ قبل از وقت کوئی چیز نہیں آئیگی۔ لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں۔ کفار آپ سے تمسخر کرتے ہیں۔ اپنے

منہ سے عذاب مانگتے ہیں۔ قیامت کا وقوع چاہتے ہیں۔ آپ کو شاعر اور مجنون کہتے ہیں۔ دیوانہ اور کاہن کہتے ہیں۔ جھوٹا اور مفتری کہتے ہیں۔ مگر آپ ان سب کی پرواکئے بغیر صبر سے کام لیں۔ پچھلی سورۃ میں بھی فرمایا کہ آپ صبر کریں اور مچھلی والے پیغمبر کی طرح بے صبری نہ کریں۔ جس کی وجہ سے وہ ابتلا میں پڑ گئے تھے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے پیارے نبی تھے مگر جلد بازی کی وجہ سے آزمائش سے دو چار ہونا پڑا۔ لہٰذا آپ صبر و استقلال کا دامن نہ چھوڑیں۔ تنگ دل نہ ہوں۔ زبان پر حرف شکایت نہ لائیں۔ کوئی تکلیف آئے، صدمہ گذرے تو صبر اور نماز سے مدد لیں۔ اِسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ" نماز پڑھیں اللہ کی طرف رجوع کریں تو ہر ایذا کا مقابلہ ہو گا۔

قیامت قریب ہے

نبی علیہ السلام کو کفار کی ایذا رسانی پر صبر کی تلقین کے بعد ارشاد ہوا۔ کہ یہ لوگ جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں، اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا یہ لوگ اُسے بعید خیال کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَّنَرٰٮهُ قَرِيۡبًا ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہ ماضی اور حال تو ہمارے اعتبار سے ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی چیز نہیں۔ مزید برآں جو چیز گذر گئی وہ تو بعید ہو گئی مگر جو چیز قطعی طور پر آنے والی ہے، وہ تو بہر حال قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے کو ضرور پورا کرے گا اور ان کا منہ مانگا عذاب آکر رہے گا۔

سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

فرمایا جب وہ دن آئے گا تو حال یہ ہو گا يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، اس کی رنگت تبدیل ہو جائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ آسمان درپچے درپچے ہو جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔ ——— اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ وہ تمام چیزیں جو آج نظر نہیں آتیں، وہ سب نظر آئیں گی، انسان انہیں دیکھ سکیں گے۔

پہاڑ جو اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی مخلوق ہے۔ اور اللہ نے انہیں ابتدائے آفرینش سے زمین پر ٹکایا ہوا ہے، اُن کی حالت یہ ہو جائے گی وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ یعنی پہاڑ رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے عِهۡن رنگین اون کو کہتے ہیں۔ تو پہاڑوں کے ذرات منتشر ہو جائیں گے سیاہ و سفید ہر قسم کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ بالکل ایسے جیسے رنگین اون دھنی جاتی ہے

دوست دوست کو نہیں پوچھے گا

گذشتہ سورۃ میں کفار کے متعلق اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا کہ قیامت والے دن نہ تو ان کو

اچھی خوراک ملے گی جس سے اُن میں قوتِ مدافعت پیدا ہو اور نہ کوئی دوست ہوگا، جو تکلیف میں اُن کی غمگساری کر سکے۔ اس جگہ بھی فرمایا وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا اور اس دن دنیا کا کوئی دوست اپنے دوست کو نہیں پوچھے گا۔ دوسری سورۃ میں فرمایا کہ آج کے دوست کل وہاں دشمن بن جائیں گے اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ماسوائے متقیوں کے یعنی وہ پرہیزگار اور متقی لوگ جن کی دوستی محض اللہ کے لیے تھی، وہ وہاں بھی قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ کوئی دوست کسی کو نہیں پوچھے گا۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ یُبَصَّرُوْنَهُمْ ایک دوسرے کو سامنے دیکھیں گے۔ پہچانیں گے کہ دنیا میں یہ میرا دوست تھا، مخلص تھا، جگری تھا مگر اُس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ کیونکہ انہوں نے کام دینے والے اعمال ہی سرانجام نہیں دیئے۔ نہ ایمان لائے، نہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کئے۔ اِسی لیے آج کون کسی کو پوچھیگا، سب کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔

بیٹے کسی کام نہیں آئینگے

یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْهِ۔ اس دن مجرم خواہش کرے گا کہ کاش وہ عذاب سے بیٹوں کے ساتھ فدیہ دے دے۔ وہی بیٹے جو رشتے میں سب سے قریب اور عزیز ہوتے ہیں اور جن کی خاطر اُس نے دنیا میں جھوٹ بولا، چوری کی، خیانت کی کیونکہ یہ فطری طور پر پیارے ہوتے ہیں تو اس دن خواہش کرے گا کہ ان کو فدیہ دے کر اپنی جان بچا لوں مگر اُس کی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔ جیسا سورۃ عَبَسَ میں فرمایا یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ الخ اس دن انسان اپنے بھائی سے، ماں باپ اور بیوی بیٹوں سے بھاگے گا

بیوی اور بھائی بھی فدیہ نہیں بنیں گے

بیوی جو دنیا میں اُس کی رازدار تھی۔ چاہے گا کہ اُسے فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑا لوں یعنی بیوی میری بجائے جہنم میں چلی جائے اور میں بچ جاؤں۔ اسی طرح بھائی جو دنیا میں دست و بازو ہوتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں "ہر کہ برادر ندارد، قوتِ بازو ندارد" اور یہ بھی مقولہ ہے کہ جس کی بیوی نہیں ہے اُس کو آرام نہیں ہے۔ اور اسی طرح "ہر کہ مادر ندارد، شفقت ندارد" جس کی ماں نہیں وہ شفقت سے محروم ہے۔ الغرض اُس دن مجرم خواہش کرے گا وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ کہ بیوی اور بھائی کو فدیہ میں پیش کر دے۔ مگر یہ بھی نہیں ہوگا۔

خاندانی بڑائی ناکام ہو جائے گی

وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُؤْوِیْهِ وہ قبیلہ جس کی رسم و رواج ادا کرنے کے لیے بڑی بڑی ڈھینگیں مارتا تھا۔ کہتا تھا ہمارا خاندان اور فیملی ایسی ہے، ہماری قوم ایسی ہے اور اس کے لیے [illegible]

تمام رسوم ادا کرتا تھا، خواہش کرے گا کہ سارے قبیلے کو فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لوں۔ الّتی تؤیہ
وہ قبیلہ جو اس کو پناہ دیتا تھا دنیا میں اُسے فدیہ میں پیش کر دوں۔ مگر وہ قبیلہ بھی اس کے کسی کام
نہ آئے گا۔

روئے زمین کا کوئی فدیہ قابلِ قبول نہیں ہوگا

ومن فی الارض جمیعاً ثم ینجیہ کہے گا، کاش ساری زمین اور اس پر
رہنے والے سب کو فدیہ دیکر بچ جاؤں، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر
ساری زمین خزانے اور سونے سے بھری ہوئی ہو، اور اس جیسی اور بھی ہو اور انسان چاہے کہ یہ سب
کچھ فدیہ دے کر جان بچائے تو اللہ نے فرمایا قبول نہیں ہو:

مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے ابن آدم! اگر
ساری زمین سونے کی بھری ہوئی ہو تو کیا تم اُس کا فدیہ دینے کے لیے تیار رہو۔ آدمی عرض کرے گا،
ہاں مولا کریم! میں تیار ہوں۔ ارشاد ہو گا تم جھوٹے ہو۔ میں نے تم سے ایک تھوڑی چیز کا دنیا میں مطالبہ
کیا تھا۔ "الّا تشرک بی شیئاً" کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ مگر تم نے دنیا میں میری اتنی
بات نہ مانی، اب سونے کی بھری ہوئی ساری دنیا فدیہ دینے کے لیے تیار ہو، تم جھوٹے ہو۔

الغرض فرمایا کہ زمین والے جتنے بھی ہیں، کہے گا کہ ان کو فدیہ دیکر اپنے آپ کو بچالے۔ فرمایا
ایسا نہیں ہوگا۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ وجوہات بیان فرمائی ہیں جن کی بنا پر ایسا نہیں
ہو سکے گا۔

كَلَّا ۚ إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾

ترجمہ:۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا بیشک وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ ہے (۱۵) کھینچنے والی ہے کلیجہ کو (۱۶) دوزخ ان لوگوں کو پکارے گی جنہوں نے پشت پھیری اور روگردانی کی (۱۷) جس نے مال جمع کیا اور سمیٹ کر رکھا (۱۸) بیشک انسان جی کا کچا پیدا کیا گیا ہے (۱۹) جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبرا ہو جاتا ہے (۲۰) اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن کر بیٹھ جاتا ہے (۲۱) مگر نمازی (۲۲) جو اپنی نمازیں مداومت کرتے ہیں (۲۳) اور وہ لوگ جن کے مالوں میں حق مقرر ہے (۲۴) سائل کا اور محروم کا (۲۵) اور جو لوگ قیامت کے دن کی تصدیق کرتے ہیں (۲۶) اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں (۲۷) بیشک ان کے رب کا عذاب بے فکر ہونے کی چیز نہیں ہے (۲۸)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے منہ سے عذاب مانگنے والوں اور قیامت کا مطالبہ کرنے والوں کا رد فرمایا۔ اور کہا کہ یہ لوگ قیامت کو بعید سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ قریب ہے اور اپنے وقت پر آئے گی۔ اس دن مجرم آرزو کرے گا کہ کاش اپنے بیٹوں، بیوی، بھائی، قبیلے اور تمام روئے زمین والوں کو فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے، مگر ایسا نہیں ہوگا۔ فرمایا کلا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

اوّل تو ان تمام چیزوں کا فدیہ بننا ہی محال ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو یہ باطل آرزو پوری نہیں ہوگی۔ اس مقام پر سب سے پہلے بیٹوں کا ذکر کیا کہ آدمی کا سب سے زیادہ حق اور تسلط بیٹوں پر ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ غمال رکھنا ہو تو سب سے پہلے یہی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد انسان کا تسلط اپنی بیوی پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھائی اور پھر سارا قبیلہ۔ عام اجنبی لوگوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ تو اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اسی ترتیب کے ساتھ ذکر کیا کہ انسان خواہش کرے گا کہ فلاں کو فدیہ میں دے دوں، فلاں کو دے دوں، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ یعنی اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

دوزخ مجرم کو خود طلب کرے گی۔

فرمایا كَلَّا ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ مجرم فدیہ دے کر اپنی جان بچالے بلکہ اِنَّهَا لَظٰى بیشک وہ تو جلانے والی آگ ہے۔ لظٰی کا معنیٰ جلانے والی، آتشِ سوزاں۔ اور نَزَّاعَةً کھینچنے والی ہے لِّلشَّوٰى اطراف کو شویٰ ہاتھ پاؤں کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کا اطلاق اندرونی اعضاء پر بھی ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ کلیجہ کیا ہے۔ یعنی کلیجے کو کھینچتی ہے۔ حدیث شریف میں اس کی کیفیت بھی بیان ہوئی ہے کہ قیامت کے دن جب جمگھٹا ہوگا۔ تو بعض آدمیوں کو دوزخ خود طلب کرے گی۔ اور کہے گی اِلَیَّ یَا مُنَافِقُ اے منافق میری طرف آؤ۔ یَا جَامِعَ الْمَالِ اے مال اکٹھا کرنے والے، ادھر آؤ۔

بعض روایتوں میں آتا ہے۔ کہ اس دن لوگ کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے ملے جلے ہوں گے۔ دوزخ میں سے اونٹ کی گردن جیسی ایک گردن نکلے گی اور جن لوگوں کو پکڑنا مقصود ہوگا انہیں چن چن کر پکڑے گی جیسے کرین پکڑتی ہے۔ اور اٹھا کر لے جائے گی۔ وہ گردن پانچ سو سال کی مسافت تک لمبی ہوگی اور مجرمین کو چن چن کر نکال لے گی۔

تو فرمایا وہ آگ کلیجے کو کھینچتی ہے۔ جس طرح سورۃ ہمزہ میں فرمایا اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ یہ ایسی آگ ہوگی جو سب سے پہلے دل پر چڑھتی ہے۔ انسان کے اعضاء کا نمبر تو بعد میں آئے گا، پہلے یہ دل پر اثر انداز ہوگی۔ لہٰذا شویٰ سے مراد اگر کلیجہ ہے تو بھی اور اگر اعضاء واطراف ہیں تو بھی آگ کا اثر سب سے پہلے ان چیزوں پر ہوگا۔

مجرمین پر فردِ جرم

فرمایا تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى یعنی دوزخ ان لوگوں کو پکارے گی جنہوں نے

پشت پھیری اور روگردانی کی۔ یعنی دوزخ ان لوگوں کو طلب کرے گی جنہوں نے اطاعتِ الٰہی کی طرف سے پیٹھ پھیری اور ایمان لانے سے روگردانی کی۔ کہے گی آؤ! تمہاری سزا کا وقت آن پہنچا ہے تمہارے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے۔

تو جس نے پشت پھیری معصیت کے ساتھ اور اعراض کیا ایمان لانے سے اور اس کے ساتھ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی یعنی جس نے مال جمع کیا اور سمیٹ سمیٹ کر رکھا۔ لفظ جمع میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ اس نے حلال و حرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کیا۔ یہ نہیں دیکھا کہ مکروہ ہے یا مشتبہ بس اکٹھا ہی کرتا چلا گیا جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں کی ذہنیت ہوتی ہے حلال و حرام کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ کا سرمایہ دارانہ نظام ہی ہمارے ملک میں رائج ہے جس میں ایک ہی بھوت سوار ہے، مال جمع کرو، بنک بیلنس قائم کرو۔ کاروبار کرو، حلال و حرام کی کوئی پرواہ نہ کرو۔

کسبِ حلال اور کسبِ حرام

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضور علیہ السلام کے ایک صحابی حضرت سمرۃؓ شیرہ کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس پر بھی گرفت کی۔ کہ تم شیرہ بیچتے ہو، اس سے لوگ شراب بنائیں گے جو کہ حرام ہے۔ لہٰذا یہ کام ترک کر دو، ورنہ گرفت ہو گی۔ اگرچہ شیرہ بذاتہٖ حرام نہیں ہے۔ مگر اس سے شراب بنانے کا احتمال ہے لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ یہ کاروبار ترک کر دو۔ یہ مشکوک ہے۔

ترمذی شریف میں روایت موجود ہے حضرت عمرؓ بازار میں گشت کرتے تھے اور اعلان کرتے تھے، جس کو مسئلے کا علم نہ ہو، وہ بازار میں بیٹھ کر تجارت نہ کرے، پہلے حرام و حلال کی تمیز سیکھو کہ کونسا کاروبار جائز ہے اور کون سا ناجائز اُس کے بعد تجارت کرو۔ جو حلال و حرام کو نہیں سمجھتا اُسے تجارت کی اجازت نہیں ہو گی۔ حضرت عمرؓ اس قدر محتاط تھے۔

اسلامی نظامِ معیشت کا تعلق اس اصول سے ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا جائز نہیں ہے۔ نیز لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً دُگنا چوگنا سود مت کھاؤ۔ مگر یہاں جو ذہنیت کارفرما ہے وہ قیصر و کسریٰ کی ذہنیت ہے۔ اس دور میں اسے امریکہ اور برطانیہ کی ذہنیت کہا جا سکتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت پہلے زمانے میں بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔ مال جمع کرنے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سینما کی کمائی ہے

یا انشورنس کی۔ پیسہ سود سے آرہا ہے یا سٹے سے۔ خنزیر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے یا تھیٹر کی کمائی ہے۔ بس مال جمع کرنے سے غرض ہے خواہ کسی راستے سے آئے۔ تو اس کیلیے دوزخ پکار پکار کر کہے گی۔ یا جامِعَ الْمَالِ یا مُنَافِقُ یا مُشْرِکُ ادھر آؤ۔ تم نے دنیا میں ایمان سے روگردانی کی تھی معصیت میں آلودہ تھے۔ آؤ! آج اپنے کیئے کا بدلہ چکھو۔

جمع مال میں حلال و حرام کی تمیز

اہل اسلام کے لیے مال جمع کرنے پر بھی پابندی ہے۔ آپس کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ حلال و حرام کی تمیز پیدا کرو۔ اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ روزی کے حصول کے لیے اچھا راستہ پکڑو۔ وہ طریقہ اختیار کرو جس کو اللہ اس کے دین اور شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ غلط راستے پر مت چلو۔ یہ فلم ایکٹر کتنی کمائی کرتے ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ مگر کمائی حرام ہے۔ بینڈ باجے والے، کھیل تماشے والے فوٹو گرافر اور بینک والے بڑی کمائی کرتے ہیں مگر حرام ہے۔ مجسمہ ساز اور ان کی تجارت کرنے والے، یہ سب ناجائز ذرائع ہیں۔ خدا کی جانب سے لعنت برستی ہے۔ تو گویا جمع مال میں حلال و حرام کی تمیز ضروری ہے

جائز و ناجائز اخراجات

جس طرح طلب رزق میں حلال ذرائع کی پابندی ہے۔ اسی طرح خرچ کرنے میں بھی پابندی ہے "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ" ہمارے عطا کردہ مال میں سے خرچ کرتے ہیں مگر کس طرح۔ اَعْطُوْا کُلَّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ" اس طرح کہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ جائز راستے پر چلو، اور خرچ کرتے ہیں کنجوسی نہ کرو۔

انفاق میں پہلے فرائض آتے ہیں۔ پہلا نمبر زکوٰۃ ہے۔ صدقہ فطر اور قربانی ہے اس کے بعد نفقاتِ واجبہ ہیں۔ "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ" قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔ بھائی یا بہن غریب ہے۔ چچا زاد بھائی نادار ہے، اس کے پاس وسائل نہیں تو حنفی قانون میں واجب ہے کہ اس کو اتنا دے کہ اس کا بھی وقت بسر ہو سکے۔

اس کے علاوہ عبادت میں خرچ کرنے کا موقع ہے جیسے حج اور عمرہ۔ مساکین اور مسافر حقدار ہیں سب کی درجہ بدرجہ حق رسی کرے۔ تو یہاں فرمایا کہ اس نے مال جمع کرتے وقت بھی حلال و حرام کی تمیز نہ کی اور خرچ کرتے وقت بھی بخل سے کام لیا کیونکہ اس نظام معیشت کا طریق کار ہی یہ ہے کہ کماؤ جس طرح بھی آئے اور خرچ کرو، جہاں جی چاہے۔ مگر اسلام میں تو پابندی ہے۔ حرام جگہوں پر خرچ نہیں کر سکتے۔ فضول خرچی منع ہے۔ سب سے پہلے فرائض ادا کرو۔ اس کے بعد جائز ضرورتیں

پوری کرو۔ باطل رسومات، کھیل تماشے اور عیاشی کے کاموں میں خرچ نہ کرو۔ بلکہ اسلام کے متعین کردہ راستے پر چلو اسی میں فلاح ہے۔

رفاہیت بالغہ

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، قیصر و کسریٰ کی حکومتیں رفاہیت بالغہ میں مبتلا تھیں۔ ہر چیز عمدہ سے عمدہ استعمال کرتے تھے، پہننا ہے تو بہت اعلیٰ، لباس ہے تو نفیس ترین، رہائش تو بڑے اعلیٰ درجے کی، خوراک بہت عمدہ۔ فرماتے ہیں، یہی رفاہیت بالغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عرب کی سرزمین پر آخری نبی کو مبعوث فرمایا اور رفاہیت بالغہ کے نظام کو باطل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے سادگی کی تعلیم دی، تعیش اور اسراف کو ناجائز قرار دیا۔ وہ لوگ میز کرسی کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حضورؐ نے فرش پر بیٹھ کر کھانے کا طریقہ سکھایا۔ وہ لوگ چارپائی کے بغیر سوتے نہیں تھے، آپ نے زمین پر سو کر دکھایا۔ اور اسے سنت قرار دیا۔ آپ نے سادہ زندگی بسر کر کے تکلف سے منع فرمایا۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اعلان کرایا قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ "میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا اور میں کسی چیز میں تکلف کرنے والا نہیں ہوں۔ خوراک جیسی ملی کھالی، لباس جیسا میسر آیا، پہن لیا۔ رہائش کے لیے جس قسم کا مکان ملا، اس میں رہائش پذیر ہوگیا۔ سواری کے لیے آپ نے کبھی اونٹ یا گھوڑے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ بلکہ بسا اوقات آپ گدھے پر سوار ہو جاتے تھے۔ ترمذی شریف میں موجود ہے۔ حضرت جابرؓ کی بیمار پرسی کے لیے جا رہے ہیں۔ تین میل کا سفر ہے، صحابہ کی جماعت ساتھ ہے مگر سواری کے لیے گدھا بھی میسر نہیں ہوا۔ کلر والی زمین پر پیدل ہی چل رہے ہیں جبکہ گرد و غبار بھی اڑ رہا ہے۔ آپ نے کوئی تکلف نہیں فرمایا۔

بہر حال جَمَعَ اور اَوْعٰی میں یہ سارا مضمون آجاتا ہے۔ جمع کرتے وقت حلال و حرام کی تمیز نہ کی، مشتبہ اور مکروہ کا خیال نہ کیا، خرچ کرنے کی جگہ پر خرچ نہ کیا، بخل سے کام لیا۔ حقوق ادا نہ کیے۔ اسراف اور ناجائز کاموں پر خرچ کیا۔ لہو و لعب کی سرپرستی کی۔ تو ایسے لوگوں کو دوزخ تَدْعُوْا پکار پکار کر ____ بلائے گی کہ تمہاری سزا کا وقت آچکا ہے۔ اس کی طرف آجاؤ۔

انسانی فطرت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ عام طور پر حال یہ ہے۔ کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ انسان جی کا کچا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا تو بے صبرا ہو جاتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل

بن کر بیٹھ جاتا ہے یعنی دونوں صورتوں میں اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یا تو صبر کا دامن چھوڑ دیتا ہے یا بخل پہ اُتر آتا ہے۔

اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ہاں جو ایماندار اور نمازی ہوں گے وہ ایسا نہیں کریں گے اللہ تعالےٰ نے اس موقع پہ آٹھ خصلتوں کا ذکر فرمایا۔ جن کے حاملین کی یہ حالت نہیں ہوگی۔ نہ تو وہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن چھوڑیں گے، اور نہ آسائش میں بخیل بنیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا ارشاد گرامی ہے انسان میں دو خصلتیں بہت بُری ہیں۔ ایک انتہائی درجے کی بزدلی اور دوسرا انتہائی درجے کا بخل۔ بخل یہ ہے کہ مال موجود ہونے کے باوجود جائز مقام پر خرچ نہ کرے۔

جائز ضروریات کے لیے خرچ کرنے کی اجازت

حضرت ہندہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ میرا خاوند کنجوس آدمی ہے، اتنا بھی نہیں دیتا کہ بچوں کا جائز خرچہ پورا ہو سکے۔ تو کیا میں اس کے علم کے بغیر اُس کے مال میں سے اتنا لے سکتی ہوں، جس سے بچوں کا جائز خرچہ پورا کروں، تو آپ نے اجازت دے دی۔ فرمایا تم جائز کاموں کے لیے لے سکتی ہو، معروف یعنی جائز ضروریات کے لیے، نہ کہ ضائع کرنے کے لیے۔

نمازی بخیل نہیں ہوتا

تو فرمایا اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ذکر نمازیوں کا کیا، مراد ایمان والے لوگ ہیں۔ اور ایمان والوں کی اس اعلیٰ خصلت کو بیان فرمایا کہ جو نمازی ہوگا وہ بخیل نہیں ہوگا وہ تو پورے حقوق ادا کرے گا دوسری جگہ فرمایا مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ "اللہ تعالےٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمانوں کو ضائع کرے یعنی تمہاری نمازوں کو۔ وہ نمازیں جو تم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھیں وہ تبدیلی قبلہ کی بنا پر ضائع نہیں جائیں گی بلکہ مقبول ہوں گی۔ جس طرح وہاں ایمان کا ذکر کر کے مراد نماز لیا ہے، اسی طرح یہاں نمازی سے مراد ایماندار لوگ ہیں۔

نماز میں مداومت

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وہ ایماندار جو اپنی نماز میں مداومت کرتے ہیں۔ مداومت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ اگر نماز ادا نہیں کی تو بے قراری پیدا ہو جاتی ہے۔ سکون نہیں آتا۔ اسی لیے جتنے صالح سلف گذرے ہیں وہ نماز کا اہتمام وقت سے پہلے ہی شروع کر دیتے تھے۔ امام ابو طالب مکی ؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں، جو اذان سے پہلے ہی نماز کی تیاری شروع کر دیتے ہیں، نماز کی اذان کوئی راستے میں سنتے ہیں، کوئی مسجد میں پہنچ کر، جب تک وہ نماز ادا نہیں کر لیتے انہیں قرار نہیں آتا۔

الغرض نماز کی مداومت میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں یعنی وضو، طہارت، لباس کی پاکیزگی، وقت کی پابندی اور باقی تمام لوازمات۔ دائمون سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی بلکہ مداومت سے مراد اپنے لوازمات کے ساتھ نماز کو ہمیشگی سے قائم کرنا ہے۔

سائل و محروم کی حق رسی

اس کے بعد اگلی خاصیت بیان فرمائی۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق مقرر ہے۔ شریعت نے حقیقی سائل اور محتاج کو سوال کرنے کی اجازت دی ہے۔ جب تک اس کا کام نہ چل جائے۔ بلا وجہ مانگنا ناجائز اور حرام ہے۔ کسی پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ حادثہ پیش آگیا یا تاوان آگیا ــــــ تو ایسی صورت میں مانگنا جائز ہے حَتّٰی يُصِيْبَ قِوَامًا الخ یہاں تک ذرا گزران ٹھیک ہو جائے اس کے علاوہ سوال کی اجازت نہیں۔

سائل اور محروم کون ہیں

بعض فرماتے ہیں کہ سائل وہ ہے جو طلب کرتا ہے اور محروم وہ ہے جو طلب نہیں کرتا۔ بیوی طلب کرتی ہے۔ نوکر اپنی مزدوری طلب کرتا ہے ان کا حق معلوم ہے، یہ سائل ہیں، ہاں مسکین، مسافر، یتیم طلب نہیں کرتا ان کا حق مقرر نہیں ہے۔ یہ محروم ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ سائل وہ ہے جو زبان سے بول کر مانگتا ہے۔ جیسے انسان، یہ سائل ہے۔ اور محروم وہ ہے جو قوت گویائی نہیں رکھتا جیسے جانور، لہٰذا یہ محروم ہیں، جانور پال رکھا ہے۔ اس کی خوراک کا ذمہ دار اس کا مالک ہے۔ اگر اسے بھوکا رکھے گا تو سخت مجرم ہوگا۔ اس محروم کا بھی حق ہے۔

روز قیامت کی تصدیق

تیسری صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ یعنی جو قیامت کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ تو اس سورۃ کا موضوع ہے۔ کفار قیامت کا ہی انکار کرتے تھے۔ مگر ایماندار جو ہیں وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ قیامت برحق ہے اور آنے والی ہے۔ اس دن حساب کتاب ہوگا اور اعمال کا بدلہ ملے گا۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ انہیں خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ گرفت میں نہ لے لے۔ اسی خوف سے ایسا شخص نماز ترک نہیں کرے گا، جرائم سے بچے گا۔ حلال کمائی کمائے مگر اسراف سے اجتناب کرے گا۔ سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی بات سمجھائی اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ

عَصَیتُ رَبِّی عَذَابَ یَومٍ عَظِیمٍ" یعنی اگر میں اپنے رب کی مخالفت کروں گا، تو بڑے دن کے عذاب میں پکڑا جاؤں گا۔ اسی اعتقاد کی بنا پر مومن اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے

فرمایا اِنَّ عَذَابَ رَبِّہِم غَیرُ مَاْمُونٍ تیرے رب کا عذاب بے فکر ہونے کی چیز نہیں ہے۔ مومن کو ہر وقت اس کی فکر لگی رہنی چاہیئے۔ خدا کے عذاب سے بے فکر ہونا کفر کی نشانی ہے۔ اور اسی طرح قطعی طور پر پُر امید ہونا، یہ بھی کفر کی علامت ہے۔ یعنی نہ تو یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کبھی نہیں بخشے گا اور نہ یہ ایمان ہو کہ میں ضرور ہی بخش جاؤں گا۔ بلکہ اَلاِیمَانُ بَینَ الخَوفِ وَالرَّجَا یعنی ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے بارہ میں فرمایا یَدعُونَنَا رَغَباً وَّرَہَباً" میرے بندے مجھے رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے ہیں۔ تمام انبیاء کرام ہمارے انعامات میں رغبت بھی رکھتے ہیں اور ہماری گرفت سے ڈرتے بھی ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے۔

درس سوم ۳
آیت ۲۹ تا ۳۵

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾

ع ۵

ترجمہ: اور وہ لوگ جو اپنے شہوت کے مقامات کی حفاظت کرنیوالے ہیں ﴿۲۹﴾ سوائے اپنی بیویوں کے یا جن کے مالک ہیں انکے داہنے ہاتھ (لونڈیاں) تو ان پر کوئی ملامت نہیں ﴿۳۰﴾ پس جو شخص ان کے علاوہ کوئی راستہ تلاش کرے، تو یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ﴿۳۱﴾ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرنے والے ہیں ﴿۳۲﴾ اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہنے والے ہیں ﴿۳۳﴾ اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ﴿۳۴﴾ یہ لوگ بہشتوں میں ہوں گے باعزت ﴿۳۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے درس میں ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا انکار کرنے والوں کی تردید بیان کی اور قیامت کے وقوع اور مجرمین کی سزا کا حال بیان کیا۔ یہ بھی بتایا کہ قیامت کے دن مجرمین تمنا کریں گے کہ کسی طرح اُن کی جان بچ جائے۔ فرمایا اُن کی طرف سے کسی قسم کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ جہنم اُن کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی جس میں سزا پائیں گے۔

اس کے بعد عام انسانوں کی حرص اور بے صبری کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی بیان کیا کہ عام طور پر انسان کی حالت یہ ہے کہ جب اُسے خیر پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے اور جب شر پہنچتا ہے تو بے صبری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو اس گروہ سے مستثنیٰ کیا جو قرآن پاک میں مذکورہ آٹھ صفات سے متصف ہیں، یعنی نماز میں مداومت اختیار کرنے والے جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ مقرر ہے جو قیامت کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ گذشتہ درس میں یہ چار صفات بیان ہوئیں۔

شرمگاہ کی حفاظت

بقیہ چار صفات ہیں۔ وَالَّذِیْنَ ہُمْ لِفُرُوْجِہِمْ حٰفِظُوْنَ۔ وہ لوگ جو اپنے شہوت کے مقامات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِہِمْ سوائے اپنی بیویوں کے اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ یا جن کے مالک ہیں ان کے داہنے ہاتھ۔ فَاِنَّہُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ۔ تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ ہاں! جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کرے گا۔ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْعٰدُوْنَ۔ یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جن میں یہ صفت پائی جائے گی یعنی اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں گے وہ بھی بے صبری والے گروہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

جائز ذرائع۔ نکاح اور ملک یمین

قضائے شہوت کے لیے اسلام نے دو ہی ذرائع جائز قرار دیے ایک نکاح اور دوسرا ملک یمین۔ پہلے ذریعہ کے لئے ازواج کا لفظ یعنی جوڑا استعمال کیا۔ ازواج، زوج کی جمع ہے۔ عورت کا جوڑا مرد ہے اور مرد کا عورت۔ گویا زوج کا لفظ مرد اور عورت ہر دو پر بولا جاتا ہے۔ تو ازواج سے مراد وہ جوڑے ہیں جو عقد نکاح کے ذریعے آپس میں منسلک ہو جائیں۔

ہر عورت ہر مرد کے لیے زوج نہیں بن سکتی۔ بلکہ اس کے لیے بہت سی شرائط ہیں۔ ویسے لغوی اعتبار سے تو مرد و زن جوڑا ہے جیسے فرمایا خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی یعنی مرد اور عورت کو جوڑا پیدا کیا مگر شہوت رانی کے لیے ہر عورت ہر مرد کی زوج نہیں بن سکتی، نہ ہر مرد ہر عورت کا زوج بن سکتا ہے جوڑا بننے کے لیے دو ہی صورتیں ہیں یعنی نکاح یا ملک یمین۔

نکاح کے ضمن میں یہ شرط ہے کہ "مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ" کہ عقد نکاح اور پاکدامنی مقصود ہو۔ "غَیْرَ مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ" محض دوستانہ قائم کر کے قضائے شہوت کر لی، یہ حرام ہے۔ دوسری صورت مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ کی ہے کہ عورت مرد کی ملکیت ہو یعنی شرعی لونڈی ہو۔ ان صورتوں کے علاوہ باقی تمام ذرائع کو حرام قرار دیا۔

شرعی لونڈی کون ہے

لونڈیاں اور غلام بنانا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ اس زمانے میں تو یہ چیز بھی نہیں ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں ساری دنیا میں لونڈی غلام کا رواج تھا۔ اور ہزاروں سال سے چلا آرہا تھا۔ جنگ میں دشمن کے جو مرد و زن پکڑے جاتے تھے، ان کو حکومت غلام اور لونڈیاں قرار دیتی تھی۔ انکو فاتح آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ اور پھر ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ کسی عورت کا کسی مرد کی ملکیت میں آنا۔ اس مرد کے لیے بغیر نکاح عورت کو تصرف میں لانا اور قضائے شہوت کرنا جائز تھا۔

لڑائی میں جو قیدی بنتے تھے، ان کے ساتھ چار قسم کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے اِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً "یا تو اُن قیدیوں پر احسان کرو، انہیں ویسے ہی رہا کر دو یا اُن سے فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ تیسری صورت یہ تھی کہ دشمن کے ایسے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور چوتھی صورت میں غلام اور لونڈی بنا لیا جاتا تھا۔ غلام اور لونڈی بنانا اِن چار صورتوں میں سے ایک ہے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ قیدی کو ہر حالت میں غلام یا لونڈی ہی بنا لیا جائے بلکہ اگر پہلی تین صورتوں میں سے کوئی بھی مناسب نہ ہو تو یہ چوتھی صورت اختیار کر کے غلام اور لونڈی بنایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں ہوا ہے۔ بلکہ ساری دنیا میں یہ رواج موجود تھا، تو جس عورت کو لونڈی بنا کر کسی کی ملکیت میں دے دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ بلا نکاح شہوت رانی جائز ہوتی تھی، نکاح کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کو مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کہا گیا ہے۔

لونڈی کے لیے بعض شرائط

ہاں البتہ لونڈی کے بھی بعض شرائط ہیں۔ اگر لونڈی کا مالک خود کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر دے تو پھر اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، اُس سے خدمت کے باقی کام لے سکتا ہے مگر اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ قطعاً حرام ہے۔

مالک لونڈی کو بیچ بھی سکتا ہے۔ اس قسم کی خرید و فروخت عام ہوتی تھی۔ غلام اور لونڈی بکتے بکاتے تھے۔ مگر کافی عرصہ سے اب یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ اور ایشیا کے لوگوں نے مل کر پیرس میں ایک کانفرنس کی تھی۔ جس میں طے پایا تھا کہ لونڈی غلام کا نظام ختم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اُس کے بعد دنیا میں یہ نظام باقی نہیں رہا۔

اس دور میں واحد ذریعہ نکاح ہے

اس دوران میں مسلمانوں پر زوال آ گیا۔ اور جہاد میں دشمن کے مرد و زن پر قبضہ اور ان کو لونڈی غلام بنانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا قضائے شہوت کا صرف ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا یعنی نکاح۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت جائز نہیں۔ ہم جنسی یعنی لواطت حرام ہے۔ مُسَاحقہ یعنی ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ خلط ملط بھی حرام ہے۔ اسی طرح جانوروں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا، حدیث میں اس پر بھی لعنت آئی ہے۔ اُجرت دے کر زنا کرنا اور قضائے شہوت کے لیے متعہ کرنا بھی حرام ہے۔ یہ سب ذرائع مَا وَرَاۗءَ ذٰلِكَ میں آتے ہیں اور کوئی بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہوت رانی کی اجازت صرف زوج کی صورت ہی دی ہے۔

نکاح کے لیے بعض شرائط

زوجیت سے صرف قضائے شہوت ہی مراد نہیں بلکہ یہ کئی ایک مقاصد کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مُحْصِنِيْنَ" قید احصان میں لانے والے ہوں۔ محض شہوت مقصود نہیں ہونی چاہیئے صحیح طور پر نکاح ہو، حقوق ادا کیے جائیں اور نسل کشی مطلوب ہو۔ اس طرح نکاح میں آنے والی عورتوں کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ وہ کسی دوسرے کی منکوحہ بیوی نہ ہو، محرمات میں سے نہ ہو کہ ان کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں۔ اور پھر یہ ہے کہ دو یا زیادہ آدمیوں کی مشترکہ بیوی بھی نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک کے لیے مختص ہونی چاہیئے۔ اور اس کا اعلان بر سرِ عام گواہوں کی موجودگی میں ہونا چاہیئے عَلٰی رُءُوْسِ الْاَشْهَادِ کہ فلاں عورت فلاں مرد کے ساتھ مختص ہے، اس کا نکاح ہوا ہے۔ نکاح کا مقصد امورِ خانہ داری کی سرانجام دہی بھی ہے اور نسلِ انسانی کا آگے بڑھانا بھی ایک بڑا مقصد ہے اللہ تعالیٰ نے انسان پر شہوت کو مسلط کر کے نسلِ انسانی کی بقاء کا ذریعہ پیدا کر دیا۔ کہ انسان اس بات پر مجبور ہے۔

متعہ اور نکاح میں فرق

نکاح کی صورت میں مذکورہ مقاصد پیشِ نظر ہوتے ہیں امورِ خانہ داری اور نسلِ انسانی کو آگے بڑھانا، مگر متعہ میں محض شہوت رانی مقصود ہوتی ہے۔ دو چار مہینے کے لیے وقتی طور پر متعہ کر لیا۔ مقررہ مدت ختم ہوئی۔ تو معاملہ خود بخود ختم ہو گیا۔ نہ نسل صحیح ہوئی، نہ عدت کی ضرورت، نہ وراثت کا مسئلہ پیدا ہوا، بلکہ نسل بھی حرام ہو گئی۔ نہ نسل کا ثبوت، نہ امورِ خانہ داری مقصود بلکہ صرف شہوت رانی سے غرض۔ تو مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے تحت یہ سب ذرائع حرام ہیں۔

اسلام اور لونڈی غلام

اس دور میں لونڈی غلام کا وجود تو ویسے ہی ختم ہو چکا ہے۔ ہاں آئندہ اگر کوئی موقع آئے کہ کفار کے ساتھ جہاد ہو۔ مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو۔ قیدی مرد اور عورتیں آئیں، اُن کی رہائی کی بھی کوئی صورت پیدا نہ ہو، نہ فدیہ لینا مناسب ہو، نہ احسان کر کے چھوڑ دینا اور نہ اُن کے قتل کی نوبت آئے تو پھر چوتھی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔ ہاں اگر اس رواج کو ختم کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، اسلام پر کوئی زوال نہیں آتا۔ اگر ساری دنیا کے لوگ مل کر اس رواج کو ختم کر دیں کہ لونڈی غلام نہیں رکھنا، تو درست ہے۔ ایسے قانون کی اسلام بھی پابندی کرے گا۔ اس سے اسلام کے کسی اصول پر حرف نہیں آتا۔

لونڈی غلام بنانا فرض واجب نہیں

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے لونڈی غلام بنانے کو روا رکھا ہے یہ درست ہے

مگر یہ کوئی فرض واجب تو نہیں کہ لونڈی غلام بنانا لازمی امر ہو۔ چونکہ نزول قرآن کے وقت یہ بین الاقوامی رواج تھا، اس لیے اسلام نے بعض اصلاحات کے ساتھ اس کی اجازت دی، لازم قرار نہیں دیا۔ اس زمانے میں سارے کاروبار غلاموں کے سر پر تھے۔ اس وقت کے معاشی نظام میں ان کا وافر حصہ تھا۔ اگر اس نظام کو یک دم بند کر دیا جاتا۔ تو دنیاوی کاروبار میں خلل واقع ہو سکتا تھا، لہذا اسلام نے اس کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ یہ تمہارے انسانی بھائی ہیں، کسی وجہ سے تمہارے ماتحت ہو گئے ہیں، ان کے ساتھ انصاف کرو، ان کا حق ادا کرو، زیادتی نہ کرو۔ یہی نہیں بلکہ غلام کی آزادی کو تعزیراتی قوانین اسلام کا حصہ بنا کر ان کی آزادی کی راہ ہموار کر دی۔ لہذا یہ الزام کہ اسلام لونڈی غلام بنانے کی ترغیب دیتا ہے، قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

تو فرمایا جس نے جائز ذریعے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کیا۔ وہ تعدی کرنے والا ہے شرمگاہ کی حفاظت کا یہ مطلب ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ شَرِّ مَنِیِّیۡ اے اللہ! میں مادۂ شہوت کے شر سے تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں اس میں شر ہے اور قدرت نے اسے انسان پر مسلط کر دیا ہے تاکہ نوع انسانی کا بقا رہے۔ مگر اس کے ساتھ بہت سی شرائط عائد کر دیں، جن کی پابندی ضروری ہے۔ کوئی مسلمان ان شرائط کے بغیر شہوت رانی نہیں کر سکتا۔ جو شخص اپنی شرمگاہ کی ناجائز ذرائع سے حفاظت کرے گا، وہی کامیاب ہو گا۔ اسی لیے فرمایا "وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ"۔ یہ پانچویں صفت ہے۔

امانت اور عہد کی حفاظت

نیکوکاروں کے گروہ کی چھٹی اور ساتویں صفت یہ بیان کی کہ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ۔ وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرنے والے ہیں حفاظت کرنے والے ہیں۔ امانت میں ہر قسم کی خصوصی اور عمومی امانتیں شامل ہیں۔ خصوصی امانتوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اس میں وضو، غسل، نماز وغیرہ کے مسائل شامل ہیں جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو شخص وضو درست نہیں کرتا، غسل جنابت صحیح نہیں کرتا۔ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔ جو نماز کا خیال نہیں رکھتا۔ زکوٰۃ کو چھپاتا ہے یا اس میں کمی بیشی کرتا ہے وہ بھی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

عمومی امانتوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ کسی سے کوئی امانت لے کر واپس نہ کرے

کسی کا حق مارے، چوری کرے، یہ عام امانتیں ہیں۔ لہٰذا مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان امانتوں میں تمام خصوصی اور عمومی احکام آجاتے ہیں۔ اِن کی رعایت ضروری ہے۔ جو اُن کی نگرانی کرے گا، فلاح پائے گا۔ جو اُن کی حفاظت نہیں کرے گا، ناکام ہوگا، جہنم کا شکار بنے گا۔

شہادت کی درستگی

آٹھویں اور آخری صفت ہے کہ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِشَھٰدٰتِھِمْ قَآئِمُوْنَ اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم ہیں۔ یعنی گواہیوں کو بلاکم وکاست بیان کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اَقِیْمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ" محض اللہ کے لیے بلا رو رعایت شہادت کو قائم کرو۔ اس میں امیر غریب کی پرواہ نہ کرو۔ اگر شہادت درست ہوگی تو فیصلے بھی صحیح ہوں گے اور اگر رعایت کرو گے تو خرابی پیدا ہوگی، فساد ہوگا، ظلم ہوگا۔ لہٰذا مقدمہ ہو یا کوئی اور معاملہ گواہی ٹھیک ٹھیک دو۔

انگریزی قانونِ شہادت

انگریزی قانونِ شہادت تو اس قسم کا ہے کہ پولیس اور وکیل خود شہادت پڑھاتے ہیں۔ یوں کہنا، یوں نہ کہنا، ورنہ پھنس جاؤ گے۔ یا مقدمہ خراب ہو جائے گا۔ بھلا اس قسم کی شہادت سے مقدمے کا فیصلہ صحیح ہو سکتا ہے؟ اس قسم کی گواہیاں حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے "اَقِیْمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ" جو کچھ دیکھا ہے، حق و انصاف کے ساتھ گواہی دو۔ انگریز کا قانونِ شہادت تو بالکل ہی غلط ہے، اس کے تحت قیامت تک درست فیصلہ نہیں ہوگا۔ کسی کو انصاف میسّر نہیں آئے گا۔ سب معاملات خراب ہوں گے۔ جو جیتا وہ بھی ہارا اور جو ہارا وہ تو خراب ہوا ہی ہے۔ اِن حالات میں لوگ صحیح فیصلے کی برکات سے محروم رہیں گے۔ ناانصافی کا دور دورہ ہوگا۔ اگر کوئی شہادت کو چھپائے گا تو یہ بھی نفسِ شہادت کے خلاف ہوگا۔

اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل

فرمایا اِن آٹھ صفات کے حامل لوگ جہنم کی دعوت سے بچ جائیں گے۔ آخر میں آٹھ صفات میں سے پہلی صفت کو پھر دہرایا۔ شروع میں فرمایا تھا "اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ" اور یہاں فرمایا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ یعنی وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ مَا دُوْوِمَ عَلَیْہِ اللہ کے نزدیک پسندیدہ اعمال وہ ہیں جن پر ہمیشگی اختیار کی جائے اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک عمل ایک دن کیا اور چار دن غائب ہوگیا۔ یہاں حفاظت سے مراد مداومت ہے یعنی وہ لوگ نماز کے ارکان، واجبات، سنن، مستحبات، اوقات سب کی حفاظت کرتے ہیں۔

قبولیت نماز کے لیے شرائط

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نماز فوت نہ ہو جائے۔ ہر وقت یہی فکر لگی رہتی ہے پھر یہ کہ جو نماز پڑھتے ہیں وہ اِس کے شرائط و آداب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ نماز کے لیے کپڑے کی پاکیزگی۔ جسم کی طہارت اور وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قبولیت نماز کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے حلال روزی کی ضرورت ہے۔ اگر لباس حرام پہنا ہے تو نماز کیسے قبول ہو گی۔ دعا کس طرح مستجاب ہو گی۔ یہ تمام چیزیں حفاظتِ نماز کے ضمن میں آتی ہیں۔

نماز مقرّب الی اللہ ہے

اللہ تعالیٰ نے نماز کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر سے اوّل اور آخر ذکر کیا۔ شاہ ولی اللہ رح فرماتے ہیں کہ نماز اُمُّ العِبَادَات یعنی سب عبادات کی بنیاد اور مُقَرِّبْ اِلَی اللّٰہِ یعنی اللہ سے قریب کرنے والی عبادت ہے۔ نماز اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے والی ہے۔ اگر کسی آقا کا بھاگا ہوا غلام اُس کے حضور دست بستہ حاضر ہو جائے، تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ نماز کی بھی یہی صورت ہے اپنے مالک الملک کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑا ہو جائے تو بچ جائے گا۔ وگرنہ مالک سخت قہر میں ہو گا یہ نماز غضب کو ٹھنڈا کرنے والی چیز ہے۔

نمازی کے لیے بشارت

اسی لیے فرمایا کہ نمازوں کی حفاظت کرنے والے اور آٹھ صفات کے حاملین اُولٰٓئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ جنت میں جائیں گے اور اُن کی عزت کی جائیگی۔ ورنہ عام طور پر اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا۔ انسان حریص اور بے صبرا ہے۔ اِس میں جزع فزع ہے۔ ایک حالت میں ناشکری کرتا ہے اور ایک حالت میں بے صبری کا اظہار کرتا ہے۔ ہاں ان آٹھ صفات والے لوگ جنت کے حقدار ہوں گے اور عزت پائیں گے۔ باقی محروم ہوں گے۔

درس چہارم ۴ آیت ۳۶ تا ۴۴

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۲ ۸

ترجمہ پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، کہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں ﴿۳۶﴾ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ ﴿۳۷﴾ کیا ان کافروں اور مشرکوں میں سے ہر ایک امید رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں کے باغوں میں داخل ہو گا ﴿۳۸﴾ خبردار ہم نے ان کو اس چیز سے پیدا کیا جسے یہ جانتے ہیں ﴿۳۹﴾ پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی یقیناً ہم قادر ہیں ﴿۴۰﴾ اس بات پر کہ ہم ان لوگوں سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم اس بات میں عاجز نہیں ہیں ﴿۴۱﴾ پس اُن کو چھوڑ دیں یہ باطل باتوں میں گھستے رہیں اور کھیل تماشے میں لگے رہیں، یہاں تک کہ یہ اس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ﴿۴۲﴾ جس دن قبروں سے نکلیں گے اتو دوڑتے ہوئے جائیں گے گویا کہ وہ اپنے نشانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ﴿۴۳﴾ اُن کی نگاہیں پست ہوں گی ان پر ذلّت سوار ہو گی یہی ہے وہ دن جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا ﴿۴۴﴾

گذشتہ سے پیوستہ گذشتہ آیات میں منکرین قیامت کو وعید سنائی گئی تھی۔ کہ قیامت کے روز مجرمین کو دوزخ خود اپنی طرف پکارے گی۔ جو دنیا میں احکام الٰہی سے پشت پھیرتے تھے، روگردانی کرتے تھے مال سمیٹ

سمیٹ کر رکھتے تھے، خرچ کرنے میں بخل کرتے تھے، حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتے تھے انہیں دوزخ چن چن کر اپنے اندر داخل کرے گی۔ انسان کے پیدائشی طور پر حریص اور بے صبرا ہونے کا ذکر کیا یعنی جب اُسے شر پہنچتا ہے تو بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور جب اُسے خیر پہنچتی ہے تو بخل کرتا ہے۔ البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن میں آٹھ صفات پائی جاتی ہیں۔ یعنی نماز میں مداومت اختیار کرنے والے، جو اپنے مال میں محتاجوں اور محروموں کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ روزِ قیامت کی تصدیق کرتے ہیں۔ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، شہوت کے مقاموں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اپنی امانتوں اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں اور خصوصاً نماز کی پوری پوری نگرانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً کامیاب ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ انہیں بہشت میں داخل کرے گا۔ جہاں اُن کی عزت و تکریم کی جائے گی۔

انسان کی فطری بے صبری پر اشکال

اب مشرکین اور کفار کا رد ہے جو قیامت کے بارے میں ٹھٹھا اور استہزاء کرتے تھے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدائشی طور پر حریص اور بے صبرا پیدا کیا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا" تو پھر اس سے ثابت قدمی اور نیک اعمال کی توقع کس حد تک درست ہے۔ یہاں یہ اشکال بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ جانوروں میں بھی حرص و لالچ کا عنصر موجود ہے اور یہی مادہ انسان میں بھی فطری طور پر ہے تو پھر انسان کو حیوان پر فضیلت کس طرح حاصل ہوتی ہے، اور اس سے نیکی کی توقع کس طرح رکھی جا سکتی ہے۔

جواب۔ انسانی ترقی کا انحصار بے صبری پر ہے

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں حرص اور بے صبری کا مادہ دوسری مخلوق سے زیادہ رکھا ہے۔ مگر انسان کا یہ عنصر اس لیے رکھا ہے کہ وہ ترقی کے منازل طے کر سکے۔ اگر انسان میں بھی باقی مخلوق کی طرح حرص و بے صبری کا مادہ معمولی مقدار میں رکھا جاتا تو پھر انسان کو باقی مخلوق پر فضیلت حاصل نہ ہوتی، کسی ذی روح میں حرص و بے صبری کا جس قدر زیادہ مادہ ہو گا۔ اُسی قدر اُس میں ترقی کرنے کی تڑپ زیادہ ہو گی۔ اور وہ کوشش اور محنت کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرے گا۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو انسان بھی حیوانوں کی طرح ترقی کے راستے پر گامزن نہ ہوتا۔ انسان کی درجاتِ عالیہ اور قربِ الٰہی تک رسائی اسی بے قراری کی مرہونِ منت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اَلصَّبْرُ یُحْمَدُ فِی الْمَوَاطِنِ کُلِّھَا
اِلَّا عَلَیْکَ فَاِنَّہٗ مَذْمُوْمٌ

صبر ہر بات میں اچھی چیز ہے۔ مگر اے مولا کریم! تیرے بارے میں صبر نہیں ہو سکتا۔ یعنی تیری رضا اور تیرا قرب حاصل کرنے کے لیے صبر اچھا نہیں ہے بلکہ بے قراری ہی بہتر ہے تاکہ مقصد جلد از جلد حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی ایک شعر میں اس مفہوم کو بیان کیا ہے

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

میں اُس کی انتہا طلب کرتا ہوں، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ نگاہیں ہمیشہ بے قرار رہتی ہیں اور دل میں امید رہتی ہے۔ کہ آگے بڑھ جائیں، ترقی کر جائیں۔

مولانا رومؒ نے اسی چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر کہ بروے می رسی بروے مائیست

اے بھائی! اسکی بارگاہ بے نہایت ہے۔ جس مقام پر بھی پہنچو، وہاں ٹھہرو مت بلکہ آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

الغرض اگر حرص اور بے صبری انسان میں نہ ہوتی تو قربِ خداوندی اور مراتب عالیہ حاصل کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ انسان بھی جانوروں کی طرح عام چیز پر ہی اکتفا کر لیتا۔ تو حقیقت میں یہ دو خصلتیں انسان کی ترقی کے لیے اللہ تعالےٰ نے اسے ودیعت کی ہیں۔ بخاری اور مسلم کی حدیث میں موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ دو حریص ایسے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک علم کا طالب اور دوسرا مال کا طلبگار۔ یہ دونوں چاہتے ہیں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے آگے ہی بڑھتے جائیں۔

دو چیزوں میں حسد جائز ہے

حضور علیہ السلام نے فرمایا، حسد جائز نہیں مگر دو چیزوں میں۔ ایک وہ جس کو خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے، اور پھر اسے صحیح جگہ پر صرف کرنے کی توفیق دی ہے دوسرا وہ کہ جس کو خدا تعالےٰ نے علم دیا ہے، اور وہ لوگوں کو حکمت سکھاتا ہے۔ یہ دونوں قابلِ رشک ہیں۔ اور اصل میں یہ

دو چیزیں بھی حرص اور بے قراری کی وجہ سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو دی ہیں۔ تاکہ اُسے ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اُن کفار و مشرکین کا رد فرمایا ہے جو قیامت کا انکار کرتے تھے، ٹھٹھا اور مذاق کرتے تھے۔ اور متنبہ کیا ہے۔ کہ قیامت کو پیش آنے والے واقعات میں اُن کا حال بُرا ہو گا۔

قرآن وسنت کی بعض اصطلاحات

ارشاد ہوتا ہے فَمَالِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے۔ کفر کے اصطلاحی معنی انکار کرنا ہے۔ یعنی توحید، رسالت، قیامت، معاد، احکام الٰہی، کُتُب سماویہ، ملائکہ اور تمام وہ چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان کا انکار کرنا۔ اسی طرح شرک یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کو مانتے ہوئے اُس کی عبادت میں یا صفات میں کسی کو شریک کیا جائے۔ منافق وہ ہوتا ہے۔ جو زبان سے تو اقرار کرے مگر اس کا دل کفر کے ساتھ مطمئن ہو۔ الحاد ٹیڑھا چلنے کو کہتے ہیں اسی طرح شک بھی بڑی بیماری ہے۔ یہ تمام اصطلاحات ہیں، جو قرآن میں استعمال ہوتی ہیں۔

کفار کی گروہ بندی

فرمایا فَمَالِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِیْنَ ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی عِزِیْنَ گروہ در گروہ۔ کفار جھنڈ در جھنڈ بیٹھے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں، مذاق اور استہزاء کر رہے ہیں ہیں۔ قیامت کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔

عزین سے مراد گروہ در گروہ ہے، جیسا کہ حضورؐ کی ایک حدیث میں ہے۔ کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے تو صحابہ کی جماعتیں گروہ در گروہ بیٹھی تھیں۔ آپ نے فرمایا مَالِیْ اَرٰکُمْ عِزِیْنَ کیا ہے کہ میں تم کو گروہ در گروہ بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

الغرض قرآن نے بیان فرمایا کہ ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ آپؐ کے گرد گروہ در گروہ بیٹھے ہیں، ٹھٹھا اور استہزاء کر رہے ہیں، مذاق اڑا رہے ہیں۔

کفار کی خام خیالی

قرآن پاک میں موجود ہے کہ بعض کافر قیامت کا انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ سب جھوٹی کہانیاں ہیں۔ قیامت کوئی نہیں ہے۔ آج تک دنیا سے گیا ہوا کوئی شخص واپس نہیں آیا، یہ ساری دنیا کیسے جی اٹھے گی۔ اور اگر بالفرض قیامت آ بھی گئی تو جس طرح آج ہم اس دنیا میں بہتر زندگی گذار رہے ہیں اور مسلمانوں کی حالت خستہ ہے اسی طرح اس دن بھی ہماری ہی حالت اچھی ہو گی۔ اگر کوئی بہشت وہاں ہوا تو وہاں بھی ہم ہی جائیں گے۔

جس طرح آج ہمیں سہولتیں حاصل ہیں، اسی طرح قیامت کو بھی حاصل ہونگی۔ کلمہ پڑھنے والے اور توحید کے دعویدار اسی طرح تکلیف میں رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ اَنْ یُّدْخَلَ جَنَّۃَ نَعِیْمٍ کیا ان کافروں اور مشرکوں میں سے ہر ایک امید رکھتا ہے۔ کہ وہ نعمتوں کے باغوں میں داخل ہوگا۔ فرمایا کَلَّا خبردار ایسا نہیں ہوگا۔ یہ ان کی خام خیالی ہے۔

حقیر قطرۂ آب سے پیدائش

اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّمَّا یَعْلَمُوْنَ فرمایا کہ ہم نے اُن کو اُس چیز سے پیدا کیا، جسے یہ جانتے ہیں۔ دراصل یہ الفاظ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے کفار مشرکین کی توجہ اُن کی خلقت کی طرف دلائی ہے کہ یہ سمجھتے بھی ہیں، کہ ہم نے انہیں پانی کے حقیر قطرے سے پیدا کیا ہے جیسا فرمایا اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ کیا ہم نے تم کو پانی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا نہیں کیا۔ دوسری جگہ فرمایا "خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ" انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ کافر ہو، مشرک ہو، نیک ہو، بد ہو، سب کی پیدائش پامال مٹی اور ناپاک قطرہ سے ہے۔ پھر اس کا مقام خروج اور دخول بھی ناپاک ہے۔ وہ ناپاک قطرہ جس کو یہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جسم کے ساتھ لگ جائے تو فوراً اس کو دور کرتے ہیں، جسم کو پاک کرتے ہیں۔ فرمایا اپنی اس حیثیت کے باوجود تم یہ توقع رکھتے ہو کہ نعمتوں کے باغوں میں جاؤ گے۔

مشرکین۔ نجاست در نجاست

فرمایا نعمت کے باغوں میں وہ داخل ہو سکتا ہے، جو ایمان لے آئے۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرے، اپنے اخلاق و اطوار پاک کرے، ورنہ اُس کی اصلیت تو ناپاک ہی ہے۔ کفار و مشرکین تو ناپاک چیز سے پیدا ہوئے پھر کفر و شرک اور برائیوں والے ناپاک کام کئے تو ان کے اوپر گندگی پہ گندگی چڑھتی گئی، مجسم گندگی بن گئے، یہ جنت میں کیسے جائیں گے۔ جیسے منافقوں کے متعلق فرمایا "اِنَّھُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ" یہ گندے ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے مشرکوں کے بارے میں فرمایا۔ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ "مشرک تو ناپاک ہیں، اوّل پیدائشی ناپاکی، اُس کے بعد کفر و شرک کی ناپاکی۔ کیا یہ جنت میں داخل ہونے کے قابل ہیں؟

تزکیہ مدار فلاح ہے

ہاں! حقیر قطرۂ آب سے پیدا ہونے والا جب اپنے آپ کو ایمان سے پاک کر لیتا ہے۔ اعمال صالحہ سے اپنی تطہیر کر لیتا ہے۔ باطن کو بھی نورِ ایمان سے پاک کر لیتا ہے۔ توحید اور اخلاق

حسنہ سے مزین ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر کو بھی تمام آلائشوں سے پاک کر لیتا ہے۔ تو بہشت میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یعنی بہشت کے باغوں میں داخلے کا مدار تزکیہ ظاہر و باطن پر ہے۔

تمام تصرفات قبضۂ قدرت میں ہیں

فرمایا تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی۔ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ہم اس بات پر قادر ہیں عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ کہ ہم ان لوگوں سے بہتر لوگ پیدا کر دیں۔ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ اور ہم اس بات میں عاجز نہیں ہیں کہ ہم کو تھکا کر کوئی نکل بھاگے گا۔

اس موقع پر مشرق اور مغرب کی بجائے مشارق اور مغارب یعنی جمع کے صیغے استعمال کیے۔ بظاہر تو مشرق اور مغرب ایک ایک ہی ہے اور واحد کا صیغہ ہی استعمال ہونا چاہیئے تھا۔ مگر سورج کے طلوع و غروب کے مختلف مقامات ہونے کی بنا پر مشارق اور مغارب کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سورج کے ہر روز طلوع اور غروب کا نقطہ بدلتا رہتا ہے۔ سردی میں مقام طلوع و غروب اور ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں اور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں جمع کے صیغے استعمال کیے۔ تو فرمایا جس طرح مشرق اور مغرب ہر چیز کا تصرف ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اسی طرح ہم اس بات پر بھی قادر ہیں۔ کہ کفار و مشرکین جیسے نافرمان اور استہزاء کرنے والے لوگوں کی جگہ بہتر لوگوں کو لے آئیں۔

کفار مکہ کا نعم البدل انصار مدینہ

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی انتظام فرما دیا۔ مکہ میں دشمنان دین آپ کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق کرتے تھے۔ ایذا رسانی کے لیے دوڑتے تھے۔ اس کے بدلہ میں اللہ نے مدینہ میں آپ کے گرد وہ لوگ جمع کر دیئے جو ایمان اور نیکی کے ساتھی تھے۔ اطاعت اور توحید خداوندی کے جذبے سے سرشار تھے۔ اپنا مال دولت اور تمام قوتیں اسلام اور رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ آپ سے ہدایات کے حصول اور نفس کی تہذیب کے لیے ہر وقت آپ کے گرد جمع رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیا جو مکے کے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ سے بہر حال بہتر تھے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم اس بات پہ قادر ہیں کہ ان کفار و مشرکین کی جگہ اچھے لوگوں کو کھڑا کر دیں۔ اگر یہ مان لیں تو ان کی ہی بہتری ہوگی اور نہ ہم اپنا فیصلہ صادر کر دیں گے۔

کفار کو ان کے حال پر چھوڑ دیں

فرمایا فَذَرْهُمْ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا یہ باطل باتوں میں ہی گھستے رہیں اور کھیل تماشے میں لگے رہیں۔ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ یہاں

تک کہ یہ اس دن سے جا ملیں جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی اور وعدے یعنی قیامت کا دن آ جائے گا اور یہ اس سے جا ملیں گے۔

قبروں سے نکلیں گے تو دوڑتے ہوئے جائیں گے

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا جس دن قبروں سے نکلیں گے۔ تو دوڑتے ہوئے جائیں گے۔ یعنی جدھر سے آواز آ رہی ہوگی۔ بگل بج رہا ہوگا۔ ادھر دوڑ کر جائیں گے كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ گویا کہ وہ اپنے نشانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح تیز دوڑیں گے، جس طرح تیر نشانے کی طرف جاتا ہے۔

نُصُب، نَصَب کی جمع ہے اور نصب بت کو بھی کہتے ہیں۔ جس طرح دنیا میں لوگ بتوں کی عبادت کے لیے تیزی سے دوڑتے ہوئے جاتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے۔ کہ میں پہلے جا کر سجدہ کر لوں، عبادت کر لوں، اسی طرح قیامت کو لوگ قبروں سے دوڑتے ہوئے اٹھیں گے اور اپنے نشانوں کی طرف جائیں گے۔ نصب کا یہ معنی بھی کیا ہے مگر پہلا معنی زیادہ متبادر ہے۔

کفار کی ذلت و رسوائی

کفار جب قبروں سے برآمد ہوں گے تو ان کی حالت یہ ہوگی کہ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ ان کی نگاہیں پست ہونگی، جھکی ہوئی ہوں گی۔ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ان پر ذلت سوار ہوگی۔ سیاہی چھائی ہوئی ہوگی، چہرے سیاہ ہوں گے اگر دو غبار پڑا ہوا ہوگا، آنکھیں اوپر اٹھا کر نہیں دیکھ سکیں گے۔ ندامت ہوگی۔ کہیں گے جس دن کا ہم انکار کرتے تھے، وہ آن پہنچا۔ قیامت برحق ثابت ہوئی۔ اب تو برا حشر ہوگا۔ فرمایا ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ۔ یہی ہے وہ دن جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ آج تم کو اس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔ اپنے عقیدے اور اعمال کی جزا آج ضرور تم کو ملے گی۔ یہی وہ دن ہے۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَصَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَىٰ عَلَىٰ خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

سورۃ نوح

(مکمّل)

درس اوّل ۱ — آیت ۱ تا ۷

سُوْرَةُ نُوْحٍ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ نوح مکی ہے اور یہ اٹھائیس آیتیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ① قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ② اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ③ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ④ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ⑤ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ⑥ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ⑦

ترجمہ : بیشک ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا (اور دعوت الی الحق کا یوں حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ڈراؤ پیشتر اس کے کہ ان کے پاس دکھ دینے والا عذاب آجائے ① کہا اس نے اے میری قوم کے لوگو! بیشک میں تمہیں کھول کر ڈرانے والا ہوں ② (اور میں تمہیں صاف صاف کہتا ہوں) کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو اور میری بات مانو ③ اللہ تعالیٰ تمہاری کئی غلطیاں معاف کر دیگا، اور تمہیں مقررہ وقت تک مہلت دیگا، بیشک جب اللہ تعالیٰ کا مقررہ وقت آجاتا ہے مؤخر نہیں کیا جاتا اگر تم سمجھتے ہو ④ نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو شب و روز دعوت دی ⑤ مگر میری دعوت نے ان لوگوں کے لیے کوئی اضافہ نہیں کیا سوائے بھاگنے کے ⑥ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ اے پروردگار! تو ان کی بخشش فرمادے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں

ٹھونس لیں، اور کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیے اور انہوں نے اصرار کیا اور بڑا تکبر کیا (۷)

کوائف اور مضامین

اس سے پہلی سورۃ معارج تھی۔ جس میں زیادہ تر قیامت کا ذکر تھا، تاہم ضمناً توحید و رسالت کا بیان بھی تھا۔ اس سورۃ کا نام حضرت نوح علیہ السلام کے نام پر سورۃ نوح ہے۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی اٹھائیس آیات دو رکوع دو سو چوبیس الفاظ اور نو سو انیس حروف ہیں۔

اس سورۃ میں اللہ تعالے نے حضرت نوح علیہ السلام کی اُس دعوت الی الحق اور دعوت توحید کا ذکر فرمایا ہے، جو انہوں نے اپنی قوم کو دی۔ اس دعوت کے مختلف طریقے اور اس کارروائی کا بیان ہے جو نوح علیہ السلام نے اس سلسلہ میں سرانجام دی۔ گویا دعوت الی الحق کے لیے اللہ تعالےٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

سابقہ سورۃ سے ربط

گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالے نے حضور علیہ السلام کو صبر جمیل کی نصیحت فرمائی۔ کفار و مشرکین آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے ٹھٹھا اور تمسخر کرتے تھے۔ آپ کے گرد گروہ در گروہ جمع ہو کر آپ کی دعوت کی تکذیب کرتے تھے۔ قیامت کا انکار کرتے تھے۔ اور کہتے تھے اگر یہ برحق ہے تو پھر آتی کیوں نہیں۔ نہایت بیہودہ باتیں کرتے تھے۔ تو اللہ تعالے نے فرمایا فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا اے نبی علیہ السلام! آپ انکی ایذا رسانی پر صبر و استقلال کا مظاہرہ کریں، تنگ دل نہ ہوں، وقت آنے پر ان کو ضرور سزا ملے گی۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔

اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کو اُس صبر جمیل کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی تلقین اللہ تعالے نے سابقہ سورۃ میں حضور نبی کریم کو کی۔ فرمایا کہ دعوت الی الحق اور دعوت الی التوحید کے سلسلہ میں جس قدر صبر حضرت نوح علیہ السلام نے کیا، کسی اور کو میسر نہیں آیا۔ لہذا اس جگہ اُن کی دعوت کی تفصیلات اور ایذا رسانی پر صبر کا ذکر کر کے حضرت نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا۔ کہ اے نبی علیہ السلام آپ بھی صبر کریں ہم ان سے ضرور بدلہ لیں گے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک

حضرت نوح علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں یا دسویں پشت میں ہیں۔ ان سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بھی نبی تھے۔ اللہ تعالے نے ان پر بھی وحی بھیجی جس طرح آدم علیہ السلام

پر۔ ان کے علاوہ اگر اللہ تعالےٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا ہو تو اس کا ذکر نہیں ملتا۔ حضرت ادریسؑ کے بارے میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اِن کا نام اخنوخ تھا۔ وہ بھی آدم علیہ السلام کی اولاد سے تیسرے یا چوتھے نمبر پر تھے۔

آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے زمانے کے درمیان اکثر لوگوں کا اعتقاد اچھا تھا۔ مگر نوح علیہ السلام کے زمانہ میں آکر بگڑ گیا۔ اور انہوں نے شرک کو اختیار کر لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے باپ لمک یا ملک انکو شرک سے منع کیا کرتے تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کا وقت آیا تو اللہ تعالےٰ نے انہیں صاحب شریعت نبی اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام کا جو ذکر ملتا ہے۔ اُن پر بھی اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی۔ جس میں اکثر احکام ایسے تھے، جن کا تعلق دنیا کی آبادی سے تھا۔ عقیدہ تو موجود تھا، اس کے علاوہ شریعت کے کوئی خاص احکام نہیں تھے۔ تفسیر مدارک والے لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے کپڑے سینے کی سوئی اور مشین حضرت ادریس علیہ السلام نے ایجاد کی۔ ان پر کئی صحیفے نازل ہوئے۔ جن میں دنیا کی آباد کاری کے احکام تھے۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں میں شرک پیدا ہو گیا تھا۔ جس کا ذکر اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں آتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے حالاتِ زندگی

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ قرآن پاک کی دیگر بہت سی سورتوں میں ضمناً آتا ہے۔ مگر یہ سورۃ پوری حضرت نوح علیہ السلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ دو نبی ایسے ہیں کہ جن کا ذکر اللہ تعالےٰ نے مکمل طور پر الگ الگ سورۃ میں فرمایا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اس سورۃ میں اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر سورۃ یوسف میں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اس کے بعد آپ نو سو پچاس برس تک اپنی قوم کو تبلیغ فرماتے رہے سورۃ عنکبوت میں ہے۔
فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا" یعنی حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پچاس کم ہزار سال ٹھہرے رہے۔ اور لوگوں کو حق کی دعوت دیتے رہے۔ اس دوران میں نوح علیہ السلام کے ساتھ بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔
"إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا" نوح علیہ السلام ہمارا بڑا شکر گزار بندہ تھا۔ کوئی ایسی ایذا نہیں،

جو اُن کو نہ پہنچی ہو۔ قولی، فعلی، عملی، مار پیٹ ہر طرح سے اُن کو تکلیف دی گئی۔ مگر انہوں نے ہر مصیبت کو صبر و تحمل سے برداشت کیا۔

اس زمانے میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہی لمبی نہ تھی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے پہلے اکثر لوگوں نے لمبی عمریں پائی ہیں۔ تین تین، چار چار، پانچ پانچ سو سال عمر کے لوگ تھے۔ مگر نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال تھی۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ نو سو پچاس سال آپ تبلیغ کرتے رہے۔ اس کے بعد مشہور تاریخی طوفانِ نوح آیا۔ یہ طوفان دس رجب سے لے کر دس محرم تک مسلسل چھ ماہ تک قائم رہا اور آپ اتنا عرصہ کشتی میں سوار رہے۔ اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کے نتیجے میں صرف ستر آدمی ایمان لائے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔ اور یہی لوگ کشتی میں سوار ہوئے۔ اور اس طوفان کی زد سے محفوظ رہے۔ اس طوفان کا حال سورۃ ہود کے دو رکوع میں بیان کیا گیا ہے۔ بائیبل اور تورات میں بھی اس طوفان سے متعلق روایات ملتی ہیں۔

طوفانِ نوح کی کیفیت

طوفان کی اس قدر کیفیت تو قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ کہ اللہ نے زمین سے پانی کو اُبلنے کا حکم دیا تھا، اور اُوپر سے بارش بھی برسائی تھی۔ مگر طوفان کی مدت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ تورات کی روایت میں میعاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اوپر سے مسلسل موسلا دھار شدید قسم کی بارش برس رہی تھی اور نیچے سے زمین کو پانی اُگلنے کا حکم تھا اور یہ سلسلہ پورے چالیس دن جاری رہا۔ یہاں اگر بارہ گھنٹے یا چوبیس گھنٹے مسلسل بارش ہو، تو کیا حالت ہوتی ہے اور جہاں مسلسل چالیس روز تک اوپر سے بارش اور نیچے سے پانی ابلتا رہا ہو۔ وہاں کی بستیوں کا کیا حال ہو گا۔ تورات کی روایت کے مطابق پانی بلند ترین پہاڑی سے بھی تیس فٹ اونچا چلا گیا تھا۔

کیا طوفان ساری دنیا آیا تھا؟

اِس سلسلے میں دو روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ طوفان ساری دنیا پہ آیا تھا۔ اِس سے کوئی خطۂ زمین نہیں بچا تھا۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ اُس زمانے میں ساری دنیا پر آبادی ہی نہیں تھی۔ طوفان صرف اُس علاقے میں آیا تھا جس علاقے میں انسانی آبادی موجود تھی۔

طوفان تھمنے کے بعد نوح علیہ السلام ساٹھ سال تک دنیا میں موجود رہے تو اِس طرح نوحؑ کی عمر مبارک ایک ہزار پچاس سال بنتی ہے۔ اس سے زیادہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مگر زیادہ مشہور یہی ہے۔ کہ چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، نو سو پچاس سال وعظ کیا اور ساٹھ سال

طوفان کے بعد اس دنیا میں قیام کیا۔ اس طرح آپ کی عمر ایک ہزار پچاس سال ہوئی۔

پہلے صاحب شریعت رسول

بخاری اور مسلم شریف کی روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز جب لوگ نوح علیہ السلام کے پاس سفارش کے لیے جائیں گے تو ان الفاظ سے آپ کو خطاب کریں گے یانوح انک اول الرسل الی اھل الارض یعنی اے نوح علیہ السلام آپ اہل زمین کی طرف۔ سب سے پہلے رسول ہیں۔ آپ سفارش کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں، ہم بڑی تکلیف میں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ مجھ سے کوتاہی ہوگئی تھی۔ اگر باز پرس ہوگئی تو اللہ تعالےٰ کو کیا جواب دونگا نفسی نفسی اذھبوا الی غیری دوسروں کے پاس جاؤ۔ گویا اس طرح وہ لوگوں کو ٹال دیں گے۔

الغرض حضرت نوح علیہ السلام اہل زمین کی طرف پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔ اور ایسے رسول کہ جن کی قوم کو تبلیغ کی حجت پوری ہونے پر سزا دی گئی۔ اس سے پہلے نہ کوئی مستقل شریعت تھی اور نہ ہی کسی قوم کو سزا دی گئی۔

پورے سال کے روزے

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ادریس اور حضرت شیث علیہ السلام کے ادوار میں صرف دنیا کی آباد کاری کے قوانین تھے، کوئی مستقل شریعت نہیں تھی۔ البتہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں شریعت کا نفاذ ہوا۔ مثلاً مشہور ہے۔ کہ آپ کے زمانے میں پورے سال کے روزے فرض تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ بہت زیادہ جسمانی طاقت رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان میں روحانیت پیدا کرنے کے لیے سال بھر کے روزے مقرر فرمائے۔ مگر انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر دیا۔

عوج بن عنق

اس سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے نہایت اختصار کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت آپ کی قوم کے انکار اور طوفان کی صورت میں عذاب کا ذکر فرمایا ہے۔ اس طوفان میں کافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ قصے کہانیوں کی کتابوں میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص عوج بن عنق کو زندہ رکھا گیا۔ یہ بھی کافر تھا اور اونچے قد کا آدمی تھا۔ یہ پانی میں نہیں ڈوبا تھا۔ اس کو اللہ تعالےٰ نے اس لیے زندہ رکھا تاکہ بعد میں آنے والے لوگوں کو بتا سکے کہ ان کے ساتھیوں کے ساتھ کیا حشر ہوا تھا۔ بعض اوقات مجرموں کو سزا دی جاتی ہے تو کسی کو چھوڑ بھی دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ دوسروں کو جا کر بتائے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ بہرحال یہ تاریخی روایتوں میں بیان آتا ہے۔ قرآن و حدیث یا کوئی اور معتبر روایت نہیں ملتی۔ واللہ اعلم۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ غلط ہے یا صحیح۔ ممکن ہے خدا کی قدرت سے ایسا ہی

ہوا ہو۔ جیسے دجال اور خضر علیہ السلام کے حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو بھی عبرت کے لیے زندہ رکھا ہو۔ صحیح بات اتنی ہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے تمام کافروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ صرف وہی بچے تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ اور پھر انہیں کی اولاد سے نسل انسانی قائم رہی اس لیے اس اعتبار سے حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

موجودہ نسل انسانی حضرۃ نوحؑ کی اولاد سے ہے

کشتی نوح میں جو ستر آدمی سوار تھے، اُن کی اولاد بھی آگے نہیں چلی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام اور یافث تھے۔ اس وقت جتنی بھی انسانی نسل دنیا میں موجود ہے، یہ ان تین خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مشرق وسطےٰ کے تمام عرب قبائل، اور ہندوستان پاکستان وغیرہ کے باشندے سامی نسل سے ہیں۔ حبشہ والے اور ارد گرد کے افریقی ممالک کے لوگ حام کی اولاد ہیں۔ اسی طرح روسی اور یورپی ممالک کے باشندے تیسرے بیٹے یافث کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے جو دعوت حق دی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا اور آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو تسلی دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کا نمونہ پیش کر کے صبر جمیل کی تلقین کی۔ کہ جس طرح حضرت نوح نے صبر و تحمل سے کام لیا، اسی طرح آپ بھی صبر کریں اور تسلی رکھیں۔

حضرت نوح کی بعثت اور انذار

سورۃ کے ابتداء میں فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ ہم نے نوح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا۔ آپ اسی قوم اور خاندان کے فرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول بنایا، وحی نازل فرمائی۔ شریعت عطا کی اور دعوت الی الحق کا یوں حکم دیا اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ کہ آپ اپنی قوم کو ڈرائیں، انہیں خواب غفلت سے جگائیں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ پیشتر اس کے کہ ان کے پاس دکھ دینے والا عذاب آجائے عذاب سے مراد وہی طوفان ہے۔ کہ طوفان آنے سے پہلے پہلے آپ ان کو خوف دلائیں۔ گویا یہ اللہ کی طرف سے انذار کا حکم تھا۔

نبیوں کی تعلیم میں بشارت اور انذار دونوں چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر نبی مبشر اور منذر ہوا کرتا ہے۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ " وہ اہل ایمان کو خوش خبری بھی دیتے ہیں۔ اور نافرمانوں کو ڈراتے بھی ہیں۔ یہاں پر حضرت نوح علیہ السلام کو انذار کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کہ آپ ان کو ڈرائیں شاید یہ راہ راست پر آجائیں۔

انذار کا تقدم

بعض اوقات انذار کو تقدم حاصل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات بشارت کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی سورۃ مدثر میں آتا ہے۔ "قُمْ فَاَنْذِرْ" یعنی اے نبی کریم! آپ اٹھ کھڑے ہوں اور ان کو آنے والے برے وقت کے خطرناک نتائج سے ڈرائیں۔ یہاں پر نوح علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے اَنْذِرْ قَوْمَكَ کہ اپنی قوم کو ڈرائیں۔

انذار کو مقدم لانے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اکثر انسان برائی میں ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی اکثریت کی مناسبت سے انذار کو مقدم رکھا گیا۔ کہ آپ ان کو ڈرائیں کہ کفر و شرک کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ آگاہ ہو جاؤ۔ خبردار ہو جاؤ معصیت اور نافرمانی قابلِ مؤاخذہ ہے اپنے آپ کو بچا لو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے یہی دعوت لوگوں کو دی۔ اس مقام پہ اس دعوت کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دوسری سورتوں میں دوسرے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم پا کر نوح علیہ السلام نے قوم سے یوں خطاب کیا قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اے میری قوم کے لوگو! میں تم کو کھول کر ڈر سنانے والا ہوں۔ کہ اگر کفر و شرک سے باز نہیں آؤ گے تو اس کا بہت برا نتیجہ سامنے آئے گا، لہذا سنبھل جاؤ۔ سورۃ یونس میں ہے کہ آپ نے فرمایا اے لوگو! میں جو بات کہتا ہوں، خوب سمجھ لو "ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً" تمہارے معاملے میں کوئی اشتباہ والی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ میں تمہیں صاف صاف کہتا ہوں اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ صرف اللہ کی عبادت کرو۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں، الٰہ صرف ایک ہی ہے۔ اسی کی عبادت کرو۔ میرا پیغام اور میری تعلیم یہی ہے۔ اور نیز یہ کہ وَاتَّقُوْهُ اسی سے ڈرو کیونکہ اگر اس کا خوف دل میں ہو گا تو معصیت سے بچ جاؤ گے وَاَطِيْعُوْنِ اور میری بات مانو، میری اطاعت کرو کیونکہ نبی کی اطاعت فرض ہے۔ اور صرف یہی بات نجات کا ذریعہ ہے۔ کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو۔

مافوق الاسباب استمداد غیر اللہ سے شرک ہے

اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں آتا ہے۔ کہ یہ لوگ خاص قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔ اور وہ یہ ہے کہ نیک لوگوں کی روحوں سے امداد طلب کرتے تھے۔ حالانکہ مافوق الاسباب استمداد مانگنا شرک ہے۔ مافوق الاسباب امداد کرنا صرف خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ "وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ" امداد اسی سے طلب کی جا سکتی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو طاقت نہیں کہ اسباب کے دائرے سے باہر

کسی کی امداد کرسکے۔ غائبانہ امداد نہ کوئی فرشتہ کرسکتا ہے، نہ جن، نہ انسان، نہ بھوت اور نہ کوئی ظاہری اور باطنی چیز۔ لہٰذا اسی بناء پر قوم نوح شرک میں مبتلا تھی۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عبادت صرف اللہ ہی کی روا ہے

حکم ہوا کہ اے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو۔ ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کو یہی نصیحت کی۔ "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" اے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ کے ماسوا کوئی خالق، مالک، مدبّر، مربّی، مستحقِ عبادت مدد کرنے والا۔ نافع وضار نہیں ہے۔ یہ تمام اختیارات صرف خدا تعالےٰ کے پاس ہیں۔ باقی ساری مخلوق عابد ہے۔ مقرب سے مقرب ہستی بھی عبادت پر ہی فخر کرسکتی ہے "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ" میں بھی اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں تم بھی اسی کی عبادت کرو۔ مقربین فرشتے حتیٰ کہ جبرائیل علیہ السلام بھی اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

عبادتِ الٰہی کا صلہ

فرمایا اگر اللہ کی عبادت کرو گے، اسی سے ڈرو گے اور میری اطاعت کرو گے تو يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری کئی غلطیاں معاف کردے گا۔ یہاں پر مِنْ سے مراد بعض غلطیاں ہیں، ساری غلطیاں معاف نہیں ہوتیں۔ اگر حقوق اللہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ تو معافی مانگنے سے اور استغفار کرنے سے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں اور اگر غلطی حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق میں ہے۔ تو متعلقہ بندے ہی معاف کرسکتے ہیں۔ ورنہ معافی نہیں ہوگی۔ اسی لیے يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ فرمایا کہ تمہاری کچھ غلطیاں معاف فرمادے گا۔ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اور تمہیں مقررہ وقت تک مہلت دے گا۔ اس وقت تک جو اس کی مصلحت میں مقرر ہے۔ زیادہ سے زیادہ طبعی عمر تک کہ جب وہ مقررہ وقت آجاتا ہے تو پھر اس میں تاخیر نہیں ہوتی خواہ وہ وقت سزا کے لیے مقرر ہو یا جزا کے لیے۔ فرمایا اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں، پورا ہو کر رہتا ہے۔ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اگر تمہیں عقل وشعور اور سمجھ ہے تو یاد رکھو وہ وقت آنے والا ہے۔

حضرت نوحؑ کی شب و روز دعوت

اللہ تعالےٰ کے ارشاد کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا، تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ نے تبلیغ کے وہ تمام طریقے اختیار کیے جو اس سورۃ میں اور دوسرے مقامات پر مذکور ہیں مگر سینکڑوں سال کی محنت کے باوجود وہ قوم راہِ راست پر نہ آئی۔ آخر تھک ہار کر حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں

دعا کی قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا اے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو شب و روز مسلسل دعوت دی فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا مگر میری دعوت نے ان لوگوں کے لیے کوئی اضافہ نہیں کیا، سوائے بھاگنے کے۔ یعنی یہ لوگ میری دعوت سے راہِ فرار ہی اختیار کرتے رہے ہیں تاکہ ان کے کان میں کلمہ خیر کی آواز تک نہ پڑے۔ میں نے جتنا زیادہ ان کو پکارا، یہ اتنا ہی بگڑے۔

یہاں پر لیل و نہار کا لفظ بتا رہا ہے۔ کہ تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرنے کے لیے دن کا ہونا ہی شرط نہیں بلکہ رات اور دن جب بھی موقع میسّر آئے تو یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔ اسی لیے میں نے شب و روز ایک کر دیا، ہر آن ان کو دعوت الی الحق دی، زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ کیونکہ جو کسی کام میں متفکر ہوتا ہے۔ وہ کسی خاص وقت یعنی دن یا رات کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ جب بھی موقع ملے اپنا فرض سر انجام دیتا رہتا ہے۔ میں نے ان کو جس قدر نرمی کے ساتھ بلایا یہ اتنے ہی سخت ہو گئے۔ اے مولا کریم! میں نے ان کو دن کو تبلیغ کی، رات کو تبلیغ کی۔ ان کو عام مجمعے میں بھی بلایا اور تنہائی میں بھی بات کی خوشی کے موقع پر بھی توجہ دلائی اور غمی کے حال میں بھی ان کی راہنمائی کی کوشش کی مگر انہوں نے میری ایک نہیں مانی۔ انہوں نے سوائے بھاگنے کے اور کچھ نہیں کیا۔

دعوت حق سے بیزاری

وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ تاکہ اے پروردگار تو ان کی بخشش فرمائے، یہ ایمان قبول کر لیں اور توحید کو اختیار کر لیں، میری دعوت کا مقصد یہی تھا تو جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تاکہ نوح علیہ السلام کی کوئی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ اور اپنے کپڑے سمیٹنے لگے۔

کپڑے سمیٹنے کا مقصد کسی کام سے اپنے آپ کو الگ کر لینا ہے کہ یہاں سے کھسک جاؤ کسی کی بات نہ سنو۔ کپڑے سمیٹنے کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کان انگلیوں سے بند نہ ہوتے ہوں، تو ان میں کپڑا ٹھونس لیا جائے تاکہ کسی صورت بات کان میں نہ پڑ جائے۔ یا کپڑا اوپر ڈال لینا تاکہ رکاوٹ بن جائے اور بات کان تک نہ پہنچ سکے۔ اگر اس سے مراد کپڑا اوڑھ کر لیٹ جانا لیا جائے تو یہ بھی بیزاری کا اظہار ہے۔ نفرت کرنا ہے بھاگنے کی کوشش ہے۔ یہ ساری باتیں اس میں آ جاتی ہیں۔

باطل عقیدے پر اصرار اور تکبر

فرمایا کہ انہوں نے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ وَ اَصَرُّوۡا انہوں نے اصرار کیا اور ضد

کی کہ ہم تو اپنا عقیدہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور جس کی پرستش ہم کرتے ہیں اس کو ترک نہیں کریں گے۔ گویا انہوں نے کفر و شرک پر اصرار کیا۔ بلکہ اس کے علاوہ وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا۔ انہوں نے بڑا تکبر کیا۔

سورۃ ہود میں ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کو کہتے تھے، تو بیوقوف آدمی ہے، جو خواہ مخواہ ہمیں ایسی باتیں کرتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے "اِنَّا لَنَرٰكَ فِي سَفَاهَةٍ" کہتے تھے کہ تیرے جیسا بیوقوف آدمی ہی ایسی باتیں کرتا ہے۔ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کرو، اپنے بزرگوں کو چھوڑ دو، اُن کی روحانیت سے استمداد نہ کرو۔ تو ہمیں اپنے طریقے سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم تیری بات نہیں سنتے تو عقل مند آدمی نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا "لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ" اے میری قوم کے لوگو! میں بیوقوف نہیں ہوں۔ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم غلطی پر ہو اور بیجا اصرار کر رہے ہو۔ تکبر کر رہے ہو، اور یہ تکبر ہی کا اظہار تھا کہ "وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ" یعنی تیرے پیچھے لگنے والے تو ہمارے کمی کمین لوگ ہیں۔ فلاں چوہدری نے نہیں مانا، فلاں خانصاحب نے تسلیم نہیں کیا۔ فلاں سردار نے تمہاری دعوت کو قبول نہیں کیا۔ صرف چند مزدور پیشہ لوگ تیرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جن کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہی اُن کا تکبر تھا۔ حالانکہ ابتداء میں انبیاء کے متبع ہمیشہ کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ سارے نبیوں کی تاریخ یہی ہے۔ بڑے لوگ بعد میں مجبور ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ﴿۹﴾

ترجمہ:۔ بیشک پھر میں نے ان کو برملا دعوت دی ﴿۸﴾ پھر میں نے ان کو علی الاعلان دعوت دی۔ اور میں نے ان کو پوشیدہ طور پر بھی دعوت (توحید) دی ﴿۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ

پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر فرمایا ہے کہ کس طرح انہوں نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ دوسرے رکوع میں مشرکین کے شرک اور اس کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے اور آخر میں پھر منکرین کے لیے سزا کی دعا ہے۔ الغرض اس سورۃ میں نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ کہ انہوں نے کس طرح لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا، اور ان کی طرف سے دی گئی ایذاؤں اور پریشانیوں کو کس طرح برداشت کیا۔

اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کے پانچ طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے درس میں ان پانچ میں سے دو طریقوں یعنی رات اور دن کی تبلیغ کا بیان آچکا ہے اور آئندہ باقی طریقوں کا ذکر ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکار خدا کا پیغام اور اس کی وحدانیت کی تعلیم انہیں پانچ طریقوں سے دیتے رہے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سارے طریقے سینکڑوں سال تک اپنی قوم پر آزمائے مگر سوائے اسی ستر آدمیوں کے جو کشتی پر سوار ہوئے، اور کوئی ایمان نہ لایا سورۃ ہود میں ارشاد ربانی ہے۔ "وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ" یعنی اے نوح! تمہاری قوم میں سے سوائے ان "ستر" لوگوں کے جو ایمان لاچکے، اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد جب اپنی قوم سے بالکل مایوس ہوگئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا فرمائی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کے سلسلے میں جس قدر محنت کی، اس کی تفصیل اسی دعا کے اندر ہی آرہی ہے۔ جیسا کہ پہلے درس میں گذر چکا ہے۔ آپ نے اپنی قوم کو دن کو بھی دعوت دی اور رات کو بھی دعوت دی مگر وہ بھاگتے رہے۔ اب آگے دوسرے ذرائع تبلیغ کا ذکر آرہا

برملا دعوت

دعوت الی الحق کا تیسرا طریقہ آپ نے یہ بتایا کہ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا پھر میں نے اُن کو برملا دعوت دی۔ تبلیغ کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ بعض اوقات برملا دعوت مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی سوچ اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ اگر اُن کو فرداً فرداً کوئی بات سمجھائی جائے تو وہ شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ کیا بات ہے، ہمیں اکیلے کیوں بتلایا جا رہا ہے۔ کہیں اس میں کوئی فاسد غرض نہ ہو۔ اس بات کا ذکر برملا کیوں نہیں کیا جا رہا۔ تو اس لیے نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی قوم کو برملا بھی دعوت دی۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں ہے "ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً" اے لوگو! میری بات صاف صاف سمجھ لو، اس کے بعد تمہارے دلوں میں شک و شبہ یا تاریکی نہیں رہنی چاہیئے۔ میری دعوت واضح ہے۔ "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ"۔ یعنی عبادت صرف اللہ کی کرو۔ اُسی سے ڈرو اور میری بات مانو۔

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر برملا دعوت کی حجت بھی پوری کر دی، کیونکہ رات کی دعوت میں گھر میں اکیلے آدمی اور علیحدگی کا تصور پایا جاتا ہے اور جہاراً میں عام مجمع کا علی الاعلان دعوت مقصود ہے۔ جو جو طریقے حضرت نوح علیہ السلام نے اختیار کئے، وہ سارے طریقے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استعمال فرمائے۔ یعنی رات کو بھی تبلیغ کی، دن کو بھی، عام مجالس میں بھی کی، بازاروں اور منڈیوں میں دعوت دی، عام اجتماعات میں خدا کا پیغام سنایا۔

علی الاعلان دعوت

دعوت کا چوتھا طریقہ یہ بیان کیا کہ ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ پھر میں نے اُن کو علی الاعلان دعوت دی۔ علی الاعلان سے مراد ہے ڈھنڈورا پٹوا کر۔ جیسے کوئی اہم معاملہ ہو تو ڈھنڈوری پٹوائی جاتی ہے۔ اعلان کروایا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے ڈھنڈوری پٹوا کر عام اعلان کے ذریعے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ کہ خبردار ہو جاؤ، پھر نہ کہنا کہ ہمیں پتہ نہ چلا اب کان کھول کر اللہ کا پیغام سن لو۔ مگر پھر بھی قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔

پوشیدہ طور پر دعوت

بعض لوگ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی بات علی الاعلان کہی جائے یا اُن کی کسی خامی کا برملا اظہار کیا جائے تو وہ بُرا مان جاتے ہیں، نصیحت نہیں پکڑتے۔ اِسی حجت کو کو پورا کرنے کے لیے وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا۔ اے مولا کریم! میں نے اُن کو پوشیدہ طور پر بھی دعوت توحید دی۔

امام احمدؒ کے متعلق مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے لمبی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ایک بے سمجھ آدمی آیا۔ کہنے لگا ایک مسئلہ دریافت کرتا ہوں کہ حضورؐ نے ایسی لمبی ٹوپی پہنی تھی؟ یہ بات اس نے عام مجلس میں کی تاکہ امام صاحب کی خفت ہو جائے اور آپ مجمع میں رسوا ہوں۔ اس بُری نیت سے سوال کیا۔ تو اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا نَصَحتَ اَمْ فَضَحْتَ تو نے نصیحت کی ہے یا رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ سوال برملا کر کے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ الغرض برملا بات میں بعض اوقات خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو پوشیدہ طور پر بھی تبلیغ کر کے انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔

تبلیغ کے پانچ اصول

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! میں نے دعوت الی الحق اور تبلیغ دین کے تمام طریقے استعمال کر لیے میں نے ان کو رات کو بھی دعوت دی اور دن کو بھی دعوت دی۔ شب و روز میں جب بھی موقع ملا میں نے تیرا پیغام پہنچانے میں سستی نہیں کی۔ پھر ان کو برملا مجالس میں بھی سمجھایا، اور علی الاعلان بھی خدا کا پیغام پہنچایا۔ میں نے ان کو تنہائی میں فرداً فرداً بھی تیرا پیغام سنایا، مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

تبلیغ کے یہ اصول ہر زمانے میں کارآمد ہیں

تبلیغ کے یہ پانچ اصول ہر زمانے کے ہر مبلغ کے لیے کارآمد ہیں۔ اگر کسی کو رات کو موقع ملتا ہے تو رات کو تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے، خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ مگر اس زمانے میں رات کے وقت تو ساری دنیا کھیل تماشے میں مصروف ہوتی ہے۔ چار ارب کفار و مشرکین کے علاوہ کلمہ گو بھی اسی رَو میں بہ رہے ہیں۔ لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت کون کرتا ہے اور تبلیغ کون کرتا ہے دن کے وقت لوگوں کی اکثریت پیٹ کی ضروریات میں لگی رہتی ہے۔ ایسے کتنے آدمی ہوں گے جو محض رضائے الٰہی کے لیے لوگوں تک دین پہنچائیں جسے سمجھ کر نجات حاصل کر سکیں۔ حصولِ روزگار، معیشت، ملازمت، محنت یہ سب چیزیں جائز ہیں۔ مگر نوعِ انسانی کے لیے سب سے زیادہ اہم ضرورت کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ جس سے لوگ فلاح پائیں۔

لاؤڈ سپیکر کا غلط استعمال

اب راتوں کو ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ تبلیغ ہو رہی ہے۔ لاؤڈ سپیکر ایک نئی مصیبت آگئی ہے۔ رات کو اس پر صلوٰۃ و سلام شروع کر دیا۔ یا مخالفوں کو کچلنے کے لیے بُرا بھلا کہنے لگے نعرہ بازی یا گانا بجانا شروع کر دیا۔ یہ کون سی تبلیغ ہے۔ کوئی پنجابی غزل ہو رہی ہے، کوئی اردو نغمہ گا رہا ہے، کوئی

کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے۔ اس سے کون سی اصلاح ہوتی ہے۔ کسی کے ذہن میں کوئی اچھی بات تو اترتی نہیں، جب اترے گی بُری بات ہی اترے گی۔ کیونکہ تبلیغ تو مقصد ہی نہیں، محض اپنے فرقے اور اپنی پارٹی کی حمایت مقصود ہے یا پھر پیٹ پروری مطلوب ہے۔

عرب کہتے تھے فِی العِتَابِ حَیٰوۃٌ؟ دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں زندگی ہے لہٰذا بعض لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے روزی ہی علمائے دیوبند کو گالیاں دینے میں رکھی ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو دو سو سال ہو گئے ہیں۔ مگر آج تک لوگ انہیں گالیاں دے کر روزی کھا رہے ہیں۔ تبلیغ کا کوئی پروگرام نہیں۔ بس مخالفین کو گالیاں دو اور اپنا پیٹ بھرو۔ یہ تو ضمناً بات آگئی تھی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں تبلیغ کا کوئی معقول طریقہ ہی نہیں ہے۔ اگر لاؤڈ سپیکر ہی استعمال کرنا ہے تو کوئی اچھی بات تو کرو۔ یہ کون سی نیکی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کھول کر دوسروں کی نمازیں خراب کرو۔ اُدھر نماز ہو رہی ہے، اُدھر وہ درس دے رہے ہیں۔ ایک مسجد میں درس ہو رہا ہے، اور دس بیس مسجدوں میں نمازیں خراب ہو رہی ہیں۔ کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔

عبادت میں خلل

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے، پڑوسی کو مت ستاؤ۔ چہ جائیکہ عبادت کے اندر لوگوں کو ستایا جائے۔ بعض اوقات لاؤڈ سپیکر کے غر غر کی آواز ایسی آتی ہے کہ نمازوں کے دوران پتہ ہی نہیں کہ امام کیا پڑھ رہا ہے اور مقتدی کیا سُن رہے ہیں۔ رکوع و سجود میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ مصیبت ہے۔ یہ لوگ عذاب میں مبتلا ہیں۔ کیا خاک ترقی کی ہے۔ کوئی نماز نہیں پڑھ سکتا، کوئی تلاوت نہیں کر سکتا۔ دن میں بھی ہو رہا ہے۔ رات کو بھی بارہ بجے تک جاری ہے۔ کیا دعوتِ لیل و نہار کا یہی مقصد تھا۔ کہ دوسروں کی عبادت میں خلل ڈالا جائے۔ گانا بجانا ہو اور گالیاں دی جائیں۔ دن کو پیٹ کا دھندا ہے اور رات کو لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔

عناد و تعصب دین نہیں

جب کہیں جلسہ ہوتا ہے، یہ ملا تقریر ہوتی ہے، تو وہاں بھی یہی چیز ہے جس طرح ممکن ہو مخالفین کو ذلیل کرو۔ خدا راضی ہو یا نہ ہو مگر اپنی پارٹی اور اپنے فرقہ کو قائم رکھو۔ کسی کو فائدہ ہو یا نہ ہو، کسی کے عقیدے کے خلاف ہو یا حق میں کوئی جائے جہنم میں، تم اپنا مطلب پورا کرو۔ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ یاد رکھو تعصب اور عناد کوئی دین نہیں۔ حضورؐ نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی ہے۔ وہ شخص کامل الایمان نہیں، جو پڑوسیوں کو ستاتا ہے یہ نماز کے دوران بھی شور کر رہے

ہیں، یہ کون سا دین ہے۔

نمازی کے آگے سے گذرنا سخت گناہ ہے

تبوک کے واقعہ میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آگے سے گذر گیا۔ نماز میں خلل واقع ہوگیا۔ آپ نے اس کے لیے بد دعا فرمائی کہ خدا کرے تو اپنی ٹانگوں سے چل نہ سکے۔ وہ آدمی لنگڑا ہوگیا تھا۔ اُس نے حضورؐ کو ایذا پہنچائی تھی۔ مرتے دم تک ٹھیک نہ ہوا۔ یہ روایت ابوداؤد میں موجود ہے۔

نمازی کے آگے سے گذرنے والا مسئلہ بھی اہم ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص چالیس سال یا چالیس دن تک کھڑا رہے تو یہ اس کے لیے نمازی کے آگے سے گذرنے سے بہتر ہے۔ ہاں اس طرح نمازی کی نماز میں فرق نہیں آئے گا۔ البتہ گذرنے والا گنہگار ہوگا۔ نماز ہو جائے گی۔ اسی لیے اگر کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہا ہے تو آگے سُترہ رکھنے کا حکم ہے تاکہ نماز سکون کے ساتھ ادا کی جا سکے۔

دین قیامت تک قائم رہے گا

اَعْلَنْتُ لَھُمْ کے مطابق تبلیغ دین کا ایک طریقہ علی الاعلان بھی ہے۔ مگر یہاں تبلیغ کی بجائے لہو و لعب، فحاشی اور عریانی کا اعلان ہوتا ہے۔ ٹانگے کے پیچھے سینما کا اشتہار باندھ کر فحاشی پھیلائی جا رہی ہے تبلیغ دین کا اعلان کون کرتا ہے۔ کیا حکومت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے۔ دین ایک سچی حقیقت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے دین قیامت تک مٹے گا نہیں اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا۔ جو دین پر خود بھی قائم رہیں گے اور دعوت بھی دیتے رہیں گے۔ مخالفوں کی ایذائیں بھی برداشت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ مگر اس زمانے میں حکومتیں کیا کر رہی ہیں، پارٹیاں کیا کر رہی ہیں۔ دولتمند یہ خدمت کہاں تک سر انجام دے رہے ہیں۔ دین کی کونسی دعوت دے رہے ہیں۔ کس بات کا اعلان کر رہے ہیں۔ اسی طرح وَاَسْرَرْتُ لَھُمْ اِسْرَارًا۔ کے مصداق پوشیدہ طور پر تبلیغ کا کیا حق ادا کر رہے ہیں۔

اُسوۂ حسنہ پر عمل کا فقدان

بہرحال تبلیغ کے یہ پانچوں طریقے نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر آزمائے۔ اور ان کا ذکر اپنی دُعا میں کیا۔ یہی پانچ طریقے تمام امتوں پر لاگو ہیں۔ مگر کیا آج کا مسلمان ان پر عمل درآمد کر رہا ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اَعْلَنْتُ لَھُمْ کے مطابق مسلمان ساری دنیا میں کلمۂ حق کا اعلان کرتے مگر یہ منافقت میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ سب سے بہتر ہے۔ پھر اسے قبول کیوں نہیں کرتے۔ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ عبادت میں پکڑو، نکاح طلاق میں پکڑو۔ سیاست میں

پکڑو۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طور طریقہ سب سے افضل ہے تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ وزیر اکٹھے ہوئے اسلام کی سربلندی کی باتیں ہوئیں۔ پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کا اعلان ہوا۔ اِن تقریبات سے کس قدر فائدہ ہوا، جب کہ اسلام کے اصولوں پر عمل ہی نہیں ہے۔ عقیدہ درست نہیں ہے۔ دماغوں میں کفر و شرک بھرا ہوا ہے۔ بدعملی اور عیاشی کا دور دورہ ہے فحاشی پائی جاتی ہے۔ لہو ولعب میں مبتلا ہیں۔ مگر زبان سے کہتے ہیں کہ اسلام سچا مذہب ہے اگر واقعی سچا مذہب ہے تو پھر اس پر عمل کر کے کیوں نہیں دکھاتے۔

قول و فعل میں تضاد

برناڈ شا بڑی مشہور انگریز شخصیت ہوئی ہے۔ وہ اسلام کی بڑی تعریف کیا کرتا تھا۔ مولوی ظفر علی خاں مرحوم لندن گئے۔ برناڈ شا سے ملاقات ہوئی تو اُس نے اسلام کی بڑی تعریف کی۔ ظفر علیخاں جذباتی آدمی تو تھے ہی، کہنے لگے اگر اسلام ایسا سچا دین ہے تو پھر تم اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتے برناڈ شا نے مولوی صاحب کو ڈانٹ دیا کہ تم مجھے اسلام کی دعوت دیتے ہو۔ پہلے خود اسلام پر کاربند ہو کر آؤ۔ تمہارا خود اسلام پر عمل نہیں ہے، مجھے کیا دعوت دیتے ہو۔ میں تم سے اسلام کو زیادہ جانتا ہوں۔ پہلے صحابہ کرامؓ جیسے بن کر آؤ۔ پھر مجھے دعوت دینا۔ تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے۔

اسلام کے نام پر الحاد کی تبلیغ

مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ساری دنیا میں توحید کا اعلان کرتے، اسلام کی دعوت دیتے۔ مگر اب تو کوئی اعلان بھی نہیں کر سکتا۔ بیرونی ممالک میں وفد جاتے ہیں۔ طلبا بھی جاتے ہیں۔ مگر لہو ولعب کے لیے۔ شراب نوشی اور رنڈی بازی کے لیے۔ یہ دوسروں کو کیا ٹھیک کریں گے، خود رگ و ریشے میں یہودیت، نصرانیت اور الحاد لیا ہوا ہے۔ نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں، کام سارا یہود و نصاریٰ اور الحاد کا کرتے ہیں۔ وہاں سے کیا سیکھ کر آتے ہیں۔ یہ کیا اعلان کریں گے۔

پوشیدہ طور پر بھی وہی دعوت دے گا۔ جس کے دل میں کوئی ہمدردی ہے اور جسے اپنے دین کی حقانیت پر یقین ہے کہ اس سے بہتر کوئی دین نہیں، ہم اگر کسی کو سمجھائیں گے، کسی کا بھلا کریں گے، تو ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا "فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ" آپ ان کو نصیحت کریں خواہ اُن کو فائدہ دے یا نہ دے، آپ کو ہر حالت میں یہ نصیحت فائدہ پہنچائے گی۔ آپ کا فریضہ ادا ہو گا۔ اللہ تعالےٰ کے ہاں درجات بلند ہوں گے۔

یہ اُس دعوت کا ذکر ہے جو نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی اور جو ان کی دعا کے اندر آئی ہے۔ اگلی آیات میں ان باتوں کا ذکر ہے، جو نوح علیہ السلام نے لوگوں سے کہیں۔ اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے یہ باتیں اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھائیں، شاید کہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝۱۴ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝۱۵ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝۱۸ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝۱۹ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰ ع ۹

ترجمہ: پھر میں نے انہیں کہا اپنے رب سے استغفار کرو ، بیشک وہ بہت بخشش کرنے والا ہے (۱۰) اللہ تعالیٰ چھوڑ دے گا آسمان کو تم پر کہ موسلا دھار بارش برسائے (۱۱) اور بڑھا دے گا تمہارے لیے مال اور بیٹے اور تمہارے لیے باغات تیار کر دے گا اور تمہارے لیے نہریں بنا دے گا (۱۲) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے وقار سے خوف نہیں کھاتے (۱۳) اور بتحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختلف اطوار (دوروں) میں پیدا کیا (۱۴) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو کیسے تہ بہ تہ پیدا کیا (۱۵) اور آسمانوں کے اندر چاند کو نور بنایا اور سورج کو روشن چراغ بنایا (۱۶) اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے ایک خاص طریق پر پیدا کیا (۱۷) پھر تمہیں زمین میں واپس لوٹائے گا اور پھر اسی سے دوبارہ نکالے گا (۱۸) اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا (۱۹) تاکہ اس کے کشادہ راستوں پر تم چل سکو (۲۰)

گذشتہ سے پیوستہ

یہ سورۃ نوح ہے۔ اور ان دروس میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ جو انہوں نے تھک ہار کر بارگاہ الٰہی میں پیش کی کہ "رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا" یعنی اے پروردگار میں نے اپنی قوم کو شب و روز دعوت دی مگر میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگنے

لگے۔ انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور کپڑے سمیٹ لیے اصرار اور تکبر کیا۔ میں نے ان کو برملا بھی دعوت دی اور پوشیدہ طور پر بھی نصیحت کی، علی الاعلان بھی تبلیغ حق کی مگر انہوں نے میری کسی بات کو نہیں مانا۔

استغفار کی ترغیب

آخر میں میں نے انہیں یہ بھی کہا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اپنے رب سے استغفار کرو، معافی مانگو کیونکہ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا وہ بہت بخشش کرنے والا ہے۔ استغفار کا معنی بخشش مانگنا، ڈھانپ لینا پردہ پوشی کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ تم ایمان قبول کر لو، تو اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں کو معاف کر دیں گے۔ کفر و شرک کو چھوڑ دو کیونکہ ان کی موجودگی میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب کفر و شرک سے باز آجاؤ گے تو بخشش کے اہل بن جاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہاری باقی تمام کوتاہیوں سے درگزر فرما دیگا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلْاِسْلَامُ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ اسلام لانے سے سابقہ کوتاہیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے کتنا بھی بڑا جرم ہو مگر جب وہ کفر و شرک سے مجتنب ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو اس کی سابقہ تمام کوتاہیاں معاف ہو جاتی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، وہ بڑا بخشنے والا ہے تمہیں معاف فرما دے گا۔

استغفار کی برکات

فرمایا اگر تم استغفار کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا اللہ تعالیٰ آسمان کو چھوڑ دیگا کہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے۔ وَیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ اور بڑھا دے گا تمہارے لیے مال اور اولاد وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ اور تمہارے لیے باغات کے پھل تیار کر دے گا۔ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا اور تمہارے لیے نہریں بنا دیگا۔ یہ تمام چیزیں تمہیں میسر آجائیں گی۔ بشرطیکہ تم اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لو۔

بارش کے لیے استغفار

بارش کے باب میں بھی ایسا ہی آتا ہے۔ بارش رک جائے، قحط پڑ جائے تو استغفار کیا جائے ایک دفعہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا۔ قحط سالی ہے، بارش نہیں ہو رہی ہے تو آپ نے استغفار کیا اور لوگوں سے بھی استغفار کرنے کو کہا۔ کسی نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے استغفار کیا ہے اور اس کی تعلیم دی ہے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے۔ تو آپ نے یہی آیت پڑھی۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے

ہیں۔ اِستسقا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا سے گناہوں کی معافی مانگے، اور دعا کرے کہ مولا کریم! ہماری کوتاہیاں معاف فرمادے اور اس کے نتیجے میں ہم پر اپنی رحمت نازل فرما۔

نمازِ استسقاء کی حقیقت

یہ عام طریقہ ہے۔ کہ جب بارش نہ ہو رہی ہو تو کھلے میدان میں نکل کر دو رکعت نمازِ استسقاء ادا کی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد بارش کی دعا کی جاتی ہے۔ تاہم استسقا کی حقیقت اتنی ہے۔ کہ گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔ اگر دو نفل پڑھ لیے جائیں تو فبہا، اگر نفل نہ بھی پڑھے جائیں تو یہ ضروری نہیں ہیں۔ یہ مستحبات میں ہے۔ مقصد استغفار اور دعا ہے۔ بعض اوقات فرض نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کر لی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ایک آدمی نے آ کر شکایت کی کہ حضرت! پانی نہیں مل رہا ہے۔ جانور ہلاک ہو رہے ہیں۔ تو آپ نے خطبے کے دوران ہی بارش کے لیے دعا فرما دی تھی۔

ہر پریشانی کا حل۔ استغفار

حضرت حسن بصریؒ سے ایک روایت منقول ہے۔ کہ اُن کے پاس مختلف قسم کے لوگ آئے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! قحط سالی ہو رہی ہے۔ آپ نے فرمایا استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری بیوی بانجھ ہو گئی ہے بچہ نہیں جنتی۔ فرمایا۔ استغفار کرو۔ ایک اور شخص کہنے لگا۔ ہماری کھیتی باڑی خراب ہو گئی، فصل نہیں دیتی۔ آپ نے اس کو بھی فرمایا، استغفار کرو۔

الغرض مختلف قسم کی پریشانی والے لوگوں کو آپ نے ایک ہی جواب دیا کہ استغفار کرو۔ تو ایک شاگرد نے دریافت کیا۔ کہ حضرت آپ نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ تو فرمانے لگے کہ یہ قرآن پاک کا مفہوم ہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام نے نہیں فرمایا تھا کہ اپنے رب سے استغفار کرو اس کے بدلے میں بارش برسے گی، مال اور اولاد میں برکت ہو گی اور پانی کی سیرابی نصیب ہو گی۔ اِن لوگوں نے یہی چیزیں تو طلب کی تھیں، لہٰذا میں نے ان کو ایک ہی جواب دیا کہ اپنے رب سے استغفار کرو۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض اوقات لوگ ایمان بھی لاتے ہیں، استغفار بھی کرتے ہیں، مگر اُن کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں۔ بارش نہیں ہوتی، اولاد نہیں ملتی یا کوئی اور پریشانی دور نہیں ہوتی۔ تو اس اشکال کا جواب کیا ہے؟ حالانکہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم استغفار کرو تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، بارش ہو گی، اولاد ہو گی، مال کی فراوانی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی

تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ استغفار کے صلے میں مطلوبہ مقاصد کا حصول محض قوم نوح کے لیے تھا، عام اقوام کے لیے نہیں تھا۔ مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں چالیس سال تک قحط مسلط رہا، عورتیں بانجھ ہوگئیں اور ان لوگوں کو دیگر پریشانیاں لاحق ہوگئیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں یہ نسخہ بتایا تھا۔ یہ خصوصیت اُسی قوم کے لیے تھی۔

استغفار سے روحانی خوشی

یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایمان اور استغفار کا نتیجہ یقیناً اچھا ہوتا ہے اس کے نتیجے میں یا تو مطلوبہ چیز مل جاتی ہے یا اس سے بہتر کوئی چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ جو شخص استغفار کرے گا، اُسے روحانی خوشی یقیناً حاصل ہوگی۔ یا پھر رضا بالقضا کی صورت میں نہایت اچھا صلہ میسّر آئے گا اگر اُسے روحانی خوشی حاصل ہو جائے یا اللہ تعالےٰ کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ مال، اولاد اور بارش سے یقیناً بہتر ہے۔

استغفار کی کثرت کا حکم

اسی لیے کثرت سے استغفار کرنے کا حکم ہے۔ صحابہ کرامؓ بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم بعض اوقات ایک ایک مجلس میں سَو سَو دفعہ استغفار کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ تَوَّابٌ غَفُوْرٌ، تَوَّابٌ رَحِیْمٌ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ فرمایا جو سچے دل سے یہ سید الاستغفار پڑھے گا، تو اس کے گناہ اگر سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے، تو خدا تعالےٰ معاف فرمائے گا۔ اس میں اسم اعظم بھی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی استغفار کے الفاظ ہیں اُن کے پڑھنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے۔ کہ محض زبانی رٹ نہ لگائے بلکہ دل کی گہرائیوں سے استغفار کے الفاظ پڑھے گا تو اللہ تعالےٰ اُس کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں گے۔

فوت شدہ والدین کے لیے استغفار

بیہقی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ مرنے والے لوگ منتظر رہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی دعا کرے یا صدقہ خیرات کرے۔ جب ان چیزوں کا ثواب انہیں پہنچتا ہے تو انہیں بڑی راحت ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص کو اپنے اعمال کی نسبت سے زیادہ بلند درجہ حاصل ہوگا۔ اُس کو تعجب ہوگا اور وہ عرض کرے گا، باری تعالےٰ! میرے اعمال تو اس قابل نہیں تھے جس قدر درجہ تو نے مجھے عطا کیا۔ تو اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِکَ لَکَ یہ درجہ تجھے تیرے بیٹے کے استغفار کرنے کے صلے میں عطا ہوا ہے وہ تیرے لیے بخشش

مانگتا ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ اسی لیے حضور علیہ السلام نے تعلیم دی کہ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کیا کرو۔ تاکہ اُن کے گناہ معاف ہوں اور درجات بلند ہوں۔ استغفار ایسا مفید وظیفہ ہے۔ ہر لائق بیٹا اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کرتا ہے۔

استغفار گناہوں کی میل دور کرتا ہے

قرآن پاک میں استغفار کا بیان کثرت سے آیا ہے۔ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ اللہ کے سوا گناہوں کو کون معاف کرنے والا ہے ؟ معافی دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ انسان کو عاجزی اور کثرت سے استغفار کرنی چاہیئے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ استغفار تسبیح و تہلیل سے بھی زیادہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ استغفار انسان کے گناہوں کو اس طرح دور کرتی ہے جس طرح صابن کپڑے کے میل کچیل کو دور کرتا ہے۔ تسبیح تو بمنزلہ خوشبو کے ہے۔ اگر استغفار سے میل کچیل دور ہو جائے تو تسبیح و تہلیل کی تھوڑی سی خوشبو بھی بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اور انسان کی روح نکھر جائیگی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ کہ استغفار کثرت سے کرنی چاہیئے۔ اِس کے صلے میں دنیا میں خیر و برکات حاصل ہوں گی۔ اگر یہ نہ مِل سکیں تو اس سے بہتر نعمت یعنی روحانی مسرت تو ضرور حاصل ہوگی۔ قیامت میں نیکیوں کا ذخیرہ میسّر آئے گا۔ اور اگر رضا بالقضاء کا مقام حاصل ہوگیا تو بندہ بہت بلند مقام پر چلا گیا۔

ہر نبی کا وظیفہ۔ استغفار

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا میں بیان کردہ جس طرح تبلیغ کے طریقے تمام لوگوں کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ اسی طرح طریقہ استغفار بھی تمام بنی نوع انسان کے لیے واجب العمل ہے۔ تمام انبیاء کرام نے استغفار کا طریقہ اپنایا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عمل کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ "یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ فیصلے کے دن میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیگا۔ تو گویا استغفار کرنے کا۔ معافی مانگنے کا دستور العمل بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمام انسان اِس طرح اپنے پروردگار سے کوتاہیوں کی معافی طلب کریں۔ اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

دلائلِ توحید

استغفار کی حقیقت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر کرنے کے بعد اگلی آیات میں توحید کے دلائل سمجھائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ دلائل کا تعلق انسان کے اپنے وجود سے ہے اور کچھ خارجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصد اِن دلائل سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

اور اُس کی قدرت تامہ فوراً سمجھ میں آجائے۔ فرمایا۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کہ اللہ کے وقار سے خوف نہیں کھاتے۔ رجا کا معنیٰ امید بھی ہوتا ہے اور خوف بھی یہاں پر یہ دونوں معنیٰ لگتے ہیں۔ یعنی تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی، وقار اور اس کی عظمت سے نہ امید رکھتے ہو۔ نہ خوف کھاتے ہو اور نہ ایمان قبول کرتے ہو۔

تخلیقِ انسانی

دلائل توحید کے سلسلے میں پہلے انسان کی پیدائش کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختلف طریقوں سے پیدا فرمایا۔ ذرا غور کرو کہ تمہاری پیدائش کس طرح ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب تم کچھ بھی نہیں تھے، جیسا کہ سورۃ دھر میں ہے "هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" تم کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں عناصر کی شکل میں انسان کی تخلیق کی۔ یہ غذا جو انسان کھاتا ہے، یا مٹی وغیرہ یہ عناصر (ELEMENTS) ہیں۔ پھر انسان کو غذا ملی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم میں مختلف مواد پیدا کئے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا، کیا تم غور نہیں کرتے، ہم نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ اور پھر نسل انسانی کو قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ پھر قطرۂ آب میں تبدیلیاں پیدا کیں، پھر اس کو گوشت میں تبدیل کیا پھر اس میں ہڈیاں پیدا کیں۔ اور پھر اس کے اوپر چمڑا لگا دیا۔ اعضاء بنائے "فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ" اب کہاں عناصر اور کہاں انسان جیسی ہستی۔ "فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا" اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ قرآن پاک نے جگہ جگہ انسان کی توجہ اس کی پیدائش کی طرف دلائی ہے۔ "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" انسان اپنی وجہ تخلیق کی طرف غور کرے کہ وہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے کیا بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر تخلیق انسانی ایک بہترین دلیل ہے۔

علاوہ ازیں، انسان کا صرف وجود ہی تخلیق نہیں کیا، بلکہ اس میں ظاہری اور باطنی قویٰ پیدا کئے۔ باطنی قویٰ میں روح، نفس، عقل اور دیگر باطنی حواس رکھے۔ ان میں جتنے لطائف ہیں وہ ملبند سے ملبند چلے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ آخری لطیفہ نور القدس سے بھی بڑھ کر حجر بحت ہے۔ جس کے اندر تجلی الٰہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری قویٰ کا تعلق ہے، قرآن پاک کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان سے زیادہ حسین و جمیل کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ

نے سب سے احسن شکل وصورت انسان کو عطا کی۔ تو گویا یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی وحدنیت کی دلیل ہیں۔

آسمانوں کی تخلیق

انسانی تخلیق کے بعد آسمانوں کی تخلیق کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالےٰ نے سات آسمانوں کو کیسے تہ بر تہ پیدا کیا۔ جو آسمان ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ آسمانِ دنیا ہے جس کو اللہ نے ستاروں اور سیاروں سے مزین فرمایا۔ سورۃ ملک میں ارشاد ہے زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ" آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے زینت بخشی۔ اِن کے حسن وجمال کا مشاہدہ کرنا ہو تو رات کے اندھیرے میں کرو۔ باقی چھ آسمان اِس سے اوپر تہ بر تہ ہیں۔ اور سب سے اوپر بہشت ہے یہ بھی اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کی نشانی ہے۔

شمس وقمر کی ضیاپاشیاں

آسمانوں کا ذکر کرنے کے بعد چاند اور سورج کی تابانیوں کو بطور دلیل پیش کیا ارشاد ہوتا ہے۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا اور اِن آسمانوں کے اندر چاند کو نور بنایا۔ چاند کی دھیمی دھیمی اور میٹھی میٹھی چاندنی کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے کئی مفاد وابستہ کر رکھے ہیں۔ پھلوں میں رطوبت، رس اور مٹھاس چاند کی مرہونِ منت ہے۔ اور پھر اندھیری راتوں میں روشنی کا مینار بھی ہے۔ اسی طرح سورج کے متعلق فرمایا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ اور سورج کو روشن چراغ بنایا۔ اس کی روشنی اور حرارت میں بے شمار مفاد ہیں۔ حیوانات، نباتات، جمادات ہر چیز کے لیے سورج کی حرارت اور روشنی لازمی ہے۔ ورنہ کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔

اب تو سائنس کا زمانہ ہے۔ ایٹمی دور ہے۔ انسان سورج کی شعاؤں سے بہت کام لینے لگا ہے۔ جوں جوں تیل کے ذخائر ختم ہو رہے ہیں انسان سائنسی ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اب سورج کی شعاعوں سے گھروں میں چولہے گرم کئے جائیں گے۔ کھانا پکایا جائے گا اور بے شمار کام لیے جائیں گے جس دن سے اللہ تعالےٰ نے سورج کو پیدا کیا، اِس کا خزانہ برابر چل رہا ہے۔ انسان جن ذخائر کو نکالتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے سورج میں روشنی اور حرارت کا ایسا خزانہ رکھا ہے کہ جب تک نظامِ شمسی (SOLAR SYSTEM) کو قائم رکھنا منظور ہے، یہ چلتا رہے گا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ایک دن آئے گا جب سورج کو بے نور کر دیا جائے گا۔ اس کی تمام طاقتیں چھین لی جائیں گی۔ جیسا فرمایا اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ یعنی جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔

فرمایا جو شخص چاند اور سورج کی ضیا پاشیاں اور اُن سے مستفید ہو کر بھی اِن سے دلیل نہیں پکڑتا اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہیں لاتا، وہ بالکل عقل کا اندھا ہے اُسے ذرا بھی تمیز نہیں۔

انسان ہر حالت میں زمین سے وابستہ ہے

اگلی دلیل کے طور پہ فرمایا، ذرا غور کرو وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ اللہ تعالےٰ نے تمہیں زمین سے بطور نباتات پیدا کیا۔ انسان کی ابتدا بھی مٹی سے ہوئی اور پھر اس کی خوراک کا ذریعہ بھی زمین ہی کو بنایا۔ انسان کی غذا کو زمین سے پیدا کیا۔ اگر غذا ہی نہ ہوگی تو مواد کہاں ہوں گے۔ مواد نہیں تو خون پیدا نہیں ہوگا۔ اور انسانی زندگی باقی نہیں رہے گی۔ گویا تخلیق اور زندگی کی بقا کا انحصار زمین پہ ہے۔

زمین کی وابستگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا پھر تمہیں زمین ہی میں واپس لوٹائے گا۔ جب مقررہ وقت پہ انسان کی موت واقع ہوگی تو زمین میں ہی دفن ہوگا جیسا سورۃ عبس میں فرمایا ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ " پھر موت دی اور قبر میں ڈال دیا۔ تو گویا اس کی واپسی کی جگہ بھی زمین ہی ٹھہری۔ اور پھر قیامت کو اسی زمین سے ہی اٹھایا جائے گا۔ دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ فرمایا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى " یعنی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ نکالیں گے ۔۔۔۔ فرمایا۔ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۔ اسی میں تم کو لوٹائیگا اور پھر اسی سے تم کو نکالے گا۔ تو گویا انسان کی توجہ اس طرف دلائی کہ تم ہر روز لوگوں کو پیدا ہوتے اور مرتے دیکھتے ہو، اسی پر قیاس کر کے دوبارہ اٹھائے جانے پر بھی ایمان لے آؤ۔ اور ان مشاہدات کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل پکڑو۔

زمین سے وابستگی کی ایک اور حقیقت بیان کی۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا۔ اللہ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا جس پر آرام کرتے ہو۔ نہ بہت سخت ہے نہ بہت نرم بلکہ اسے انسان کے حسب حال بنایا۔ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ تاکہ اس کے نشان زدہ کشادہ راستوں پر چل سکو۔ زمین پہ بے شمار راستے بنا دیے۔ تاکہ لوگ اپنی معاشی ضروریات کے لیے سفر اور نقل و حمل کر سکیں۔

آسمانی راستے

حضرت علیؓ نے خطبے کے دوران فرمایا۔ کہ اے لوگو! میں زمین کی نسبت آسمانی راستوں

کو زیادہ جانتا ہوں۔ آسمانی راستوں سے مراد ایمان اور نیکی کے راستے ہیں۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں جن راستوں پر چل کر تم قربِ الٰہی اور رضائے خداوندی حاصل کر سکتے ہو۔ زمینی راستوں سے تو تم واقف ہو جن سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہو، مگر آسمان کے راستے مجھ سے پوچھو، جو ایمان، نیکی اور اطاعت کی طرف جاتے ہیں۔

الغرض نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے یہ تمام مشاہدات پیش کئے اور توحید کی دعوت دی۔ کہ ان دلائل کی موجودگی میں تم اللہ کی وحدانیت پہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

درس چہارم ۴ — آیت ۲۱

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾

ترجمہ :۔ نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا اے پروردگار بیشک انہوں نے میری نافرمانی کی ہے۔ اور ان لوگوں نے اتباع کیا ان کا جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے سوائے خسارے کے کچھ زیادہ نہ کیا۔ ﴿۲۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ نوح میں نبوت اور رسالت، طریقہ تبلیغ، توحید اور قیامت کا ذکر ہے اور بنیادی عقائد ہیں ——— تو گویا اس سورۃ میں منکرین توحید کا رد، مشرکوں اور کافروں کی مذمت اور ساتھ ساتھ جزائے عمل کا بیان ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ اور اس میں اُس پیغام کا بیان ہے جو انہوں نے اپنی قوم تک پہنچایا، یعنی اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ۔ عبادت صرف اللہ کی کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ دنیا و آخرت کا فائدہ اسی میں ہے۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام کے اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کرنے اور مصائب و تکالیف اٹھانے کے باوجود "وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ" بہت کم لوگ ایمان لائے، وہی ستر آدمی جو کشتی پر سوار ہوئے۔ باقی ساری قوم ایمان سے خالی گئی۔

آخر کار نوح علیہ السلام نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی۔ کہ مولا کریم میں نے اپنی قوم کو صبح اور شام دعوت دی، برملا دعوت دی، علی الاعلان دعوت دی اور پوشیدہ طور پر دعوت دی مگر یہ ایمان نہ لائے۔ اس کے بعد ان دلائل توحید کا ذکر کیا جو انسان کے اپنے وجود سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض خارجی دنیا سے متعلق ہیں مگر قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آیت زیر درس میں قوم کی نافرمانی اور دولت مند لوگوں کے اتباع کا ذکر ہے۔

نام اور لقب

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام عبد الغفار تھا۔ اور نوح لقب تھا۔ نوح کا لفظ نوحہ کے مادے سے ہے۔ جس کا معنی رونا اور گریہ وزاری کرنا ہے۔ چونکہ نوح علیہ السلام قوم کی حالت زار پر کثرت سے روتے رہے، نوحہ کرتے رہے۔ لہٰذا ان کا لقب نوح پڑ گیا۔

اتباع رسول فرض ہے

تمام انبیائے کرام کا یہ فرض منصبی رہا ہے۔ کہ وہ قوم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی

اسی سے ڈرائیں اور اپنے اتباع کا حکم کریں۔ جیساکہ نوح علیہ السلام نے بھی کیا اور قوم کو دعوت دی۔ "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ"۔ اسی طرح ہر قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے نبی کا اتباع کرے۔ خود قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے گویا اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کی۔ کیونکہ نبی خود نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی مطلق اطاعت بھی لازم ہے۔ وہ خدا کا نائب ہوتا ہے، اس کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے۔ اللہ کی اطاعت اس لیے کہ وہ مالک و معبود ہے۔ اور نبی کی اطاعت اس لیے کہ وہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا نبی کی اطاعت سے سرتابی کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ عام صلحاء، اولیاء یا علماء کی اطاعت سے انکار کرنے والا کافر نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اطاعت اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ وہ تبلیغ رسالت کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے باپ سے کہہ دیا تھا "فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا"۔ اے میرے باپ! میری بات مان لے، میں تجھے سیدھا راستہ دکھاتا ہوں۔ کہ صراطِ مستقیم میرے پاس ہے۔

اس ضمن میں اپنے باپ پر واضح کیا کہ "قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ"۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ میرے پاس اس کا علم ہے۔ یعنی قطعی اور یقینی علم سوائے نبی کے کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ اسی لیے نبی کی اطاعت مطلقاً فرض ہوتی ہے۔ باقیوں کی اطاعت فرض نہیں ہے۔

صاحب مال و دولت کا اتباع

الغرض حضرت نوح علیہ السلام اپنی دعا میں اللہ تعالےٰ سے عرض کرتے ہیں۔ کہ میری قوم نے میرا اتباع کرنے کی بجائے "وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا" یعنی میری قوم نے ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال اور اولاد نے انہیں سوائے خسارے کے کچھ نہ پہنچایا۔ یعنی میرا کہا ماننے کی بجائے دولتمندوں، رئیسوں اور صاحب مال و اولاد کا اتباع کیا۔ جس طرح انہوں نے کہا اسی طرح میری قوم نے کیا۔ اور اس طرح غلط روش پر چل نکلے۔ اگرچہ مال و اولاد کی کثرت ایک نعمت ہے۔ مگر اکثر و بیشتر اللہ تعالےٰ سے غافل کرنے کا ذریعہ بھی ہے آخرت کو فراموش کرنے کا ایک قوی سبب ہے۔ دنیا کے اکثر متمولین نے غرور و تکبر کے ساتھ یہی کہا۔ "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا"۔ ہمارا مال اور اولاد زیادہ ہے۔ ہمیں کون پوچھنے والا ہے۔ کون سزا دینے والا ہے۔ جیساکہ پچھلی سورۃ میں گذر چکا ہے "اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ"۔

یہ بدبخت رئیس محض اس لیے انکار کرتا ہے کہ اللہ نے اسے مال اور اولاد دے رکھا ہے۔ ولید بن مغیرہ کے دس بیٹے تھے۔ آگے بھی آئے گا وَبَنِيْنَ شُهُودًا۔ جب بیٹے مجلس میں حاضر ہوتے تھے تو بڑی رونق ہوتی تھی۔ حدیث شریف میں ایک دوسرے شخص ابوالرجال کا ذکر آتا ہے۔ اُس کے بھی دس جوان بیٹے تھے، مجلس میں آتے تھے۔ مشاورت میں حصہ لیتے تھے، صلح و جنگ میں شریک ہوتے تھے اور وہ اس پر اتراتا تھا تو گویا اولاد کی کثرت اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو مال و اولاد کی کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ کوئی خال خال ہی ایسا ملے گا۔ ورنہ نو ہزار نو سو ننانوے معزور ہی ہونگے۔

سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معیشت

وہ مال جس کی بدولت لوگ تکبر کرتے ہیں، سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا مرہون منت ہے۔ اور یہ نظام ہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ جس میں نہ مال جمع کرنے پر کوئی پابندی ہے اور نہ خرچ کرنے میں۔ جس ذریعے سے چاہو مال کماؤ۔ اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ اسی طرح جس کام میں چاہو خرچ کرو، کوئی رکاوٹ نہیں۔ سود کی کمائی ہو یا شراب کے ٹھیکہ کی، خنزیر کی تجارت ہو یا تھیٹر کی آمدنی، اس میں کوئی پابندی نہیں۔ خرچ کرنے میں حقوق العباد کی پروا نہیں، یتامیٰ و مساکین کا خیال نہیں، زکوٰۃ اور صدقہ خیرات کی طرف توجہ نہیں، محض اپنی عیش و عشرت سے غرض ہے۔ یہ اسی سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی لعنت ہے۔

اشتراکی نظام معیشت بھی ویسا ہی لعنتی ہے جیسے روس، چین اور ویت نام کا نظام۔ وہ تو آسمانی شریعت کو مانتے ہی نہیں، وہ تو خدا کی ہستی کا ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کا تو یاجوج ماجوج والا نظریہ ہے۔ کہ زمین والوں کو ہم نے مغلوب کر دیا ہے۔ اور اب آسمان والے کو مارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ مذہبی لوگوں نے اپنا کام چلانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ سٹالن کے کلام میں موجود ہے کہ خدا کا عقیدہ ہوّا ہے۔ اور ہم اس ہوّے کو مٹانا چاہتے ہیں۔ الغرض اشتراکی اور سرمایہ دارانہ دونوں نظام لعنت ہیں۔ اسلام کا نظام معیشت ہی فطری نظام ہے۔ جو کمانے اور خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز سکھاتا ہے۔

سوسائٹی کے اعضائے فاسدہ

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اعضائے فاسدہ کو کاٹنا ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی چوتھی دفعہ چوری کرے اُسے قتل کر دو۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں، یہ ٹھیک ہے۔ اور

یہ تعزیر اً قتل ہے ۔ ایک دفعہ ، دو دفعہ ، تین دفعہ ، اب جو باز نہیں آتا ، اُسے شوٹ کر دو ، یہ سوسائٹی کے لیے پھوڑا ہے ۔ اگر اس کو باقی رکھا گیا ، تو سارے جسم کو خراب کرے گا ۔ لہٰذا ہر عقلمند ڈاکٹر اُسے کاٹ دینے کا ہی مشورہ دیگا ۔ جس طرح کسی انسانی جسم کا پاؤں یا ران یا بازو کاٹنا ضروری ہو جاتا ہے اُسی طرح سوسائٹی کے عضوِ فاسد کو بھی ختم کرنا ضروری ہے ۔ تاکہ باقی سوسائٹی میں گندگی نہ پھیلنے پائے آج کل ایران والے بھی یہی کچھ تو کر رہے ہیں ۔ یہ منشیات کی سمگلنگ کرنے والے بھنگ ، چرس ، شراب کا کاروبار کرنے والے ، پچیس تیس آدمی اُڑا دیے کہ یہ باز نہیں آتے تھے ، سوسائٹی کے لیے بمنزلہ ناسور تھے ۔ انہوں نے کمائی میں حلال وحرام کی پرواہ نہیں کی ، انہیں باقی نہیں رہنا چاہیئے ۔

لائسنس یافتہ رنڈیاں

سرمایہ داری نظام میں اسی قبیل کا ایک دوسرا ذریعہ معاش ہے ۔ رنڈیاں لائسنس لے کر چکلے میں بیٹھ جاتی ہیں ۔ حکومت خود سرپرستی کرتی ہے ۔ اُسے آمدنی سے غرض ہے ، چاہے کسی راستے سے آئے ۔ امام حلبیؒ نے سیرت میں لکھا ہے کہ پہلی صدی کے آخر تک مسلمانوں کے زیر تسلط کسی بھی علاقے میں کوئی ایک بھی قحبہ خانہ نہیں تھا ۔ مسلمان آدھی دنیا سے زیادہ حصے پہ چھائے ہوئے تھے ، مگر کسی جگہ کوئی ایک لائسنس یافتہ رنڈی نہیں تھی ۔ برخلاف اس کے انگریز کے زمانے میں یہاں پچھتر فیصد کنجریاں مسلمان تھیں ۔ کلکتہ ، بمبئی ، مصر ، ہر جگہ یہ لعنت مسلمان عورتوں نے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی ۔ ایران کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے ۔ وہ شیعہ ہیں اور متعہ کر لیتے ہیں ۔ ہندو ہو یا سکھ ہو ، سب کے سب متعہ کر لیتے ہیں ۔ پیسہ کمانے سے غرض ہے ۔ حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں ۔ اس نظام کی یہی خصوصیت ہے ۔

حلال وحرام کی تمیز

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ وَاَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ ۔ اللہ سے ڈرو اور طلبِ رزق میں صحیح راستے پر چلو ۔ برے راستے سے کمانا حرام ہے ۔ ایسی کمائی میں برکت نہیں ہوگی عبادت قبول نہیں ہوگی ۔ اس سے صدقہ وخیرات منظور نہیں ہوگا اور آگے جہنم کا توشہ بنے گا ۔ مسند احمد کی روایت میں ہے ۔ کہ حرام مال چھوڑ جانا ، جہنم کے راستے کا توشہ ہے ۔ کپڑا حرام مال سے پہنا نماز قبول نہیں ہوگی ، خوراک حرام مال سے کھائی دعا قبول نہیں ہوگی ۔ یہ الگ بات ہے ۔ کہ مفتی اور قاضی نماز کی ادائیگی کا فتویٰ دے دیں مگر قبولیت دوسری چیز ہے ۔ اگر غسل کر کے صاف جسم اور پاک کپڑے کے ساتھ نماز ادا کی گئی تو مفتی یہ تو نہیں کہے گا کہ نماز ادا نہیں

ہوئی، مگر نماز کا مقبول ہونا اور چیز ہے۔

ابو درداؓ کہتے ہیں —— کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میری یہ دو رکعت نماز بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گئی ہے تو بخدا میرے نزدیک یہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ کیونکہ قبولیت کا معیار یہ ہے کہ "اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ" یہ مقبول اس کی ہوگی جو متقی ہو گا۔ کفر و شرک سے بچنے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہو گا۔

شادی بیاہ کی رسوم

جس طرح طلبِ رزق میں جائز ناجائز کا خیال نہیں رکھا جاتا، اسی طرح خرچ کرتے ہیں بھی کسی بات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ دولت مند لہو لعب میں مشغول ہیں، رسومات پر بلا وجہ بھاری رقوم خرچ کر رہے ہیں۔ پچھلے جمعہ میں ایک بزرگ نے بتایا کہ ایک منگنی کی رسم میں چالیس جوڑے کپڑے تو برادری کے لوگوں کو دئیے ہیں اور دس جوڑے خاص قسم کے خاص عورتوں کو دیے گئے۔ اور کھانا صرف نو دیگیں پکائی گئیں۔ یہ صرف منگنی ہے۔ اور شادی پر کیا ہو گا۔ یہ ہمارے ملک کا رواج ہے۔ دولت مند کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ مکانات روشن ہوتے ہیں۔ سینکڑوں قمقمے جلتے ہیں۔ کیا یہ اسراف و تبذیر نہیں کیا اس پر لعنت نہیں برستی۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کی جارہی ہیں۔ دیکھا دیکھی دوسرے بھی رسومات کی ادائیگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ نتیجہ سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے۔ "مالِ حرام بود بجائے حرام رفت" حرام کی کمائی حرام کے راستے ہی خرچ ہو گی۔ کھیل تماشے میں جائے گی۔ جوئے اور شراب میں جائے گی یا فحاشی کے کاموں میں صرف ہو گی۔

فوتیدگی کی رسوم

اسی طرح مرنے کی رسومات میں بھی بے جا اسراف کیا جاتا ہے۔ یہ تیجا ہے، یہ دسواں ہے۔ یہ چالیسواں ہے، مردہ چاہے عذاب میں مبتلا ہو جائے، رسوم ادا ہونی چاہئیں۔ ہمارے ملنے والے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک شخص کی لاہور میں شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد بیوی ایک چھوٹا بچہ چھوڑ کر فوت ہو گئی۔ بیچارہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ تین دن کے بعد جانے لگا کہ کوئی مزدوری کروں، بچے کی پرورش بھی ذمے ہے۔ تو ساس اور سسر کہنے لگے، الّو کے پٹھے! کدھر جاتے ہو، آگے جہلم آ رہا ہے، وہ کون کرے گا۔ اس کے لیے رقم ادا کر کے جاؤ۔ بیچارے کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ناچار گھر کے برتن بیچ کر تین سو روپے سسرال والوں کو دیے تاکہ جہلم کی رسم ادا کر سکیں تب کہیں جا کر اس کی جان

جھونٹی اور محنت مزدوری کے لیے جا سکا۔ یہ ہے مال و دولت جس نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا

مال اچھا ساتھی ہے

ہاں تو ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مال و دولت کی محبت میں انسان کس حد تک اپنے مالک سے دُور ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یہی مال ایک اچھا ساتھی بھی ثابت ہو سکتا ہے حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ مال اُس شخص کے لیے اچھا ساتھی ہے لِمَنْ اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ۔ جو اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرتا ہے۔ ورنہ یہی مال وبالِ جان ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی دیوار کے سامنے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ آئے۔ آپ نے فرمایا ھُمُ الْاَقَلُّوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلَّا مَنْ قَالَ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَ ھٰکَذَا۔ جو لوگ دنیا میں بہت مال و دولت رکھتے تھے، کل قیامت کو ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں جس نے دائیں بائیں ہر طرف حقوق ادا کئے، وہ وہاں بھی دولت مند ہوں گے۔ ورنہ عام طور پر آج کا دولت مند کل کا قلاش ہوگا۔ اُس نے حقوق ادا نہیں کئے۔ دولت عیاشی اور فحاشی میں لٹائی۔ کمائی بھی ناجائز طریقے سے کی۔ خرچ بھی ناجائز کیا۔

اسلامی نظام معیشت

اسلامی نظام میں کمانے پر بھی پابندی ہے۔ اور خرچ کرنے پر بھی۔ اسلام حرام ذرائع سے مال اکٹھا کرنے سے منع کرتا ہے، اور حلال ذرائع کی ترغیب دیتا ہے۔ جب حلال راستے سے مال آ جائے تو پھر سارے حقوق ادا کرو، اس کے بعد جو بچ رہے اُسے اپنے مصرف میں لاؤ۔ کوئی جائداد خریدو، کوئی اور چیز خریدو، تمہارے لیے مباح ہے۔ اور اگر حقوق ادا نہیں کئے صرف دولت جمع ہی کرتے رہے۔ بیلنس برابر کرتے رہے، ذرائع آمدنی کی حلت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو پھر خرچ کرنے میں کون سی پابندی قبول کرو گے۔ بلڈنگ بازی پر خرچ ہو گا۔ ایک ایک بلڈنگ کے نقشہ تیار کرتے پر ستر ستر ہزار کی رقم اٹھ رہی ہے۔ کیا یہ اسراف و تبذیر کی حد نہیں ہے۔

اس سلسلے میں حکومت ہماری راہنمائی کر رہی ہے۔ وہ خود سر بفلک عمارات کی تعمیر میں لگی ہوئی ہے۔ قصر صدارت کی تعمیر پہ پینتالیس کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اب اندازہ لگاؤ کہ اسلام کا نام لینے والی مملکت میں قصر صدارت پہ اٹھنے والے اس قدر بھاری اخراجات کہاں تک جائز ہیں۔ وفاقی سیکریٹریٹ کی تعمیر پہ—— اربوں روپے خرچ کیے گئے اس کی تزئین کے لیے ستر ستر ہزار روپے کے قالین عمارات کے راستوں پہ بچھے ہوئے ہیں۔ جن پر لوگ جوتوں سمیت چلتے ہیں۔ خدا کا

غضب، اس قدر اسراف جس ملک کے اسی فیصدی لوگوں کو دو وقت کی پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہ ہو، صرف بیس فیصدی لوگوں کے پاس کوئی توازن یا وسائل ہیں، اس ملک میں اتنا عالیشان قصر صدارت اور سیکرٹریٹ بنانا کہاں جائز ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ قریش کو زمین نہیں خریدنے دیتے تھے کہ تم لوگوں کے لیے بڑا نمونہ قائم کرو گے۔ لہذا ضرورت سے زیادہ ضروریات زندگی مت حاصل کرو۔

الغرض موجودہ زمانے کے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام معیشت دونوں باطل ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے حاملین خدا کی ہستی کو مانتے ہوئے، انجیل کو برحق تسلیم کرتے ہوئے اس نظامِ باطل کو اپنائے ہوئے ہیں۔ جس میں چند آدمی عیش کرتے ہیں۔ اور دوسرے غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں، اشتراکی نظام انکارِ خدا اور انکارِ شریعت کی بنا پر لعنتی ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت ہی واحد نظام ہے جو آمد و خرچ کے حدود مقرر کر کے مخلوقِ خدا کے درمیان توازن قائم رکھتا ہے۔

معیارِ اتباع

آیت زیرِ درس میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس بنیادی خامی کی شکایت کی ہے جس کی رو سے انہوں نے مال و دولت کے زعم میں مبتلا ہو کر نبی کے اتباع کے بجائے سرمایہ دارانہ ذہنیت کا اتباع کیا۔ عرض کیا۔ قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي اے میرے پروردگار انہوں نے میری نافرمانی کی وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا اور ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال و اولاد نے سوائے خسارے کے کچھ فائدہ نہ کیا۔ مال و دولت والے لوگوں نے اپنے مال کی بدولت غلط نمونے قائم کئے رسوماتِ باطلہ پر عمل پیرا رہے۔ دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلاتے رہے انہوں نے نبی کے اتباع کے بجائے مال و دولت کو قابلِ تقلید جانا۔ کہتے تھے نبی کے پاس کیا ہے جو ہم اس کی پیروی کریں۔ یہ انسان ہو کر نبوت کا دعوے کرتا ہے نہ اس کے پاس مال و دولت ہے، نہ کوٹھی ہے، نہ فوج ہے، نہ باغات ہیں۔ ہم اس کا اتباع کیوں کریں۔ اتباع تو ان لوگوں کا ہونا چاہیئے جن کے پاس یہ سارے لوازمات موجود ہیں۔ تو گویا نوح علیہ السلام کے عدمِ اتباع کی وجہ یہ تھی اور اس قوم کا معیارِ اتباع نبوت کے بجائے سرمایہ تھا۔ اس آیت میں نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور یہی شکایت پیش کی۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۙ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾

ترجمہ:۔ اور انہوں نے تدبیر کی بہت بڑی تدبیر (۲۲) اور ان کی قوم کے سرکردہ لوگوں نے کہا کہ ____ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑ بیٹھنا اور ود، سواع، یغوث یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا (۲۳) اور تحقیق انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا۔ اور (اے پروردگار) ان ظالموں کیلیے سوائے گمراہی کے کچھ زیادہ نہ کر (۲۴)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس میں نوح علیہ السلام کی قوم کی حالت کا بیان تھا، جو انہوں نے اپنی دعا میں اپنے رب کے حضور پیش کی۔ اور نہایت دکھ کے ساتھ عرض کیا رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ یعنی اے اللہ! میری قوم نے میری نافرمانی کی اور وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا" اور ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال و اولاد نے انہیں سوائے نقصان کے کچھ اضافہ نہ کیا۔ یعنی مال و اولاد کی کثرت نے انہیں خود بھی دین سے محروم رکھا اور دوسروں کو بھی محروم کیا۔

اس درس کی آیات میں سے پہلی آیت میں قوم نوح علیہ السّلام کے ان داؤ پیچوں کا تذکرہ ہے جو انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلانے کے لیے آزمائے۔ دوسری آیت میں ان کے پانچ معبودانِ باطلہ کا بیان ہے جن کی پرستش پر وہ جمے رہے اور تیسری آیت میں نوح علیہ السلام نے اس گمراہی کا حال بیان کیا ہے جس میں قوم کے لوگ خود بھی مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے رہے۔

قومِ نوح کے داؤ پیچ

عرض کیا کہ میری قوم نے نہ صرف یہ کہ میری نافرمانی کی اور دولت مندوں کا اتباع کیا۔ بلکہ وَمَکَرُوْا مَکْرًا کُبَّارًا۔ انہوں نے تدبیر کی، بہت بڑی تدبیر۔ یعنی میری دعوت کو پھیلنے سے روکنے کے لیے انہوں نے بڑا داؤ پیچ کھیلا۔ کہ لوگ میری بات کو نہ مانیں۔ مکر کا معنی اخفی تدبیر ہوتا ہے۔ اور کُبّار مبالغہ کا صیغہ ہے۔ عُجَّاب اور قُرّاء کے وزن پر مثلاً کبیر بڑے کو کہتے ہیں، کُبار اوسط درجے کو اور زیادہ مبالغہ کرنا ہو تو کُبّار بولتے ہیں یعنی ادنیٰ درجہ، اوسط درجہ اور اعلیٰ درجہ یہ کُبّار مبالغہ کا

صیغہ ہے اور اس کا معنیٰ ہوا بہت بڑا داؤ۔ تو گویا اس قوم نے نبی کی مخالفت میں بہت سے داؤ چلائے جن کی تفصیل شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ نے اس طرح بیان کی ہے۔

نبوت میں شبہات پیدا کرنا

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پہلی تدبیر انہوں نے یہ کی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کے متعلق شبہات پیدا کیے۔ کہ یہ نبی نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے انبیاء کی نبوت کے متعلق مشرکین نے شک و شبہات پیدا کیے، قرآن پاک میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اور نوح علیہ السّلام کی بھی اسی طرح تکذیب کی گئی۔ یہ تو ہمارا بھائی ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، فلاں کا بیٹا ہے، کھاتا پیتا ہے، کاروبار کرتا ہے، اس کے بیوی بچے ہیں، یہ کیسے رسول ہو سکتا ہے۔ "مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِى الْاَسْوَاقِ" یہ کھانا کھانے والا اور گلیوں بازاروں میں چلنے پھرنے والا کیسے رسول ہو سکتا ہے گویا انہوں نے بشریت اور انسانیت کو رسالت کے خلاف سمجھا۔ سورۃ قمر میں حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق بھی ایسا ہی آتا ہے "اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ" کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کا اتباع کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو "اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ" ہم پاگل ہوں گے جو ایسا کریں گے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے "اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ" ہم تو تمہیں بیوقوف خیال کرتے ہیں جو تمام معبودان کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب میں کہا "يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ" اے میری قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں بلکہ "وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں تو رب العلمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں تاکہ اس کا پیغام تم تک پہنچاؤں۔

تو گویا قوم نوح کی پہلی مکاری یہ تھی کہ وہ آپ کی نبوت کے متعلق لوگوں میں شک و شبہات پیدا کرتے تھے۔ تاکہ لوگ آپ پر ایمان نہ لائیں۔

اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار

قوم نوح کا دوسرا داؤ یہ تھا کہ وہ خدا کی وحدانیت اور بعض اوقات اُس کے وجود کا ہی انکار کر دیتے تھے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں فرعون کے متعلق موجود ہے کہ وہ کہتا تھا۔ "مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" یہ رب العلمین کیا چیز ہے۔ کوئی رب نہیں۔ وہ اس قدر مغرور تھا۔ کہ کہتا تھا "مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ" میں اپنے علاوہ تمہارا اور کوئی معبود نہیں جانتا۔ تو اس طرح گویا حضرت نوح کی قوم کے لوگ بھی اللہ

تعالیٰ کے وجود اور اس کی الوہیت کا انکار کرتے تھے کہ جب خدا کی ذات کا انکار ہو جائے گا تو اس کو بھیجنے والے نبی کی خود بخود ہی تکذیب ہو گی۔ تو گویا مَکْرًا کُبَّارًا کی یہ بھی ایک صورت تھی۔

منظہر خدا کا عقیدہ

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب نبوت میں شبہات پیدا کرکے یا خدا کا انکار کرکے بھی ان کی چال کامیاب نہ ہوتی، تو وہ ایک اور حربہ استعمال کرتے۔ کہتے ہم مان لیتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور آپ اس کے رسول بھی ہیں مگر جن کی ہم پوجا کرتے ہیں، ان کے اندر بھی خدا کا ہی وجود ہے تو ہمیں ان کی پوجا سے کیوں ہٹاتا ہے۔ یہ بھی تو مظہر خدا ہیں۔ اس پراپگنڈا کی بنا پر جاہل لوگ سمجھتے تھے کہ یہ معبودان بھی خدا کے مقرب ہیں ان کی عبادت کرنے سے خدا راضی ہو گا، ان کے اندر خدا جلوہ گر ہے۔ یہ بھی انکی ایک چال تھی کہ لوگ نوح علیہ السلام کا کہنا نہ مانیں۔

مظہر خدا کا عقیدہ ہندوؤں کے اوتار والے عقیدے سے مشابہ ہے۔ یہ عقیدہ عیسائیوں، پرانے بابلیوں، مشرکوں اور مصریوں میں بھی پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی اور کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے بعض کلمہ گو مشرک بھی اس عقیدہ باطل میں مبتلا ہیں۔ جیسا کہتے ہیں۔ ؎

وہی جو عرش پر تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفےٰ ہو کر

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جلوہ گری سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ ان میں الوہیت کی کوئی صفت آگئی ہے تو یہ تو باطل ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق میں الوہیت کی کوئی بات نہیں آتی۔ الوہیت اور مخلوق متضاد چیزیں ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ معبودانِ باطلہ اور خدا تعالےٰ میں وجود قدرِ مشترک ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا وجود واجب ہے یعنی اپنی ذات سے ہے، جب کہ ان کا وجود اللہ تعالےٰ کا پیدا کردہ ہے۔ ایک واجب الوجود ہے اور دوسروں کا وجود ممکن ہے۔ اور ممکن الٰہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہونے میں نبی، جبریئل، بزرگ اور ساری مخلوق برابر ہیں تو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا معبود نہیں بن سکتی۔ جب کہ وہ سارے اپنے وجود میں خدا کی طرف محتاج ہیں۔ لہٰذا یہ اوتار یا مظہر خدا کا عقیدہ سرے سے ہی باطل ہے۔ یہ عقیدہ سخت ظالمانہ اور بدترین شرک والا عقیدہ ہے۔

اپنے علم پر تکبر

نبوت کے انکار کی ایک وجہ ان کا وہ محدود علم تھا جس پر غرور و تکبر کرتے تھے۔ قرآن پاک نے بعض بدبخت قوموں کا حال یوں بیان کیا فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ

مِّنَ الْعِلْمِ" اللہ کے رسول جب واضح باتیں لے کر آئے تو بعض مشرکین اپنے علم پر اترانے لگے اور نبی کی تعلیم کا انکار کر دیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس علم موجود ہے۔ تم ہمیں کیا سبق پڑھاؤ گے، ہم خوب جانتے ہیں۔ پرانے رومی کہتے تھے کہ نبیوں کا وعظ و نصیحت عام لوگوں کے لیے ہوتا ہے، ہم تو صاحب علم ہیں، حکمت و دانائی کے مالک ہیں، ہمیں ایسی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح یونانی حکمائ کہتے تھے کہ ہم مہذب، شائستہ، اور ہدایت یافتہ ہیں۔ ہمیں نبیوں کے اتباع کی ضرورت نہیں ہے۔ افلاطون اور دوسرے فلاسفر بھی یہی کہتے رہے کہ ہم عیسٰے علیہ السلام کا اتباع کیوں کریں، ہمارے پاس علم و حکمت کا خزانہ ہے نبی کا اتباع تو وہ کریں جو جاہل ہیں، جن کے پاس علم نہیں ہے۔ تو گویا اس طرح انہوں نے نبی کی پیروی سے انکار کیا۔ آج بھی اس قسم کے لوگ موجود ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ یہ مُلّا لوگ دقیانوسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس کیا ہے۔ ہمارے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی ہے، فلسفہ و حکمت ہے، علوم و فنون ہیں، ہمارے لیے ان کی پرانی باتیں کیا معنیٰ رکھتی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا جتنا بھی علم ہے وہ تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ قطعی اور یقینی علم تو نہیں ہے۔ کیونکہ قطعی علم صرف نبی کے پاس ہوتا ہے جو بجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی سارا ظن اور گمان ہے۔ سائنسی تجربات یا مشاہدات کو علم نہیں کہہ سکتے، نہ صنعت و حرفت اس شمار میں آتا ہے۔ بلکہ حقیقی علم اللہ تعالےٰ کی جانب سے نبی کے پاس آتا ہے۔ اور اُسی کا یہ انکار کرتے ہیں۔ نبی کی رسالت میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں تو گویا یہ ساری صورتیں مکرٍ و مکراً کُبَاراً کے تحت آتی ہیں۔

معبودانِ باطلہ پر اصرار

تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ سارے معبودانِ باطلہ کو ترک کر کے صرف ایک —— خدا کی پوجا کرو۔ اس تبلیغ کے جواب میں حضرت نوح کی قوم کے سرکردہ لوگوں نے کہا وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں میں آکر اپنے معبودوں کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔ یہ شخص تم سے تمہارے معبود چھڑانا چاہتا ہے مگر تم ایسا نہ کرنا بلکہ خاص طور پر وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۵ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔ قوم نوح کے اور بھی معبود تھے،

مگر یہ پانچ خاص معبود تھے، جن کو نہ چھوڑنے کی تلقین کرتے تھے، حضور علیہ السلام کے متعلق

بھی مشرکین نے کہا اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ”کیا تمام معبودان کو چھوڑ کر صرف ایک خدا پر قناعت کر لیں اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ“۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

شاہ عبد القادرؒ فرماتے ہیں کہ قوم نوح علیہ السلام ہر مقصد کے لیے الگ الگ معبود مقرر کر رکھے تھے۔ ان پانچ معبودانِ باطلہ کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

ودّ

ود :- ودّ مودّت سے ہے۔ عربی میں مودّت، محبت کو کہتے ہیں۔ تو ودّ گویا محبت کا دیوتا تھا۔ اسے مرد کی شکل میں بناتے تھے، جو کہ بڑا قوی اور حسین و جمیل ہو مرد کو فطرتاً عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ اس سے مقاربت کرتا ہے تو نسل پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ ودّ محبت کا دیوتا تھا۔ اس کی پرستش کرتے تھے، ہندو اس کو برہماجی مہاراج کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے کائنات کو ایجاد کرنے والا۔

سواع

سواع عربی زبان میں سکون و استقرار پر بولا جاتا ہے۔ اس کو حسن و جمال کی دیوی کہتے تھے۔ اور عورت کی شکل میں بناتے تھے۔ جس طرح عورت گھر کو چلاتی ہے، امور خانہ داری سرانجام دیتی ہے۔ اسی طرح یہ دیوی کائنات کو چلاتی ہے ان کا خیال تھا کہ دنیا کی قیومیت، استقرار اور ثبات اسی کے دم سے ہے۔ یہ دنیا کے کاروبار کو چلاتی ہے اور تھامتی ہے۔ ہندو اسے بشن جی کہتے ہیں۔

یغوث

یغوث، غوث کے مادے سے ہے۔ جس کا معنی ہے۔ فریاد رس۔ اس کو گھوڑے کی شکل میں بناتے تھے۔ گھوڑا بڑا تیز رفتار جانور ہے۔ جہاں ضرورت ہو تیزی سے مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے غوث کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب مصیبت میں غائبانہ طور پر پکارو، غوث صاحب فوراً مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ انسانوں کی فریاد رسی کرتے ہیں۔ اسی لیے قوم نوح کے لوگ یغوث کی پرستش کرتے تھے کہ وہ ان کی فریاد رسی کرتا تھا۔

یعوق

یعوق، عوق کے مادے سے ہے، جس کا معنی ہے حفاظت کرنے والا۔ تکلیف کو دور کرنے والا یہ شیر کی شکل میں بناتے تھے۔ یہ عقیدہ آج بھی موجود ہے۔ شیر خدا مشکل کشا کو آج بھی لوگ غائبانہ طور پر پکار رہے ہیں۔ دکن میں جگہ جگہ حضرت علیؓ کے نام پر شیر بنائے ہوئے ہیں۔ تو یہ مشکل کشائی والا عقیدہ قوم نوح میں بھی تھا حالانکہ قرآن پاک میں صاف طور پر موجود ہے بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (الانعام - ۴۱) اللہ کے سوا تکلیف کو کون دور کر سکتا ہے۔ تکلیف ہٹانے والا صرف اللہ ہے۔ تم بے شک پکارتے رہو، پھر بھی اس کی رضا پر منحصر ہے، اگر چاہے گا تو تکلیف کو رفع کر دے گا، وگرنہ پابند نہیں ہے، وہ اگر

کسی کو تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ اِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ" اگر خدا کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، مغلوب و محکوم کرنا چاہتا ہے تو ساری دنیا مل کر بھی اُس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتی۔

غوث کا عقیدہ اِس زمانے میں بھی عام ہے۔ خواجہ بہاؤ الدینؒ کے بارے میں غوث بہاؤ الدین کہتے ہیں۔ غوث الاعظم حضرت پیرانِ پیر شیخ عبد القادر جیلانی ہیں۔ یہ بھی غائبانہ امداد کرتے ہیں، لوگوں کی فریاد رسی کرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ قومِ نوح اور اِن لوگوں کے عقیدے میں کیا فرق ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ ولی اللہ تھے، اُن کے ہاتھ پر سوا لاکھ آدمیوں نے توبہ کی۔ انہوں نے کفر شرک کی بیخ کنی کی۔ اُن کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ غائبانہ فریاد رسی کرتے ہیں کہاں کا انصاف ہے؟ جس قدر ——— توحید کی تبلیغ انہوں نے کی، اُس زمانے میں اور کسی بزرگ نے نہیں کی۔ اُس کے اثرات آج تک موجود ہیں آپ ہفتے میں ایک دن جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مواعظِ حسنہ موجود ہیں ایک ایک حرف کو پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ان کے مقالات میں توحید ہی توحید ہے۔ ان کی تصنیف فتوح الغیب پڑھ کر دیکھو، شرک کی جتنی تردید انہوں نے کی ہے، اُس دور میں کسی بزرگ نے نہیں کی۔ آج وہی پیرانِ پیر غوث ہیں۔ انہیں فریاد رس بنا لیا گیا ہے۔ بزرگوں کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ عقیدت ہو کہ وہ بھی بندے تھے، خدا کی توحید کا درس دیتے تھے۔ لوگوں کو کفر و شرک سے ہٹاتے تھے، اُن کی وجہ سے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔

خواجہ بہاؤ الدین ذکریاؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے اب اُن کی قبر پر کتنا اونچا گنبد بنا ہوا ہے۔ قبر پر ہر منٹ میں پانچ آدمی سجدہ کرتے ہیں۔ کیا وہ یہی کام کرتے تھے، العیاذ باللہ۔ انہوں نے تو مشرکانہ عقائد کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا۔ کیا وہ کہہ گئے تھے کہ میری قبر پر گنبد بنا لینا؟ یہ تو بعد میں بادشاہوں نے بنا ڈالے اور یہ اڈے قائم ہو گئے۔

کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ کہہ گئے تھے کہ میرا گنبد بنانا، قبر کو پختہ کرنا، چِپس لگانا اور پر جگہ جگہ لائٹ جلائی جا رہی ہے ——— قبر پر پنکھے چلائے جا رہے ہیں۔ عقل کا تو بالکل ہی دیوالیہ نکل گیا۔ قبر کے اوپر ہوا کے پنکھے لگانے کا کیا فائدہ۔ عجیب عقیدہ ہے جو ملنگ مر گیا، اس کی قبر بنا لی، گنبد بنا لیا۔ یہاں وہ دیوانہ بیچارہ مر گیا۔ مجذوب تھا یا پاگل تھا۔ اب

اُس کا گنبد بنا لیا ہے، پوجا شروع ہو گئی ہے۔ حکومت ایسی خرافات کی سرپرستی کرتی ہے، خود گنبد بناتی ہے اور لوگوں کو خرافات کی ترغیب دیتی ہے۔ حالانکہ حکومت کا کام ان چیزوں کو مٹانا تھا۔ مگر ہو کیا رہا ہے۔ چادریں چڑھاؤ، گلاب کے پانی سے قبروں کو غسل دو، عرس جماؤ۔ قوالی کراؤ، اسراف کرو۔ لوگ سجدے کرتے ہیں، کرتے رہیں، جہنم میں جائیں، حکومت کو ٹیکس سے غرض ہے۔ ان اڈوں کی آمدنی حکومت اپنی مدوں میں خرچ کرتی ہے۔ کچھ کلرک کھا جاتے ہیں، کچھ نوکر کھاتے ہیں۔

نسر

نسر گدھ کو کہتے ہیں۔ گدھ کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے۔ یہ بڑا طاقتور پرندہ ہے۔ اس کی نگاہ بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ تو یہ معبود گدھ کی شکل میں بناتے تھے۔ کہتے تھے یہ بڑی تیزی سے مدد کے لیے پہنچتا ہے یہ عمر کا دیوتا ہے۔ اس کی وجہ سے عمر لمبی ہوتی ہے۔

معبود کیسے بنے؟

مذکورہ پانچ قسم کے معبود قوم نوح میں پائے جاتے تھے۔ حضرت عروہؒ بن زبیرؓ کی روایت میں ہے کہ یہ پانچوں آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ وَدّ ان میں بڑا تھا۔ یہ سارے نیک اور صالح لوگ تھے۔ جب یہ مر گئے اور کچھ زمانہ گزر گیا۔ تو شیطان نے لوگوں کو اس طرف راغب کیا اور انہوں نے ان کے مجسمے بنا لیے۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر پانچ بزرگوں کے نام ہیں (یہ حضرات ادریس علیہ السلام، شیث علیہ السلام یا آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ جب آدم علیہ السلام قریب المرگ تھے تو یہ پانچوں بیٹے اُن کے پاس موجود تھے) قوم نوح کے نیک آدمی تھے، جب یہ مر گئے تو لوگوں کو بڑا افسوس ہوا۔ کیونکہ ان کی نیکی کی وجہ سے لوگوں کو ہدایت نصیب ہوتی تھی۔ شیطان نے اُن کے دلوں میں رغبت ڈالی کہ ان کے مجسمے اور تصویریں بنا لو اور جہاں تم عبادت کرتے ہو انہیں وہاں رکھ لو تاکہ انہیں دیکھ کر تم عبادت کی طرف زیادہ راغب ہو سکو۔ کہ یہ بزرگ ایسی عبادت کرتے تھے نوافل ادا کرتے تھے، ورد کرتے تھے۔

کچھ وقت اور گزرا تو یہ بزرگ خود معبود بن گئے۔ شیطان نے سبق پڑھایا کہ ان کی پرستش ہونی چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہونے لگا۔ اس کے بعد طوفان نوح میں یہ سب عابد و معبود ڈوب گئے۔ عربوں میں پھر سے شیطان نے ان کو تازہ کیا۔ لوگوں کو ان کی طرف رغبت دلائی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شیر اور گدھ اور دوسری صورتوں میں معبود موجود تھے اور مختلف قبیلوں میں انکی پوجا ہوتی تھی

اسی طرح لات ایک نیک آدمی تھا۔ بخاری شریف میں ہے کہ حج کے زمانے میں لوگوں کو ستو پلایا کرتا تھا۔ اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد اس کا مجسمہ بنایا گیا اور عبادت شروع ہوگئی۔ عزیٰ ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے کوئی بزرگ بیٹھا ہوگا۔ لہذا اس کی پوجا شروع ہوگئی۔ مناۃ بڑا سرکش تھا مشلل کے مقام پر اس کا عظیم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ لوگ مدینے سے اس کے نام پر احرام باندھتے تھے۔ اور صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ لگاتے تھے۔

الغرض نوح علیہ السلام نے اپنی دعا میں بیان کیا کہ میری قوم نے لوگوں کو بہکانے کے لیے بڑے داؤ پیچ کھیلے۔ اور معبودانِ باطلہ کی پرستش پر خود بھی مصر رہے اور دوسروں کو ترغیب دی کہ اپنے معبودان خاص طور پر پانچ کو کسی حالت میں بھی ترک نہ کرنا۔

گمراہی کی طرف دعوت

اس کے بعد نوح علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ ان لوگوں کے کفر و شرک پر اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا کہ انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا۔ اور خود بھی گمراہ ہوئے۔ بالکل اسی طرح جیسے مکے والوں کے متعلق ہے کہ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ یعنی خود بھی دور ہٹتے ہیں اور دوسروں کو بھی ایمان پیغمبر اور قرآن سے روکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی عیسائی مشنریاں لالچ دے کر گمراہ کر رہی ہیں، ہسپتال بناتے ہیں، اسکول چلاتے ہیں، پیسے کا لالچ دیتے ہیں، دودھ اور کھلونے بھیج کر گمراہی کی طرف بلاتے ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوتی ہے دباؤ ڈال کر بھی لوگوں کو عیسائی بنایا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے اندلس میں کیا کیا۔ بعض کو مار دیا گیا۔ بعض بھاگ گئے اور بعض کو جبراً عیسائی بنا لیا گیا۔ چین کے صوبہ ختن میں مسلمانوں کی سات کروڑ کی آبادی تھی جہاں صرف ایک کروڑ مسلمان رہ گئے ہیں۔ یہ کمیونسٹوں کی کاروائی ہے۔ مار دیا۔ دبا دیا۔ تقسیم کر دیا یا کمیونسٹ بنا لیا۔

بخارا میں چالیس ہزار مسجدیں تھیں اور ملک میں چار سو سے زیادہ مدارس تھے۔ مگر آج وہاں دو ہزار مسجدیں بھی نہیں ہیں۔ یہاں بھی گمراہی کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔

اعشیٰ شاعر کا واقعہ کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ نبی کریمؐ سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر کفار نے اسے ایک سو اونٹ اناج کا دیا کہ وہ آپ کے پاس نہ جائے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ وہ صناجۃ العرب یعنی عرب کا باجہ کہلاتا ہے۔ اگر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھ دیا تو سارا عرب فریفتہ ہو جائے گا۔ لہذا اسے لالچ دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے سے روکا۔

اس کے متعلق مشہور ہے۔ کہ ایک غریب آدمی کی پانچ سات جوان لڑکیاں تھیں مگر انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ اُس شخص نے اعشیٰ کو اپنے ہاں دعوت دی، اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ اونٹ ذبح کیا، کھانا کھلایا، شراب پلائی۔ اس نے موج میں آکر اس غریب آدمی کی مدح میں قصیدہ کہہ دیا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً اس شخص کے چرچے ہونے لگے اور بڑے بڑے رئیسوں کی طرف سے اس کی لڑکیوں کے لیے نکاح کے پیغام آنے لگے۔ تو اس طرح اُسے گمراہ کیا گیا۔ اگرچہ سو اونٹ اناج اس کے کام نہ آیا وہ راستے ہی میں اونٹنی سے گر کر مر گیا۔ تاہم گمراہ ہو گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! ان کو گمراہی کی سزا یہ دے کہ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا یعنی ان ظالموں کے لیے سوائے گمراہی کے کچھ زیادہ نہ کر۔ ان کو تباہی کی طرف بڑھا۔

اگلی آیت میں حضرت نوح کی بددعا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا گیا ہے۔ کہ یہ قوم کا گلا سڑا پھوڑا ہے۔ اسے کاٹ کر تباہ و برباد کر دے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

ع ۲ / ۱۰

ترجمہ: وہ لوگ (قوم نوح) اپنی کوتاہیوں کے سبب غرق کیے گئے ـــــ پھر آگ میں داخل کیے گئے۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ پایا ﴿۲۵﴾ اور نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے پروردگار زمین پر کسی کافر کو بسنے والا نہ رہنے دے ﴿۲۶﴾ بیشک اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے۔ اور یہ نہیں جنیں گے مگر ڈھیٹ کافر ﴿۲۷﴾ اے پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو ـــــ اور جو میرے گھر میں مومن بن کر داخل ہو۔ اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش دے۔ اور ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ زیادہ نہ کر ﴿۲۸﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے دوران اُن داؤ پیچوں کا ذکر تھا جو آپ کی قوم نے آپ کی دعوت کے خلاف آزمائے۔ نبوت میں شبہات پیدا کئے لوگوں کو تلقین کی کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑنا۔ خاص طور پر وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سے وابستگی پر آمادہ رکھا۔ مفسّرین کرام فرماتے ہیں کہ قوم نوح کے لوگ ایسے سخت اور بدوضع تھے کہ بوڑھے مرتے وقت اپنی اولاد کو وصیت کر جاتے تھے کہ نوح علیہ السلام کی بات نہ ماننا بلکہ اپنے معبودوں پر جمے رہنا۔ سابقہ درس میں یہ بھی گزر چکا ہے۔ کہ قوم نوح کے معبودانِ باطلہ کی پرستش نبی علیہ السلام کے زمانے کے مشرکین بھی کرتے تھے اور انہوں نے بھی انہیں ناموں سے مجسمے بنا رکھے تھے۔ یہ تصور ہندوستان میں بھی برہما، بشن، وشنو، اندر دیوتا اور ہنومان کے نام سے پایا جاتا ہے۔ جس طرح نوح علیہ السّلام کے زمانے میں ان پانچ معبودوں سے مختلف اغراض وابستہ کی ہوئی تھیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ مبارک

اور پھر ہندوؤں کے تصورات میں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں۔

انسان کے اندرونی معبود

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ قوم نوح علیہ السلام کے جن پانچ معبودان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو انسان کے خارجی معبود ہیں۔ جن کی مشرک پرستش کرتے ہیں۔ مگر ہر شخص کے اندر بھی یہ پانچوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جب تک آدمی ان کے پھندے سے آزاد نہ ہو، اس کی عبادت صحیح نہیں ہوتی ان اندرونی معبودان کی تفصیل شاہ صاحبؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

ودّ

جس طرح خارجی دنیا میں مشرکین نے ودّ کو محبت کا دیوتا بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اندرونی طور پر انسان کا اپنا جسم ودّ ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہر انسان اپنے جسم کے بناؤ سنگھار میں مصروف نظر آتا ہے۔ تقاضائے طبع بھی یہی ہے کہ انسان اپنے جسم کی پرورش، زیب و زینت، ترو تازگی میں لگا ہوا ہے اور ساری عمر لگا رہتا ہے حتیٰ کہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ انسان کا جسم اُس کا ودّ ہے جس کی پرستش ساری عمر کرتا رہتا ہے۔

سواع

انسان کا نفس اندرونی طور پر اس کے لیے سواع ہے۔ جس کی رضا انسان کو ہر حالت میں مطلوب ہوتی ہے۔ انسان تقویٰ و طہارت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کو اپنے نفس کے مقابلے میں ٹھکراتا رہتا ہے اور اپنے نفس کی بات مانتا ہے اُس کی پوجا کرتا ہے۔ ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جن کو اس بات کا احساس ہو، کہ نفس کو اُس حد تک راضی رکھنا چاہیئے جس حد تک خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا پہلو نہ نکلے۔ شریعت کا ابطال نہ آئے اور اطاعت میں فرق نہ آئے۔ اگر خدا کی اطاعت اور اس کی رضا کو نفس پر قربان کر رہا ہے۔ تو یہی انسان کا سواع ہے جس کی وہ پرستش کر رہا ہے۔

یغوث

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ یغوث انسان کا خاندان ہے، جس میں باپ، بیٹا، بھائی اور دیگر افراد شامل ہیں۔ انسان ان کو راضی رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ تاکہ یہ بھی بوقت ضرورت اس سے تعاون کریں۔ خاندان کے یغوث کو خوش رکھنے کے لیے ہر قسم کی رسومات ادا کرتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ کہ اگر برادری بگڑ گئی تو میرا تمام معاملہ خراب ہو جائے گا، لہٰذا ان کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور شریعت کے قانون کو بھی ترک کر دیتا ہے لہٰذا یہ خاندان ہی اس کا یغوث ہے۔ ساری عمر اسی کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے۔

یعوق

انسان کا مال اس کے لیے بمنزلہ یعوق کے ہے۔ انسان مال کی محبت میں کم و بیش بڑا شدید

ہے وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ۔ مال کے متعلق انسان سمجھتا ہے۔ کہ یہ اس کی تکلیف کو دور کریگا یہ اس کے لیے عوق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ یعنی سمجھتا ہے کہ مال اس کو قائم رکھیگا۔ اس لیے انسان مال جمع کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ یہ مال کی محبت کا نتیجہ ہے کہ اس کے فرائض بھی ادا نہیں کرتا۔ نہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے نہ صدقہ خیرات کرتا ہے۔ بلکہ اسے سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ کہ مشکل وقت میں کام آئے گا۔ لہٰذا یہ انسان کے لیے عوق ہے۔

نسر

—— شیطان انسان کے لیے نسر ہے، جو اسے ہر وقت بہکاتا رہتا ہے۔ یہ حرص اور غصے کے بازوں کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہوتا ہے اور ایسے ایسے وسوسے ڈالتا ہے۔ جس سے انسان کا عقیدہ خراب ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے شرک کرنے والوں کا حال بیان ہوا۔ شیطان کے بہکاوے میں آنا گویا نسر کی پرستش کرنا ہے۔

الغرض یہ اندرونی پانچ معبودانِ باطلہ ہیں، جن سے ہر آدمی کو واسطہ پڑتا ہے۔ اور جو اس کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

قومِ نوح کی غرقابی کا سبب

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ پچھلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی تھی کہ انہوں نے اپنے نبی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اب اگلی آیت میں اُس قوم کی [illegible] کی سزا کا ذکر ہے۔ مِمَّا خَطِيٓـَٔتِهِمْ أُغْرِقُوا یعنی وہ لوگ اپنی کوتاہیوں کے سبب غرق کیے گئے۔

یہاں پر مِمَّا کا لفظ سببیہ ہے۔ یعنی وہ قوم بہ سبب اپنی کوتاہیوں کے تباہ و برباد ہوئی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے کہ تباہی ہمیشہ کسی گناہ کی پاداش میں آتی ہے۔ اور تکلیفیں اور پریشانیاں یقیناً کسی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تو قوم نوح کی غرقابی اُن کے گناہوں کی وجہ سے تھی۔

یہاں پر خَطِيٓـَٔتِ جمع کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اُس قوم میں کوئی [illegible] کوتاہی نہ تھی بلکہ وہ لوگ بہت سے گناہوں میں ملوث تھے۔ مثلاً اُن کی اعتقادی خطا یہ تھی کہ وہ توحید کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اپنی اولاد کو بھی وصیت کرتے تھے کہ نوح علیہ السلام کی بات نہ ماننا اور اپنے معبودوں کو ترک نہ کرنا۔ رسالت کے متعلق ان کی خطا یہ تھی کہ وہ نوح علیہ السلام کے ساتھ انتہائی بدسلوکی سے پیش آتے تھے۔ جہاں چاہا آپ کو پکڑ لیا، گلا دبا دیا۔ بے ہوش ہو گئے۔ پتھر مارتے تھے، گالیاں دیتے تھے، بیوقوف اور پاگل کا خطاب دیتے تھے مگر نوح علیہ السلام اس دور

میں یہی دعا کرتے تھے رَبِّ اغۡفِرۡ لِقَوۡمِیۡ فَاِنَّھُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ یعنی اے پروردگار میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں۔ نادان ہیں۔ مگر وہ لوگ آپ کو ایذا پہنچانے میں کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ نبی کو اذیت پہنچانا اللہ تعالےٰ کی شدید ناراضگی مول لینا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَنۡ اٰذٰی لِیۡ وَلِیًّا فَقَدۡ بَارَزۡتُہٗ بِالۡحَرۡبِ۔ یعنی جو میرے کسی دوست کو تکلیف پہنچائے گا، اس کے لیے میرا چیلنج ہے کہ اُسے ذلیل اور تباہ کر دوں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر سرزد ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ انتقام ضرور لیتے ہیں۔

قوم نوح کی ایک خطا یہ بھی تھی کہ وہ جزائے عمل کا انکار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی حقوق میں بھی کوتاہی کے مرتکب ہوتے تھے۔ تو یہ سارے کے سارے اُن کے جرائم تھے۔ جن کی بناء پر خطیئٰت جمع کا لفظ فرمایا۔ کہ وہ اپنی خطاؤں کے سبب غرق کیے گئے۔

اور پھر اُن کی غرقابی کے لیے پانی عذاب الٰہی کی صورت میں آیا۔ آسمان کی طرف سے بھی پانی کو چھوڑ دیا گیا یعنی چالیس دن تک مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور زمین سے بھی پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پانی کی اس قدر بہتات ہو گئی کہ اونچے سے اونچے پہاڑ سے بھی اس کی سطح تیس فٹ تک بلند ہو گئی۔ اور اس طرح وہ قوم اپنے گناہوں کی پاداش میں کیفر کردار تک پہنچی۔

تمام منکرین غرق ہو گئے

جیسا کہ اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا آئے گی کہ اے مولا کریم! زمین پر ایک بھی کافر کو باقی نہ چھوڑ۔ تو یہاں اُغۡرِقُوۡا کا مطلب یہی ہے۔ کہ اُس قوم کے تمام کے تمام کفار غرق ہو گئے۔ اور ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہا۔ صرف وہی ستر آدمی بچے تھے جو ایمان لائے اور کشتی میں سوار ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی اس عذاب سے نہ بچ سکا حالانکہ وہ کہتا تھا سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ مِنَ الۡمَآءِ یعنی پہاڑ پر چڑھ کر پانی کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔ مگر وہ بھی غرق ہو گیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ابن ابی حاتمؒ کی روایت ہے جسے ابن کثیرؒ نے بھی بیان کیا ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ قوم نوح میں سے اگر خدا تعالیٰ کسی پر رحم کرتا تو یقیناً اس بچے پر کرتا۔ جسے اُس کی ماں لے کر پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔ جب پانی اُس عورت کے کندھے تک پہنچا تو اُس نے بچے

کو سر پر اٹھا لیا۔ اور جب پانی سر تک پہنچ گیا تو اُس نے بچے کو اور اوپر بازوؤں پر اٹھا لیا کہ کسی طرح وہ بچ جائے مگر پھر بھی وہ نہ بچ سکا اور اپنی ماں کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔ تو اس طرح گویا تمام کفار غرق ہو گئے اور اُن میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔

آگ کی سزا

تو فرمایا کہ وہ لوگ دنیا میں تو پانی میں غرق ہوئے اور موت کے بعد عالم برزخ میں پہنچے تو آگ میں داخل کئے گئے "فَاُدْخِلُوْا نَارًا" مفسرین نے اس سے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ پانی کی سزا تو انہیں دنیا میں ملی، مگر آگ کی سزا برزخ میں مل رہی ہے اور یہ سزا بھی برحق ہے۔ اگرچہ یہ مکمل سزا نہیں ہے کیونکہ مکمل سزا تو قیامت کو ملے گی تاہم برزخ میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے۔ آلِ فرعون کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں کہ انہیں صبح شام آگ پہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرنے والا چاہے کسی شکل میں مرے، قبر اور برزخ کا عذاب اس سے ٹل نہیں سکتا۔ اُس کے جسم اور روح کا کوئی نہ کوئی حصہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جسے تکلیف یا راحت محسوس ہوتی ہے۔ ہاں البتہ عالم برزخ میں وقت کا احساس نہیں ہوتا، جب حشر میں اٹھیں گے تو کہیں گے "مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا" ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال لیا۔

الغرض قومِ نوح کے لوگ اِدھر پانی میں ڈبوئے گئے، اُدھر آگ میں داخل کئے گئے "فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا" مگر انہوں نے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پایا۔ نہ ودّ صاحب آئے نہ سواع نے مدد کی، نہ یغوث نے فریاد رسی کی نہ یعوق کسی کام آیا اور نہ نسر سے کچھ بن پڑا۔ خدا کے سوا کوئی بھی مافوق الاسباب مددگار نہ آیا۔ آج بھی صورت حال یہی ہے۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، لوگ خواہ مخواہ وہم میں مبتلا رہتے ہیں اور شرک میں ڈوبے رہتے ہیں۔ طرح طرح سے اپنا عقیدہ گندہ کرتے ہیں۔

نوح علیہ السلام کی بددعا

سورۃ کے آخری حصے میں حضرت نوح کی تین دعاؤں کا ذکر ہے۔ پہلی یہ دعا کی "وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا"۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار! زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ رہنے دے۔ دیّار دوران سے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں معنے لگتے ہیں۔ یعنی کسی چلنے پھرنے والے یا کسی گھر میں رہنے والے کو زندہ نہ چھوڑ۔ یہ قہرِ الٰہی کا ظہور ہے۔ یہ غَضَباً لِّلّٰهِ ہے یعنی اللہ کے لیے ناراضگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور سزا شروع ہو چکی ہے۔

حضرت نوح نے مزید عرض کیا۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ اگر تو ان کو زندہ چھوڑیگا تو میرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا اور یہ نہیں جنیں گے مگر ڈھیٹھ کافر یعنی ان کی اولادیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ سورۃ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کو بتلا دیا گیا تھا کہ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ یعنی تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے، بس وہی ایماندار رہیں گے، ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائیں گے۔ لہٰذا حضرت نوح نے ان کی تباہی و بربادی کی بد دعا ہی کی۔

شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں یہ گلا سڑا عضو ہے، اس کو کاٹ دینا ہی ضروری ہے۔ ورنہ یہ ایک عضو فاسد باقی جسم کو بھی فاسد کر دے گا۔ اِن لوگوں کا اعدام اوفق من الوجود ہے۔ ان کا خاتمہ ان کے زندہ رہنے سے زیادہ قرین مصلحت ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعائے مغفرت

نوح علیہ السلام نے دوسری دعا یہ کی کہ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ اے پروردگار مجھے اور میرے والدین کو بخش دے کہ وہ بھی نیک اور صالح تھے۔ لوگوں کو شرک سے منع کرتے تھے۔ نوح علیہ السلام کی یہ دعا بھی اپنے منصب کے مطابق تھی، پیغمبر سے صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات چھوٹی موٹی لغزشیں ہو جاتی ہیں، جن سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں انہیں معمولی لغزش پر بھی بڑی بے چینی لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عرض کیا کہ اے اللہ! میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما دے۔

نیز فرمایا کہ اس کی بھی بخشش فرما دے۔ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہو۔ گھر میں آنے والے کے لیے مومن ہونا شرط ہے۔ کیونکہ کافروں کے لیے تو تباہی و بربادی کی بد دعا ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یعنی گھر میں آنے والوں کے علاوہ عام مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بھی اُن کے ایمان کی بدولت معاف فرما دے یہ عام دعا ہے جو اللہ کے اس نیک بندے نے مانگی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس کا مصداق بنائے۔ ہر مسلمان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ کہ اپنی دعا میں عام مومنین اور مومنات کو یاد کیا کرے۔ ان کی بخشش کی دعا کیا کرے۔ یعنی یوں کہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ الْاَحْيَاءِ مِنْهُمْ وَالْاَمْوَاتِ۔

ظالموں کے لیے تباہی کی بد دعا

دعا کا تیسرا حصہ نوح علیہ السلام نے یہ عرض کیا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا یعنی ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ زیادہ نہ کر۔ یہ بھی جوش اور غضبِ الٰہی ہے۔ یہ ظالم ہر حالت میں کفر و شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں اللہ تعالٰے کا فرمان ہے "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" ظالم جب تک ظلم پر قائم رہے گا، اللہ تعالٰے معاف نہیں کرے گا۔ اُسے ہدایت نہیں دے گا سب سے بڑے ظالم تو کافر ہیں جیسا فرمایا "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" اسی طرح مشرکوں کے متعلق فرمایا "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" شرک سے بڑا ظلم کون سا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ کفر و شرک کے ظلم پر ڈٹے ہوئے ہیں، اُن کے لیے سوائے تباہی کے اور کچھ اضافہ نہ کر۔

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعا کے تیسرے حصے میں ظالموں کی مکمل تباہی کی درخواست کی۔ آپ کی دعا منظور ہوئی اور پوری قوم ماسوائے ستر مومنین کے غرق ہو گئی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

سورۃ الجن

(مکّیّ)

درس اوّل ۱ — (آیت ۱ تا ۵)

سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ جن مکی ہے اور یہ اٹھائیس آیتیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴿۱﴾ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴿۲﴾ وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ﴿۳﴾ وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ﴿۴﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۵﴾

ترجمہ :- اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن پاک سنا۔ تو کہنے لگے، ہم نے تو بڑا عجیب قرآن پاک سنا ہے ﴿۱﴾ نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں بنائیں گے ﴿۲﴾ اور بے شک ہمارے رب کی شان بلند ہے۔ نہیں بنائی اس نے اپنے لیے کوئی بیوی اور نہ اولاد ﴿۳﴾ بیشک ہم سے بے وقوف شخص اللہ پہ بڑی زیادتی کی بات کہا کرتا تھا ﴿۴﴾ اور ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن سارے کے سارے خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بولیں گے ﴿۵﴾

کوائف سورۃ

اس سورۃ کا نام سورۃ جن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق جن، ان کے عقائد اور ہدایت قبول کرنے کا ذکر ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی، اس کی اٹھائیس ۲۸ آیات، دو ۲ رکوع،

دو صد پچاسی[۲۸۵] الفاظ اور آٹھ سو ستر[۸۷۰] حروف ہیں۔ پہلی سورۃ کی طرح اس کا موضوع بھی بنیادی عقائد ہیں، جن میں سب سے زیادہ توحید ہے۔ اس کے بعد قیامت اور رسالت کا بیان ہے۔ قرآن پاک کا کلام الٰہی اور برحق ہونا بھی اس کے موضوع میں شامل ہے۔

لفظ جن کا معنیٰ

جن کا لفظی معنی پوشیدہ یا مستور ہے، یعنی وہ چیز جو مستور ہو۔ اسے جن کہتے ہیں۔ جن کے مادے سے کئی ایک چیزیں مشتق ہیں۔ مثلاً جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اپنے گنجان اور گھنے درختوں سے اس میں موجود چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کا مادہ جن ہی ہے۔ اسی طرح لفظ جنون بھی اسی مادہ سے ہے۔ یہ بھی عقل کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پوشیدہ کر دیتا ہے۔

جنات کی حقیقت

جن اللہ تعالےٰ کی مخلوق ہے۔ نگاہوں سے مستور ہے، نظر نہیں آتی۔ مگر شکل تبدیل کرنے کے بعد نظر بھی آتی ہے۔ جنات چونکہ انسانوں اور حیوانات سے زیادہ لطیف ہیں، اس لیے اس جہاں میں یہ پوشیدہ ہیں۔ عالم دنیا کے اختتام پر اگلے جہان میں یہ سب چیزیں نظر آئیں گی، کیونکہ اُس جہان میں انسانی قوتوں میں بھی بہت زیادہ لطافت پیدا ہو جائے گا۔ ملائکہ تو جنوں سے بھی زیادہ لطیف مخلوق ہے۔ اگلے جہان میں ان کا بھی مشاہدہ ہو سکے گا۔

مخلوق کی مختلف قسمیں

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ[۱] فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کی مخلوق کی مختلف قسمیں ہیں، کسی میں عقل غالب ہے تو کسی میں وہم کا مادہ زیادہ ہے کسی مخلوق میں باقی صفات کی نسبت شہوت اور غضب غالب ہے۔ اور کوئی مخلوق معجون مرکب ہے کہ اس میں ساری صفات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ملائکہ :- ملائکہ وہ مخلوق ہے، جس میں دیگر صفات کی نسبت عقل غالب ہے۔ اس میں شہوت کا مادہ بالکل نہیں۔ اگر غضب بھی ہے تو وہ مغلوب ہے۔ اُس پر عقل غالب ہے۔ ملائکہ میں عقل و فہم اور علم کی فراوانی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۲] کہ ملائکہ کی سات قسمیں ہیں۔ سب سے عالی ملائکہ حاملین عرش ہیں اس کے بعد اُن فرشتوں کا نمبر ہے جو حَافِّيْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ یعنی عرش الٰہی کے گرد گھومنے والے ہیں پھر وہ فرشتے ہیں جو آسمانوں کے اوپر ہیں۔ اُن میں ہفت آسمان کے ملائکہ کا نمبر ہے۔ اس کے بعد فضا والے ملائکہ آتے ہیں اور اس کے بعد زمین والے۔ ان میں بھی کئی طبقات ہیں۔ یہ ملائکہ

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی پ ۲۹ ص ۱۴۱ [۲] الخیر الکثیر ص ۴۶، ۴۷ مطبوعہ اکوڑہ خٹک

سفلیہ کہلاتے ہیں اور عالم بالا میں رہنے والے ملاء الاعلیٰ کہلاتے ہیں۔

بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہے۔ جس کا مادۂ تخلیق بہت ہی لطیف ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیںؒ کہ درجہ اول کے ملائکہ کا مادہ ایسا ہے۔ جیسے وہ آگ جو موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوہ طور کے ایک درخت پر ظاہر ہوئی تھی۔ وہ نار تھی یا حجاب ناری تھا یا کیا چیز تھی۔ وہ روشن آگ کی طرح تھی مگر جلانے والی آگ نہیں تھی۔ آگ درخت پر ظاہر ہوئی جوں جوں وہ زیادہ روشن ہوتی جاتی تھی درخت کی سر سبزی بڑھتی جاتی تھی۔ درجہ اوّل کے ملائکہ کا مادہ اس سے بھی لطیف تر نورانیت ہے۔ البتہ جو ملائکہ ان سے کم تر ہیں یعنی عالم مثال کے ملائکہ تو اُن کا مادہ تخلیق کم تر ہے الغرض یہ ایسی مخلوق ہے جس پر عقل غالب ہے۔ وہ اطاعت ہی کرتے ہیں۔ اُن میں معصیت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے کامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کمال کے اندر پیدا کیا ہے۔

۲۔ **جنات** :۔ دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جس پر باقی صفات کی نسبت وہم غالب ہے۔ یہ جنات ہیں، جن کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ لہذا یہ انسان اور حیوانات کی نسبت زیادہ لطیف ہیں اس لیے نظر بھی نہیں آتے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ شکل تبدیل کر سکتے ہیں، اسی طرح جنات بھی جس شکل میں چاہیں متشکل ہو جائیں۔ انسان کی شکل میں آسکتے ہیں جانور کی شکل میں آسکتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں، درندوں حتیٰ کہ سانپ کی شکل میں بھی آسکتے ہیں۔ مادۂ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے۔ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ اور جنوں کو شعلہ مارنے والی آگ سے پیدا کیا۔ شعلہ میں ہوا بھی شامل ہے۔ لہذا جنات کے مادہ تخلیق میں آگ اور ہوا دو چیزیں شامل ہیں۔

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیںؒ آدم کے دور سے پہلے زمین پر جنات کا دور تھا، جنات سے پہلے حن اور بن اللہ کی کوئی مخلوق تھی۔ اُن کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ لیکن تصریح نہیں ہے کہ حن اور بن کیسی کیسی مخلوقات تھیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایسا انسان بڑا حکیم ہوگا جو صرف ایک دور کی بات کو سمجھ سکے یعنی آدم علیہ السلام کے دور کی۔ دوسرے

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶ / ج ۱ ۲؎ تفسیر عزیزی ص ۱۴۱ / پ ۲۹ ۳؎ البدایہ والنہایہ ص ۵۵ / ج ۱

ادوار کے حالات نہ تو کسی کتاب میں منقول ہیں، نہ کسی پر ظاہر کیے گئے ہیں، لہٰذا انہیں کوئی آدمی نہیں جان سکتا۔ بہرحال اس زمین پہ کوئی قوم حن اور بن آباد تھی، اس کے بعد جنات کا زمانہ آیا، پھر آدم علیہ السلام کا دور آیا۔ جب یہ دور ختم ہوگا تو قیامت واقع ہوگی۔

الغرض جنات ایک ایسی مخلوق ہے، جس پہ وہم غالب ہے۔ اور وہم ایسی کمزور چیز ہے جس کی وجہ سے جنات میں چھچھورہ پن اور دیگر مختلف قسم کی حرکات پائی جاتی ہیں۔

۳۔ **حیوانات**:۔ حیوانات میں شہوت اور غضب کا مادہ غالب ہے۔ اور ان کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اگر غضب اور سبعیت غالب ہوگی تو درندہ ہے۔ اگر خفت ہوگی تو پرندہ ہے۔ اور اگر محض کھانے پینے اور جفتی کی صفت غالب ہے تو بہیمہ ہوگا جیسے عام جانور ہوتے ہیں۔

۴۔ **انسان**:۔ اللہ تعالیٰ کی چوتھی مخلوق معجونِ مرکب ہے، اس میں ساری صفات پائی جاتی ہیں اور وہ انسان ہے۔ اس میں وہم، عقل، شہوت، بہیمیت، ملکیت سب موجود ہیں اور انسان ان تمام صفات کا جامع ہے۔

الغرض اس سورۃ میں رب العزت نے جنات کی مخلوق کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ یہ مخلوق بھی اس کی صفات کا مظہر ہے۔ اور پھر ان جنات کی بھی مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ سورۃ کی بعض آیات سے واضح ہوتا ہے۔ اور ان کے کام بھی مختلف ہیں۔ جنات عموماً ہوا اور فضاء میں رہتے ہیں۔ بعض زمین پر بھی رہتے ہیں اور ویسے ہی کام کرتے ہیں جیسے انسان کرتے ہیں۔ کوئی مزدوری کرتا ہے، کوئی کاشتکاری کرتا ہے۔ کوئی جانوروں کا سلسلہ کرتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جس طرح انسان کرتے ہیں۔

جنات بھی حضور علیہ السلام کے امتی ہیں

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ عام ہے، اس لیے انسانوں کی طرح جنات بھی آپ کی امت میں داخل ہیں۔ آپ جنات کی طرف بھی مبعوث ہوئے ہیں۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی زندگی میں چھ مواقع پہ آپ جنات کو تبلیغ کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ان میں ایک واقعہ سفر کا ہے، ایک جنت البقیع کے قریب کا۔ بعض واقعات مکی زندگی کے ہیں۔ بعض اوقات قرآن کریم اور دین کی تعلیم کے لیے ساری ساری رات آپ نے جنات کے ہاں گزاری۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک رات حضور علیہ السلام مجھے ہمراہ لے گئے آپ نے ایک جگہ لکیر کھینچ کر مجھے اُس کے اندر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ اس لکیر سے باہر نہیں نکلنا۔ فرمایا اس لکیر سے اندر تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا، جو بھی آئے گا، اس لکیر تک ہی آئے گا، اس کے اندر داخل نہیں ہوسکے گا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام تشریف لے گئے اور ساری رات جنات کو تلقین کرتے رہے۔ رات کے بالکل آخری حصے میں آپ واپس تشریف لائے اور پھر تھوڑی دیر کے لیے وہیں لیٹ گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ مختلف قسم کی شکلیں آتی تھیں کوئی ایسے آدمی آتے تھے جیسے ہندوستان کے جاٹ ہوتے ہیں۔ بالکل ویسی وضع قطع کے۔ کوئی کسی اور شکل میں۔ اُس لکیر کے گرد گھوم گھام کر چلے جاتے تھے اور میں اُس لکیر کے اندر ہی رہا۔[1]

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں۔ یہاں صرف اس ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔

مجموعی طور پہ حضور علیہ السلام نے چھ[2] مرتبہ جنات کو تعلیم دی۔

سابقہ سورۃ سے ربط

اِس سورۃ کا سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے۔ کہ سورۃ نوح میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کو مخالفین کی ایذا رسانی پہ صبر کی تلقین کی تھی اور تسلی دی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی تکالیف کا حال بیان کر کے حضرت نوح علیہ السلام اور آپکے ساتھیوں کو برداشت کی نصیحت کی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخالفین تباہ و برباد ہوئے اس کا مقصد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلانا تھا۔ کہ جس طرح حضرت نوح کی قوم مخالفت کی وجہ سے تباہ ہوئی، اسی طرح اگر مشرکین عرب بھی آپ کی مخالفت پہ ڈٹے رہے تو اُن کا حشر بھی قوم نوح سے مختلف نہ ہوگا، اس طرح گویا حضور علیہ السلام کو اور آپ کے ماننے والوں کو تسلی دی گئی۔

اِس سورۃ میں جنات کا قرآنِ پاک سُن کر ایمان لانے کے واقعہ کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارۃً سمجھائی ہے۔ کہ جنات غیر جنس اور غیر قوم ہو کر جب تعصب سے خالی الذہن ہو کر کلام الٰہی کو سنتے ہیں تو وہ بھی ایمان قبول کر لیتے ہیں۔ مگر مکے والے حضور علیہ السلام

---

[1] ترمذی ص۲۰۵ ابواب الامثال [2] اکام المرجان ص۵۲

کی قوم، برادری اور ہم زبان ہو کر قرآنِ کریم کو سنتے ہیں، سمجھتے بھی ہیں، مگر تعصب، ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں۔ تو گویا اس سورۃ کا پہلی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے۔ کہ جس طرح نوح علیہ السلام کی قوم انسان ہونے کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتی تھی، اسی طرح حضور علیہ السلام کی قوم بھی آپ کا انکار کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ تو قادر ہے کہ ان کو بھی ہدایت دے دے جو نہ ہم قوم ہیں، نہ ہم زبان ہیں، نہ ہم جنس۔ ایک یہ مکے والے ہیں کہ یہ بھی اگر تعصب سے الگ ہو کر اور خالی الذہن ہو کر قرآن کو سنتے تو ان کو بھی ہدایت نصیب ہوتی۔

طائف کا تبلیغی سفر

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنہ ۱۰ نبوی میں طائف کا تبلیغی سفر اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حضور علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ وفات پا چکی تھیں، آپ کے چچا ابو طالب مشرک ہونے کے باوجود آپ کے ہمدرد تھے۔ اور آپ کی حمایت کرتے تھے۔ وہ بھی فوت ہو چکے تھے، مشرکین مکہ کی ایذائیں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ان حالات میں آپ نے مکے والوں سے مایوس ہو کر طائف کا سفر کیا۔ تاکہ تبلیغ دین کا فریضہ وہاں جا کر ادا کر سکیں۔

طائف میں تین بڑے سردار تھے۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی مگر وہ بدنصیب بُرے طریقے سے پیش آئے۔ شہر کے لچے لفنگے لوگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ انہوں نے پتھر مارے گالیاں دیں، نہایت بدسلوکی کی، آپ وہاں سے چل کر ایک باغ میں درختوں کے سائے میں آ بیٹھے یہ باغ مکہ کے عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اس سفر میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ آپ کے غلام حضرت زیدؓ تھے آپ زخمی ہو گئے، خون بہہ رہا تھا۔ جس جگہ آپ تشریف فرما ہوئے وہاں اب درخت نہیں ہیں۔ مسجد بنی ہوئی ہے۔ لوگ وہاں تبرکاً نفل پڑھتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر اب بھی وہاں باغ ہے وہاں اس وقت بھی درخت موجود ہیں۔

الغرض باغ کے مالکان شیبہ، عتبہ وہاں موجود تھے اور یہ سارا واقعہ دیکھ رہے تھے انہوں نے اپنے نصرانی غلام عداس کو انگور کا گچھا دے کر بھیجا۔ غلام عیسائی مذہب رکھتا تھا اور نینویٰ کا رہنے والا تھا۔ نینویٰ عراق میں صوبہ موصل کی ایک بستی ہے، جو حضرت یونس علیہ السلام کا وطن ہے۔ وہاں آپ کی قبر بھی ہے۔ بہر حال غلام انگور کا گچھا تھال میں رکھ کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا اور عرض کیا کہ یہ میرے مالکوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے آپ تناول فرمائیں۔ آپ نے

انگور لیتے ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا۔ عداس بڑا متعجب ہوا اور عرض کیا کہ یہاں کے لوگ تو اس قسم کی بات نہیں کرتے۔ حضور علیہ السلام نے پوچھا، تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ عرض کیا نینویٰ کا ہوں آپ نے فرمایا، وہ تو میرے بھائی یونس علیہ السلام کا گاؤں ہے۔ غلام نے عرض کیا، آپ اُن کو کیسے پہنچانتے ہیں۔ فرمایا، وہ میرا بھائی اور اللہ کا نبی تھا، میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ اس بات سے عداس اتنا متاثر ہوا کہ آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ شیبہ اور عتبہ وغیرہ مشرکین دور سے دیکھ رہے تھے جب غلام واپس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ تم اس شخص کے ہاتھ پاؤں کیوں چوم رہے تھے۔ کہنے لگا کہ اُس نے مجھے وہ بات بتائی ہے جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے تم پر بھی اُس کا جادو چل گیا ہے۔

تو یہ طائف کا سفر بھی بظاہر ناکام ہوا۔ طائف والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو پناہ نہ دی حالانکہ خاندانِ قریش کی ایک عورت بھی وہاں بیاہی ہوئی تھی، آپ اُس کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آپ طائف کے تینوں سرداروں عبدیالیل، مسعود اور حبیب کے پاس بھی گئے۔ اُن کو اسلام کی دعوت دی مگر سب نے آپ سے بدسلوکی کی۔ اس طائف کے سفر کی ناکامی کے بعد آپ نے مدینہ طیبّہ کی طرف ہجرت کی۔

جنات کا واقعہ کہاں پیش آیا

جنات کے قرآن سننے کا واقعہ کہاں پیش آیا۔ اس کے متعلق آرا مختلف ہیں۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ جس کا ذکر سورۃ احقاف میں مذکور ہے وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ طائف کے سفر میں پیش آیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس موقعہ پر پیش آیا جب آپ تبلیغ دین کے لیے عکاظ کی منڈی میں تشریف لے گئے۔ یہ جگہ مکے اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ جہاں ہر سال پورے بیس دن تک منڈی لگتی تھی اور اس میں سارے عرب کے لوگ آتے تھے۔ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ اس منڈی میں تشریف لا رہے تھے تو راستے میں وادیٔ نخلہ کے مقام پر آپ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس دوران جنوں کی ایک جماعت وہاں سے گزر رہی تھی تو انہوں نے قرآن کریم سنا۔ یہ جن نصیبین کے مقام کے تھے، جو کہ عراق اور شام کے درمیان ایک جگہ ہے۔

جنات کا قرآن پاک سُن کر ایمان لانا

احادیث میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے پہلے جنات آسمان پر جاتے تھے۔ وہاں ملائکہ کی گفتگو سنتے تھے اور اس میں انہیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد پہرے سخت ہو گئے۔ اب جو جن اوپر جاتا تھا آگے سے شہاب پڑتے تھے، کئی ہلاک ہو جاتے تھے، کئی بھاگ جاتے تھے۔ فرشتوں سے بات سُن کر وہ اپنے کاہنوں کے کان میں پھونک دیتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت[2] میں ہے کہ جب پہرے سخت ہو گئے تو جنات کو تشویش ہوئی۔ جنات نے آپس میں مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ فَاضْرِبُوْا مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا یعنی زمین کے مشرق و مغرب میں گھوم پھر کر دیکھو کہ کیا بات ہوئی ہے۔ کہ اب ہم اوپر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ جنات کی مختلف جماعتوں کو زمین کے اکناف و اطراف کی طرف بھیجا گیا تاکہ معلوم کریں کہ دنیا میں کون سی نئی بات ہوئی ہے۔

تو جنات کا یہ گروہ جن کی تعداد نو یا سات تھی، اسی تفتیش میں وادیٔ نخلہ سے گذر رہا تھا۔ حضور علیہ السلام صبح کی نماز میں تلاوت فرما رہے تھے صبح کا وقت فرشتوں کی حاضری کا وقت ہوتا ہے " وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا " اسی لیے فجر کی نماز میں قرات ذرا لمبی کرنے کا حکم ہے تو اس موقع پر جب جنات نے حضور علیہ السلام سے قرآن پاک سنا، تو سمجھ گئے کہ یہی وجہ ہے کہ ہم اوپر جانے سے روک دیئے گیے ہیں۔ مسلم شریف[3] کی روایت میں ہے کہ قرآن سُن کر سارا گروہ ایمان لے آیا اور واپس چلا گیا، مگر حضور علیہ السلام کو اس کا علم نہ ہوا۔ جنات کے چلے جانے کے بعد معجزے کے طور پر وہاں کے ایک درخت نے اللہ کے حکم سے حضور علیہ السلام کو خبر دی کہ جنات آئے تھے اور انہوں نے کلام الٰہی سُنا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے آپ پر جب وحی نازل فرمائی تو اس میں جنات کا ذکر کیا۔

قرآن پاک عجیب کتاب ہے

تو اس سورۃ میں یہی ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ " اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ " کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن پاک سُنا فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا تو کہنے لگے، ہم نے تو بڑا عجیب قرآن

---

[1] ترمذی صہ ۴۷۸/۲ج [2] بخاری صہ ۷۳۲/۲ج [3] مسلم صہ ۱۸۴/۱ج

سنا ہے نفر کا اطلاق تین سے لے کر دس تک کی تعداد پہ ہوتا ہے۔ یہ جنات نو تھے، اس لیے ان پر نفر کا لفظ استعمال کیا گیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ[1] لکھتے ہیں۔ کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پڑھی جاتی ہیں اور دوسری وہ جو دیکھی جاتی ہیں اور مطالعہ کی جاتی ہیں قرآن کریم اس لحاظ سے عجیب کتاب ہے۔ کہ اس میں پڑھی جانے والی کتابوں کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور مطالعہ کرنے والی کتابوں کی بھی، پڑھی جانے والی کتابوں میں قرآن پاک آسان بھی ہے اور ورد بھی۔ کلامِ الٰہی کو پڑھنے کے برابر کوئی ورد نہیں۔ یہ سب سے افضل ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو خالص نیت اور حسنِ عقیدت سے کلام پاک پڑھتا ہے۔ میں اُسے اُن سے افضل دوں گا جو مانگتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں یا دوسرے اوراد کرتے ہیں اگرچہ میرا کلام پڑھنے والا نہ بھی مانگے۔ اور پھر یہ ورد بھی ایسا ہے کہ ایک حرف پڑھو، تو کم از کم دس نیکیاں حاصل ہوں گی۔ الف، لام، میم حروفِ مقطعات میں سے ہیں، فرمایا جو آدمی اس کو عقیدت سے پڑھیگا، اُسے تیس نیکیاں نصیب ہوں گی۔ کلام پاک میں ایک اور خوبی ہے۔ باقی اوراد کو جب تک آدمی سمجھ کر نہیں پڑھے گا، اُس کا اثر نہیں ہوگا، مگر کلام الٰہی ایسی چیز ہے۔ کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، اس کا فائدہ ہر حالت میں ہوگا، نیز علمی لحاظ سے بھی یہ بہت بلند کتاب ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2]، کہ بسا اوقات جب میں غور کرتا ہوں، تو قرآن پاک کی ہر ہر آیت میں مجھے علم و عرفان کے اتنے وسیع خزانے نظر آتے ہیں جیسے سمندر کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ حقائق و دقائق کے ایسے بحرِ بیکراں نظر آتے ہیں، جن کا کوئی ساحل نہ ہو۔ شاہ صاحبؒ تو بلند درجے کی روحانیت والے انسان تھے، امام اور محدث تھے، انہیں تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک بھی ہے، کہ قرآن پاک ایسا کلام ہے کہ لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ[3] کہ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ ابدالآباد تک قائم رہیں گے۔ یہ کلام الٰہی ہے۔ خدا کی صفت ہے۔ چونکہ خدا غیر محدود ہے، اس کا کلام بھی غیر محدود ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں، یہ اس کی مہربانی ہے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۴۶ پ ۲۹ [2] فیوض الحرمین مترجم صفحہ ۴۲ طبع رحیمیہ دیوبند [3] ترمذی صفحہ ۴۱۲

ترمذیؒ شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز پر اتنا راضی نہیں ہوتا، جتنا بندے کی زبان سے اپنا کلام سُن کر۔ تو گویا اس میں ایک تو ورد والی خصوصیت پائی جاتی ہے اور دوسری علمی خصوصیت جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ نہ تو ورد والے طبقے سے ملتا ہے اور نہ مطالعہ والی اور دیکھنے والی کتاب سے۔ بلکہ تمام کی خصوصیت خود اس میں پائی جاتی ہیں اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ایک ایسا عجیب قرآن سُنا جو یَهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ فَاٰمَنَّا بِهٖ لہٰذا ہم سنتے ہی اس پر ایمان لے آئے۔

اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے

ایمان لانے کے بعد جنات نے اقرار کیا کہ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا اور بیشک ہمارے رب کی شان بلند ہے۔

جد کا لفظ مشترک ہے۔ اس کا معنیٰ دادا بھی ہوتا ہے اور کوشش بھی۔ اسی طرح جد کا معنیٰ بخت بھی ہوتا ہے اور عظمت و بڑائی بھی۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی بھی ہوتے ہیں جو اپنے اپنے محل پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس موقع پر عظمت اور بڑائی مراد ہے۔ یعنی ہمارے رب کی شان اور مرتبہ بڑا بلند ہے۔

جنات نے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت یہ بیان کی مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا یعنی اُس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد ہے۔ بیوی تو ضرورت کے لیے ہوتی ہے، مگر خدا تعالیٰ صمد ہے۔ اُسے کوئی ضرورت نہیں۔ اولاد کی خواہش اس لیے ہوتی ہے۔ کہ بڑھاپے میں کام آئے گی اور میرے بعد میری قائم مقام ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ وہ غنی ہے وہ نہ حاجت مند ہے، نہ محتاج۔

جنات نے مزید بیان کیا وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا یعنی ہم میں سے بیوقوف شخص اللہ پر بڑی زیادتی کی بات کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اللہ نے بیوی بنالی، کوئی کہتا ہے، بیٹا بنالیا۔ کوئی اُس کا شریک ٹھہراتا ہے۔ کوئی اس کا سہیم بناتا ہے، یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں، کیونکہ

لہ ترمذی ص۱۱۴ ج۲

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ[1]
یعنی ملت ابراہیمی سے صرف وہی اعراض کرتا ہے جس نے اپنے آپ کو احمق بنالیا ہے جو کہتا ہے کہ اللہ کا شریک ہے یا اُس کے بیوی بچے ہیں وہ فطرت کے خلاف گیا۔

جنات نے یہ بھی واضح کیا وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ یعنی ہم گمان کرتے تھے۔ کہ انسان اور جن سارے کے سارے خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ انس وجن واقعی جھوٹ بولتے ہیں۔ شرک اور کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہراتا ہے کوئی عبادت میں اور کوئی استعانت میں غیروں کو شریک بناتا ہے۔ یہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔

---

[1] بقرہ ۱۳۰ پ۱

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ﴿۷﴾ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ﴿۸﴾ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

ترجمہ:۔ اور یہ بات بھی ہے۔ کہ کچھ مرد انسانوں میں سے پناہ پکڑتے تھے جنوں میں سے کچھ مردوں کے ساتھ۔ پس بڑھا دیا۔ انہوں (انسانوں) نے اُن کے لیے سرکشی کو ﴿۶﴾ —— اور اسی طرح جنات نے بھی خیال کیا جس طرح تم نے خیال کیا کہ اللہ تعالے مرنے کے بعد ہرگز کسی کو نہیں اٹھائے گا ﴿۷﴾ اور بیشک ہم نے آسمان کو چھوا تو اسے ہم نے سخت پہریداروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا ﴿۸﴾ اور بیشک ہم پہلے بیٹھا کرتے تھے آسمان کے ٹھکانوں میں باتیں سننے کیلئے پس اب جو کوئی بات سنتا ہے تو وہ اپنے گھات میں شہاب کو موجود پاتا ہے ﴿۹﴾ اور بیشک ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ

بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے (۱۰) اور بیشک ہم میں نیکوکار بھی ہیں اور اس کے علاوہ (یعنی بدکار) بھی ہم مختلف راستوں پہ بٹے ہوئے تھے (۱۱) اور بیشک ہم نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہم کہیں بھاگ کر اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں (۱۲) اور جونہی ہم نے ہدایت کی بات سُنی، فوراً اس پر ایمان لے آئے، پس جو اپنے رب پہ ایمان لے آئے گا وہ کسی نقصان کا خوف نہیں کھائے گا، اور نہ اس کو کسی زبردستی کا کھٹکا ہوگا۔ (۱۳) اور بیشک ہم میں سے فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصاف بھی۔ پس جس نے فرمانبرداری کی تو انہوں نے نیکی کی راہ تلاش کر لی (۱۴) اور جو بے انصاف ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے (۱۵)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالےٰ نے جنوں کے ایمان لانے کا ذکر کیا۔ کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے نماز کی حالت میں قرآن پاک سُنا اور کہنے لگے، بے شک ہم نے عجیب قرآن سنا ہے، جو نیکی کے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے۔ اللہ تعالےٰ بیوی اور اولاد سے پاک ہے۔ اُس کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم میں سے بے وقوف لوگ اللہ کے بارے میں زیادتی کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ انسان اور جن خدا پہ جھوٹ نہیں بولتے ہوں گے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ سب باتیں جنوں کے اس گروہ نے کیں جو ایمان لایا۔

جنات سے استعاذہ

اس درس کی آیات میں جنات کا کلام ہی دہرایا جا رہا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ بات بھی کی، وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ یعنی یہ بات بھی ہے کہ کچھ مرد انسانوں میں سے پناہ پکڑتے تھے جنوں میں سے کچھ مردوں کے ساتھ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا پس زیادہ کیا ان انسانوں نے اُن کے لیے سرکشی کو۔ رَهَق کا معنی ہے زیادتی اور اس سے مراد نافرمانی اور سرکشی ہے، یعنی ان آدمیوں نے اُن جنات کو اور زیادہ سرکشی میں ڈال دیا۔ یا ان جنات نے اُن آدمیوں کو اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دیا۔ تو گویا زَادُوْهُمْ کی ضمیر جنوں اور انسانوں دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے۔ اگر یہ انسانوں کی طرف منسوب کی جائے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ فائدے کی بجائے زیادہ خسارے میں مبتلا ہوئے۔ جیسے "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یا وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ"

یا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ خسارے میں اس وجہ سے کہ شرک میں مبتلا ہوتے۔ اوروں کے علاوہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنایا۔ لہذا بڑے خسارے میں رہے۔

اگر زَادُوْهُمْ کو جنات کی طرف منسوب کیا تو معنی یہ ہوگا کہ انسانوں نے جنات کی تھام استعاذہ پکڑ کر اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دیا جن اور زیادہ مغرور ہو گئے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں ہمارے ساتھ استعاذہ کرتے۔ ہمارے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ ہمارے نام کی نذر کرتے ہیں۔ لہذا ان میں اور زیادہ اکڑ پیدا ہوگئی۔ اور وہ اور زیادہ سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔

اس قسم کا استعاذہ ناجائز اور شرک ہے۔ کوئی بتی وغیرہ جلا کر جنات کو بلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بعض لوگ مکان یا کارخانہ بناتے وقت اس کی بنیادوں میں خون ڈالتے ہیں۔ اس میں یہی تصور کارفرما ہوتا ہے کہ جنات راضی ہوں اور ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ پرانے زمانے میں عرب کے مشرکین اس قسم کا استعاذہ کرتے تھے۔ یہ سب شرک اور کفر ہے۔

استعاذہ کا باطل طریقہ

پناہ پکڑنے کی کئی صورتیں تھیں جو آج بھی رائج ہیں۔ منجملہ ان کے جب کوئی بیمار ہو جاتا تھا، تو جنات سے مدد طلب کرتے تھے۔ اگر آئندہ کی کوئی بات معلوم کرنا ہوتی تو کاہنوں کے پاس جاکر جنات سے معلوم کرتے۔ گویا کہ وہ غیب داں ہیں۔ اسی طرح سفر کے دوران اگر کسی جگہ اقامت کرتے تو اس طریقہ سے پناہ پکڑتے اَعُوْذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الْوَادِيْ یعنی میں اس وادی کے سردار کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں۔ تاکہ جنات وغیرہ نقصان نہ پہنچائیں گویا ہر جگہ جنات ہوتے ہیں، ان کا سردار ہوتا ہے۔ اگر اس کی پناہ میں آجائیں گے تو شر سے محفوظ رہیں گے۔ ورنہ تکلیف ہوگی۔ مکانات کی بنیادوں میں جانوروں کا خون ڈالنا، جنات کو قربانی پیش کرنا ہے۔ تاکہ وہ خوش ہوں اور ہماری عمارت صحیح سلامت رہے۔ آج بھی بعض لوگ یہ تصور رکھتے ہیں کہ جنات مشکل کشائی کرتے ہیں اور یہ کہ مصیبت کے وقت پہنچتے ہیں۔ یہ سب مشرکانہ عقائد ہیں۔ اسلام نے اسے باطل قرار دیا ہے۔ نہ تو جنوں کے ہاتھ میں شفا ہے۔ نہ وہ غیب داں ہیں اور نہ وہ مشکل کے وقت کام آتے ہیں نہ آسکتے ہیں۔

استعاذہ کا صحیح طریقہ

حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چل کر کسی جگہ ٹھیرتا ہے۔ اگر وہ ان الفاظ کے ساتھ استعاذہ کرے گا تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ[1]

---

[1] مسلم ص۳۴۷ ج۲

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ یعنی میں اللہ تعالےٰ کے کلمات تامہ کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں ہر اُس چیز کے شر سے جسے اللہ نے پیدا کیا۔ یہ چیز جن ہو یا کچھ اور ہو۔ اِن کے شر سے حفاظت کے لیے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ یہ استعاذہ کا صحیح طریقہ ہے۔ جس کی تعلیم حضور علیہ السلام نے دی۔

حضرت سعید ابن جبیرؒ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضرت رافع ابن عمیرؓ کا اس وقت کا واقعہ ہے جب انہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ کہیں بیابان میں سفر پر تھے۔ ایک اونٹنی تھی اور وہ خود تھے۔ اور کوئی ساتھ نہیں تھا۔ رات ہوئی تو اونٹنی کا گھٹنا باندھ دیا اور خود لیٹ گئے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نیزہ پکڑے آرہا ہے۔ اور اونٹنی کو مارنا چاہتا ہے۔ گھبرا کر اٹھے۔ خیال کیا کہ یہ خواب ہے۔ لہٰذا پھر سو گئے۔ دوبارہ وہی خواب دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ اٹھ کر دیکھا تو واقعی ایک آدمی نیزہ پکڑے ہوا تھا اور وہ اونٹنی کو مارنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا، وہ نوجوان کو روکتا تھا۔ کہ اونٹنی کو مت مار۔ اتنے میں تین خرگوش یا گورخر سامنے آئے۔ تو بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ اِن میں سے کوئی لے لو اور اِس شخص کی اونٹنی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ چنانچہ اُس جوان آدمی نے ایک گورخر لے لیا۔ اور چلا گیا۔

دراصل حضرت رافع بن عمیرؓ نے اُس مقام پر قیام کرتے وقت وہی کلمہ کہا تھا جو مشرکین کہتے تھے یعنی اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الْوَادِیْ۔ گویا جنات کی پناہ پکڑی تھی۔ جب وہ جوان آدمی گورخر لے کر چلا گیا تو اُس بوڑھے نے حضرت رافعؓ سے کہا کہ بیوقوف آدمی، تم نے سوتے وقت جنوں سے استعاذہ کیا تھا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، بلکہ یوں کہتے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِرَبِّ مُحَمَّدٍ یعنی اے پروردگار! میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں تاکہ مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت رافعؓ نے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ بوڑھا آدمی بولا کہ وہ نبی ہیں۔ ان کا دور آگیا ہے، وہ شرک سے منع کرتے ہیں۔ اور تم نے تو کفر و شرک کی بات کی تھی۔ یہ کہہ کر بوڑھا شخص بھی غائب ہوگیا۔ وہ جن ہی تھا۔

حضرت رافعؓ کہتے ہیں۔ کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں اونٹنی کو تیز تیز چلاتا ہوا یثرب پہنچا۔ حضور علیہ السلام اُس وقت مدینہ میں تشریف فرما تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میرا واقعہ میرے پہنچنے

سلہ تفسیر مظہری صفحہ ۸۵ جلد ۱۰ بحوالہ ہواتف الجن

سے پہلے ہی حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلا دیا چنانچہ جب میں حاضر خدمت ہوا، تو آپ نے انکشاف فرمایا۔ کہ تمہارے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ تو اس طرح حضرت رافع بن عمیرؓ اسلام سے مشرف ہوئے (شاہ عبدالعزیزؒ اور) امام بیہقیؒ نے اور بھی ایسے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کا واقعہ بھی بیان ہوا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جب وہ شام کا سفر کرتے تھے تو وہاں کسی کاہن سے غیب کی خبریں دریافت کیا کرتے تھے۔ اب کی بار بھی گئے تو کاہن کے پاس پہنچے۔ اس کی فیس دی اور اُس سے بعض واقعات پوچھے۔ تو کاہن کہنے لگا کہ اب وہ کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ جو جن میرے پاس آیا کرتا تھا، وہ اب نہیں آتا۔ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ اب کیوں نہیں آتے تو اس جن نے بتایا کہ اب نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوگئے ہیں۔ اور اب ہمارے لیے کوئی ایسی بات کرنا ممکن نہیں رہا۔

بہرحال وہ لوگ جنات سے استعاذہ کرتے تھے، جو کہ کفر ہے۔

قیامت کا انکار

جنات کے بیان کا سلسلہ جاری ہے۔ وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ جس طرح تم خیال کرتے ہو، اسی طرح جنات نے بھی خیال کیا اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ کہ اللہ مرنے کے بعد کسی کو نہیں اٹھائے گا۔ یعنی جس طرح انسانوں میں سے بھی بعض لوگ قیامت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی قیامت نہیں۔ مرنے کے بعد کوئی نہیں اٹھایا جائے گا۔ اسی طرح بعض جنات بھی قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ کسی کو رسول نہیں بنائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بعض کافر انسان بھی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ یعنی خدا تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی وحی نازل نہیں کی۔ ہم نہیں مانتے کہ انسانوں میں بھی کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اسی طرح جنات میں بھی اس قسم کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ کہ جس طرح انسانوں میں منکرین قیامت اور منکرین رسالت ہیں اسی طرح جنوں میں بھی ہیں[2]

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص۱۵۸ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص۱۵۳ پ۲۹۔

جنات پر سختی

اپنی بات کے اگلے حصے میں جنات نے اُن پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد اُن پر عائد کی گئیں۔ ارشاد ہے کہ جنوں نے کہا وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا۔ یعنی ہم نے آسمانوں کو چھوا تو اسے ہم نے پہریداروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا۔ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ اور ہم سننے کے لیے ٹھکانوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا مگر اب صورت حال یہ ہے کہ جو کوئی بات سنتا ہے وہ اپنے گھات میں شہاب کو موجود پاتا ہے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل شیاطین یا جنات آسمان میں بلندی پر جاتے تھے۔ اس کے لیے عنان کا لفظ آتا ہے۔ تو وہاں پر جو فرشتے اترتے تھے وہ آپس میں مکالمہ کرتے تھے۔ جنات اور شیاطین میں سے کوئی فرشتوں کی کوئی بات سُنتا تھا اور اس میں کچھ جھوٹ وغیرہ ملا کر اپنے کاہن کے کان میں پھونک دیتا تھا۔ مگر حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد پہرے سخت کر دیے گئے۔ اب جو کوئی آگے جاتا تھا تو بڑے زور سے شہاب پڑتے تھے۔ کوئی بھاگ جاتا، کوئی زخمی ہو جاتا، کوئی مر جاتا۔ اس صورت حال کی تحقیق کے لیے جنوں کا گروہ وادی نخلہ میں سے گزر رہا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام سے قرآن پاک سُنا، تو سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ اور اُن کے اُوپر آسمان کی طرف جانے پر کیوں پابندی لگ گئی ہے۔ الغرض ان آیات میں جنات نے اپنی اس حالت کا تذکرہ کیا ہے

جنات میں فرقہ بندی

امام حسن بصریؒ[2] فرماتے ہیں کہ جس قدر فرقے انسانوں میں موجود ہیں، اسی قدر جنات میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً انسانوں میں رافضی اور شیعہ ہیں۔ تو جنات میں بھی ایسے ہی ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں مجوسی اور پارسی ہیں اور پھر فروعی اختلافات ہیں تو جنات میں بھی ہیں —— انسانوں کی طرح جنوں میں بھی غیر مقلد یعنی اہل حدیث، حنفی، مالکی، بریلوی، دیوبندی وغیرہ سب فرقے موجود ہیں۔ پہلے بھی ایسے فرقے تھے اور آج بھی ہیں۔ جبھی انسانوں میں کوئی نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے، جنات بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو اس قسم کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو استعجاب کی بات نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے سارا جنات کا کلام نقل کیا ہے۔

---

[1] ترمذی ص ۴۷۹ کتاب التفسیر [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۵۳ و تفسیر کبیر ص ۱۵۷ ج ۳۰

انسانوں کی طرح جن نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مطیع بھی ہیں اور نافرمان بھی ہیں، قاتل اور زانی وغیرہ ہر قسم کے جنات پائے جاتے ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے بھی انسان جنوں کے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے جنات کے کاروبار بھی انسانوں کی مانند مختلف ہیں، مثلاً تاجر پیشہ، کاشتکار، صناع، کوئی ایک جگہ مقیم ہے کوئی سفر کرتا ہے۔ وَاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا اور بے شک ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے

جنات کی حق شناسی

انہیں مختلف کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے جنات نے کہا وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ یعنی ہم میں نیکوکار بھی ہیں اور اس کے علاوہ یعنی بدکار بھی۔ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا۔ ہم مختلف راستوں پر بٹے ہوئے تھے۔ کوئی نیک اور شائستہ، کوئی برے اور بدکار، کوئی ناہنجار، کوئی مشرک، کوئی مومن، کوئی عیسائی، کوئی یہودی، کوئی رافضی الغرض انسانوں کی طرح مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

اور آخر کار جنات کو اقرار کرنا پڑا وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ۔ کہ ہم اللہ تعالےٰ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکتے وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا۔ اور نہ ہم بھاگ کر اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم کہیں بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ جائیں ہم تو ہر وقت خدا کے قبضے میں ہیں، وہ جب چاہے ہمیں پکڑ لے، سزا دے۔ گرفت کرے یا ہلاک کر دے، یہ سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہے لہذا وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ جونہی ہم نے ہدایت کی بات سنی، فوراً ایمان لے آئے۔ ہمارے لیے یہ چیز قابل فخر ہے۔ کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اور ایمان لاکر داعی بن گئے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم کلام بھی نہیں ہوئے محض کلام پاک سن کر ایمان کی دولت سے مشرف ہو گئے۔

جنات کے اس طریقے سے ایمان لانے کا اطلاق عام انسانوں اور خاص طور پر مکے کے لوگوں پہ ہوتا ہے۔ کہ جنات تو قرآن پاک سن کر ایمان لے آئے مگر یہ انسان ہیں کہ قرآن پاک سنتے ہیں مگر اس پہ ایمان نہیں لاتے۔ اس بات میں ان کے لیے تنبیہ کا پہلو ہے۔ کہ ان کا بھی فرض ہے کہ وہ فوراً ایمان لے آئیں۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا

یعنی جو اپنے رب پر ایمان لے آئے گا، وہ کسی نقصان کا خوف نہیں کھائے گا۔ وَلَا رَهَقًا
اور نہ اس کو کسی زبردستی کا کھٹکا ہوگا۔ یعنی اس پر کوئی زیادتی کی جائے ۔۔ یا اُس کی محنت رائیگاں
جائے ۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ اُسے کسی دوسرے کے جرم میں پھانس لیا جائے۔
یا کسی ناکردہ گناہ میں ملوث کر لیا جائے۔ اگر ایمان لے آیا ہے۔ تو اُسے اُس کا پھل ضرور ملے گا۔

اس کے بعد جنات نے مزید بیان کیا وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ط

نیک و بد جنات

اور بے شک ہم میں سے فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصاف بھی ہیں۔ قاسط کا معنیٰ ظلم کرنے والا
بے انصاف فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا۔ پس جس نے فرمانبرداری اور اطاعت
کی، انہوں نے نیکی کو حاصل کر لیا۔ تحری کا معنیٰ کوشش کرنا، جانفشانی کرنا اور حاصل کرنا ہے۔
گویا اطاعت کر کے انہوں نے نیکی کے راستہ کو تلاش کر لیا۔ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ اور جو کفر و شرک
کرنے والے ہیں۔ گناہ اور ظلم میں آلودہ ہے۔ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ وہ دوزخ کا
ایندھن بنیں گے۔ یعنی جنات ناری ہونے کے باوجود دوزخ میں جائیں گے۔ اور اُن کو بھی
ویسی ہی سزا ملے گی جیسی انسانوں کو

اس موقع پہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ جنات تو ناری مخلوق ہے۔ اُن کو آگ میں
ڈالنے سے انہیں کیا سزا ملے گی۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ جنات کی
پیدائش کی آگ اور دوزخ کی آگ کے ٹمپریچر میں بہت زیادہ فرق ہوگا۔ دوزخ کی آگ بہت سخت
ہے۔ اس لیے ناری مخلوق کو اس دوزخ کی آگ میں تکلیف پہنچے گی۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ
جہنم کے مختلف طبقات ہیں اور اُن میں ایک طبقہ زمہریر ہے جو کہ بہت سرد ہے۔ لہٰذا یہ بھی
ممکن ہے۔ کہ جنات جیسی ناری مخلوق کو زمہریر میں پھینک دیا جائے تاکہ اُن کو سرد مقام پہ سزا
دی جاسکے۔ بہرحال شرک اور کفر کرنے والے جنات دوزخ میں جائیں گے چاہے وہ نار کے طبقہ
میں ہوں یا زمہریر کے طبقہ میں۔ اُن کو سزا ہر حالت میں ملے گی۔

لہ تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۶۶ پ ۲۹)

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ ع قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ :۔ اور اگر یہ لوگ سیدھے رہتے راستے پر، البتہ ہم ان کو وافر پانی سے سیراب کرتے ﴿۱۶﴾ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں اور جو شخص اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں چلائے گا ﴿۱۷﴾ اور بیشک مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو ﴿۱۸﴾ اور بیشک جب کھڑا ہوا اللہ تعالیٰ کا بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے لیے قریب تھا کہ یہ لوگ ہجوم کر کے اس کے گرد اکٹھے ہو جائیں ﴿۱۹﴾ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے بیشک میں اپنے رب کو پکارتا ہوں اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ﴿۲۰﴾ آپ کہہ دیجئے (اے لوگو) میں تمہارے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں ﴿۲۱﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بیشک مجھے خدا کے سامنے ہرگز کوئی بھی پناہ نہیں دے گا اور میں خدا کے سوا ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پاتا ﴿۲۲﴾ مگر میرے ذمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغامات ادا کرنا ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔ پس بیشک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۲۳﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس تک کی آیات میں اللہ تعالےٰ نے جنات کا کلام دہرایا تھا۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے اکہ جنوں کے ایک گروہ نے کلام الٰہی سُنا اور کہا کہ ہم نے تو عجیب قرآن سُنا ہے۔ لہٰذا ہم ایمان لائے ہیں۔ جنات انسانوں کے بارے میں اور خود جنوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شاید وہ جھوٹ نہ بولتے ہوں، مگر معلوم ہوا کہ وہ دونوں ہی جھوٹ بولتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آسمانوں پر جا کر فرشتوں کی بات چیت سننے کا ذکر تھا۔ اور پھر اُس رکاوٹ کا ذکر تھا جو شہاب پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ سب حضور علیہ السلام کی بعثت اور نزولِ قرآنِ پاک کی وجہ سے تھا۔

جنات نے خود اقرار کیا کہ اُن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ دوسری مخلوقات کی طرح جن بھی عاجز ہیں اور اُن میں ایسی کوئی خوبی نہیں، جس کی وجہ سے اُن کی پرستش کی جائے یا اُن کے ساتھ استعاذہ کیا جائے۔

جنوں نے کہا کہ قرآن کریم سننے کے بعد ہم ایمان لے آئے اور جو ایمان لائے گا۔ وہ کامیاب ہوگا۔ اُسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اور اُس پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ جنات میں فرمانبردار بھی ہیں، اور نافرمان بھی۔ جو فرمانبرداری کرتے والے ہیں، انہوں نے نیکی کو تلاش کر لیا۔ اور جو ظلم کرنے والے بے انصاف ہیں، وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لیے انعامات

یہاں تک جنات کا کلام تھا جو اللہ جل شانہٗ نے ذکر فرمایا اور اُن کا حال بذریعہ وحی اپنے پیغمبر علیہ السلام کو بتلا دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔ وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا۔ یعنی اگر یہ لوگ سیدھے رہے راستے پر، تو ہم ان کو خوب پانی سے سیراب کریں گے۔ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں۔ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا اور جو شخص اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرے گا۔ اللہ تعالےٰ اُس کو سخت اور دشوار عذاب میں چلائے گا۔

وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا کا تعلق اُوْحِيَ اِلَيَّ سے ہے۔ یعنی اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیں کہ میری طرف اس بات کی بھی وحی کی گئی ہے۔ کہ اگر یہ لوگ سیدھے رہے یعنی اس راستے پر اَلطَّرِيْقَةُ الْمَرْضِيَّةُ عِنْدَ اللّٰهِ جو اللہ تعالےٰ کا پسندیدہ راستہ ہے التوحید کا راستہ اور صراط مستقیم ہے

تو ہم انہیں بہت سے پانی سے سیراب کریں گے۔

اِسْتَقَامُوْا کا تعلق انسان کے ساتھ بھی ہے اور جنوں کے ساتھ بھی۔ یعنی اگر انسان اور جن اللہ کے پسندیدہ راستے پر قائم رہے تو اللہ تعالےٰ اُن کے رزق میں فراوانی فرمائیں گے۔ اور اُن سے تکلیف کو دور فرمائیں گے۔ مَاۤءً غَدَقًا کا معنیٰ کثیر پانی ہے مگر یہاں صرف پانی ہی مراد نہیں بلکہ ہر قسم کے رزق کی وسعت مراد ہے۔ جس میں پانی بھی ایک اہم جزو ہے۔ کیونکہ پانی ہر جاندار کے لیے عظیم نعمت ہے۔ الغرض ایمان اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے اس آیت میں ظاہری اور باطنی انعامات کی خوشخبری ہے۔

اگلی آیت کے پہلے حصے میں لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ کہہ کر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ مذکورہ انعامات ان کی آزمائش کے لیے ہیں۔ کہ حصولِ نعمت پر کون شکریہ بجالاتا ہے اور کون کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا کردہ ہر نعمت میں امتحان کا پہلو ضرور ہوتا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں، مکے میں قحط پڑا ہوا تھا۔ تو یہاں اللہ تعالےٰ نے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ قحط اہل مکہ کے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہے۔ جب لوگ نافرمانی کرتے ہیں، تو اس کے اثرات مختلف قسم کی پریشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جن میں قحط سالی، اور پانی کی قلت بھی ہے، جس کی وجہ سے انسان، حیوان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سب تکلیف میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کفر و شرک اور ظلم و شرارت سے باز آجائیں اور اللہ تعالےٰ کے پسندیدہ راستے پر چلنے لگیں جس طرح جنات کلام الٰہی سُن کر راہِ راست پر آگئے۔ تو اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت کا نزول فرمائیں گے جس سے زمین کو سرسبز و شاداب کردیں گے اور قحط کو دور فرمادیں گے۔

اہل انجیل کو بھی اللہ تعالےٰ نے یہی ارشاد فرمایا تھا کہ اگر یہ اللہ کی کتاب کو صحیح طور پر قائم کرتے تو ہم ان کے لیے ہر طرح سے خیر و برکات نازل فرماتے۔ بعض بستیوں کے متعلق بھی اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اگر یہ ٹھیک راستے پر چلتے تو ہم ان کے لیے زمین و آسمان سے خیر و برکات نازل فرماتے۔

ان آیات میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اے نبی علیہ السلام! آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف یہ حکم بھی

---

[1] تفسیر ابن کثیر عربی ص ۴۳۱ ج ۴ و تفسیر عزیزی ص ۱۶۷ پ ۲۹

آیا ہے۔ کہ معصیت اور گناہوں کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، قحط پڑتے ہیں، پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیں کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ راستے پر چلتے رہے تو ہم ان کو بہت سے پانی سے سیراب کریں گے یعنی اسباب رزق کثرت سے مہیا کریں گے۔

یاد الٰہی سے اعراض کرنے والوں کیلئے وعید

آیت کے دوسرے حصے میں یاد الٰہی سے اعراض کرنے والوں کے لیے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ جو شخص اپنے رب کی یاد سے روگردانی کرتا ہے۔ یعنی اس کی وحدانیت کا انکار کرتا ہے، اطاعت کے راستے کی بجائے کفر و شرک کے راستے پر گامزن ہوتا ہے معصیت کا راستہ اختیار کرتا ہے يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا تو اللہ تعالیٰ اُسے سخت چڑھتے ہوئے عذاب میں چلاتا ہے۔ یعنی آخر کار وہ دشوار عذاب کا شکار بنے گا۔

مساجد میں غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں کے متعلق ارشاد فرما چکے ہیں۔ کہ آپ ان کا اعلان وحی الٰہی کے واسطہ سے کہہ دیں۔ ایک یہ کہ جنوں نے قرآن پاک سنا اور ایمان لائے اور دوسری بات یہ کہ اگر لوگ سیدھے راستے پر چلتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر رزق کی فراوانی فرمائیگا۔ اب تیسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے۔ کہ آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ لفظ مساجد، مسجد کی جمع ہے اور یہ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مسجد مصدر میمی ہے اور سجدے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی لفظ سجدہ گاہ کے معنے میں بھی آتا ہے، اور اس سے مراد آلات (اعضاء) سجدہ بھی ہیں اس مقام پر یہ تینوں معنی ہو سکتے ہیں۔ سجدہ گاہ:- اگر مساجد سے مراد سجدہ گاہ لیا جائے تو وہ یہی مسجدیں ہیں جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا خَيْرُ الْبِقَاعِ الْمَسَاجِدُ[1] یعنی ساری دنیا میں سے زمین کے پسندیدہ ٹکڑے مسجدیں ہیں۔ جہاں عبادت کی جاتی ہے، نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ ویسے تو ساری زمین ہی اللہ کی ہے اَلْاَرْضُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ مگر مساجد کی تعمیر خاص طور پر کی جاتی ہے۔ تاکہ ان میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ اور حضور علیہ السلام نے مساجد کی ترغیب بھی دلائی، فرمایا[2] مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ

---

[1] کنز العمال ص ۱۵۹ ج ۷ و ص ۱۶۱ ج ۷ [2] مسلم ص ۲۰۱ ج ۱ بخاری ص ۶۴ ج ۱ و ترمذی ص ۴۳

یعنی جس شخص نے اللہ کے لیے مسجد تعمیر کی، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

اب یہ مسجدیں جب کہ خالص اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو پھر ان مواقع میں کفر و شرک کی بات کرنا نہایت ہی ناپسندیدہ ہے۔ ویسے تو کفر و شرک کسی مقام پر بھی روا نہیں، مگر اس کا ارتکاب مساجد میں کرنا نہایت ہی قبیح فعل ہے۔ جیسے حرم شریف کے متعلق فرمایا[1] وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ یعنی جو کوئی حرم کے اندر الحاد وکجروی کرے گا، ہم اُس کو دوہرا عذاب دیں گے۔ کیونکہ یہ پاک خطہ ہے، اللہ نے اس کو محترم بنایا ہے۔ بہرحال شرک وکفر تو اللہ کے قہر وغضب کو بھڑکانے والی چیز ہے، مساجد میں مطلقاً معصیت کی بات بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں۔

آداب مسجد

آداب[2] مساجد کے ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ اپنے چھوٹے بچوں کو مسجدوں سے الگ رکھو کہ وہ بے شعور ہوتے ہیں۔ مسجد میں پیشاب، پاخانہ کریں گے تو بے حرمتی ہوگی۔ اسی طرح پاگلوں کو بھی مسجد میں نہ آنے دو، وہ بھی اس قابل نہیں کہ مسجد کی حرمت بحال رکھ سکیں مسجد میں لڑائی نہ کرو، تلوار مت کھینچو۔ مسجد میں حدود مت جاری کرو کہ ہاتھ کٹے گا، قتل ہوگا تو مسجد آلودہ ہوگی۔ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان نہ کرو، خرید و فروخت نہ کرو، یہ سب چیزیں مسجد کے آداب کے خلاف ہیں۔

اور یہ بھی ارشاد فرمایا نَظِّفُوْهَا یعنی مسجدوں کو پاک صاف رکھو۔ اس میں ظاہری اور باطنی کسی قسم کی گندگی نہیں ہونی چاہیئے۔ ظاہری گندگی سے تو مسجد کی پاکیزگی کی کوشش اکثر کی جاتی ہے۔ مگر یہی مساجد باطنی گندگی سے بھری ہوئی ہیں۔ شرک و بدعت، غلط قسم کے وعظ، مساجد میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ رسومات باطلہ کی ترغیب دی جاتی ہے، شرک و بدعت کی تعلیم ہوتی ہے، یہ سب ناجائز کام ہیں۔ کیونکہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ——

سجدہ:۔ اگر مساجد سے مراد محض سجدہ ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ سجدے صرف اللہ کے لیے ہیں، اور کسی کے سامنے سجدہ نہ کرو۔ قطعاً حرام ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سجدہ

---

[1] سورۃ حج ۲۵ پ ۱۷، [2] کنز العمال ص ۴۷۱ و ص ۴۷۲

سوائے خدا کے کسی کو بھی روا نہیں، نہ سورج کو، نہ چاند کو، نہ مخلوق میں سے کسی اور کو۔ "لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ"۔

الغرض سجدہ صرف اُس ذات کے لیے ہے جو سب کی خالق ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَهُنَّ" یہ سجدہ بعض صورتوں میں کفر وشرک بنتا ہے اور بعض صورتوں میں حرام ہوتا ہے اگر تعظیم کا اعتقاد نہ ہو تو اس صورت میں بھی سجدہ حرام ہے۔ بعض قبر کو سجدہ کرتے ہیں۔ بادشاہ، پیر، بزرگ، اُستاذ، باپ ہر کسی کو سجدہ حرام ہے۔ سجدہ عبادت تو تمام شریعتوں میں اللہ کے سوا حرام رہا ہے، مگر سجدہ تعظیمی بھی ہماری شریعت میں حرام ہے۔ سجدہ کا مستحق صرف اللہ ہے۔

<u>اعضائے سجدہ</u>: مساجد سے مراد اگر اعضاءِ سجدہ ہیں تو اعضاء تو سارے اللہ نے ہی پیدا کئے ہیں۔ تو اللہ کے پیدا کردہ اعضاء غیر اللہ کے سامنے کیسے سجدہ ریز ہو سکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَةِ اٰرَابٍ۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پہ سجدہ کروں۔ ناک اور پیشانی تو ایک عضو ہی شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو پاؤں کل سات اعضاء ہیں، جن پہ سجدہ کیا جاتا ہے۔ تو اللہ کے پیدا کردہ اعضاء صرف اللہ کے سامنے ہی سجدہ کریں گے۔

غیر اللہ کے لیے رکوع بھی جائز نہیں

ترمذی[2] شریف کی حدیث میں صراحتاً موجود ہے۔ کہ جھک کر ملنا بھی درست نہیں۔ منہ سے سلام کہہ سکتے ہیں، ہاتھ سے مصافحہ درست ہے، معانقہ کر سکتے ہیں، ——— مگر حضور علیہ السلام نے جھک کر ملنے سے منع فرمایا ہے۔ کہ اس طرح رکوع ہوتا ہے سجدہ تو ویسے ہی حرام ہے، مگر یہ جھک کر ملنا بھی مکروہ ہے۔ الحنا کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

بزرگوں کی قبروں کے ساتھ معاملہ

اب حالت یہ ہے بڑی بڑی قبروں پہ سجدے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب میرے ساتھ اُلجھ گئے۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ کی بات ہے۔ کہنے لگے کوئی شخص قبر پہ سجدہ نہیں کرتا، یہ خواہ مخواہ الزام تراشی ہے۔ چنانچہ میں اُن کو سید علی ہجویریؒ کی قبر پہ لے گیا۔ ہم وہاں صرف پانچ منٹ ٹھہرے اور اتنے عرصہ میں سات آدمیوں نے وہاں سجدہ کیا۔ وہ صاحب

---

[1] ترمذی ص۶۶ باب ماجاء فی السجود علی سبعة اعضاء [2] ترمذی ص۳۹ باب ماجاء فی المصافحة

کہنے لگے، تم ٹھیک کہتے ہو، واقعی لوگ قبروں پر سجدہ کرتے ہیں۔ وہاں عجیب وغریب حالت تھی، کوئی بوسہ دے رہا ہے، کوئی ہاتھ مل رہا ہے، کوئی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کر رہا ہے کوئی کوئی حرکت کر رہا ہے۔ یہ حکومت کیا کرتی ہے، اُسے کمائی سے غرض ہے، کبھی بیس ہزار روپے کی آمدنی ہے کبھی چالیس ہزار کی، عرس کے موقع پر لاکھ دو لاکھ یومیہ آمدنی ہوتی ہے۔ محکمہ اوقاف نے کیا اصلاح کی ہے۔ کیا لوگوں کو شرک سے روکا ہے۔ لوگ اسی طرح کفر و شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حکومت خود بڑے نمونے قائم کرتی ہے۔ پختہ مزار بنائے جاتے ہیں۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا واضح ارشاد موجود ہے نَهٰى اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ[1] قبروں کو پختہ نہ بناؤ، یہ حرام ہے۔ اور شرک کی ترویج کا ذریعہ ہے۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ پچھلے دنوں ڈیڑھ سو زائرین کا جو وفد اجمیر شریف گیا، وہ مزار پر چڑھانے کے لیے دو لاکھ روپے مالیت کی چادر ہمراہ لے کر گیا۔ آپ ہی بتائیں کہ اس میں کیا تُک ہے۔ لوگ بھوکوں مریں، کھانے کو کچھ نہ ملے اور آپ دو لاکھ روپے کی چادر چڑھا رہے ہیں۔ یہ کس شریعت میں جائز ہے۔ یہ تو کفر و شرک کی بات ہے۔ قبروں پر بے شک جاؤ مگر فاتحہ پڑھنے کے لیے ایصال ثواب کے لیے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہیں۔ باقی تمام چیزیں کفر، شرک، بدعت ہیں۔

اس سلسلہ میں حکومت کے وزراء حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جب حکومت خود چادریں چڑھائیگی تو باقی لوگ کیا کریں گے۔ کیا قبروں پر چادریں چڑھانا وزیروں کا کام ہے۔ کیا عرس کرنا ایڈمنسٹریٹروں کا کام ہے مگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لوگوں کو توحید کے راستے سے ہٹا کر کفر کے راستے پر ڈالا جا رہا ہے اور حکومتیں سرپرستی کر رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔

مستحق عبادت صرف اللہ تعالےٰ ہے

الغرض اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے۔ کہ مسجدیں یا سجدے یا اعضاء سجدہ اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا سجدہ سوائے خدا کے کسی کو روا نہیں، اپنی حاجتوں میں صرف خدا کو پکارو۔ اپنی عبادتوں میں صرف خدا کے سامنے ہی جھکو۔ وہی عبادت کا مستحق ہے۔ جب ہم ذات الٰہی کے لیے اِلٰہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا معنی یہی ہوتا ہے

---

[1] مسلم ص ۳۱۲ ج ۱

کہ مستحق عبادت صرف وہی ہے، اور کوئی نہیں باقی تو ساری مخلوق ہے۔ اور مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں۔ تو ایک مخلوق دوسری مخلوق کی معبود کیسے ہو سکتی ہے۔ مخلوق تو عابد ہے اور تم اس کو معبود بنا رہے ہو۔ کہیں قبر کی پرستش ہو رہی ہے، کہیں پیر صاحب کے سامنے سجدہ ہو رہا ہے۔ کہیں نیاز ہو رہی ہے، چڑھاوا چڑھایا جا رہا ہے۔ دہائی دی جا رہی ہے، کہیں مشکل کشائی کے لیے پکارا جا رہا ہے۔ یہ تمام باتیں مشرکانہ ہیں اور ناجائز ہیں۔ عابد اور معبود میں تفریق لازم ہے۔

"یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ ایسا کون سا انسان ہے، جس کی عبادت کی جائے۔ سجدہ ہو یا کوئی عبادت، اس کا مستحق صرف اللہ ہے۔ عبادت کا مفہوم غایت درجے کی تعظیم ہے، یہ قول سے بھی ہوتی ہے اور فعل سے بھی۔ اس کے مختلف طریقے ہیں، سجدہ، رکوع، نیاز، ندا سب عبادت میں داخل ہیں۔ اگر یہی افعال غیر اللہ کے لیے کئے جائیں تو شرک ہے۔ شرک کی کم و بیش بیس قسمیں ہیں۔ کتاب دلیل المشرکین میں اس کی تشریح موجود ہے۔

عبداللہ سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

"اُوحِیَ اِلَیَّ" کے سلسلے میں چوتھی بات یہ کہی کہ آپ کہہ دیجئے "وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ" اور جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ۔ اور اس سے مراد حضور نبی کریم علیہ السلام ہیں۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خود کو اللہ کا بندہ کہا تھا "اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ" میں اللہ کا بندہ ہوں۔ حضور علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ اے لوگو! عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں عیسائیوں نے مبالغہ آرائی کی اور کفر میں مبتلا ہوئے، خبردار! میری تعریف میں مبالغہ آرائی نہ کرنا[1] انا عبد اللّٰہ فقولوا عبد اللّٰہ و رسولہ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ تم بھی مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا، انہوں نے تعریف و مدح سرائی میں غلو کیا، خبردار! تم ایسا نہ کرنا۔

حضور علیہ السلام کا اعلانِ توحید

تو فرمایا جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا یَدْعُوْهُ اسے یعنی اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے لیے کَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا۔ قریب تھا کہ یہ لوگ اس کے گرد لبدے کی طرح ٹھٹھ باندھ کر اکٹھے ہو جاتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اللہ کا بندہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کلام الٰہی پڑھتا تھا۔ تو لوگ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے تھے۔ مومن تو اس لیے جمع ہوتے کہ آپ کے ساتھ مل کر اللہ کی عبادت کریں اور کفار طعن و تشنیع اور اذیت پہنچانے کے لیے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جنات کی طرف اشارہ ہے کہ جب آپ وادیٔ نخلہ میں کھڑے ہو کر خدا کو پکار رہے تھے تو جنات کی جماعت

---

[1] ترمذی مع شمائل صـ۵۹۴

بالکل قریب ہو رہی تھی، گویا کہ ٹھٹھ باندھ کر قریب تر ہو رہے تھے کہ قرآن پاک اچھی طرح سن سکیں۔ جسے سن کر جنات ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ بے شک میں اپنے رب کو پکارتا ہوں وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا۔ اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ جنات نے بھی کہا تھا، ہمارا خیال نہیں تھا کہ لوگ بری بات کرتے ہوں گے مگر معلوم ہوا کہ جن بھی شرک کرتے ہیں اور انسان بھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ میرا طریقہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا ہے اور اس کی طرف دعوت دینا ہے۔

عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ الآیۃ[1] خدا تعالیٰ کی ذات تمام شرکیہ باتوں سے پاک ہے۔ میں ان کی تردید کرتا ہوں۔ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ نہ عبادت میں، نہ مدد طلب کرنے میں، نہ حاضر ناظر سمجھنے میں، نہ مشکل کشائی میں، نہ واجب الوجود ہوتے میں، نہ مدبر ہونے میں، میں کسی کو خدا کا شریک نہیں بناتا۔ واجب الوجود بھی وہی ہے۔ علیم کل بھی وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی قادر مطلق نہیں۔ اور کوئی ایسا نہیں جو اپنے ارادے سے جو چاہے کرے۔ خدا کے سوا کوئی نافع اور ضار نہیں۔ کوئی اس لائق نہیں ——— کہ اس کے نام کی نذر و نیاز دی جائے وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا۔

نفع اور نقصان نبی کے اختیار میں نہیں ہے

ارشاد خداوندی ہے کہ آپ یہ بھی کہہ دیں۔ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا یعنی اے لوگو! میں تمہارے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ یہ چیزیں میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ کیونکہ النافع اور الضار ذات خداوندی ہے۔ حتیٰ کہ میں تم کو ہدایت بھی نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ۔ یعنی اے نبی علیہ السلام! جس کو آپ چاہیں، اپنے ارادے سے منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ بلکہ ہدایت تو اللہ دیتا ہے جس کو چاہے۔ حضور علیہ السلام کو اپنے چچا ابو طالب کے اسلام لانے کی کتنی طلب تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ کہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا۔ ابولہب بھی حضور علیہ السلام کا

---

[1] سورۃ یوسف ۱۰۸۔ پ ۱۳۔

حقیقی چچا تھا۔ اُس کے متعلق بھی ارشادِ خداوندی ہے "تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ" اور "سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَّامْرَاَتُهٗ" وہ اور اس کی بیوی دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ کیونکہ وہ شرک سے باز نہیں آئے۔ ابوطالب نے باوجود حضور علیہ السلام کا وفادار ہونے اور حمایت کرنے کے ایمان قبول نہیں کیا۔ لہٰذا دوزخ کا شکار ہوا۔ اسی لیے فرمایا کہ میں تمہارے لیے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ نافع اور ضار ہونا صفتِ خداوندی ہے۔

دنیا میں انسانوں نے کیسے کیسے بیہودہ عقیدے بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی پیر کے متعلق نفع ونقصان کا عقیدہ رکھتا ہے، کوئی قبر والے کے بارے میں کوئی جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام کے بارے میں، کوئی جنات کے بارے میں تعویذ وغیرہ۔ جلا کر جنات کو طلب کرنا، انہیں مشکل کشائی میں شریک کرنا وغیرہ وغیرہ سب شرکیہ باتیں ہیں کیونکہ نفع و نقصان کا مالک صرف خداوند قدوس ہے۔ اُس کے علاوہ مافوق الاسباب کوئی فریادرس نہیں۔

آج کل تو بچوں کو کیٹ (CAT) میٹ (MAT) ریٹ (RAT) پڑھایا جاتا ہے، پہلے زمانے میں کریما پڑھایا جاتا تھا، جو توحید خالص کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔

ندارم غیر از تو فریاد رس
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

اے مالک الملک! تیرے سوا کوئی فریادرس نہیں ہے، گنہگاروں کے گناہ معاف کرنے والا تو ہی ہے۔ اور کوئی نہیں۔ جیسا فرمایا "اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ" ایک مجبور آدمی کی پریشانی میں جب سارے ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو پریشانی کو کون دور کرتا ہے۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ اگر نہیں ہے۔ تو پھر یہ لوگ کیوں شرک میں مبتلا ہیں۔

صحابہ کے عمل سے انبیاء علیہم السلام بھی مستثنیٰ نہیں

نبی علیہ السلام کو مزید ارشاد ہوا کہ آپ اس بات کا بھی اعلان کر دیں کہ قُلْ اِنِّیْ لَنْ يُّجِيْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ۔ مجھے خدا کے سامنے کوئی بھی پناہ نہیں دے گا اگر میں نے کوئی ایسی کفر و شرک والی بات کی معصیت کا ارتکاب کیا۔ وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔ اور میں خدا کے سوا کوئی جائے پناہ بھی نہیں پاتا۔ ہر نبی نے یہی کہا اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ اگر میں اپنے رب کی ذرا بھی نافرمانی کروں گا، تو بڑے دن کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ حضرت

شعیب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور خود حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی کہا تھا۔ کہ خدا کے سوا کوئی پناہ نہیں اور اگر میں کوئی ایسی بات کروں، تو کوئی بچانے والا نہیں۔ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ" اگر آپ ذرا بھی شرک کریں گے تو خدا آپ کے سارے اعمال ضائع کر دے گا۔ خدا تعالیٰ بالکل رعایت نہیں کرتا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہے۔ تو باقی لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اگر وہ شرک کا ارتکاب کریں گے، تو اُن کا کیا حال ہوگا۔ کیا ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ کفر کرنے کے باوجود اللہ کے پیارے ہی رہیں گے اور اُس کے نبی کے مقبول ہی ہونگے۔ اور ہمیں معافیاں ملتی ہی رہیں گی ؟

نبی کا کام پیغام الٰہی پہنچا دینا ہے

فرمایا کہ میرا کام تو یہ ہے۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ ہدایت دینا میرا کام نہیں، نہ میرے بس کی بات ہے۔ کسی کو منزل مقصود تک پہنچانا بھی میرے اختیار سے باہر ہے۔ اور سن لو! وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَهَنَّمَ اس کے لیے جہنم کی آگ ہے خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے لہذا لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُسکی وحدانیت کو مان لیں، اس کے رسول کی بات کو بھی تسلیم کریں کیونکہ وہ خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچانے والا اور ہادی ہے۔ اور جو اُن کی نافرمانی کرے گا، اُس کے لیے جہنم کی آگ تیار ہے۔ جس سے خلاصی ممکن نہیں۔

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۞۲۴ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۞۲۵ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۞۲۶ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۞۲۷ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۞۲۸

ع ۲ / ۹ / ۱۲

ترجمہ :- یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے پس یہ لوگ اس وقت جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور تعداد میں کم (۲۴) اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے مدت دراز بنائے گا (۲۵) غیب کو جاننے والا ہے پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا (۲۶) مگر اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کرتا ہے تو اس کے آگے اور پیچھے اللہ تعالیٰ چوکیدار بھیجتا ہے (۲۷) تاکہ ظاہر کر دے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور اس نے احاطہ کیا ہے ان کے تمام احوال کا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی گنتی کر رکھی ہے (۲۸)

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے۔ کہ جنات کے ایک گروہ نے کلام الٰہی سنا اور اس پہ ایمان لائے اور کفر و شرک سے بیزاری کا اعلان کیا۔ دوسری بات آپ یہ بھی فرما دیں کہ اگر انسان اور جن اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ راستے یعنی اُس کی وحدانیت عبادت اور اطاعت کے راستے پر رہیں گے تو ہم اُن کے لیے وسائل رزق کو آسان کر دیں گے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ آپ یہ بھی کہہ دیں کہ مساجد اللہ کے لیے ہیں۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، کسی کو نہ پکارو۔

اس کے بعد نبی علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ اللہ کا بندہ جب اُسے پکارنے کے لیے کھڑا ہوا، تو یہ لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے، حکم ہوا کہ آپ کہہ دیں کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں، اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ نیز یہ کہ میں تمہارے لیے نفع، نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔ اور اگر میں نے نافرمانی کی تو مجھے ہرگز کوئی پناہ نہیں دے گا اور کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میرا کام تو پیغام الٰہی کو پہنچانا ہے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اس کے لیے نار جہنم کی وعید ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔

نصرت الٰہی ہی کامیابی کی دلیل ہے

سورۃ کے آخری حصہ میں نبوت و رسالت، اللہ تعالیٰ کی صفات اور قیامت کا ذکر ہے۔ اور ساتھ مشرکین کا شکوہ بھی ہے۔ فرمایا حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یہاں پر حَتّٰی ابتدائیہ ہے۔ یعنی یہ حالت اسی طرح قائم رہے گی، نافرمان لوگ مخالفت کرتے رہیں گے، شرک میں مبتلا رہیں گے، حق سے گریزاں رہیں گے، ٹھٹا مذاق کریں گے، ایذا پہنچائیں گے۔ یہاں تک کہ وعدے کا دن آجائے گا یعنی قیامت برپا ہو جائے گی۔ وعدے کے دن سے مراد یوم الحساب ہی ہے کہ قبرستان کی بعض مسنونہ دعاؤں میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اَتٰکُمْ مَّا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُّؤَجَّلُوْنَ[۱] یعنی تمہارے پاس وہ چیز آ پہنچی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور جس کے لیے مہلت دی گئی تھی۔ تم تو یہاں قبرستان میں پہلے پہنچ چکے ہو اور اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ ہم بھی تم سے عنقریب ملنے والے ہیں۔ یعنی موت ہر ایک کے لیے برحق ہے۔ اس کے بعد برزخ بھی برحق ہے اور پھر جزا و سزا کی منزل بھی برحق ہے جس کے لیے دنیا میں مہلت دی گئی تھی۔ ہر شخص اور ہر قوم کو مہلت دی جاتی ہے، اور اس کے بعد جب وقت آجاتا ہے۔ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ[۲] پھر اس میں تاخیر نہیں ہوتی۔

وعدے والی چیز کا وقوع اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی۔ اجتماعی طور پہ تو قیامت واقع ہوگی، جب ہر چیز فناہ ہونے کے بعد دوبارہ قائم ہوگی۔ اور انفرادی طور پہ یہ وعدہ ہر شخص کی موت پر آجاتا ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے، مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ[۳] یعنی جو آدمی مر گیا، اس کی قیامت برپا ہو گئی۔ کیونکہ سوال و جواب کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ محاسبہ کا

۱؎ مسلم ص۳۱۳ ج۱ کتاب الجنائز ۲؎ سورۃ نوح آیت ۵، ۳؎ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۲۳۴ ج۱ بحوالہ دیلمی عن النبیؐ مرفوعاً

عمل بھی جزوی طور پہ شروع ہو جاتا ہے اگرچہ مکمل محاسبہ حشر کے دن ہوگا۔ مگر محاسبے کے عمل سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا۔ برزخ میں ہر ایک کا محاسبہ ہوتا ہے جس میں جزا و سزا کا مکمل احساس ہوتا ہے۔ تو اسی واسطے یہ ارشاد ہو رہا ہے۔ کہ یہ لوگ مخالفت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ آجائے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضْعَفُ نَاصِرًا پس یہ لوگ اس وقت جان لیں گے کہ کس کی مدد کمزور ہے۔ آج تو یہ نبی علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے پاس دنیوی مال و اسباب کی کمی ہے اُن کے پاس فوج نہیں ہے، مگر اُس دن پتہ چلے گا کہ کمزور کون ہے وَأَقَلُّ عَدَدًا اور تعداد میں کون کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایمان کے بغیر تعداد کی کثرت اور مال و دولت کی فراوانی وبال ہے۔ جیسا کہ سورۃ حاقّہ میں گذر چکا ہے کہ انسان کفِ افسوس ملتا ہوا کہے گا "مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ" افسوس! میرے مال نے مجھے کچھ فائدہ نہ دیا۔ نیز "هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ" میری حکومت بھی مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی۔ نہ فوج کام آ سکی۔ نہ پارٹی کا فائدہ ہوا، نہ کثرت تعداد اور کثرت مال مفید ثابت ہوا۔ وہاں پہ پتہ چلے گا کہ مدد و نصرت کس کی کام آتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے۔ "إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ" یعنی[1] ہم اپنے رسولوں اور ایمانداروں کی دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی کریں گے۔ اُس دن ایمان داروں کی مدد اللہ کی جانب سے ہوگی، سب معاملات درست ہو جائیں گے۔ برخلاف اس کے منکرین کی نہ کوئی جماعت رہے گی، نہ فوج، نہ مال و دولت کام آئے گا۔ چنانچہ اُس دن انہیں معلوم ہوگا کہ مدد کس کی کمزور ہے اور تعداد کس کی کم ہے لہذا دنیا میں اگر حق پرستوں کی حمایت قلیل ہو تو انہیں گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ اللہ کی مدد پہ بھروسہ کرنا چاہیئے

وقوعِ قیامت کا وقت نبی کے علم میں نہیں تھا

مشرکین اعتراض کرتے تھے۔ کہ جب آپ کے کہنے کے مطابق جزائے عمل کی منزل برحق ہے، تو پھر قیامت برپا کیوں نہیں ہوتی۔ جیسے سورۃ ملک میں آتا ہے، "مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا یعنی قیامت کب برپا ہوگی۔ اسی نوعیت کے اعتراضات کے جواب میں یہاں فرمایا قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَا تُوعَدُونَ

---

[1] مومن آیت ۵۱

آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ۔ یا میرا رب اس کے لیے مدت دراز بنائے گا۔ اس قدر تو میں جانتا ہوں کہ جزائے عمل اور محاسبہ قطعی طور پر واقع ہوگا، مگر اس کے وقت انعقاد کے بارے میں نہیں جانتا۔ گذشتہ سورۃ میں بھی اسی قسم کا مضمون گذر چکا ہے اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا" یعنی یہ لوگ اسے بعید خیال کرتے ہیں حالانکہ ہمارے نزدیک وہ قریب ہے۔ تاہم فرمایا کہ مجھے اس گھڑی کا علم نہیں ہے جس میں قیامت واقع ہوگی۔

سزا کا مقررہ وقت بھی اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے

ایک تو قیامت کا انعقاد ہے اور دوسرے سزا کا واقع ہونا۔ اگر شخصی طور پر بھی سزا واقع ہوگی تو وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس وقت ان پر افتاد آتی ہے۔ اور کس قسم کی سزا سے دوچار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات انسانوں کو انسانوں کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے مشرکین مکہ کو بدر میں سزا دی گئی۔ کسی کو بیرونی ذرائع یعنی آفاتِ ارضی و سماوی سے سزا دی گئی جیسا کہ بعض قوموں کا حال گذر چکا ہے۔ تو ان تمام انفرادی آفتوں کے آنے کا وقت بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور مجموعی طور پر وقوع قیامت بھی اللہ ہی کے علم میں ہے۔ نبی علیہ السلام کو حکم ہوا۔ کہ آپ کہہ دیں کہ اس بات کا علم مجھے نہیں ہے کہ قیامت قریب ہے یا دور ہے۔

علم غیب خاصہ خداوندی ہے

اس ضمن میں مزید وضاحت فرمائی عٰلِمُ الْغَیْبِ یعنی غیب کو جاننے والا صرف اللہ ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وقوعِ قیامت کے وقت کو میں نہیں جانتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں بھی یہی ہے "اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" یعنی اے مولا کریم! تمام غیبوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔ یہاں لفظ الغیب استغراق اور جنس کے لیے ہے۔ یعنی جنس غیب اور تمام غیوب کا جاننے والا صرف وہی ہے۔ اس کے سوا باقی مخلوق کے لیے غیب کی نفی کی گئی۔ لہذا مخلوق میں سے کسی کو عالم الغیب کہنا درست نہیں ہے۔ فرمایا "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ" ارض و سماء کی ساری کائنات میں غیب سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ فقہائے کرام اور علم عقیدہ والے بھی یہی کہتے ہیں کہ عالم الغیب کا اطلاق صرف ذاتِ خداوندی پر ہوتا ہے غیب کا لفظ اضافی طور پر بھی بولا جاتا ہے اور مطلق بھی۔ اضافی طور پر اس طرح کہ بعض چیزیں بعض مخلوق جانتی ہے اور بعض نہیں جانتی، لہذا بعض کے لیے وہ غیب ہے اور دوسروں

کے لیے غیب نہیں۔ آسمانی مخلوق بہت سی ایسی باتوں کو جانتی ہے جو دوسری مخلوق نہیں جانتی۔ بعض چیزیں زمین والے جانتے ہیں، آسمان والے فرشتے نہیں جانتے، تو یہ گویا غیب اضافی ہے اسی طرح ہر شخص بعض چیزیں دوسرے کی نسبت جانتا ہے یعنی کسی چیز کا علم بعض لوگوں کو ہوتا ہے بعض کو نہیں ہوتا۔ یہی اضافی غیب ہے۔ البتہ "الغیب" یعنی کلی غیب سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ذرے ذرے کا علم صرف خدا تعالےٰ کو ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے لیے تو کوئی چیز غائب نہیں۔ اس ضمن میں فقہائے کرام فرماتے ہیں۔

کہ غیب اور شہادت کے الفاظ مخلوق کی نسبت سے آئے ہیں کہ مخلوق کے نزدیک بعض چیزیں حاضر ہیں اور بعض غائب، بعض چیزوں کا علم مخلوق کو ہوتا ہے۔ بعض چیزوں کا نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جو مخلوق کے نزدیک غیب کا درجہ رکھتی ہیں یا وہ حاضر ہیں اور ان کے محسوسات میں آتی ہیں۔

انبیا علیہم السلام کا علم انبائے غیب ہوتا ہے

امام ابوبکر جصاص ؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام غیب نہیں جانتے اِلَّا مَا اَعْلَمَھُمُ اللّٰہُ[1] سوائے اس کے جو اللہ ان کو تبلا دیتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کو جو چیز بتائی جاتی ہے اس پر قرآن پاک میں انباء غیب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق فرمایا ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ" یعنی یہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔ یعنی ایسا واقعہ ہے جو تاریخ سے معلوم نہیں اور انسانی روایات بھی منقطع ہیں۔ اس طرح آئندہ پیش آنے والے واقعات مثلاً جنت، دوزخ، عالم برزخ، خدا کی ذات، صفات، عالم لاہوت، عالم ملکوت عالم مثال وغیرہ سب غیب ہیں مگر انبیا علیہم السلام کو بذریعہ وحی ان سے آگاہ کیا جاتا ہے یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں، جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔ دوسری جگہ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم رض کے متعلق صاف صاف فرمادیا[2] ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ وَمَا

---

[1] احکام القرآن ص۔ [2] سورۃ عمران آیت ۴۴۔

كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اور آپ وہاں موجود نہیں تھے جب وہ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے یعنی قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ کہ کس کا قلم پانی میں رُکتا ہے اور کس کا چلتا ہے۔ اے نبی کریم علیہ السلام! آپ کو کوئی علم نہیں تھا یہ تو ہم نے وحی کے ذریعے آپ کو بتایا۔ یہ چیزیں آپ نے نہ کسی کتاب میں پڑھیں اور نہ کسی اُستاد سے، بلکہ اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو بتائیں اور یہی غیب کی خبریں کہلاتی ہیں۔ البتہ ذرہ ذرہ کا علم اللہ ہی کو ہے "وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ"۔ "وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ"۔ علیم کل ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اسی طرح قدرت تامہ اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ میں سے ہے قادرِ مطلق اللہ کی ذات ہے۔ مخلوق کا علم قلیل اور محدود ہوتا ہے۔ مگر اللہ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسے ایک ایک ذرے کا علم ہے۔

الغرض کلی علم صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ قیامت کے وقوع کا علم مجھے نہیں دیا گیا۔ قرآن پاک نے مزید فرمایا "لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ" اللہ نے اس کا وقت کسی کو نہیں بتایا، نہ جبرائیل کو، نہ میکائیل کو بلکہ صور پھونکنے والا اسرافیل فرشتہ بھی منتظر ہے۔ کہ کب حکم ہو تو بگل بجاؤں۔ اللہ نے اُس کو بھی علم نہیں دیا۔ کیونکہ عالم الغیب وہی ہے۔

انبیائے علیہم السلام کے عطائے علم کی حقیقت

آیت کے اگلے حصے میں انبیاء علیہم السلام کو عطائے علم کی حقیقت بتائی جا رہی ہے۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا یعنی اللہ تعالیٰ اپنے خاص غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ مگر اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کرتا ہے۔ رسول تو سارے ہی پسندیدہ ہیں۔ یہاں پر مِنْ بیانیہ ہے تبعیض کے لیے نہیں۔ (یعنی جن رسولوں کو پسند کرتا ہے) اب رسول عام ہے اور نبی خاص۔ رسول ملائکہ میں بھی ہیں۔ اُن کو بھی اللہ تعالیٰ علم عطا کرتا ہے جیسے جبرائیل علیہ السلام ہیں اور پھر وہ انسانوں تک لاتے ہیں۔ اور رسول انسانوں میں بھی ہیں نبی کی تعریف یہ ہے کہ إِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ لِإِبْلَاغِ الْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ مِنَ اللّٰهِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرماتے ہیں اور رسول عام ہے کہ انسان بھی ہوتا ہے اور غیر انسان بھی جیسے فرمایا اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

ؔ۱ سورۃ اعراف آیت ۱۸۷ ؔ۲ شرح عقائد صہ ۱۴۰ مطبوعہ مجیدیہ ملتان وخیالی صہ ۳۰ لکھنؤ
ؔ۳ سورۃ حج ۷۵ پ ۱۷

رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ" یعنی اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ملائکہ میں سے بھی رسول منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔

نبی اور رسول میں فرق

متکلمین نبی اور رسول کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور رسول وہ ہوتا ہے، جس پر وحی بھی نازل ہوتی ہے اور اُس کو مستقل شریعت بھی دی جاتی ہے۔ یا کتاب دی جاتی ہے۔ نبی کے لیے مستقل شریعت کا ہونا لازمی نہیں[۱]۔ بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی آئے ان پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی۔ مگر مستقل شریعت نہیں ملتی تھی۔ اُن کو حکم تھا کہ وہ تورات کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ہاں رسولوں کو نزول وحی کے علاوہ مستقل شریعت بھی دی گئی جیسے حضرت نوح، حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ، حضرت عیسٰی، حضرت داؤد، حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صالح علیہم السلام یہ سب رسول تھے۔

انبیاء علیہم السلام کو تمام شرعی علوم سے نوازا جاتا ہے

الغرض ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کر لیتا ہے اُسے وہ علم عطا کرتا ہے، جو اُس کے منصب کے لائق اور مناسب ہو، ذرہ ذرہ کا علم نہ نبی کو ضرورت ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ ہاں شریعت کی تکمیل اور امت کی تربیت کے لیے تمام علوم انبیاء علیہم السلام کو عطا کیے جاتے ہیں۔ تکمیلِ شریعت اور تربیت امت سے متعلق کوئی ایسا علم نہیں جو نبی کو نہ دیا جائے۔ اور پھر یہ نبی کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ آگے لوگوں تک پہنچائے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَا مِنْ شَیْءٍ یُّقَرِّبُکُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ وَیُبَاعِدُکُمْ مِّنَ النَّارِ اِلَّا اَنْبَأْتُکُمْ[۲] (اوکما قال) یعنی جو چیزیں تمہیں خدا تعالیٰ کی رحمت کے مقام تک پہنچانے والی ہے اور خدا کے غضب سے بچانے والی ہے، وہ سب چیزیں میں نے تم کو بتا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کا مکمل علم حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت اور دین کے متعلق کوئی علم اللہ نے اپنے نبی کو نہیں دیا۔ تو یہ غلط ہے۔ دین کا علم اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اس کے علاوہ جو غیر شرعی احکام ہیں، ان کا علم بھی اللہ تعالیٰ نے باقی مخلوق کی نسبت انبیاء علیہم السلام کو زیادہ ہی دیا ہے مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا، کہ یہ خاصہ خداوندی ہے۔

---

[۱] معالی صفحہ ۲ مطبوعہ لکھنؤ وشرح عقائد صفحہ ۱۴ [۲] مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۲ بحوالہ البیہقی فی شعب الایمان وشرح السنہ

شعر گوئی منصب نبوت کے خلاف ہے

ہاں جو چیزیں منصب نبوت کے خلاف ہیں اور اس منصب کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں اُن کا علم اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا۔ جیساکہ سورۃ یٰس میں اس کی تصریح موجود ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ[1] ہم نے اپنے نبی کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اُن کی شان کے شایاں ہے۔ کیونکہ وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ[2] کہ شاعروں کے پیچھے لگنے والے اکثر فضول لوگ ہی ہوتے ہیں۔ واہ واہ کرنے والے۔ شراب پینے والے، جوا کھیلنے والے اکثر شعراء کی یہی حالت ہوتی ہے، وہ کوئی اچھے اعمال والے لوگ نہیں ہوتے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہاں جو مومن ہیں ان کی شاعری میں کچھ اچھی باتیں بھی ہیں ورنہ اکثر شاعری تخیلات پر مبنی ہوتی ہے جو نبی کی شان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ نبوت کی بنیاد حقائق حقہ پہ ہوتی ہے۔ اور شعر و شاعری کا مبنیٰ التخیل پر ہوتا ہے۔ جس قدر خیالی اور وہمی چیز ہوگی۔ اتنا ہی شعر لذیذ معلوم ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم نے شعر و شاعری نبی کو سکھائی ہی نہیں۔ یہ کتنا بڑا فن ہے، اس میں ہزاروں لاکھوں کتابیں ہیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ السلام کو نہیں سکھایا۔ سحر اور جادو کا علم، مسمریزم کا علم، کہانت کا علم، جفر اور رمل کا علم بڑے بڑے علوم ہیں مگر منصب نبوت کے منافی ہیں، لہٰذا اپنے نبی کو نہیں سکھائے کہ یہ اس کی شان کے مناسب نہیں۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پہ عالم الغیب کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔

دنیوی علوم منصب نبوت سے خارج ہیں

بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ جب سے کائنات پیدا ہوئی ہے اُس وقت سے لے کر قیامت تک کے ذرے ذرے کا علم حضور علیہ السلام کو دے دیا گیا۔ یہ تو قرآن پاک کی تکذیب ہے اللہ تعالےٰ تو فرماتے ہیں، کہ ہم نے شعر کا علم نبی کو نہیں دیا۔ یہ اُس کی شان کے منافی ہے، تو پھر ذرے ذرے کا علم کیسے ثابت ہوا۔ ہاں دینی احکام کے متعلق آپ کو مکمل علم عطا کیا گیا۔ کائنات کی بہت سی چیزوں کا علم دیا اور بہت سی چیزوں کا نہیں دیا۔ مسلم شریف[3] کی پیوند کاری والی حدیث موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ درختوں کی پیوند کاری شاید کسی غلط رسم کی بنا پہ کی جاتی ہے لہٰذا آپ نے فرمایا کہ اگر لوگ نہ کریں تو اچھا ہے۔ حالانکہ اس بارے میں وحی نازل

---

[1] سورۃ یٰس آیت ۶۹ [2] سورۃ شعراء آیت ۲۲۴ [3] مسلم صفحہ ۲۶۴/۲ ج

نہیں ہوئی تھی۔ تو لوگوں نے پیوند کاری ترک کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پھل کے موسم میں درختوں پر پھل ہی نہ آیا۔ حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ہم نے پیوند کاری چھوڑ دی، لہٰذا پھل نہیں آیا۔ یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین یعنی جوڑے پیدا کئے ہیں۔ نر کھجور کا بور مادہ کھجور پہ پڑتا ہے تو تلقیح (پیوند کاری) ہوتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ پھل پیدا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ کہ یہ تو دنیوی بات تھی اور اُسے تم بہتر جانتے ہو۔

اسی طرح اور بہت سی چیزیں ہیں، جن کا علم نبی کے لیے ضروری نہیں۔ مثلاً تجارت کا علم ______ کاروبار ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ صنعت و حرفت ہے۔ اگر نبی ان میں سے کوئی علم نہیں جانتا۔ تو اس سے منصبِ نبوت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ ہاں دین کے احکام تقرب الی اللہ، حلال و حرام، جائز و ناجائز وغیرہ کے متعلق اگر کوئی کہے کہ نبی کو علم نہیں تو وہ کفر ہوگا۔ دنیوی معاملات کو نبی کی نسبت دوسرے لوگوں کا بہتر جاننا عین ممکن ہے۔

علمِ غیب کا باطل عقیدہ

بہر حال عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے۔ تخلیقِ کائنات سے قیامت تک کا علم حضور علیہ السلام کو نہیں دیا گیا۔ ایسا عقیدہ شرکیہ اور باطل عقیدہ ہے کیونکہ علیم کل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہ اُس کی صفتِ مختصہ ہے۔ ہاں جو چیز اللہ نے حضور علیہ السلام کو بتا دی وہ انباءِ غیب میں آگئی۔ اور غیب کی تعریف یہ ہے کہ بغیر ذریعہ اور سبب کے معلوم ہو۔ نہ وحی ہو نہ مشاہدہ ہو، نہ الہام ہو، نہ آنکھ سے ہو نہ عقل سے ہو کسی بھی ذریعے سے حاصل نہ ہو، جو علم بغیر سبب اور بغیر ذریعے کے حاصل ہو، وہی غیب کہلاتا ہے۔ اور جو کسی ذریعہ سے حاصل ہوا وہ غیب نہ رہا، لہٰذا انباءِ غیب میں شمار ہوگا تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۤءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتا دیں

نبی کا علم محدود ہوتا ہے

اس آیت سے بھی لوگ غلط مطلب لیتے ہیں، حالانکہ اِن کا تعلق قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ کے ساتھ ہے۔ کہ میں نہیں جانتا۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس آیت میں رسولوں پر غیب ظاہر کرنے سے مراد کلی غیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول کو پسند کرتا ہے اس پر کلی غیب ظاہر کر دیتا

ہے یہ بالکل باطل معنیٰ ہے۔ کیونکہ پہلی آیت خود بتا رہی ہے کہ مجھے قیامت کے واقع ہونے کا علم نہیں۔ "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ"۔ اسی طرح بارش نازل ہونے کی گھڑی اور اس کی پوری کیفیت سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ کہ کتنے قطرے نازل ہوں گے۔ کوئی سائنسدان نہیں بتا سکتا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے۔ مومن ہے یا کافر، نیکوکار ہے یا بدبخت۔ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوائے خدا کے کسی کے علم میں نہیں۔

بعض ایسے آلات ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر، حکیم معلوم کر لیتے ہیں کہ پیٹ میں بچہ ہے یا بچی مگر یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ نیک ہے یا بد اس کی عمر کتنی ہوگی، یہ دنیا میں کیا کام کرے گا، اسی طرح بارش کے کتنے قطرے برسیں گے، کون سا قطرہ مفید اور کون سا مضر ہے، کس سے سیرابی ہوگی اور کونسا طوفان کی شکل میں تبدیل ہوگا۔ اوّل سے آخر تک کون جان سکتا ہے قیامت کب واقع ہوگی۔ ہر شخص کی موت کہاں آئے گی۔ یہ سب کچھ اللہ ہی جانتا ہے کیونکہ "اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ" یہ تمام چیزیں ذات خداوندی کے ساتھ مختص ہیں۔ لہٰذا عالم الغیب والشہادۃ وہی ہے۔ وہ نبیوں کو سب سے زیادہ علم عطا کرتا ہے مگر وہ بھی محدود ہوتا ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کا علم اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں دیا۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے علم میں فرق

غیب کو رسولوں پر ظاہر کرنے کی علت بیان فرمائی فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا کہ نزول وحی پورے اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب فرشتہ اللہ کے احکام لے کر آتا ہے، تو اس کے آگے اور پیچھے اللہ تعالیٰ چوکیدار بھیجتا ہے، ہر طرف پہرے لگا دیتا ہے، تاکہ جنات اور شیاطین کوئی دخل اندازی نہ کر سکیں۔ اور احکام الٰہی محفوظ طریقے سے پہنچ جائیں۔ نیز یہ کہ لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّھِمْ یعنی خدا تعالیٰ ظاہر کر دے کہ نبیوں نے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ تو گویا جو علم اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو محفوظ طریقے سے پہنچاتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے، اس کا ظرف بڑا ہوتا ہے اور اس میں فرائض کی ادائیگی کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ولی کو جو الہام ہوتا ہے، اس کے سمجھنے، ادا کرنے اور ظاہر کرنے میں گڑبڑ کا امکان ہوتا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض چیزیں اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کو بذریعہ الہام بتا دیتا ہے، مگر وہ قطعی نہیں ہوتیں۔

کیونکہ ولی کا ظرف نبی کے ظرف کے برابر نہیں ہوتا۔ اور یہ یقین نہیں ہوتا کہ انہوں نے بالکل ویسا ہی اسے سمجھا ہے جیسا منشاء ایزدی ہے۔ اور پھر جب وہ اسے ادا کرتا ہے تو اس بات کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ انہوں نے ویسے ہی ادا کیا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں۔ اس میں غلطی کا امکان ہے۔ لہٰذا وہ قطعی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہؒ[1] فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اللہ کا منشاء اپنے صحابہؓ پر ظاہر کر دیا، مگر صحابہؓ نے اُسے صحیح طور پر سمجھا نہیں، وہ شخص اہل بدعت میں سے ہے اہل حق میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ آیت "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا منشاء مکمل طور پر نبی پر ظاہر کیا اور نبی نے اُسے مکمل طور پر صحابہ تک پہنچایا۔ صحابہ نے اُسے پورے طور پر سمجھا اور اُسے دوسروں تک پہنچایا، اسی لیے شیعہ، رافضیہ یا معتزلہ کا اعتقاد باطل ہے۔

محیط کل اللہ کی ذات ہے

فرمایا تاکہ خدا تعالیٰ ظاہر کر دے کہ نبیوں نے اپنے رب کے احکام پہنچا دیے ہیں وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ اور وہ احاطہ کرتا ہے جو کچھ ان نبیوں اور رسولوں کے حالات ہیں، ہر چیز کا احاطہ اُس کے پاس ہے جس قسم کے حالات اُن کے سامنے پیش آتے ہیں یا آنے والے ہیں یا آچکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کا احاطہ کرتا ہے۔ "وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" یعنی علیم کل صرف خدا کی ذات ہے، وہ قادرِ مطلق، جو چاہے اپنے اختیار اور ارادے سے کرے، یہ بھی اُس کی صفات مختصہ میں ہے وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی گنتی کر رکھی ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں کل کتنے درخت ہیں، درختوں پر کتنی ٹہنیاں اور کتنے پتے ہیں۔ کوئی سائنس دان، کوئی ماہر علم نباتات بتا دے کہ پہاڑ میں ریت کے کتنے ذرے ہیں، سمندروں میں پانی کے کتنے قطرے ہیں، سارے نفوس کتنے ہیں۔ اُن کے احوال کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ محیط کل ہے۔ وہ ہر چیز کا شمار رکھنے والا ہے اور پھر جتنا علم مناسب سمجھتا ہے مخلوق کو دے دیتا ہے اور وہ انبائے غیب ہوتی ہیں۔ غیب دان فقط وہی ذات ہے۔

الغرض سورۃ مبارکہ کے آخر میں معاد کا ذکر بھی آگیا۔ کہ اس کے وقوع کا علم صرف اللہ کو

---

[1] ازالۃ الخفا صفحہ ۲۶ ج ۱)

ہے۔ شرک کی تردید بھی ہوگئی کہ کس طرح جنات نے شرک سے بیزاری کا اظہار کردیا۔ بعد میں دعوت الی التوحید بھی آگئی کہ سجدے صرف اللہ کے لیے ہیں۔ سجدہ لغیر اللہ شرک کے مترادف ہے۔ نبی کا طریقہ بھی یہی ہے اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِهٖٓ اَحَدًا" یعنی میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔ اے لوگو! اگر بچنا چاہتے ہو، تو اسی راستے کو اختیار کرو۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

سورۃ المزّمّل

(مکّی)

درس اوّل ۱ (آیت ۱ تا ۹)

سُورَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ عِشْرُونَ آيَةً وَفِيهَا رُكُوعَانِ

سورۃ مزمل مکی ہے یہ بیس آیتیں ہیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹

ترجمہ:- اے کمبل اوڑھنے والے (۱) آپ رات کو کھڑے ہوں مگر تھوڑا حصہ (۲) نصف شب یا نصف سے کچھ کم کردیں (۳) یا نصف سے کچھ زیادہ کریں اور قرآن پاک ترتیل سے پڑھیں (۴) بے شک ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈالنے والے ہیں (۵) بیشک رات کو اٹھنا روندنے کے اعتبار سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ درست ہے بات کرنے کے اعتبار سے (۶) بیشک آپ کے لیے دن کے وقت بہت شغل رہتا ہے (۷) اور اپنے رب کے نام کو یاد کریں اور سب سے ہٹ کر صرف اسی کی طرف الگ ہوں (۸) مشرق اور مغرب کا رب وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا اسی کو اپنا کارساز پکڑو۔ (۹)

کوائف اور مضامین سورۃ

اس سورۃ کا نام سورۃ مزمل ہے۔ سورۃ کی پہلی آیت میں ہی لفظ مزمل آیا ہے، جس کے نام پر سورۃ کا نام ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس کی بیس ۲۰ آیات اور دو ۲ رکوع ہیں۔ اس میں دو سو پچاسی ۲۸۵ الفاظ اور آٹھ سو اڑتیس ۸۳۸ حروف ہیں۔

سابقہ سورۃ جن کی طرح اس سورۃ میں بھی بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ جس طرح اس سورۃ میں

توحید، رسالت، قرآن کریم کی حقانیت وصداقت اور دلائل توحید مذکور تھے اسی طرح اس سورۃ میں بھی ان بنیادی عقائد کا ذکر ہے اس طرح گویا اس سورۃ کو سابقہ سورۃ کے ساتھ مناسبت ہے۔

سورۃ جن میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا شکوہ کیا۔ کہ وہ قرآن کریم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے اور نہ اُسے سنتے ہیں۔ حالانکہ غیر جنس کے جنات نے جب خالی الذہن ہو کر اللہ تعالے کا کلام سنا تو اُس سے متاثر ہوئے اور ایمان قبول کر لیا۔ جو بھی شخص اپنی ذاتی خواہشات اور تعصب سے الگ ہو کر کلام الٰہی کو سُنے گا، اُس کے لیے ہدایت کا راستہ ضرور واضح ہو جائے گا۔ جس طرح وہاں حضور علیہ السلام کے نماز میں قرآن پاک پڑھنے کا بیان تھا، اسی طرح یہاں بھی قیام اللیل اور قرآن پاک پڑھنے کا بیان ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ اُسے نماز میں پڑھا جائے اللہ تعالے نے اس سورۃ میں اس کے پڑھنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔ تو یہ بھی اس سورۃ کی سابقہ سورۃ کے ساتھ مناسبت اور ربط ہے۔

زمانہ نزول

یہ سورۃ قرآن کریم کی نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نزول کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتا ہے پہلے اور دوسرے رکوع میں بارہ مہینے کا فرق ہے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ تفسیر الاتقان[1] میں اور دوسرے مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی جو غار حرا میں نازل ہوئی وہ سورہ اِقْرَأْ کی پہلی پانچ آیتیں ہیں یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ سے لے کر مَالَمْ يَعْلَمْ تک۔ اس کے متصل دوسرے نمبر پر سورۃ فاتحہ بھی وہیں نازل ہوئی۔ اور آپ کو وضو کا طریقہ بھی وہیں بتلایا گیا۔ نزول وحی سے دوسرے دن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ نے نماز ادا کی۔ نزول کے تیسرے نمبر کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ تیسرے نمبر پر سورۃ نٓ نازل ہوئی، مگر صحیح بات یہ ہے کہ تیسرا نمبر اس سورۃ کا ہے۔ یعنی تیسرے نمبر پر سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نازل ہوا، اس کے بعد سورۃ مدثر، پھر سورۃ نٓ اور پھر دوسری سورتیں

اسلام کا انقلابی پروگرام

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ایک انقلابی پروگرام دیا ہے۔ اس سورۃ میں ارشاد ہے

---

[1] اتقان صـ ۲۴/ ج۱ طبع لاہور۔ مظہری صـ ۳۰/ ج ۱۰ [2] مسند احمد صـ ۲۷/ ج ۴ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ صـ ۳۳

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا یعنی اے کمبل یا لحاف اوڑھنے والے کھڑے ہوں رات کے وقت اور نماز ادا کریں۔ سورۃ مدثر کے الفاظ ہیں قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی آپ کھڑے ہوں اور اللہ کی مخلوق کو بُرے نتائج سے خبردار کریں۔ تو گویا نزول کی طبعی ترتیب بھی یہی ہے۔ کہ پہلے رات کو نماز کے ذریعے ذاتی تکمیل کا حکم ہوا ہے اور اس کے بعد انذار کے ذریعے مخلوق خدا کی تکمیل کا ذکر ہے۔ تو گویا اس سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے جماعت کی تیاری اور اس کے پروگرام کا ذکر کیا ہے۔ انقلاب ایک فرد واحد کے بس کی بات نہیں اس کے لیے جماعت کی ضرورت ہے۔ وہ کون سی جماعت ہے اور اسے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے اس سورۃ میں یہی باتیں بیان کی گئی ہیں جیسا کہ سورۃ کے دوسرے رکوع میں موجود ہے۔ "اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ"

اس آیت میں طائفہ سے مراد وہی گروہ صحابہ ہے جو آپ کے ساتھ تھا۔

قرآن کریم یا انبیاء علیہم السلام کا پروگرام انقلابی پروگرام ہوتا ہے۔ انقلاب کا معنی تبدیلی پیدا کرنا ہے، یعنی سابقہ غلط روش یا غلط عقیدہ یا بداخلاقی کو تبدیل کرنا ہے اور اس قسم کا انقلاب ایک تربیت یافتہ جماعت ہی برپا کر سکتی ہے۔

انقلاب کے لیے معیاری تربیت کی ضرورت ہے

الغرض دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے پہلی منزل تربیت ہے اگر انقلاب لانے والوں کو معیاری تربیت حاصل نہ ہو، تو وہ کوئی اچھا انقلاب نہیں لا سکیں گے، بلکہ فساد برپا کریں گے جیسا کہ غیر اسلامی حکومتیں کرتی آئی ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جاپان میں کیا ہوا تھا۔ وہی جاپان جس کا وزیر اعظم کل مر گیا ہے۔ وہ جاپانی النسل تھا، مگر عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ہم نے اخباروں میں پڑھا۔ آپ نے بھی پڑھا ہوگا، آپ کو یاد ہوگا کہ امریکہ کے جاپان پر حملے کے نتیجے میں سوا لاکھ جاپانی عورتیں حاملہ ہوئی تھیں اور پھر ان کے بچے پیدا ہوئے۔ یہ تعداد وہ ہے جن کے بچے پیدا ہوئے، اور جن کے نہیں ہوئے اُن کا آپ خود اندازہ لگالیں، تو یہ تھا وہ انقلاب جو امریکی سپاہیوں نے حرام کاری کی صورت میں جاپان میں برپا کیا۔ اس کے بعد اُن بچوں کی حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوا، تو امریکہ نے جاپانیوں کو امریکہ میں رہائش کے کچھ حقوق بھی دیئے، تو بہر حال بغیر تربیت کے انقلاب برپا کرنے کا یہ حشر ہوا اس مقام پر وہ اصول بتائے جاتے ہیں۔ جن کے مطابق حضور علیہ السلام اور آپ کی جماعت

"طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ" کی تربیت مطلوب ہے۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے دنیا میں کس قسم کا انقلاب برپا کیا۔ تو یہ گویا انقلاب کی تیاری کی منزل ہے۔ جس میں ذاتی تکمیل یعنی اپنی اصلاح مقصود ہے۔ جب یہ پہلا مرحلہ طے ہو جائے گا تو پھر دوسرا مرحلہ اصلاحِ عالم کا آئے گا۔ جہان کی اصلاح وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کی اپنی ذاتی اصلاح ہو کر روحانی ترقی نصیب ہو چکی ہو۔ اسی لیے امام رازیؒ، امام بیضاویؒ جیسے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں انسانوں کی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کی تکمیل کرتے رہے۔ جب یہ تکمیل ہو جاتی ہے تو انسان انقلاب برپا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور اگر اپنی ہی اصلاح نہیں ہوئی تو دوسروں کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ وہی مرحلہ ہے جس میں ذاتی اصلاح کی ضرورت ہے۔

لفظ مزمل کے معانی

لفظ مزمل کے دو معنے آتے ہیں اور دونوں ہی اس مقام پر صادق آتے ہیں۔ زَمَّلَ اوپر کپڑا اوڑھ لینا جس سے مزمل ہے یعنی کپڑا اوڑھنے والا۔ دوسرا تَزَمَّلَ ہے۔ زمیل ساتھی کو کہتے ہیں اور مزمل ساتھی اکٹھا کرنے والے کو۔

پہلا معنی تو عام ہے جیسا کہ احادیث اور تفاسیر کی کتابوں[1] میں موجود ہے کہ ابتداء میں جب حضور علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی تو اس کی دہشت تھی چونکہ یہ نئی چیز تھی اور طبیعت پر بوجھ تھا جسم مبارک پر کپکپی طاری تھی۔ اسی حالت میں آپ گھر تشریف لائے، اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے، مجھ پر کپڑا ڈال دو، کمبل اوڑھا دو۔ لہٰذا حضرت خدیجہؓ نے آپ کو کمبل اوڑھا دیا لفظ مزمل کا ایک معنی تو یہ ہے، یعنی کمبل اوڑھنے والے۔ بعض روایات[2] میں یہ بھی آتا ہے کہ جب آپ نے لوگوں کے سامنے نزولِ وحی کا اظہار کیا، تو مخالفین نے طرح طرح کی باتیں بنائیں، جیسا کہ سورۃ ن میں گزر چکا ہے، کسی نے مجنوں کہا، کسی نے شاعر کہا اور کسی نے کاہن کہا۔ ان باتوں سے آپ کو غم لاحق ہوا اور آپ کمبل اوڑھ کر گھر میں لیٹ گئے۔

قیام اللیل کا حکم

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر خطاب کیا یعنی اے کمبل اوڑھنے والے

---

[1] مظہری صفحہ ۱۰۲/۱۰ روح المعانی صفحہ ۱۷۸/۲۹ [2] مظہری صفحہ ۱۰۲/۱۰ ابن کثیر صفحہ ۴۳۴/۴

قُمِ اللَّيْلَ یعنی آپ رات کو کھڑے ہوں اِلَّا قَلِيْلًا مگر تھوڑا حصہ۔ کھڑا ہونے سے مراد نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے تاکہ اس سے آپ کو روحانی ترقی حاصل ہو اور تکمیلِ ذات ہو سکے اور اس سے آئندہ پیش آنے والے مشکل کام میں آپ کو آسانی ہو۔ لفظ مزّمل کا دوسرا معنی یعنی ساتھی تلاش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اے ساتھی تلاش کرنے والے آپ رات کا تھوڑا حصہ نماز کے لیے کھڑے ہوں نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا نصف یا نصف سے کچھ کم اَوْ زِدْ عَلَيْهِ یا نصف سے زیادہ۔

قیام اللیل کی فضیلت

چنانچہ رات کے وقت ادا کی جانے والی نماز کے لیے قیام اللیل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی[۱] ہے عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ یعنی اے ایمان والو! تم بھی رات کے وقت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ فَاِنَّهٗ دَاْبُ الصَّالِحِيْنَ قَبْلَكُمْ کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہا ہے۔ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ اِلٰى رَبِّكُمْ اور تمہارے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے وَمَكْفَرَةٌ لِّلسَّيِّاٰتِ وہ گناہوں کو مٹانے والی ہے وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْاِثْمِ اور معاصی سے روکنے والی چیز ہے۔ لہٰذا تم بھی رات کی نماز یعنی تہجد پڑھا کرو۔

ترتیلِ قرآن

اور نماز میں قرآن پڑھنے کا اسلوب یہ ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا یعنی قرآن پاک ترتیل سے پڑھیں۔ ترتیل سے مراد ہے آہستہ آہستہ، واضح واضح اور صاف صاف کیونکہ اس طریقے سے تلاوتِ قرآن سے اس کا مطلب اور مفہوم سمجھ میں آئے گا تیزی سے پڑھنا بہتر نہیں ہے۔ جیسا کہ روایت[۲] میں آتا ہے۔ تم میں سے تلاوت کرتے وقت کسی کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیے کہ جلدی میں اخیر تک عبور کر جاؤں، بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت[۳] میں آتا ہے کہ قرآن پاک اس طرح نہ پڑھو، جس طرح ردی کھجوریں پھینکی جاتی ہیں۔ یا جیسے شعر گوئی کی جاتی ہے۔ بلکہ اطمینان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیے تاکہ ذہن پر اس کا اثر ہو۔ اور اس کا مفہوم بھی سمجھ میں آجائے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۴]۔ اس آدمی کا مسلمانی میں کیا حصہ ہوگا جس نے کتاب اللہ کے مفہوم ہی

---

[۱] کنز العمال ص۵۶۰ و ص۵۶۱ عن ابی الدرداءؓ وعن جابرؓ وعن ابی امامۃؓ و ترمذی ص۵۱ [۲] تفسیر ابن کثیر ص۴۳۴ ج۴ [۳] تفسیر عزیزی فارسی ص۱۸۰ پ۲۹ روح المعانی ص۱۰۴ ج۲۹ [۴] مقدمہ فتح الرحمٰن ص۳ مطبوعہ تاج کمپنی۔

کو نہ سمجھا۔ اور وہ کونسی شیرینی اور مٹھاس حاصل کرے گا جس نے کلام اللہ کے مدلول کو نہ جانا۔ نزولِ قرآن کا اصل مقصد تو اس سے نصیحت اور ہدایت حاصل کرنا ہے، اگرچہ خالی الفاظ کو پڑھنا بھی غنیمت ہے" مگر اصل مقصد نہیں ہے۔ قرآن پاک کو پڑھنے کا بہترین طریقہ دورانِ نماز پڑھنا ہے۔

قیام اللیل تعلق باللہ کا ذریعہ ہے

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ دنیا میں بہتر انقلاب اس وقت آئے گا جب انقلاب لانے والوں میں اس کی صلاحیت پیدا ہو گی اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو گا تو گویا قیام الیل اور ترتیلِ قرآن تعلق باللہ کا ذریعہ ہے۔ جب انسان یہ ذریعہ حاصل کر لے گا تو اس میں روحانیت آئے گی۔ وہ مہذب ہو گا، تربیت یافتہ کہلائے گا اور اسلامی انقلاب برپا کر سکے گا۔ لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کلام الٰہی نماز میں پڑھے، اس کا مفہوم اپنے ذہن میں بٹھائے اور تعلق باللہ قائم کرے، کیونکہ اس کے بغیر اسلامی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اور اگر کوئی انقلاب آئے گا تو وہ فساد اور ظلم کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ دنیا میں عدل قائم نہیں ہو گا۔ خدمتِ خلق کی بجائے خدمتِ نفس ہو گی۔ اللہ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت ہو گی۔ لہٰذا دنیا میں اللہ تعالےٰ کے قانون کو جاری کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلے اللہ کے ساتھ تعلق درست ہو جس کا ذریعہ قیام الیل ہے۔

ثقلِ قرآن

قیام الیل کے ذریعے ذاتی تکمیل کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا یعنی ہم آپ پہ ایک بوجھل بات ڈال رہے ہیں۔ جو کہ کئی طرح سے ہے۔ مثلاً قرآن پاک کے پروگرام کو دنیا میں رائج کرنا ایک بڑا بوجھل کام ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ قرآن کو پہلے اپنے اندر جذب کرنا بجائے خود ایک ثقل ہے۔ بخاری شریف[1] کی روایت میں ہے کہ جب آپ پہ وحی نازل ہوتی تھی، تو اس سے اس قدر تپش پیدا ہوتی تھی کہ سخت سردی میں پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔ اور اگر آپ کا سر مبارک کسی کی ران پہ ہوتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ران ٹوٹی جا رہی ہے۔ احادیث میں حضرت زیدؓ یا حضرت علیؓ کی ران پہ آپ کے سر مبارک رکھنے کے واقعات ملتے ہیں[2]۔ اسی طرح سواری کی حالت میں اگر وحی نازل ہوتی تھی، تو اونٹنی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حضور

---

[1] بخاری ص ج۲ ترمذی ص۵۲۳ [2] ابن کثیر ص۴۳۵ ج۴ -

صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک اونٹنی بڑی مضبوط تھی ورنہ نزول وحی پر اُسکی بھی یہ حالت ہوتی تھی کہ گردن اور پاؤں اکڑ جاتے تھے اور وہ اس طرح کھڑی ہو جاتی تھی۔ جیسے بہت بڑا وزن پڑ گیا ہو[1]

نزول وحی کی کیفیت اس قدر ثقیل ہوتی تھی کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نزول وحی کے وقت انخلاع ہوتا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح میں انخلاع بشریت سے ملکیت کی طرف منتقلی کا نام ہے۔ اور اس طرح گویا فرشتے کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے سے بڑا بوجھ پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مخالفین کے طعن کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اسی لیے اگلی آیتوں میں فاصبر کا حکم بھی آتا ہے مزید برآں قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا۔ اس کے احکام کا اجرا کرنا، اس کی تعلیم کو عام کرنا، جماعت کو منظم کرنا یہ تمام امور قولاً ثقیلاً میں آتے ہیں۔

اسی لیے فرمایا کہ ہم آپ پر طویل ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا پہلے آپ اپنی تکمیل کر لیں اور روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہو جائیں۔ آپ کی جماعت کی تربیت بھی اسی درجہ کی ہونی چاہیے کہ ان میں ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اگلی آیت میں وہ حکمت بھی بیان کر دی ہے جسکی بنا پر رات کو قیام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلاً بیشک رات کو اٹھنا روندنے کے اعتبار سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ درست ہے بات کہنے کے اعتبار سے۔ مطلب یہ کہ رات کے وقت اٹھ کر نماز پڑھنا بڑا دشوار کام ہے۔ ویسے تو عام نماز پڑھنا بھی بڑا مشکل ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ یعنی نماز کی ادائیگی بڑا بوجھل کام ہے۔ سوائے خوف خدا والوں کے۔ جس انسان میں خشیت کا جتنا مادہ ہوگا، اتنا ہی وہ نماز کا پابند ہوگا، ورنہ منافق قسم کے آدمی کے لیے یہی نماز بوجھ ہے۔ نماز پڑھنے سے اسے راحت میسر نہیں آتی۔ بلکہ بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ یہ تو عام نمازوں کی بات ہے مگر رات کے وقت جب کوئی آرام کو چھوڑ کر تہجد کے لیے بیدار ہوتا ہے، تو یہ اس کے نفس کے لیے گویا روندنے والی چیز ہوتی ہے بس یہی ہے وہ تربیت جس کی قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ جب انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالے گا، تو وہ جس میدان میں بھی جائے گا۔

---

[1] ابن کثیر ص ۴۳۵/۴

کامیاب ہوگا۔ اسی لیے فرمایا آپ کا رات کے وقت اٹھنا زیادہ شدید ہے، روندنے کے اعتبار سے رات کے پرسکون ماحول میں جو بات زبان سے نکلتی ہے، وہ مؤثر ہوتی ہے کیونکہ دن کے وقت شور و شغب کی وجہ سے پوری دلجمعی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ رات کو نماز میں قرآن پاک کی تلاوت بڑی مؤثر چیز ہے۔

اسی بات کو واضح کیا کہ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا بے شک آپ کے لیے دن کے وقت بہت سے اشغال ہیں منجملہ ان کے عبادات، جہاد کی تیاری، مقدمات کا تصفیہ، حقوق کی ادائیگی، عوام الناس سے میل ملاقات، تبلیغی پروگرام پر عمل درآمد، بیرونی وفود سے گفت و شنید وغیرہ امور ہیں، لہذا تکمیل ذات اور حصول روحانیت کا مناسب موقعہ رات کو میسر آسکتا ہے اسی لیے فرمایا کہ آپ رات کو قیام کریں تاکہ تعلق باللہ درست طریقے پر قائم ہوسکے۔

ذکر الٰہی کے ذریعے تجلی الٰہی سے تعلق قائم ہوتا ہے

اس کے بعد وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن کے ذریعے تعلق باللہ قائم ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ یعنی اپنے رب کے نام کو یاد کریں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام یا اس کی صفت، جس کے ذکر کا حکم دیا گیا ہے، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی تجلی ہوتی ہے تو مطلب یہ ہے۔ کہ ذکر الٰہی کے ذریعے اللہ کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم کریں۔ اور یہ تعلق ہی مدار فلاح ہے۔ خصوصاً تجلی اعظم کے ساتھ تعلق جو عرش الٰہی پر پڑتی ہے اور سب چیزوں کو رنگین کرتی ہے۔ تو آخرت میں اس تجلی کے ساتھ جب انسان بلند درجات پر پہنچیں گے۔ تو اس کے ساتھ براہ راست تعلق قائم ہوگا۔ اس وقت انسان اسے سمجھ سکیں گے، اور اس کا عکس محسوس کریں گے۔ یہ تعلق اس مادی دنیا میں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا حکم ہوا کہ اپنے رب کا نام لیں اور اس کی تجلی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں۔

الغرض اپنے رب کا نام لیں وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا اور سب سے ہٹ کر صرف اسی کی طرف الگ ہوں، یہاں الگ ہونا "کلیتہً" مراد نہیں ہے، کیونکہ دن کے وقت تو باقی تمام امور سر انجام دینا ہوتے ہیں۔ لہذا علیحدگی رات کے وقت ہی ہوسکتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ رات کے وقت اٹھیں اور سب سے الگ ہو کر اپنے رب کا نام یاد کریں، نماز پڑھیں تاکہ تجلی الٰہی کے ساتھ تعلق قائم ہو۔

باطل قوتوں کے مقابلے میں جماعت حقہ

جس رب کے ذکر کی ترغیب دی جا رہی ہے، اس کی صفت کاملہ یہ ہے کہ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ یعنی مشرق و مغرب کا رب وہی ہے مشرق میں ایران اور مغرب میں روم دو بڑی

سلطنتیں تھیں، انہوں نے دنیا میں بڑا فساد مچا رکھا تھا، اور ان کو ملیامیٹ کرنا حضور علیہ السلام کے پروگرام میں شامل تھا۔ آج بھی دنیا میں دو حکومتوں نے فساد برپا کر رکھا ہے، ایک اشتراکی نظام کی حامل اور دوسری سرمایہ دارانہ نظام کی۔ یہ دونوں ظالم حکومتیں اپنا الّو سیدھا کرنے کیلئے کمزور ملکوں کو استعمال کرتی ہیں۔ کسی زمانے میں برطانیہ اپنی طاقت اور وسعت کی بنا پر برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اُس کی بداعمالیوں کی بدولت اُسے سکیڑ دیا ہے ——— اور کمزور کر دیا ہے۔ اب اس کا جانشین امریکہ ہے۔ وہ بھی انگریز ہیں۔ یہ روسی بھی بگڑے ہوئے انگریز ہیں، یہودی اور نصرانی ہیں مسخ ہو چکے ہیں۔ یہی حال حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تھا کسریٰ و قیصر کی، دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ ساری دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ آدھی قیصر کے ساتھ اور آدھی کسریٰ کے ساتھ انہوں نے دنیا میں فساد مچا رکھا تھا جس کا نقشہ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ[1] میں کھینچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا کہ ان دونوں ظالم حکومتوں کو درہم برہم کر کے اُن کی جگہ نبی امی کو کھڑا کیا جائے اور ایسی جماعت کو برسرِاقتدار لایا جائے، جن میں ظالم حکومتوں والی کوئی خرابی نہ ہو لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ یعنی ایسی جماعت جس میں مشرقیوں والی برائیاں ہوں، نہ مغربیوں والی خرابیاں۔ وہ ایسی جماعت ہو۔ جو چست و چالاک مستعد اور جفاکش ہو اور پھر اُن کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے ذریعے دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔

معبود اور کارساز اللہ کی ذات ہے

فرمایا کہ مشرق و مغرب کا رب وہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مشرق و مغرب والے شرک میں مبتلا ہیں، کوئی انسان پرستی کرتے ہیں، کوئی اصنام پرستی میں مبتلا ہیں۔ کوئی حیوانات کو پوجتے ہیں تو کوئی مُردوں کی پرستش میں ملوث ہیں، کوئی ملائکہ، جنات اور پتھروں کے پرستار ہیں یعنی ہر حال میں غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے رب کا نام یاد کریں، مشرق و مغرب کا مالک وہی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ کوئی نافع ہے، نہ ضار، نہ حاجت روا، نہ ہمہ دان، نہ ہمہ بین، نہ ہمہ توان، نہ قادر مطلق، نہ علیم کل اور نہ مشکل کشا، فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ اسی کو اپنا کارساز پکڑو۔ مادی وسائل کو اختیار کرو مگر ان پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ صرف خدا کی

---

[1] حجۃ اللہ ص۱۰۵ و ص۱۰۶ طبع رشیدیہ دہلی ازالۃ الخفا ص ۴۶/۱

ذات پر کرو۔ وہ چاہے گا تو اثر پیدا کر دے گا۔ ورنہ سارے اسباب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور کوئی کامیابی نہیں ہوگی لہذا کارساز اُسی کو بناؤ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو گویا یہ اصول بتائے جا رہے ہیں کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے قیام لیل کرو۔ تربیت حاصل کرو۔ اپنے رب کا نام یاد کرو، تاکہ تجلی الٰہی کے ساتھ تعلق قائم ہو۔ مشرق و مغرب کا خدا ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کو کارساز سمجھو، مادیت پر یقین مت رکھو، مخلوق میں سے کسی چیز پر بھروسہ مت کرو۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں دوسرا اصول بھی بیان فرمائے ہیں۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ⑩

ترجمہ :- اور اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ صبر کریں اُن باتوں پر جو مخالفین کہتے ہیں۔ اور آپ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کنارہ کش ہو جائیں ⑩

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالےٰ نے پانچ باتیں بیان فرمائیں تھیں۔ اس درس میں چھٹی بات کا تذکرہ ہو گا۔ گذشتہ پانچ امور کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) **قیام الیل** :- ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے پہلا حکم قیام لیل کا دیا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوا، کہ آپ رات کا تھوڑا حصہ نماز کے لیے وقف کریں۔ رات کا تھوڑا حصہ رات کے لعتبار سے بھی ہو سکتا ہے اور انسانی عمر کے اعتبار سے بھی۔ ابتداء میں حکم یہ تھا کہ آپ رات کا زیادہ حصہ عبادت کریں اور تھوڑا حصہ آرام کریں۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی رات کو عبادت کرتے رہتے تھے۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالےٰ نے آسانی پیدا فرما دی۔ چنانچہ دوسرے رکوع میں ارشاد ہوا کہ آپ رات کو اس قدر قیام کریں جس قدر میسّر ہو، مگر یہ قیام ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جنہوں نے دنیا میں کام کرنا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے دین کو قائم کرنا ہے، انقلاب برپا کرنا ہے۔ یہ اُن کی تربیت کا سامان کیا جا رہا ہے اور اُن کو مہذب بنانے کا ذریعہ ہے تاکہ انسانوں کا تعلق اپنے رب کے ساتھ درست رہے۔

اگر تھوڑے حصہ سے مراد عمر کا حصہ لیا جائے، تو مطلب یہ ہو گا کہ آپ تندرستی اور توانائی کی حالت میں قیام لیل کا اہتمام کریں۔ اور عمر کے کسی حصے میں اگر بیماری آجائے، یا بڑھاپا لاحق ہو جائے تو پھر ضروری نہیں ہو گا عام حالات میں آپ قیام لیل کرتے رہیں۔

(۲) **ترتیلِ قرآن** :- اللہ تعالےٰ نے دوسرا حکم یہ دیا کہ قیام لیل کے وقت قرآن پاک کو ترتیل کے ساتھ پڑھیں۔ ترتیل سے مراد ہے، واضح واضح، ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کی مکمل ادائیگی کے ساتھ پڑھنا تاکہ اس تلاوت کا دل پر اثر ہو۔

(۳) **ذکرِ الٰہی**:۔ تیسرا حکم ذکرِ الٰہی کا دیا "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" اپنے رب کا نام لیں، اللہ تعالےٰ کا اسمِ پاک یاد کریں تاکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم ہو سکے۔ اللہ تعالےٰ کا ہر اسم اور ہر صفت اُس کی کسی نہ کسی تجلی کو واضح کرتی ہے، لہٰذا اُس کا ذکر کرنا اس کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" اُسے جس نام سے بھی یاد کرو، اُس کے سارے نام بھلے ہیں۔ رحمان کے نام سے یاد کرو یا رحیم یا غفار سے یا اُس کے ذاتی نام اللہ کے ساتھ یاد کرو، یہ اس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) **علیحدگی**:۔ چوتھا حکم یہ دیا "وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا" یعنی باقی چیزوں سے الگ ہو کر صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ علیحدگی بھی ضروری ہے تاکہ دلجمعی حاصل ہو۔ جب دن کے وقت دوسرے امور کی سرانجام دہی کرنا ہوتی ہے تو تنہائی میسّر نہیں آتی۔ مگر رات کو قیام کے ذریعہ سے یہ علیحدگی حاصل ہو سکتی ہے اور ہر شخص تمام اشغال سے فارغ ہو کر قیامِ لیل کی صورت میں کچھ وقت اپنے رب کو یاد کرے۔

(۵) **تربیت**:۔ پانچویں بات یہ ارشاد فرمائی کہ اسلامی انقلاب بپا کرنے کے لیے تربیت ضروری ہے۔ اس تربیت کے ذریعے ہی انسان مہذب، شائستہ اور انقلاب بپا کرنے کا اہل ہو سکتا ہے غیر مہذب اور غیر تربیت یافتہ شخص صحیح انقلاب نہیں لا سکتا۔ بلکہ وہ فساد کرے گا، برائی کو پھیلانے کا سبب بنے گا جس کی اصلاح نہیں ہو گی، اُس کی مغفرت بھی نہیں ہو گی۔ "وَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ" اس کے لیے ایمان اور اصلاح کی ضرورت ہے اور حالات کی درستگی بھی لازمی ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا "وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ" ایک دوسرے کے ساتھ بھی تعلق درست کرو۔ سوسائٹی کو بھی درست رکھو اور اپنے آپ کو بھی تہذیب یافتہ بناؤ۔

یہ بالکل ابتدائی سورۃ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی تربیت فرماتے ہیں کہ یہ یہ کام کرو تاکہ تمہاری تربیت ہو سکے، جس کے نتیجہ میں آخرت میں خدا تعالیٰ کی رضا اور تقرب حاصل ہو گا اور دنیا میں بھی اصلاحِ احوال ہو گا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اللہ ہی کو مالک اور متصرف کائنات سمجھو۔ مشرق و مغرب یعنی قیصر و کسریٰ کا مالک وہی ہے۔ یہ قیصر و کسریٰ والے تو جھوٹے لوگ ہیں کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" اس کے سوا کوئی معبود نہیں

"فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا" لہٰذا اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ مادیت پر بھروسہ مت کرو۔ کیونکہ مومن اور کافر میں یہی فرق ہے۔ کافر مادے پر بھروسہ کرتا ہے اور مومن اللہ پر توکل کرتا ہے۔ اسباب تو سارے ہی استعمال کرتے ہیں، مومن بھی، کافر بھی اور دہریے بھی، مگر مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان اسباب پر اعتماد نہیں کرتا، ان کو کارساز نہیں سمجھتا بلکہ کارساز حقیقی اللہ ہی کو سمجھتا ہے۔ برخلاف اس کے کافر تلوار پر اعتماد کرتا ہے مگر مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ تلوار فتح حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، فتح اللہ کے ہاتھ میں ہی ہے وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ "مدد منجانب اللہ ہی ہے۔ البتہ اس مادی جہان میں (PHYSICAL WORLD) میں رہتے ہوئے ظاہری اسباب کو ترک نہیں کرنا کہ یہ حرام ہے، مگر اسباب پر اعتماد نہ رکھو۔ جیسے کھانا پیٹ بھرنے کا سبب ہے مگر علت نہیں۔ یہ سمجھنا کہ روٹی سے ہی پیٹ بھرے گا یا پانی ہی سے سیرابی ہوگی، درست نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے میں اللہ تعالےٰ کا حکم اور اس کا ارادہ کارفرما ہے۔ اللہ تعالےٰ چاہے گا۔ تو ظاہری اسباب میں اثر پیدا کرے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ شفا دینے والی دوائی ہے بلکہ لَا شَافِیَ اِلَّا هُوَ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دوائی کا استعمال تو ظاہری سبب ہے دوائی میں اثر پیدا کرنا مالک الملک کے قبضہ قدرت میں ہے۔ لہٰذا اسی کو ہی اپنا کارساز بناؤ۔ یہ تمام باتیں تربیت کے ضمن میں بیان کردیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا ان آیات میں پانچواں حکم ہے۔

صبر کی تلقین

(۶) **صبر**:- اس ضمن میں اللہ تعالےٰ نے چھٹی بات یہ فرمائی وَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ صبر کریں ان باتوں پر جو مخالفین کہتے ہیں۔ نبی علیہ السلام کو خطاب کرکے بات آپ کے ساتھیوں کو سمجھائی جا رہی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ" یعنی آپ صبر کریں اور خدا سے صبر کی توفیق مانگیں۔ کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر صبر بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کا پاک کلمہ موجود ہے۔ اس کے ذریعے سے بھی اللہ سے توفیق طلب کی جاتی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ صبر کے تین محل ہیں، پہلا محل مصیبت کی آمد پر ہوتا ہے، اس وقت صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرے بلکہ تکلیف کو برداشت کرے۔ جس انسان کا تعلق

---

[1] احیاء العلوم ص ۲۷۱ ج ۴

اللہ تعالےٰ کے ساتھ قوی ہوگا، وہ برداشت کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ یہ سب تصرف خدا تعالےٰ کا ہے کیونکہ مصیبت کو لانا اور اُس کو ہٹانا اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لہٰذا جس کا عقیدہ درست ہوگا اس کا تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہوگا، اور وہ صبر کرے گا، اور جس کا تعلق خدا تعالےٰ سے کمزور ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا اور وہ معصیت میں ڈوبا ہوا ہوگا، وہ صبر نہیں کرسکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ مصیبت کے آتے پر صبر کرو اور اسے برداشت کرو۔ دوسری جگہ فرمایا "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" یعنی مصیبت کے وقت صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ نماز تعلق باللہ کا قوی ذریعہ ہے۔ اسی ضمن میں مزید حکم ہوا کہ مصیبت کے وقت یوں کہا کرو "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" یعنی ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دنیا کی ہر چیز فانی ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" لہٰذا اللہ تعالےٰ کے فیصلے پر راضی ہونا چاہیئے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] "اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى" صبر وہ ہے جو مصیبت کے آنے پر پہلے کیا جائے۔ اگر مصیبت آنے پر جزع فزع شروع کر دی، بے صبری کا اظہار کیا۔ اور بعد میں تھک ہار کر کہا کہ اچھا جی صبر ہی ہے۔ تو یہ کوئی صبر نہیں۔

صبر کے تین مادے

صبر کا پہلا مادہ تو وہی ہے جو پہلے بیان ہوا یعنی مصیبت کے آنے پر صبر کا اظہار کرنا ان معانی میں کہ مصیبت کو لانے والا اور اسے دور کرنے والا ______ اللہ تعالےٰ ہی ہے۔ تو اس لحاظ سے صبر بہت بڑی چیز ہے۔ ملتِ ابراہیمی اور دین اسلام میں صبر بڑے بڑے اصولوں میں سے ہے۔ صبر، شکر، ذکر، تعظیم شعائر اللہ یہ سب بڑے بڑے اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" یعنی صبر کرنے والے کو اللہ تعالےٰ بے حد و شمار اجر عطا فرمائے گا۔

صبر کا دوسرا مادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہے۔ خدا کی اطاعت بغیر صبر کے نہیں ہوسکتی۔ صبر کے بغیر نماز نہیں پڑھ سکتا، حج نہیں کرسکتا، روزہ نہیں رکھ سکتا۔ تو گویا اپنے آپ کو اطاعت پر جمانا اور ثابت قدم رہنا صبر کا دوسرا مادہ ہے۔

---

[1] مسلم صلہ ۳۰۱/۱)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تیسرا آمادہ اپنے نفس کو برائی اور معصیت سے روکنا ہے۔ نفس ہمیشہ آزادی چاہتا ہے اور برائی کی طرف مائل ہوتا ہے "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ" لہٰذا نفس کو نفسانی خواہشات اور برائی سے روکنا صبر ہے۔ ارشاد ربانی ہے "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ہ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی" یعنی جو شخص خدا کے سامنے کھڑا ہونے یعنی محاسبے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا، تو اس کا ٹھکانا جنت الماوٰی ہوگا۔

مخالفین کی الزام تراشیاں

مخالفین کی جن باتوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے، وہ کیا ہیں۔ مثلاً پہلی سورتوں میں گذر چکا ہے کہ وہ کہتے تھے "اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ" یعنی آپ نعوذ باللہ مجنون ہیں۔ حالانکہ خدا کا نبی اعقل الناس یعنی تمام نوع انسانی سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ تمام لوگوں سے زیادہ دانشور، دانا اور ذہین ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ جس قدر ذہانت نبیوں کو عطا کرتا ہے، باقی مخلوق کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں دیتا۔ مگر مخالفین آپ کو دیوانہ کہتے تھے۔ اور جب دیکھتے تھے کہ کیا دیوانوں کے حالات، نظریات، خدمت خلق اور عبادت ایسی ہوتی ہیں تو پلٹ کر کہہ دیتے تھے کہ آپ کاہن ہیں۔ جب دست شناسی کرنے والوں سے مقابلہ کیا، جو انتہائی خود غرض اور جھوٹے ہوتے ہیں تو پھر بھی بات نہ بنی کیونکہ آپ کے اخلاق حمیدہ تو روز روشن کی طرح عیاں تھے، لہٰذا شاعر کہہ دیا۔ یہ شخص شاعری کرتا ہے اور اس کا کلام بڑا موثر ہے مگر جب شاعروں والی صفات بھی نہ پاسکے تو ساحر یعنی جادوگر کا خطاب دے دیا۔ کسی بدبخت نے کہہ دیا کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔ "اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا" کہنے لگے یہ سحر زدہ آدمی ہے، اس کی بات نہ مانو۔

مخالفین بعض اوقات معبود برحق کے بارے میں طعن کرتے۔ کبھی پیغمبر کی ذات اور آپ کی جماعت پر طعن کرتے۔ جب مومن پاس سے گذرتے تو ان پر ٹھٹھا کرتے۔ جیسے فرمایا "اِذَا مَرُّوْا بِھِمْ یَتَغَامَزُوْنَ" یعنی کافر ایک دوسرے کو اشارے کرتے۔ اور کہتے یہ حوروں کے خاوند جا رہے ہیں، جنت کے مالک جا رہے ہیں۔ کپڑے پھٹے ہوئے، رہنے کے لیے گھر نہیں ہیں مگر جنت کے مالک ہیں۔ اس قسم کے تمسخر کرتے اور بیہودہ باتیں بناتے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ مخالفین کی باتوں پر صبر کریں۔

مخالفین کی ایذا رسانیاں

مخالفین کی ایذا رسانیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا" یعنی مسلمانوں کو اہل کتاب اور مشرکین کی زبانی بڑی

تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی مگر اس کا علاج یہی بتایا اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا کہ اگر تم صبر کروگے خدا تعالےٰ سے ڈرتے رہوگے، بُرائی کا جواب نیکی سے دوگے۔ بد اخلاقی کا جواب حسن اخلاق سے دوگے، تو پختہ بات یہ ہے کہ تم کامیابی سے ہم کنار ہو جاؤ گے۔

ایذا رسانی کی مثالیں آج کے زمانے میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد احمد آباد میں ایک انگریز نے اپنے کتے کا نام "احمد" رکھا (العیاذ باللہ) اس بدبخت کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج ہوا اور آخر میں اس نے معافی مانگ لی، افسوس کا اظہار کر دیا (I AM SORRY) مجھے علم نہ تھا، میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ یہ محض ایذا پہنچانے والی بات تھی، ورنہ اسے کس چیز کا علم نہ تھا۔ جس پاک ذات کو دنیا کے کروڑہا انسان اپنا رہبر و راہنما مان رہے ہیں اور جس کا چرچا تمہارے درمیان بھی ہوتا ہے، کیا اُس کا انہیں علم نہیں تھا۔

اسی طرح ایک خبیث جرمنی انگریز نولڈک نامی گذرا ہے، اُس نے کہا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ محمد کو مرگی کے دورے پڑتے تھے اور اس دورے کی حالت میں وہ جو کچھ بڑبڑاتے تھے اسے لوگوں نے قرآن بنا لیا (معاذ اللہ) یہ تو آج کے تعلیم یافتہ دور کی باتیں ہیں اور اُس وقت کے مشرکین تو تھے ہی جاہل وہ پیغمبر علیہ السلام کے متعلق طرح طرح کی بیہودہ باتیں بناتے تھے۔ کبھی کہتے "مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ" یعنی یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اُن کے نزدیک کھانا پینا اور چلنا پھرنا معیوب بات تھی، اُن کا خیال تھا کہ نبی کوئی فرشتہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اگر زمین میں بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتے، لیکن زمین پر چونکہ انسان آباد ہیں، اس لیے اُن کی طرف نبی بھی انسان ہی آئے گا۔ کیونکہ انسان دوسری جنس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسوہ نہیں پکڑ سکتا۔ اور اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" یعنی تمہارے لیے رسول بہترین نمونہ ہے۔ تو بہر حال مخالفین اس قسم کی باتوں سے ایذا پہنچاتے تھے۔

مخالفین سے قطع تعلق

الغرض ان تمام تر الزام تراشیوں اور ایذا رسانیوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ صبر کریں وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا یعنی آپ

ان کو اچھی طرح چھوڑ دیں، ان سے الگ ہو جائیں اور ایک حد تک قطع تعلق کر لیں۔ مگر اچھے اور احسن طریقے سے یعنی لڑائی جھگڑائی سے نہیں بلکہ اس طریقے سے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" تمہارے لیے تمہارا سلسلہ اور ہمارے لیے ہمارا طریقہ ہے مطلب یہ کہ علیحدگی بھی اختیار کرنی ہے تو هَجْرًا جَمِيلًا والی مہذب اور شائستہ لوگوں والی، لڑائی جھگڑا تو جاہلوں کا شیوہ ہے لہذا "اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا" یعنی جاہلوں کے پاس سے وقار کے ساتھ گذر جاؤ اور کہہ دو کہ بھائی تم اپنا کام کرتے رہو، ہم اپنا کام کریں گے "فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ" نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون لہذا خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی[1] فرماتے ہیں۔ کہ یہ اُن سے ترک تعلقات بھی ظاہراً کریں اور دل میں یہی خیال کریں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت ہی دے دے تو اچھا ہے۔ دل سے قطع تعلق نہ کریں۔ دل سے ان کے لیے ہدایت کی دعا ہی کریں۔ نیز لوگوں کے سامنے اُن کی بدسلوکی کا شکوہ بھی نہ کریں۔ ہاں اللہ کے حضور التجا کر سکتے ہیں کہ انھوں نے یہ تکلیف پہنچائی ہے۔ عوام کے سامنے شکوہ نہ کریں۔ کہ ہجر جمیل کے منافی ہوگا۔ ہاں اقطع تعلقی کے باوجود جب بھی موقع ملے خیر خواہی کی بات کرتے رہو، کلمہ حق کہتے رہو، اور ان سے اظہار ہمدردی کرتے رہو کہ اسی کا نام ہجر جمیل ہے۔

جماعتی تنظیم کی اہمیت

یہاں پر ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ صبر کی اس لیے بھی ضرورت ہے۔ کہ مسلمانوں کی جماعت میں ابھی پوری طاقت نہیں ہے۔ ابھی جماعت کی تربیت اور تنظیم کی ضرورت ہے، اُس کی طرف توجہ دیں اور ان کی تکالیف پر صبر کریں۔ دوسری جگہ موجود ہے۔ "قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" یعنی ان سے کہا گیا کہ ابھی ہاتھ نہیں اٹھانا، مقابلہ نہیں کرنا۔ بلکہ نماز پڑھتے رہو، تربیت حاصل کرو اور جماعت کو منظم کرو۔ جب یہ مراحل طے ہو جائیں گے اور مقابلے کے قابل ہو جاؤ گے، تو اس وقت مقابلہ بھی ہوگا اور ان کو سزا بھی دی جائے گی۔ تو گویا مکی زندگی کا سارا دور تنظیم و تربیت کا دور ہے۔ اور اس کے بعد آخری مرحلہ مدینہ طیبہ میں ہجرت کا آیا۔ نبیوں کی زندگی میں ہجرت آخری موڑ ہوتا ہے۔ اب ہر چیز برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ وطن، مال، جائداد ہر چیز کو چھوڑا جا رہا ہے۔ "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا"

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۱۹۳ تا ص ۱۹۴ پ ۲۹

اور اب ان مظلوموں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ ظالموں کا محاسبہ کریں اب ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ پہنچکر تنظیم و تربیت کا کام مکمل ہوا، تو مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ مکی دور میں برداشت اور صبر و تحمل کی تلقین ہی کی گئی کیونکہ جماعت منظم نہیں تو مقابلہ میں شکست کی صورت میں مشن ہی ختم ہونے کا ڈر ہے۔ ہر چیز کی کامیابی کا ایک معین وقت ہوتا ہے۔ لہذا آپ کو ارشاد ہوا کہ فی الحال آپ ہجر جمیل اختیار کریں، جب موقع آئے گا تو مقابلہ کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾ إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿١٤﴾

ترجمہ :- اور آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان جھٹلانے والے اصحابِ نعمت کو، اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں (۱۱) بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور جہنم کی آگ ہے (۱۲) اور گلے میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے (۱۳) جس دن زمین اور پہاڑ کانپنے لگیں گے اور پہاڑ ریت کے منتشر ٹیلے ہو جائیں گے (۱۴)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ چھ اصول بتائے ہیں جن کے ذریعے دنیا میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اس انقلابی پروگرام کے متعلق سورۃ توبہ[۱] اور سورۃ فتح میں ارشاد ہے "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ") یعنی اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا ہے۔ تاکہ اس کو سارے دینوں کے مقابلے میں غالب کر دے۔ ان مبینہ اصولوں میں رات کا قیام، قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھنا، رب تعالیٰ کے اسم کو یاد کرنا، کچھ علیحدگی اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو قوی بنانا، خدا تعالیٰ کو مالک اور متصرف سمجھنا، اُس کو معبود برحق جاننا اور اُسی کو کارساز سمجھنا۔ اور ایک اہم اصول صبر کا کہ اس راستے میں جو بھی تکلیف آئے اُس کو برداشت کرنا اور لوگوں سے احسن طریقے سے علیحدگی اختیار کرنا شامل ہیں۔

مکذبین کے لیے مہلت

اب اگلی آیات میں مخالفت کرنے والے لوگوں کے متعلق ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ یعنی آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان جھٹلانے والوں اور دولت والوں کو بھی چھوڑ دیں۔ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ مطلب یہ کہ مجھے چھوڑ دیں، میں ان سے خود سمجھ لوں گا یعنی سزا دوں گا۔ آپ ان کے متعلق

---

[۱] توبہ ۳۳ پ ۱۰ سورہ صف ۹ پ ۲۸ سورۃ فتح ۲۸ پ ۲۶۔

جلد بازی نہ کریں اور یہ خیال نہ کریں کہ ان کو فوراً سزا ملنی چاہیئے، یہ میرا کام ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ" آپ کا کام خدا کا پیغام پہنچانا ہے، مجرموں کو سزا دینا ہمارا کام ہے۔ ہم اپنی حکمت کے مطابق سزا دیں گے۔

سزا کے دو طریقے ہیں۔ حق کے پروگرام کی مخالفت کرنے والوں کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو یونہی نہیں چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ یہ مکذب ہیں۔ بعض اوقات اللہ دنیا میں ہی جہاد کے ذریعے سزا دے دیتے ہیں یا پھر کسی دوسرے خارجی ذریعہ یعنی افتاد اور مصیبت کی صورت میں سزا مل جاتی ہے۔ اور آخرت کی سزا تو ابھی باقی ہے۔ وہ آگے چل کر ملے گی۔

تو فرمایا آپ ان جھٹلانے والے صاحب دولت لوگوں کو چھوڑ دیں۔ کہ سچے عقیدے اور سچے دین کی مخالفت میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں۔ ہم ان سے باز پرس کریں گے۔ دنیا میں بھی ان کو مصیبت میں مبتلا کریں گے اور آخرت میں بھی جواب طلبی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں کہ "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ" یعنی ہمارے پاس مال و اولاد کی فراوانی ہے ہمیں کوئی سزا نہیں مل سکتی۔ قرآن پاک میں موجود ہے "اَلَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ" یہ لوگ مال جمع کرتے اور گنتے رہتے ہیں۔ انہیں آرام و آسائش کی ساری چیزیں میسر ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا، قیامت کے عقیدے کو جھٹلانے والے مترفین ہیں یعنی آسودہ حال لوگ ہیں۔ فرمایا آپ ان کو چھوڑ دیں "اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا" ہمارے پاس بیڑیاں اور جہنم کی آگ ہے۔ "وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ" اور گلے میں اٹکنے والا کھانا ہے۔ "وَّعَذَابًا اَلِيْمًا" اور دردناک عذاب ہے۔ ہم ان کو ان میں مبتلا کریں گے۔

یہ آسودہ حال لوگ جو توحید، قیامت اور رسالت کو جھٹلاتے ہیں، یہ ہمیشہ سب سے پہلے تکذیب کرنے والوں میں ہوتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اللہ نے جتنی بھی قوموں کا ذکر کیا ہے۔ اولین مکذبین یہی دولت مند ہوئے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ سرداری کا حق ہمارا ہے۔ ہم انسان کو رسول کیسے مان لیں۔ اور کیوں اس کی اطاعت کریں لوط علیہ السلام کی قوم نے کہا "اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ" ہم اس ایک انسان کا اتباع کیسے کریں۔ جب کہ اسے کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں۔ ہمارے پاس ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ اور یہ قلاش ہے۔

ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا مَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ "تمہاری کوئی برتری بھی ہم نہیں دیکھتے۔ ہمارے مقابلے میں تمہارے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ حکومت ہے، نہ فوج ہے۔ گویا اس طرح مال و دولت اکثر لوگوں کو بہکانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اولین متبعین غریب لوگ ہوتے ہیں

بخاری شریف کی حدیث میں ابوسفیانؓ اور ہرقل کا مکالمہ منقول ہے۔ ہرقل نے پوچھا کہ جس شخص نے نبوت کا دعوے کیا ہے۔ اُس کے پیچھے لگنے والے کیسے لوگ ہیں۔ یعنی بڑے لوگ ہیں یا کمزور۔ ابوسفیانؓ نے کہا کہ کمزور لوگ ہیں۔ ہرقل عیسائی مسلک رکھتا تھا پہلی کتابوں کا عالم تھا اس نے فوراً کہا وَھُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ یعنی رسولوں کے تابعدار ابتدا میں ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب کوئی طریق کار نہیں رہ جاتا تو امیر لوگ مجبور ہو کر آخر میں اسلام کی دعوت قبول کرتے ہیں۔ جو آخر تک پیغمبر کی بات کو نہیں مانتے، وہ مقابلہ کرتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرعون، ہامان اور نمرود وغیرہ کا حال مذکور ہے۔ یہی لوگ اولی النعمۃ ہیں۔

سرمایہ پرستانہ ذہنیت

مکے کے بڑے بڑے مخالفین ابوجہل، ولید، ابوسفیان وغیرہ انیس سال تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر میں جب اور کوئی رستہ باقی نہ رہا، تو پھر یا ہلاک ہوئے یا اسلام کا رستہ اختیار کیا۔ یہی دولت مند لوگ تھے جنہوں نے حضور نبی علیہ السلام کا انکار کیا۔ ایسے ہی سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کی عطا کردہ دولت کو نعمت نہیں سمجھتے، نہ حقوق ادا کرتے ہیں، نہ اس کو حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ یہی سرمایہ پرستانہ ذہنیت ہے آج کے دور میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ اسی ذہنیت کا شکار ہیں۔ اُن کا واحد مقصد حصولِ زر ہے۔ اُن کے ہاں ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ جیسا کہ پہلی سورۃ میں گذر چکا ہے "تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی" یا پھر "جَمَعَ فَاَوْعٰی" دوزخ ایسے ہی لوگوں کو بلائے گی جو منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے والے اور ہر طریقہ سے مال جمع کرنے والے ہیں۔ اور سمیٹ کر رکھنے والے ہیں۔

ہاں اگر ذرائع آمدن جائز ہوں اور اس میں سے حقوق بھی ادا کیے جائیں، تو ایسا شخص سرمایہ پرست نہیں ہوگا، بلکہ خدا پرست ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ ارشاد ہوا ہے۔ لَا تَاْکُلُوْا

لہ بخاری صفحہ ۴ ج ۱

اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" یعنی باطل طریقوں سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ وَاَجْمِلُوا فِی الطَّلَبِ[1] روزگار کے حصول میں جائز راستہ اختیار کرو۔ حرام راستے کے ذریعے مال مت کماؤ۔ ہمارے ہاں تو عام طور پہ ذرائع آمدنی میں انشورنس، بنکاری فلم انڈسٹری۔ قمار بازی ہے۔ شراب کے لائسنس، فوٹوگرافی، مجسمہ سازی، گانا بجانا جیسی معروف چیزیں ہیں۔ یہ تمام ذرائع ناجائز اور حرام ہیں۔

حقوق العباد

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2] کہ جب تک ان ناجائز ذرائع سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، سوسائٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ اکساب ضارہ میں گداگری، چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب سب کچھ شامل ہیں۔ ایک اچھی حکومت کا فرض ہے۔ کہ ناجائز ذرائع کو ختم کرکے جائز ذرائع مہیا کرے، جن سے دولت کما کر حقوق بھی ادا کئے جائیں۔ مگر یہاں تو حقوق بھی ادا نہیں کئے جاتے، دولت کو تقسیم نہیں کیا جاتا، وراثت کی تقسیم صحیح نہیں ہوتی، لوگ وصیت نہیں کرتے۔ زکواۃ ادا نہیں کرتے جو فرض ہے، قربانی نہیں کرتے جو واجب ہے۔ صدقہ فطر ادا کرنے میں پس وپیش کرتے حقوق واجبہ ادا نہیں کرتے "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ" قرابت داروں مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ "وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" سائل اور محروم کو حق نہیں دیتے حالانکہ ان دولت مندوں کے مال میں اللہ تعالٰی نے حق مقرر کر رکھا ہے

جو شخص کمانے میں قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ خرچ کرنے میں بھی سرمایہ پرستانہ ذہنیت سے نکل جاتا ہے۔ وہ خداپرست ہوجاتا ہے۔ یہ سرمایہ دار سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے حق کا اتباع کیا تو ہمارے ذرائع ختم ہوجائیں گے۔ یہود کی مخالفت کی بھی یہی وجہ تھی۔ وہ سرکشی کرتے تھے یہود ونصاریٰ اپنی زبان سے کہتے تھے۔ کہ اگر ہم نے اس نبی کا اتباع کیا تو ہماری ریاست ختم ہوجائے گی۔ مدینے کا سود خوار یہودی کعب بن اشرف سب سے زیادہ مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ اُس کا سودی کاروبار سارے عرب میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسلام قبول کرنے سے اُسے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پہ فرمایا تھا[3] کہ آج

---

[1] کنز العمال صـــ ۱۳، ۱۴ ج ۴ و مشکوٰۃ صـــ ۴۵۲ بحوالہ بیہقی و شرح السنۃ [2] حجۃ اللہ صـــ ۴۳ ج ۱ [3] مسلم صـــ ۳۹۷ ج ۱

سے سارا سود مٹا دیا گیا ہے۔ آج کے بعد کسی کو سود لینے کی اجازت نہیں۔ جو دیا ہوا ہے، وہ ختم ہے۔ صرف اصل رقم واپس لینے کا حق ہے۔ تو گویا اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے والے سرمایہ دار سچائی کی مخالفت کرتے ہیں۔

ہر جمعہ کے خطبہ میں آپ سنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یہ سب کیا ہے اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور تین منفی احسان کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ لوگ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان نہیں کرتے یہ دولت کو عیاشی، فحاشی اور ذاتی خواہشات کی تکمیل پر صرف کرتے ہیں۔ حکومتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ اپنے ذاتی عیش و آرام کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ قوم عاد کے لوگ کیوں مخالفت کرتے تھے۔ ہود علیہ السلام نے فرمایا، تم نے یہ بڑی بڑی عمارات بنائی ہوئی ہیں، مینار اور گنبد بنائے ہیں بے تحاشا دولت صرف کی ہے۔ فرعون بھی یہی کرتا تھا۔ اُس زمانے میں عام انسان کو بیل اور گدھے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ اُن سے کام لیا جاتا تھا مگر اُن کا حق ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کی یہی حالت تھی۔ ان کے سردار عیش کرتے تھے اور عام انسان ظلم کی چکی میں پستے تھے۔ وہ آج بھی مظلوم ہیں۔ آپ کے ملک میں سیکریٹریٹ کی تعمیر پہ اربوں روپیہ صرف ہوا ہے قصرِ صدر پہ پینتالیس کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اُس زمانے میں بھی یہی کچھ تھا۔

شاہ ولی اللہ رح فرماتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اُس کا باغ ہو، عمدہ حمام ہو، بڑی بلڈنگ ہو، نوکر چاکر ہوں۔ ان لوازمات کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر دی جاتی تھی۔ لوگوں کو حیوانوں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔[1] یہ ایسی باتیں ہیں، جن پر مؤاخذہ ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ صحیح نظام قائم ہو جائے تو قیام عمل کرنے والی جماعت جو اللہ پہ ایمان رکھتی ہے اور اس کے پروگرام پہ عمل پیرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھتی ہے ایسے سرمایہ پرستوں سے جواب طلبی کرے گی۔ اور انہیں سزا دے گی۔ اُن سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے لوگوں کے حقوق کیوں تلف کیے۔ جائز و ناجائز کا امتیاز کیوں روا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰۵ جلد ۱

نہیں رکھا، یہ تو دنیا میں جواب طلبی ہو گی اور آخرت میں اور برزخ میں خدا تعالیٰ سزا دے گا۔

صاحب حکومت لوگ تو بگڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ لوگ صحیح نظام کس طرح قائم کر سکتے ہیں۔ درست نظام تو وہ قائم کریں گے، جن کا تعلق خدا کے ساتھ درست ہو گا۔ ایسے نظام کو قائم کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہے اُس جماعت کے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے۔ آپ پہلی سورۃ میں پڑھ چکے ہیں۔ کہ ان لوگوں کو سزا ملنے کی کیا وجہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے "اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ"۔ یعنی یہ بدبخت دوزخ میں اس لیے جا رہے ہیں۔ کہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے حکم تو یہ تھا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر انہوں نے تو کئی معبود بنا رکھے تھے۔ مذہبی لوگوں کی ناکامی کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ" ایسے نمازیوں کے لیے جہنم ہے جو صحیح معنوں میں خدا کے انصاف پر یقین نہیں رکھتے وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ" اور مسکینوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتے۔ طعام میں کھانا، پینا، پہننا اور دیگر تمام ضروریات شامل ہیں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں[1] گے کہ اے دولت مند! میں مہمان تھا تو نے میری مہمانی نہیں کی۔ میں بیمار تھا تو نے بیمار پرسی نہیں کی۔ انسان حیران ہو گا کہے گا اَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ تو تو رب العٰلمین ہے، بے نیاز ہے، تو کیسے بھوکا پیاسا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا۔ تو نے اُس کو کھانا نہیں دیا۔ فلاں بندہ پیاسا تھا، فلاں بیمار تھا۔ اور یہ کمزور آدمی مسافر بن کر تمہارے پاس آیا تھا تم نے مہمانی نہ کی۔ اگر تم اس کی مہمانی کرتے۔ تو تم کو میری رضا حاصل ہوتی۔ اور آج کامیابی سے ہم کنار ہوتے۔ حکم ہو گا، پکڑو ان کو، بیڑیاں ڈالو، اور جہنم میں ڈال دو۔ اُس دن اس طرح فیصلے ہوں گے

انسان کے بنیادی حقوق

کھانے کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بنیادی حقوق ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے قرآن پاک کی آیات بتاتی ہیں۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بہشت میں رکھا، تو فرمایا۔ "اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾" چار چیزیں بیان فرمائیں کہ اے آدم (علیہ السلام) یہاں تم کو بھوک نہیں لگے گی۔ تمہارے کھانے کا سامان ہو گا۔ پیاسے نہیں ہو گے، یہاں پانی ملے گا، برہنہ نہیں ہو گے، لباس ملے گا۔

---

[1] مسلم صفحہ ۳۱۸ ج ۲

اور یہ کہ دھوپ نہیں لگے گی، تمہیں رہنے کے لیے جگہ ملے گی۔ یہ چار حقوق ہو گئے۔ یہ چار باتیں ترمذی شریف کی روایت میں بھی مذکور ہیں[1] ان کے علاوہ تعلیم اور صحت دو باتیں اور ہیں۔ یہ کل چھ باتیں آج بھی عالمی اداروں میں بنیادی حقوق تسلیم کی جاتی ہیں۔ آج امریکہ والے اور میکسیکو والے بنیادی حقوق کی بات کرتے ہیں یہ تو چودہ سو سال پہلے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھیں۔ کوئی شخص ان حقوق سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر شخص کو رہنے کے لیے جگہ چاہیئے۔ اُسے ضروری تعلیم حاصل ہونی چاہیئے۔ اور اس کی صحت کی حفاظت کی ضمانت ملنی چاہیئے۔ اس کی خوراک اور لباس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ مگر آج یہ حقوق انسان کو نہیں ملتے۔ ایک طبقہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرے محروم رہتے ہیں۔ ہمیشہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف اشتراکی نظام میں اگر بیکاری کا سدّباب کیا گیا ہے تو وہ ایمان کے پروگرام کو سرے سے ختم ہی کر دیتے ہیں۔ اس نظام کی بنیاد ہی انکارِ خدا اور دہریت پر ہے۔

دینِ اسلام میں دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں تعلق باللہ پہلی منزل ہے پہلے اپنا تعلق خدا کے ساتھ درست کرو۔ اپنا تعلق خدا کی تجلی کے ساتھ جوڑو۔ اس کے بعد بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ ایسی ہمدردی جو تعلق باللہ پر مبنی ہو۔ اشتراکی ہمدردی کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ ابتدائی سورتیں ہیں ان میں یہ تمام اخلاقیات کی تعلیم موجود ہے۔ یہ سارا پروگرام انہیں مکی سورتوں میں ملتا ہے۔ جہاں ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں ساری بات سمجھا دی گئی ہے۔ آگے مدنی سورتوں میں پوری تفصیل آئے گی۔

الغرض اولی النعمۃ کے لفظ کے ذریعہ واضح کر دیا کہ یہ وہی دولت مند لوگ ہیں۔ جو حق کو جھٹلانے والے ہیں۔ نمرود، فرعون، ابوجہل، یہ سب اولی النعمۃ کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہی لوگ نبیوں کا مقابلہ کرنے والے، توحید کے منکر اور بنی نوعِ انسان کے ساتھ ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ ہمدردی اور احسان جیسی پسندیدہ چیزوں سے ناواقف ہیں۔

ظلم کا سدّباب

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2]، کہ انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد لوگوں کے درمیان سے

---

[1] ترمذی صد ۳۳۹ [2] حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۵۱

ظلم کو مٹانا ہے۔ ہر شخص کو انصاف میسر ہو۔ آج بنی نوع انسان ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔ مگر اس ظلم کو مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کھانے پینے پہننے اور رہائش جیسے بنیادی سامان سے آراستہ نہ ہو، وہ آخرت کے متعلق کوئی فکر نہیں کر سکتا وہ تو انہیں چیزوں کے حصول میں مصروف رہے گا، آخرت کی تیاری کب کرے گا۔ لہذا ایک سچے نظام میں انسان ان بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ایسا نظام جس میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہو، اور جس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔

انسانی ہمدردی کا پروگرام

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی[1] ہے لَیْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَبِیْتُ شَبْعَانَ وَجَارُہٗ اِلٰی جَنْبِہٖ جَائِعٌ۔ "تم میں سے کوئی صحیح ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک تمہارا پڑوسی بھوکا ہو۔ اور تم پیٹ بھر کر کھالو۔ یہی ظلم ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے اور تم سوئے ہوئے ہو۔ یہ منافقوں کا ایمان ہے۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ ایسا نظام رائج ہونا چاہیئے۔ جس میں کوئی بھوکا پیاسا نہ ہے۔ کوئی مظلوم نہ ہو، ہر ایک کو عدل و انصاف میسّر ہو۔

یہ دولت مند مکذبین اپنی عیش و عشرت میں محو ہیں، انہیں دوسروں کی کیا فکر ہے۔ ان سے باز پرس ہوگی۔ صحیح نظام وہ ہوگا جو خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہوگا، وہی نظام جو عمر بن عبدالعزیزؒ نے قائم کیا۔ اور ہندوستان میں ناصر الدین التمشؒ نے اپنایا۔ تاریخ میں موجود ہے کہ التمشؒ کی بیوی نے کہا کہ مہمان بہت آتے ہیں، کھانا پکانے کے لیے کوئی نوکر عطا کر دیں، تو سلطان نے کہا، کہ دنیا میں تکلیف برداشت کرلو، تاکہ تمہاری آخرت اچھی ہو جائے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے مہمانوں کو کھلاؤ۔

مکذبین کے لیے سزا

فرمایا چھوڑ دو مجھے اور جھٹلانے والوں کو، جو دولت مند ہیں۔ ان کو تھوڑی سی مہلت اور دے دو۔ یہ مہلت دنیا کی مہلت ہے۔ جب تک ایسی جماعت کا نظام نہ قائم ہو جائے، جو کہ مطلوب ہے۔ اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّجَحِیْمًا ہمارے پاس ایسے لوگوں کے لیے بیڑیاں ہیں، اور جہنم ہے۔ وَطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف[2] میں آتا ہے کہ جب دوزخی تھوہر یا زقوم کا لقمہ حلق میں ڈالے گا تو وہ سو سال تک وہیں اٹکا رہے گا۔ اس کو

---

[1] طحاوی صہ ۲۷/۱ و مشکوٰۃ صہ ۴۲۴ بحوالہ بیہقی [2] ترمذی صہ ۳۷۱ ۔

نیچے اتارنے کے لیے جب پانی کا گھونٹ پیئے گا تو وہ ایسا گرم ہوگا، جو آنتوں کو کاٹ کر نیچے پھینک دیگا۔ وَعَذَابًا اَلِیْمًا اور فرمایا اسکے علاوہ طرح طرح کا عذاب الیم ہوگا مجرموں کو ذلت کے ساتھ بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ اور یہ اس دن ہوگا یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ جس دن زمین اور پہاڑ کانپنے لگیں گے، وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا اور پہاڑ ریت کے ٹیلے کی مانند منتشر ہو جائیں گے، جس طرح ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ تو ریت کا ٹیلہ بکھر جاتا ہے اسی طرح پہاڑ بھی بکھر جائیں گے۔ اس دن ان مکذبین کو اور اولی النعمۃ کو سزا ملے گی۔ کیونکہ یہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ انہوں نے اپنا تعلق اللہ تعالےٰ کے ساتھ درست نہیں کیا۔ اور مخلوق کے ساتھ بھی احسان نہیں کیا۔

درس چہارم ۴ (آیت ۱۵ تا ۱۹)

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿۱۵﴾ فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ﴿۱۸﴾ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَى رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو شہادت دینے والا ہے تمہارے اوپر جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا ﴿۱۵﴾ پس فرعون نے اس رسول کی مخالفت کی تو ہم نے فرعون کو پکڑ لیا وبال والا پکڑنا ﴿۱۶﴾ پس تم کیسے بچو گے اگر تم نے (توحید و رسالت کا) انکار کیا اس دن سے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا ﴿۱۷﴾ اس دن آسمان پھٹ جائے گا اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہیگا ﴿۱۸﴾ بے شک یہ نصیحت کی باتیں ہیں لہذا جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنا لے ﴿۱۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں چند اہم اصول بیان فرمائے، اُس کے بعد مخالفت کرنے والے مکذبین کا ذکر فرمایا اور کہا "وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ" یعنی آپ چھوڑ دیں مجھے اور ان مکذبین کو جو نعمت والے ہیں، اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے ساتھ ابھی مقابلہ نہیں کرنا ہے، بلکہ صبر کرنا ہے، آپ برداشت کریں، میں خود ان کو سزا دوں گا۔ ان لوگوں سے جواب طلبی ہو گی جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس جماعت کے ذریعے باز پرس کریں گے جن کی تربیت سابقہ اصولوں کے مطابق آپ کریں گے۔ یہ چھ اصول ہیں جو اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ انہی اصولوں کی روشنی میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے لہذا فی الحال آپ اپنی جماعت کو تیار کریں۔

شاہد رسول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے شَاهِدًا عَلَيْكُمْ جو شہادت دیتا ہے تمہارے اوپر۔ شہادت کا ایک معنیٰ تو یہ ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ کا

بنی شہادت دے گا۔ جنہوں نے مانا ان کے بارے میں اور جنہوں نے نہیں مانا ان کے متعلق بھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسری جگہ ارشاد ہے جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ ہم ہر امت میں سے گواہ لائیں گے اور وہ گواہ بنی ہوگا۔ یہ بھی فرمایا وَجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا۔ ان پر ہم آپ کو بھی گواہ بنا کر لائیں گے۔ ایک تو یہ قیامت کی گواہی ہے۔ اور دوسرے حق و صداقت کی گواہی ہے۔ جو حضور علیہ السلام کے سپرد کی گئی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں بتلانے والا اور آگاہ کرنے والا ہے۔ تمہیں تعلیم دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے مماثلت

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے۔ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ یعنی فرعون کی طرف موسیٰ علیہ السلام کی بعثت بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ مکذب تھا۔ اور اولی النعمۃ میں سے تھا، بڑا جابر اور ڈکٹیٹر تھا، بڑا ظالم بادشاہ تھا۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو قوموں کی طرف بھیجا تھا۔ ایک بنی اسرائیل جو آپ کا اپنا خاندان تھا۔ اور دوسرے قبطی جو مصر کے اصلی باشندے تھے اور جن میں فرعون بھی شامل تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام تو براہ راست بنی اسرائیل کی طرف ہی مبعوث تھے، اور فرعون کو صرف پیغام پہنچانا مقصود تھا۔ مگر یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں صاف موجود ہے۔ فَقُلْ ھَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی ۝ وَاَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی۔ "جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس پہنچے تو یہ فرمایا۔ جیسے سورۃ شعراء میں آتا ہے۔ "فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ ہم دونوں بھائیوں کو رب العلمین نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور فرعون کے سامنے کہا کہ تیرے اندر پاک ہونے کا کوئی جذبہ موجود ہے کہ میں تیری راہنمائی کروں۔ تاکہ تو ہدایت پا جائے۔ "فَکَذَّبَ وَعَصٰی" فرعون نے تکذیب کی اور نافرمانی کی جس طرح مکے کے سرداران حضور علیہ السلام کے مکذبین تھے۔ اسی طرح فرعون بھی موسیٰ علیہ السلام کا مکذب تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارۃً بتادی کہ جو حشر فرعون مکذب کا ہوا تھا، مکے کے مکذبین

لہ موضح القرآن سورۃ حج آیت ۷۸ مطبوعہ تاج کمپنی۔

کا حشر بھی اُس سے مختلف نہیں ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام سے مماثلت کی بعض دوسری وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور موسیٰ علیہ السلام کی امت کے حالات بھی ملتے جلتے ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی امت کے بارے میں فرمایا کہ تم بھی اسی طرح بگڑو گے جس طرح یہود و نصاریٰ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بگڑی تھی تم بھی اُن کے نقشِ قدم پہ چلو گے۔ اور اُن سے مشابہت اختیار کرو گے۔ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوًا بِحَذْوٍ[1] بالکل اسی طرح مشابہت جس طرح جوتے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے حالات بھی موسیٰ علیہ السلام سے ملتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی اور رسول اور صاحب خلافت بھی ہیں۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے نظام حکومت عطا فرمایا تھا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور صاحبِ خلافت بھی۔ جس قسم کی مخالفت کے حالات موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئے۔ اسی قسم کے حالات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوچار ہوئے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے والے دولت مند لوگ تھے تو آپ کا مخالف بھی یہی طبقہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین میں ملوک بھی تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی قیصر و کسریٰ تھے۔ اُن کی سلطنتوں کو درہم برہم کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے پروگرام میں شامل تھا۔ ابوجہل، ابولہب اور دیگر مخالفین اگرچہ ملوک نہیں تھے تاہم یہ بھی اُن کے قائم مقام تھے، ان کی ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ تھی۔ ان کے مکانات تھے، تجارت تھی، خدا نے دولت دے رکھی تھی۔ تو فرمایا ابھی اُن کے ساتھ مقابلہ ہے۔ اس کے بعد ملوک کی باری آئے گی اور اُن کے ساتھ جہاد کی منزل آئے گی۔

جماعتی تنظیم کی ضرورت

اس کے ساتھ ایک دوسری حقیقت بھی سمجھا دی گئی کہ ”وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ“ آپ ان دولت مند مکذبین کو چھوڑ دیں، کیونکہ میں ان کو سزا دوں گا۔ ”إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا“ یہ مجرم ہیں، آپ جلد بازی نہ کریں، لڑائی بھی نہ کریں، ابھی جنگ کی منزل نہیں آئی بلکہ تیاری کی منزل ہے۔ ابھی جماعت تشکیل دینے اور اُسے تربیت دینے کی منزل ہے، اُن کو اکٹھا کرنے کی منزل ہے۔

---

[1] بخاری ص ۴۹۱ ج ۱ و ص ۱۰۸۸ ج ۲، مسلم ص ۳۳۹ ج ۲، مستدرک ص ۱۲۹ ج ۱، ترمذی ص ۳۱۷

لہٰذا یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ یعنی اے ساتھی اکٹھا کرنے والے، اور لحاف اوڑھنے والے، کمبل اوڑھنے والے ابھی ان سے مقابلہ نہیں کرنا۔ ہم خود ان سے باز پرس کریں گے۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے تیرہ برس بعد میدانِ بدر میں ان لوگوں سے باز پرس ہوئی۔ اور ان کو سزا دی گئی۔

قومی اور بین الاقوامی نبی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں آپ قومی نبی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو قریش اور عربوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ عربی زبان بولتے ہیں۔ عربی زبان میں وحی الٰہی سناتے ہیں، عربوں کے ماحول میں رہتے ہیں۔ اور قریش کی سعادت آپ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اِس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن پاک نے بیان فرمایا "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ" یعنی ہم ہر نبی کو اُس کی قوم کی زبان میں بھیجتے ہیں۔ آپ کی دوسری حیثیت بین الاقوامی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو تمام اقوام کی طرف مبعوث فرمایا، جیسا کہ "قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا"۔ نیز یہ بھی فرمایا "وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا"۔ یعنی اے نبی کریم ہم نے آپ کو تمام بنی نوعِ انسان کی طرف مبعوث فرمایا۔ تو گویا پہلی حیثیت سے آپ قومی نبی (NATIONAL PROPHET) ہیں اور دوسری حیثیت میں بین الاقوامی (INTERNATINAL PROPHET) ہیں۔[1]

غلبۂ اسلام بذریعہ اسلامی فتوحات

شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ[2] میں اس کی تصریح یوں فرمائی ہے۔ کہ نبی ایک ایسا شخص ہے یہ ساری غیر محدود اقوام کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ نبی پہلے اپنی قوم کے لوگوں کو تربیت دے جب یہ لوگ اصلاح پذیر ہو جائیں تو انہیں لوگوں کو اپنا جارحہ بنائیں یعنی ان لوگوں کو اپنا دست بازو بنائیں، اسے آج کل کی زبان میں مجلس عاملہ (WORKING CMMITTEE) کہہ سکتے ہیں۔ اور انہیں لوگوں کے ذریعے دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کریں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک میں عرب میں انقلاب آیا، کفر و شرک ختم ہوا اور مرکز اسلام قائم ہو گیا۔ بیرونِ عرب لڑائیوں میں سے صرف ایک غزوہ تبوک میں آپ نے شرکت فرمائی۔ ایک ہزار میل کا سفر طے کیا، آپ کے ساتھ تیس[30] ہزار، چالیس[40] ہزار یا اکسٹھ[61] ہزار

---

[1] حجۃ اللہ ص ۸۴ ج ۱، تفہیمات الٰہیہ ص ۲۶۹ ج ۱

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۸ ج ۱ مکتبہ سلفیہ لاہور

صحابہ کرامؓ تھے، تین مختلف روایات ہیں۔ واقدیؒ کی روایت کے مطابق ستر ہزار آدمی تھے۔ باقی بیرونی دنیا سے معرکہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ہوا۔ قیصر و کسریٰ سے مقابلہ خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں ہوا۔ اسی طرح ایران حضرت عمرؓ کی خلافت میں سعد بن ابی وقاصؓ کی کمان میں فتح ہوا۔ یہ قادسیہ کی جنگ مشہور رہے۔ جو تین دن تک لڑی گئی۔ یہ ایسی زبردست جنگ تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ تین دن رات متواتر لڑائی ہوئی اور آخر ایران فتح ہوا۔ یہ کسریٰ کی شکست تھی، البتہ قیصر چھ صدیاں بعد مغلوب ہوا۔ اگرچہ عرب علاقوں یعنی مصر، شام، فلسطین، حمص وغیرہ میں قیصر مغلوب ہو چکا تھا مگر خود روما ترکوں کے عہد میں مغلوب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا تھا[۲] کہ جب کسریٰ ہلاک ہوگا، تو کوئی دوسرا کسریٰ نہیں کھڑا ہوگا، اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو کوئی قیصر نہیں اٹھیگا۔ لیکن وَالرُّوْمُ ذَوَاتُ الْقُرُوْنِ[۳] یعنی عیسائی قرناً بعد قرنٍ آئیں گے۔ ان سے مسلمانوں کی ٹکر جاری رہے گی حتیٰ کہ ان کا آخری حصہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ لڑائی کرنے کے لیے تیار ہوگا اور تباہ ہو جائے گا۔ تو گویا عیسائی مسیح علیہ السلام کے زمانے میں جا کر مکمل طور پر مغلوب ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ قرب قیامت میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچے گی۔ پھر جب مسیح علیہ السلام کا زمانہ آئے گا۔ تو دنیا میں کفر باقی نہیں رہے گا وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ اور صرف اللہ کا دین ہی باقی رہ جائے گا۔

الغرض اگرچہ بطور دلیل اسلام ہر زمانے میں غالب رہا مگر سیاسی غلبہ اسے خلفائے راشدین کے زمانے میں حاصل ہوا، اس زمانے میں کسی دوسری قوم کو مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی، وہ دب کر رہتے تھے یا صلح کر لیتے تھے۔

کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ میں ایسی خلافت بخشوں گا۔ کہ دین مستحکم ہوگا یہ اُسی زمانے کا جما ہوا دین ہے۔ جو آج تک آرہا ہے۔ اگر اُس زمانے میں دین اسلام کو رسوخ حاصل نہ ہوتا۔ تو بعد میں تو بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں، مسلمان خلافت کو ترک کر کے ملوکیت کی طرف واپس آگئے۔ درمیان میں کوئی اچھا آدمی آگیا تو حالات بہتر ہو گئے۔ بہر حال دین مٹا نہیں کیونکہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اسے مستحکم کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے یُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ

---

[۱] فیض الباری ص ۱۲۶ ج ۴ [۲] مسلم ص ۳۹۶ ج ۲، بخاری ص ۹۸۱ ج ۲ [۳] کنز العمال ج ۱۲ ص ۲۶۱ ج ۱۳

چنانچہ اس دور کا مستحکم شدہ دین ہی اب تک چل رہا ہے۔

الغرض نبی علیہ السلام کو تسلی دی جا رہی ہے۔ کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ دولت مند طبقہ سے تھا، حالانکہ اُن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کی مالی حیثیت کچھ نہ تھی۔ نہ اُن کے ساتھ کوئی جماعت تھی۔ لیکن انقلاب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ برپا کیا۔ اتنے بڑے دشمن کو نیست و نابود کیا۔ اس مثال سے سمجھانا یہ مقصود ہے۔ کہ عرب کے قریش اگرچہ ملوک نہیں ہیں، مگر ان کی ذہنیت سرمایہ دارانہ ہے۔ فرعون کی طرح بالآخر یہ بھی مغلوب ہوں گے۔ ان کی دنیا میں بھی گرفت ہوگی، جیسا کہ مقامِ بدر پر ہوئی اور آخرت میں بھی سزا ہوگی۔

اکتنازِ دولت

اکتنازِ دولت بجائے خود ایک لعنت ہے۔ جہاں یہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، وہاں مال کے جمع کرنے میں حلال و حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ اور خرچ کرنے میں مستحقین کے حقوق ادا نہیں کیے جاتے۔ اسی لیے اسلام نے اس ذہنیت کو ناپسند کیا۔ اسلام نے دولت کے اکتناز سے منع کیا ہے اور تقسیم کا حکم دیا ہے۔ "کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ" تاکہ یہ دولت امیر طبقہ میں ہی گردش نہ کرتی رہے بلکہ اس کا بہاؤ غرباء، مساکین، یتامیٰ کی طرف ہونا چاہیے، مال سے اپنی جائز ضروریات پوری کرنا فطری امر ہے۔ مگر دولت اپنے پاس مرتکز کر کے مت رکھو۔ ایسا کرو گے تو اولی النعمۃ کے گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ "جَمَعَ فَاَوْعٰی" کی زد میں آجاؤ گے، "جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ" میں پکڑے جاؤ گے۔ یہی وہ ظالمانہ ذہنیت ہے جسے اسلام ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسی ذہنیت سے حرص پیدا ہوتی ہے اور دوسروں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ یکسر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

سود کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے سود کے متعلق فرمایا "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ" یعنی اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے۔ اور صدقہ خیرات کو بڑھاتا ہے یعنی اس کا اجر دُگنا تگنا کر دیتا ہے۔ سود خور کی ذہنیت ایسی بیان فرمائی جیسے کسی کو جن چمٹا ہوتا ہے۔ اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سود خور کو اپنی دولت سے غرض ہوتی ہے، انسانی ہمدردی سے یکسر محروم ہوتا ہے ان ساہوکار مہاجنوں کو دیکھو، جو سود حاصل کرنے کے لیے کسی غریب بڑھیا کی جھونپڑی تک نیلام کرا دیتے ہیں۔ حالانکہ جس کے پاس لاکھوں روپیہ ہو، وہ کسی قرض خواہ کو کچھ عرصہ مہلت بھی دے

سکتا ہے کہ وہ قرض چکا سکے۔ مگر یہاں تو خود غرضی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ غریب شخص سائے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یعنی ایک مومن دوسرے کے حق میں عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے۔ کہ ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی طرح مومن بھی ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں۔ اس کی مثال انسانی جسم کے خلیات کی بھی ہے میڈیکل سائنس والے بتاتے ہیں کہ انسانی جسم میں چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی مانند خلیات ہیں جن میں خون، رطوبت وغیرہ جاتے ہیں۔ یہ خلیات اسی وقت تک درست رہتے ہیں جب تک وہ اپنی ضرورت کے مطابق مادہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ خلیات ضرورت سے زیادہ خون اکٹھا کرنے لگیں گے، تو جسم میں ورم آجائے گا۔ اور جسم کا وہ حصہ بیمار ہو جائے گا، جہاں خون کی مقدار ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گی۔ یہی حال ارتکازِ زر کا ہے۔ جب یہ کسی جگہ ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گا اور حرام و مکروہات میں صرف ہوگا، تو نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ جسم میں ورم آجائے گا۔ اور اس کی اصلاح کی ضرورت پیش آئے گی۔

فرعون کی ہلاکت

تو ارشاد ہوتا ہے۔ بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ آپ کی بعثت کی پیشن گوئی تورات میں آج بھی موجود ہے۔ کہ "اے موسیٰ! میں تیرے بھائی بندوں میں سے تیرے جیسا ایک رسول برپا کروں گا، اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا" بھائی بندوں سے مراد بنی اسماعیل ہیں۔ لہذا فرمایا تمہاری طرف اسی طرح رسول بھیجا ہے۔ جس طرح فرعون کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ پس فرعون نے رسول کی مخالفت کی۔ اسی طرح اے مکہ والو! تم بھی اپنے رسول کی مخالفت کر رہے ہو مگر یاد رکھو جس طرح اس مخالفت کی پاداش میں فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ہم نے فرعون کو پکڑ لیا۔ اسی طرح تمہیں بھی آخر کار اپنے رسول کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہوگا۔ اَخْذًا وَّبِیْلًا سے مراد وبال والا پکڑنا ہے یعنی سخت مہلک گرفت میں لیا ہے۔ اور پھر فرعون کو نہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے غرق کیا

لے مسلم ص۲/۳۲۱ ۔ مسند احمد ص۴/۴۰۵

بلکہ اُس کی لاش کو آئندہ آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً "اور اُسے پانی سے باہر نکال کر رکھ دیا۔ تو مکے والوں کو فرمایا فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یعنی اگر تم نے دین حق، توحید و رسالت کا انکار کیا، تو کیسے بچو گے۔ اُس دن سے يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا جو اپنی شدت کی وجہ سے بچوں کو بوڑھا کر دے گا السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ اُس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ پہلے درتیچے درتیچے ہو گا، پھر درہم برہم ہو جائے گا۔ نیا آسمان اور نئی زمین قائم ہو گی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اُس دن كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

دوزخیوں کی غالب اکثریت

حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ قیامت کے روز اللہ تعالےٰ آدم علیہ السلام کو طلب کریں گے۔ تو آدم علیہ السلام کہیں گے لَبَّيْكَ یعنی اے اللہ میں حاضر ہوں۔ اللہ فرمائے گا۔ اٹھو اور جہنم والوں کو الگ کر دو۔ آدم علیہ السلام عرض کریں گے، کہ اے مولا کریم! دوزخ میں جلنے والے کون لوگ ہیں۔ حکم ہو گا، ہزار میں سے نو سو ننانویں۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے کہ کل مخلوق میں اتنی کثرت دوزخیوں کی ہو گی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا! اے ایمان والو! تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ کیونکہ اس تعداد میں یاجوج ماجوج بھی شامل ہیں۔ ایک انسان کے مقابلے میں یاجوج ماجوج کی تعداد ۹۹۹ ہے۔ یہ بھی انسانوں کے ساتھ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ آج بھی دنیا کی کل پانچ ارب آبادی میں سے سواچار ارب کافر ہیں، جو جہنمی ہیں۔ ایمان والے آج بھی اقلیت میں ہیں کل آبادی کا پانچواں حصہ یا اس سے بھی کم۔ مزید یہ کہ اہل ایمان میں سے بھی صحیح ایمان والے قلیل ہی ہیں، اکثریت تو مکذبین کی ہے۔

الغرض فرمایا کہ اُس دن حالت یہ ہو گی کہ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ آسمان پھٹ جائے گا۔ زمین بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہے گی۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نئی زمین پیدا ہو گی، اُس پر محاسبہ ہو گا۔ اور كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا۔ خدا کا وعدہ برحق ہے، اُس دن پورا ہو جائے گا۔

قرآن پاک کی نصیحت

یہ تمام حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ یہ نصیحت کی باتیں

---

[1] ابن کثیر ص۳۸ ج۴ بحوالہ طبرانی روح المعانی ص۱۰۹ ج۲۹

ہیں جو اس سورۃ مبارکہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ کا نبی لوگوں کو یاد دلاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے کہ
قیام لیل کرو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق درست کرو علیحدگی میں خدا کا ذکر کرو۔ اسی کو کارساز بناؤ
مصیبت کے وقت صبر کرو۔ حقوق ادا کرو۔ قیامت آنے والی ہے۔ بڑا انقلاب آنے والا ہے۔ اگر
کفر کرو گے تو بچ نہیں سکو گے۔ لہذا فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا جو شخص چاہے اپنے
رب کی طرف راستہ بنا لے۔ کیونکہ اس کی آخری منزل اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہے۔ اس لیے اُسے
وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے، اسی راستے پہ چل کر انسان اپنے رب کے
ہاں سرخرو ہو سکتا ہے ورنہ اس کا حال وہی ہوگا۔ جو اِنْ کَفَرْتُمْ میں بیان کیا گیا ہے۔

درس پنجم ۵ (آیت ۲۰ تقریباً نصف آیت)

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ

ترجمہ :- بے شک آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ ــــ دو تہائی رات کے قریب اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں ــــ اور اللہ تعالیٰ ہی رات دن کا اندازہ کرتا ہے اللہ جانتا ہے کہ تم اس کو پورا نہ کر سکو گے تو اس نے تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا پس جتنا تمہارے لیے آسان ہو قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔ اللہ ـ جانتا ہے کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو زمین میں سفر کریں گے ـ تلاش کریں گے اللہ کا فضل اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے لہذا قرآن پاک میں سے اتنا ـ پڑھو جتنا آسان ہو۔

کیا نماز تہجد فرض ہے

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے رات کو قیام کا حکم دیا۔ یہ حکم سال بھر تک نافذ رہا۔ اور نماز تہجد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر فرض رہی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سورۃ کے پہلے اور دوسرے رکوع کے درمیان بارہ مہینے کا وقفہ ہے۔ اور اس دوران تہجد کی نماز فرض رہی۔ البتہ دوسرا رکوع نازل ہونے پر اس آیت کے ذریعہ فرضیت ختم ہو گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسانی فرما دی مگر امت کے حق میں اس کا استحباب باقی ہے۔ بلکہ تمام نفلی نمازوں میں نماز تہجد کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔

لہ مسلم ص ۲۵۶ / ۱ج

اس امر میں اختلاف ہے۔ کہ آیا قیام لیل کی فرضیت صرف امت کے لیے منسوخ ہوئی ہے یا خود پیغمبر علیہ السلام کے لیے بھی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ فرضیت کا حکم نبی علیہ السلام کے لیے منسوخ نہیں ہوا۔ اور اس پہ وہ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔
وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝
یعنی آپ رات کو قرآن کے ذریعے تہجد ادا کریں کہ یہ آپ کے لیے زاید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پہ قائم فرمائے گا۔ لہٰذا یہ نَافِلَةً لَّكَ حضور علیہ السلام کے لیے تو فرض ہے۔ مگر باقی امت کے لیے مستحب ہے۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ حضور علیہ السلام اس نماز کے اجر و ثواب کی وجہ سے اس کا التزام فرماتے رہے، مگر یہ آپ کے لیے بھی فرض نہیں ہے۔ بہر حال یہ نماز امت کے حق میں استحباب کا درجہ رکھتی ہے۔ اور استحباب بھی ایسا کہ ایک روایت میں حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] رَكْعَتَانِ فِيْ جَوْفِ الَّيْلِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا یعنی رات کے درمیان دو رکعت نماز دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔ اس قدر فضیلت بیان فرمائی ہے۔ مگر فرض نہیں ہے۔

اس کی مثال دوسرے احکام میں ایسی ہی ہے جیسے ابتدا میں عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ پھر بعد میں جب رمضان کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت اٹھ گئی تاہم اس کا استحباب باقی رہا۔ اسی طرح تہجد بھی ابتدا میں فرض تھی۔ مگر ایک سال بعد اس کی فرضیت ختم کر دی گئی۔

قیام لیل کی تصدیق

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ
بے شک آپ کا پروردگار جانتا ہے۔ کہ آپ رات کو دو تہائی حصہ یا نصف حصہ یا ایک تہائی حصہ قیام کرتے ہیں اور نہ صرف آپ خود قیام کرتے ہیں۔ بلکہ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ آپ کے ساتھ جو صحابہ کرامؓ کا گروہ ہے، وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔
ظاہر ہے۔ کہ یہ حکم ابتدا میں سب کے لیے تھا۔ یعنی حضور علیہ السلام کے علاوہ صحابہ کرامؓ بھی

---

[1] کنز العمال ص ۵۵۷ ج ۴

کبھی دو تہائی رات کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے تھے۔ اور یہ قیام اللہ کے ارشاد یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ کی تعمیل میں تھا۔ اور اس کا مقصد تربیتِ صحابہ تھا جس کے اصول بھی اللہ تعالےٰ نے بیان فرمائے جن کی وجہ سے اللہ تعالےٰ تمام دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام رات کی نماز میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ یہی حال صحابہ کرامؓ کا تھا۔ سردی کے موسم میں بعض اوقات پاؤں پھٹ جاتے تھے، اور اُن سے خون رسنے لگتا تھا۔ آپ کی اور آپ کے متبعین کی یہ حالت تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا انقلابی گروہ

شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ[2] میں فرماتے ہیں۔ کہ دنیا میں انقلاب برپا کرنا اکیلے نبی کا کام نہیں۔ اسی لیے آپ کو ارشاد ہوا۔ کہ آپ ایک جماعت منظم کریں، اس کی تربیت کریں اس کو اپنا جارحہ بنائیں۔ تاکہ دنیا میں انقلاب لایا جاسکے۔ چنانچہ "طَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ" وہی گروہ ہے اس گروہ کا ذکر سورۃ فتح میں بھی آیا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ "یعنی محمد اللہ کے برگزیدہ اور آخری رسول ہیں۔ اور جن کو آپ کی معیت نصیب ہوئی ہے، اُن کا خاصہ یہ ہے۔ کہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں (اپنوں کے درمیان) رحمدل۔ آگے اُن کے اور اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہی اصحاب کبار کے متعلق تخفیف کا حکم نازل ہوا۔ کہ بعض اوقات صحابہ کرامؓ اس فکر میں ساری ساری رات بیدار رہتے تھے۔ کہ کہیں دو تہائی یا نصف یا تہائی کے قیام سے محروم نہ رہ جائیں۔ اُس وقت۔ وقت کے اندازے کے لیے گھڑیاں تو ہوتی نہیں تھیں، اس لیے صحابہ کرامؓ فکرمند رہتے تھے۔ تو اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا وَاللّٰہُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ کہ رات دن کا اندازہ کرنا تو اللہ کے پاس ہے۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اتنے لمبے عرصہ کے قیام میں تخفیف کر دی گئی ہے

نماز تہجد میں تخفیف

ارشاد باری تعالےٰ ہوا عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ "یعنی اللہ تعالےٰ جانتا ہے۔ کہ تم اُس کو پورا نہ کر سکو گے، یعنی یہ سخت حکم ہے رات کو اتنا لمبا عرصہ قیام کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے بعد ان وجوہات کا تذکرہ بھی کر دیا جن کی وجہ سے یہ کام مشکل ہے۔ لہذا ارشاد ہوا۔

---

[1] بخاری ص ۱۵۳/۱ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۸/۱ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور

فَتَابَ عَلَیْکُمْ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا ہے تاب کا معنیٰ رجوع کرتا ہے۔ توبہ کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مہربانی کے ساتھ رجوع فرماتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں۔ خطا و لغزش کو معاف فرماتے ہیں۔ یہاں بھی فتاب کا مفہوم یہی ہے۔ کہ قیام میں مہربانی کے ساتھ تخفیف کر دی گئی ہے اب دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات کا قیام ضروری نہیں ہے بلکہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ یعنی جتنا میسّر ہو، تمہارے لیے آسان ہو اتنا ہی قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔

قیام لیل کا اصل مقصد تو تلاوتِ قرآنِ پاک ہی ہے اور اس کی بہترین تلاوت وہ ہے۔ جو نماز میں کی جائے، لہٰذا فرمایا کہ جس قدر ممکن ہو، اسی قدر پڑھ لیا کرو اس سے مراد تربیت دینا ہے۔ جس کے ذریعے اسلام کو ساری دنیا میں پھیلانا ہے۔ اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر، واضح واضح پڑھنا ضروری ہے۔ تاکہ اس کا مفہوم ذہن میں اتر جائے اور اسے آگے دوسروں تک پہنچایا جا سکے۔

قیام لیل شیوہ سلف صالحین ہے

حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے[1]۔ کہ قیام لیل کو اپنے لیے لازم پکڑو، کہ تم سے پہلے نیک لوگوں کی عادت بھی یہی تھی۔ قیام لیل شیطان کو بھگانے گناہوں کو مٹانے اور قربِ خداوندی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور اس کا اصل مقصد بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے۔ اگر تعلق باللہ درست ہو جائے گا تو دنیا میں صحیح کام ہو گا۔ اگر یہی درست نہ ہوا تو ہر کام شیطانی منشار کے مطابق ہو گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔ اور غافل ہرگز نہ ہو جانا۔

شیطانی وسوسہ

ایک روایت میں آتا ہے[2]۔ کہ ایک شخص کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا۔ کہ یہ شخص ساری رات سوتا رہا ہے۔ اور بیدار نہیں ہوا، حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور سورج نکل آیا۔ آپ نے فرمایا، اس شخص کے کان میں شیطان نے پیشاب کیا ہے۔ یعنی اس پر شیطان کا اثر غالب رہا، شیطان ہی وسوسہ اندازی کرتا ہے، اور جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو آخر میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ نماز تہجد اگرچہ فرض نہیں ہے۔ مگر اس کو ترک نہیں کرنا۔ اسے ادا کرتے رہو

---

[1] ترمذی ص ۵۱۰ [2] بخاری ص ۱۵۳ ج ۱ مسلم ص ۲۶۴ ج ۱

خواہ تھوڑا ہی قرآن پاک پڑھو۔

نماز میں مطلق قرأت فرض ہے

فرض نماز ادا کر لینے سے باز پرس نہیں ہوگی۔ مگر قیام لیل ان لوگوں کے لیے جنہوں نے دنیا میں کام کرنا ہے، ایک حد تک لازم قرار دیا۔ مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ کریں۔ اس کو سمجھیں تاکہ پروگرام کو آگے چلانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ جتنا میسر ہو قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔

ارکان صلوٰۃ میں قرآن پاک کا پڑھنا ایک رکن ہے۔ جیسے نماز کے دیگر ارکان ہیں تکبیر تحریمہ، رکوع، سجدہ وغیرہ، اسی طرح قرأت۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کیا کہ نماز میں مطلق قرأت فرض ہے۔ اسی لیے سورۃ فاتحہ نماز کا رکن نہیں ہے بلکہ واجب کے درجے میں ہے۔ خداج والی حدیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اگر سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ناقص ہوگی، باطل نہیں ہوگی۔ یہ بات دوسری روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ مطلق قرأت یعنی کوئی بھی سورۃ یا آیت پڑھنے سے فرضیت ادا ہو جاتی ہے۔

تخفیف کی وجوہات

اس کے بعد وہ وجوہات بیان ہو رہی ہیں۔ جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرأت قرآن میں تخفیف کا حکم دیا۔ فرمایا عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى یعنی اللہ خوب جانتا ہے۔ کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے۔ اگر ہر شخص پر تہجد فرض ہوتی، تو بیمار آدمی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا۔ بیماری انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کے خلاف ہے۔ کہ بیمار آدمی کو کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ وہ تو فرائض بھی مشکل سے ادا کرے گا۔ بعض اوقات فرض نماز بھی بیٹھ کر یا لیٹ کر ادا کرنا پڑتی ہے تو اس حالت میں قیام لیل کیسے ممکن ہوگا۔ لہذا بیماروں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو زمین میں سفر کریں گے وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ تو سفر کی حالت میں بھی دشواری ہے۔ اگر تہجد فرض ہو تو مسافر مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بعض اوقات سفر رات اور دن متواتر جاری رہتا ہے۔ تو اس حالت میں تہجد کیسے ادا کریں گے۔ لہذا اس وجہ سے بھی اللہ نے تخفیف فرمائی۔

اب سفر کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں جیسے فرمایا يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے سفر کریں گے۔ تلاش فضل سے ایک تو مراد رزق حلال ہے۔ رزق حلال

میں تجارت کرنا، ملازمت پر جانا، مزدوری کرنا یہ سب باتیں ظاہری طور پر فضل میں آتی ہیں۔ باطنی طور پر فضل میں حصولِ علم، سفرِ حج و عمرہ یا کسی بزرگ عالمِ دین سے ملاقات کا سفر ہے۔ کہ اس سے باطنی طور پر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے تو فرمایا کہ سفر میں ہونے کی وجہ سے اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتا، لہٰذا تخفیف فرما دی۔

فرضیتِ جہاد

نمازِ تہجد میں تخفیف کی تیسری وجہ یہ بیان فرمائی وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یعنی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ قتال کے لیے نکلیں گے۔ اس حالت میں انہیں تخفیف کی ضرورت ہے۔ قتال میں بھی بڑی مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اور جہاد فرض ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ایک انقلابی دین ہے۔ اس لیے عقائد کی درستگی اور امن و امان کے قیام کے لیے جہاد بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ"۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ "اَلْجِھَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"[1] یعنی جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ کسی عدل کرنے والے کا عدل اور ظلم کرنے والے کا ظلم اسے مٹا نہیں سکتا۔ جہاد کو ترک کرنے سے ذلّت، مصیبت اور غلامی آئے گی، ہر چیز میں خرابی پیدا ہو گی۔ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے جو پہلا خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا، اس میں فرمایا[2] مَا تَرَکَ قَوْمٌ اَلْجِھَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِلَّا ضَرَبَھُمُ اللّٰہُ بِالذُّلِّ یعنی جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دے گی، ذلیل ہو جائے گی۔

جہاد کا موقع تو اس ارشاد کے تقریباً بارہ سال بعد میدانِ بدر میں آیا۔ مگر پہلے ہی اس کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کا وقت آنے والا ہے۔ اس کے بغیر امن قائم نہیں ہو گا۔ حدود قائم نہیں ہو سکیں گی۔ دین کی حفاظت نہیں ہو گی۔ سرکشوں کی سرکوبی کے لیے جہاد کے بغیر چارہ نہیں ہو گا۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے لہٰذا اب لمبا قیام لیل منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور آسانی دے دی گئی ہے۔ فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ لہٰذا قرآن پاک میں سے اتنا ہی پڑھو یعنی اسی قدر قیام کرو، جتنا آسان ہو تاہم اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تربیت کیلئے ضروری ہے۔

---

[1] ابوداؤد ص ۳۴۳ ج ۱ [2] جمع الوسائل شرح الشمائل ص ۲۲۲ ج ۲

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰

ع ۲ / ۱۴

ترجمہ:- اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض اور تم جو بھی نیکی اپنے لیے آگے بھیجو گے ۔ اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے وہ بہتر ہے اور اجر کے اعتبار سے بڑی ہے اور اللہ سے معافی مانگتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے ۝۲۰

گذشتہ سے پیوستہ

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی روایت[1] میں تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ کہ سورۃ مزمل نزول کے اعتبار سے ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی بیس میں سے پہلے رکوع کی اُنیس آیتیں مکی دور کے ابتدائی حصے میں نازل ہوئیں، جب کہ آخری آیت اس کے ایک سال بعد نازل ہوئی۔ ابتدائی آیات میں قیام لیل کا حکم فرض کے طور پہ دیا گیا تھا۔ کہ خود نبی علیہ السلام اور آپ کے صحابہ جو آپ پر ایمان لائے۔ وہ دو تہائی رات یا نصف یا ایک تہائی ضرور قیام اللیل میں گذار دیں۔ مگر اس آخری آیت میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ یعنی اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے۔ کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے، لہٰذا اس عمل میں تخفیف فرما دی۔ اب یہ نماز فرض تو نہیں رہی تاہم اس میں اتنی سہولت دے دی کہ "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" یعنی جتنا میسر آسکے، اتنا ہی پڑھ لیا کرو۔ پانچ دس منٹ، آدھا گھنٹہ آدمی وضو کر کے دو رکعت ہی پڑھ لے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[2] رَكْعَتَانِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ جوف لیل کے اندر ادا کی گئی یہ دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔

نماز پنجگانہ کی فرضیت

نماز تہجد میں تخفیف کے بعد فرمایا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی فرض نماز کو ہر حالت میں

---

[1] مسلم صفحہ ۲۵۶ ج ۱ [2] کنز العمال صفحہ ۵۵ ج ۷

قائم رکھو۔ یہ معاف نہیں ہوگی۔ ابتدائے اسلام میں تین نمازیں فرض تھیں۔ یعنی نماز تہجد اور "قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا" فجر اور عصر کی نمازیں۔ بعد میں نماز تہجد کی فرضیت تو اٹھ گئی، البتہ معراج شریف کے موقع پہ پانچ نمازیں فرض ہوگئیں۔ حضور علیہ السلام[1] نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ یَوْمٍ وَّ لَیْلَةٍ یعنی چوبیس گھنٹے میں یہ پانچ نمازیں ہر مسلمان عاقل، بالغ مرد و زن پہ فرض ہیں۔ انہیں قائم رکھو۔ اقامت کا معنیٰ درست کرنا ہے اور اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ سے مراد نماز کو حتی الامکان درست طریقے سے ادا کرنا ہے۔ کہ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ وقت کی پابندی کرو، طہارت کا خیال رہے۔ اس کے شرائط، واجبات، مستحبات وغیرہ سب کو احسن طریقے سے ادا کرو گے تو اقامت ہوگی۔ سنن ابو داؤد کی روایت[2] میں آتا ہے۔ کہ آدمی نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے۔ مگر اس کا کسی نماز سے صرف دسواں حصہ قبول ہوتا ہے نو حصے لغو ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی نماز کا اس سے زیادہ حصہ قبول ہوتا ہے۔ اور بعض کا اس سے زیادہ۔ حتیٰ کہ فرمایا جس کی آدھی نماز قبول ہو جائے، وہ بڑا عظیم المرتبت انسان ہے۔ نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے کہ اُمُّ الْعِبَادَاتِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَی اللّٰہِ تمام عبادتوں کی جڑ ہے اور اللہ کا قرب دلانے والا عمل ہے۔ لہٰذا یہ فرض نماز کسی بھی حالت میں فوت نہیں ہونی چاہیئے۔ نماز خدا تعالےٰ کی حضوری اور اس کی طرف متوجہ ہونے کی ایک صورت ہے۔ یہ خدا کے غضب اور ناراضگی کو دور کرتی ہے۔ جس طرح مالک سے بھاگا ہوا کوئی غلام خود بخود واپس آکر اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جائے تو مالک کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص نماز میں اللہ تعالےٰ کے حضور آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ نماز ایک ایسی عبادت ہے۔ جو کہ ہر ایک مسلمان پر فرض کی گئی ہے باقی عبادات مثلاً زکوٰۃ اور حج صرف مالداروں پہ فرض ہے۔ ناداروں پہ نہیں۔ اسی طرح بیمار اور اندھے پر جہاد فرض نہیں ہے۔ "لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ"

زکوٰۃ کی فرضیت

اس کے بعد وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرو۔ اگر صاحب مال ہو، صاحب نصاب ہو

---

[1] ابو داؤد صـ۵۶ج۱ مسلم صـ۹۱ج۱ [2] ابو داؤد صـ۱۱۵ج۱

سال گزر گیا ہے۔ تو زکوٰۃ فوراً ادا کرو۔ یہ مالی فریضہ ہے۔ نماز بدنی فریضہ تھا، زکوٰۃ مالی فریضہ ہے
زکوٰۃ بھی مکی دور میں فرض ہو گئی تھی مگر اس کا نصاب اور مقدار مقرر نہیں کی گئی تھی، ہجرت
کے دوسرے سال زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ متعین ہوا۔ اس سے پہلے صرف یہی حکم تھا۔ کہ اپنے مال
کا کچھ حصہ محتاجوں کی اعانت کے لیے خرچ کرو۔ نصاب زکوٰۃ ساڑھے باون تولے چاندی یا
بیس مثقال سونا مقرر ہوا ـــــــــــ مقدارِ زکوٰۃ کے طور پر سونے
اور چاندی کا چالیسواں حصہ، مویشیوں کا نصاب الگ مقرر ہوا۔ اونٹوں کا نصاب پانچ،
گائے بھینس کا تیس اور بکریوں کا چالیس ـــــــــــ
ـــــــــــ زمین کی پیداوار میں سے عشر یعنی دسواں حصہ اور اگر
زمین میں کان نکل آئے تو پانچواں حصہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

نماز کی برکات

نماز کے متعلق فرمایا کہ یہ تعلق باللہ کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ پاکیزگی طہارت، اتفاق و اتحاد
فکر کی یکسانیت، انسانی ہمدردی، وقت کی پابندی یہ ہیں وہ دنیوی فوائد جو نماز سے حاصل ہوتے
ہیں۔ نماز نہ پڑھنے والے طہارت تک سے محروم ہوتے ہیں۔ کتنی بڑی سعادت ہے جو ان کو نصیب
نہیں ہوتی۔ جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔ وہ اتحادِ فکر سے محروم ہوتے ہیں۔ صف بندی اتحادِ
فکر کا ایک بڑا نمونہ ہے۔ نماز ایک عظیم نعمت ہے۔ خدا تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اس میں مناجات ہے
تعظیم الٰہی ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ نماز پابندی سے ادا کرو زکوٰۃ
ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔ یہ دونوں چیزیں فرائض میں داخل ہیں۔

قرضِ حسن

اس کے بعد فرمایا وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی اللہ کو قرض دو، اچھا قرض۔ یہاں
قرض سے مراد قرضِ حسن بھی ہے۔ اور مطلقاً صدقہ خیرات بھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ جو مال اللہ کی رضا کے
لیے غرباء و مساکین پر خرچ کیا جائے وہ قرضِ حسن ہے، قرضِ حسن دینے والے کو پورا اعتماد ہوتا ہے۔
کہ یہ مجھے واپس مل جائے گا۔ یعنی جب مقروض اپنی ضرورت پوری کرے گا۔ تو قرض کی رقم
واپس لوٹا دے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو جو قرض یعنی صدقہ خیرات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔
اس کا اجر و ثواب بھی اللہ کے ہاں ضرور ملے گا۔ اسی لیے فرمایا مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا

۱؎ بقرہ آیت ۲۴۵

حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً" یعنی جو اللہ کو قرض حسن دے گا، وہ اس کا دگن چوگنا واپس لوٹائے گا۔

قرض سے مراد وہ قرض بھی ہے۔ جو ایک شخص دوسرے کو دیتا ہے تاکہ وہ اپنی ضرورت پورا کرنے کے بعد قرض کی رقم واپس کر دے۔ یہ قرض جو بغیر کسی مفاد کے دیا جائے، وہ قرض حسن کہلاتا ہے۔ آج کل تو سودی کاروبار کا زمانہ ہے۔ قرض حسن کی رسم مٹ چکی ہے۔ کوئی شخص قرض حسن دینے کے لیے تیار نہیں۔ مال سے مفاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ مال خرچ کرنے والا یا تو اس سے دنیوی مفاد حاصل کرتا ہے یا اخروی۔ جو شخص صدقہ خیرات کرے گا، اُس کا مقصد اُخروی مفاد حاصل کرنا ہو گا۔ اگر وہ رقم منافع پر دے گا تو اس سے دنیوی مفاد حاصل کرے گا۔ قرض حسن میں دنیوی مفاد کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ یہ حرام ہے كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ حَرَامٌ یعنی ہر قرض جو نفع کھینچ کر لائے وہ حرام ہے[1]۔

امام اعظمؒ کا تقویٰ

امام ابو حنیفہؒ کے متعلق منقول ہے[2]۔ کہ آپ جس آدمی کو قرض دیتے تھے، اُس کی دیوار کے سائے میں بھی نہیں بیٹھتے تھے، کہیں یہ بھی مفاد میں نہ آجائے۔ آپ بہت بڑے سخی، صوفی اور بزرگ امام تھے۔ اور بہت بڑے تاجر بھی تھے۔ آپ نے اپنی تجارت کے ذریعے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچایا اہل علم کی ایسی خدمت کرتے تھے، جس کی نظیر نہیں ملتی حصول علم کے لیے طلباء کی مالی امداد کرتے تھے مگر کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتے تھے۔ نیکی کے کاموں میں بے پناہ خرچ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو مال بھی وافر دیتا تھا۔ امین ایسے تھے کہ آپ کے پاس بے شمار امانتیں جمع رہتی تھیں وفات کے وقت تقریباً پانچ کروڑ درہم کی امانتیں امام صاحب کے پاس موجود تھیں[3]۔ ہر چیز پر متعلقہ آدمی کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ وصیت میں لکھا تھا۔ کہ یہ امانتیں امانت داروں تک پہنچا دی جائیں۔

الغرض قرض حسن کے معاملہ میں امام صاحب اس قدر محتاط تھے۔ کہ مقروض کی دیوار کے سائے میں بھی نہیں بیٹھتے تھے۔ کیونکہ قرض دیکر اس سے مفاد حاصل کرنا روا نہیں۔

قرض حسن کا دوہرا اجر

بعض روایات میں آتا ہے[4]۔ کہ حضور علیہ السلام نے معراج کے موقع پر دیکھا کہ بہشت کے

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ ج۲ مخطوطہ ۲
[2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۰۵ پارہ ۲۹
[3] امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی صفحہ ۹۱ بحوالہ موفق

ایک دروازے پر لکھا تھا۔ کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لیے ایک درہم صدقہ کرے گا، اُس کو کم از کم دس درہم کا اجر ملے گا۔ اور جو کوئی ایک درہم قرض حسن دیگا، اُس کو اٹھارہ درہم کا اجر ملے گا۔ یہ بڑی حیران کُن بات تھی۔ حضور علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے اس کی وجہ دریافت کی کہ صدقہ کے مقابلہ میں قرض حسن دینے والے کا اجر کیسے بڑھ گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ صدقہ خیرات کا معاملہ یہ ہے۔ کہ یہ کبھی مستحق کو پہنچتا ہے۔ اور کبھی غیر مستحق بھی لے جاتے ہیں۔ مگر قرض ایک ایسی چیز ہے جو صرف مستحق ہی حاصل کرتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو، وہ قرض حاصل نہیں کرتا۔ تو قرض کا اجر دوہرا ہوتا ہے۔ ایک درہم جو قرض میں دیا تھا، جب وہ واپس لے لیا تو باقی نو درہم کا اجر باقی رہا جو دگنا ہو کر اٹھارہ درہم بن گیا۔ اسی لیے فرمایا وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔

قرض کے لین دین میں مشکلات

اِس زمانے میں قرض کے لین دین میں بھی سخت مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اب خلوص و خیر خواہی کا فقدان ہے۔ ذہنیت سود خوری والی عام ہوگئی ہے۔ اسی طرح قرض لینے والے بھی نیک نیت نہیں ہے۔ قرض لے کر واپس نہیں کرتے۔ یہ بھی بڑا ظلم ہے مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ وَلِیِّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ عِرْضَہٗ جب ضرورت پوری ہوگئی ہے۔ تو قرض کی رقم واپس کرنی چاہیئے۔ قرض دینے والوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ قرض دے کر کوئی مفاد حاصل کیا جائے۔ سود یا منافع لیا جائے۔ یہ خود غرضانہ ذہنیت کی غمازی ہے۔

سود قطعی حرام ہے

جب سے یہودیوں کا ایجاد کردہ بنکاری کا سسٹم جاری ہوا ہے "زر زر راحی کشد" والا معاملہ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی بڑی بڑی رقمیں بنک میں جمع ہیں۔ رقم محفوظ رہتی ہے۔ اور اس پر سال بہ سال سود ملتا رہتا ہے۔ بس سود کھاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کا واضح ارشاد ہے اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یعنی اللہ نے تجارت حلال کی ہے اور سود قطعی حرام قرار دیا ہے جو سود کو حلال سمجھ کر کھاتا ہے۔ وہ دائرہ اسلام ہی سے خارج ہو جاتا ہے، اور جو اسے حرام سمجھ کر کھاتا ہے۔ وہ گنہگار ہے۔ اُسے توبہ کرنی چاہیئے۔ اور آئندہ کے لیے باز آجانا چاہیئے۔ کسی مسلمان کے لیے سود کھانا روا نہیں۔ اگر کہیں سے سود کی رقم مِل ہی جائے تو یہ سمجھ کر کسی غریب آدمی کو دے دے کہ اس سے کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ اس سے ایسی توقع رکھنے سے بھی کفر میں داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ اس کو یوں سمجھے

۱؎ ترمذی صـ۳۲۸، نسائی صـ$\frac{۲۳۰}{۲}$ ۲؎ نسائی صـ$\frac{۲۳۱}{۲}$، ابن ماجہ صـ۱۷۵

کہ ایک نجاست تھی جو کپڑے یا بدن کو لگ گئی اور اُسے کسی محتاج کو دیکر نجاست کو دور کر لیا۔

تو فرمایا یہ تین چیزیں ہیں۔ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو، قرضِ حسن دو۔ جب محتاج کی ضرورت پوری ہو جائے تو قرض کی رقم واپس لے لو۔ اس میں تمہارے لیے ڈبل اجر و ثواب ہے۔ قرضِ حسن میں یہ بات خاص طور پہ ملحوظ رہے۔ کہ نہ تو مقروض پہ احسان جتلائے اور نہ سختی سے تقاضا کرے۔ اگر مقروض مہلت طلب کرے تو مہلت دے دے۔ یہ تمام لوازمات قرضِ حسن میں آتے ہیں۔

نیکی کا اجرِ عظیم

قانون یہ ہے وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تم جو بھی نیکی آگے بھیجتے ہو، خواہ وہ قیام لیل ہو، ذکر ہو، تسبیح ہو، مراقبہ ہو، صدقہ خیرات ہو، نماز ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو، کوئی بھی نیکی ہو۔ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ تم اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے۔ هُوَ خَيْرًا وہ بہتر ہے۔ تَجِدُوهُ مفعول اوّل ہے۔ اور خیراً مفعول ثانی۔ ھُوَ تاکید ہے یا بدل۔ اور بعض نے اس کی قرأت هُوَ خَيْرًا وَّ اَحْسَنَ اَجْرًا بھی کی ہے۔ مبتدا خبر بھی بنایا گیا ہے۔ پاؤگے اس کو اللہ کے پاس هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا یہ بہتر ہے۔ اور اجر کے اعتبار سے بڑی ہے۔ یعنی اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ انسان جو بھی بھلائی کا کام کرتا ہے۔ وہ محفوظ رہتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی تمام شرائط پوری ہوں۔ انسان عالم آخرت میں اسے پالے گا۔

استغفار کی برکات

اللہ تعالٰی نے چوتھا قانون یہ فرمایا وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اللہ تعالٰی سے بخشش اور معافی مانگتے رہو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، قرض حسن دو، ان میں استغفار بھی ہے۔ کثرت سے استغفار کرو۔ نیکی کرنے کے بعد بھی بخشش طلب کرو۔ نماز کے بعد حضور علیہ السلام نے تین دفعہ استغفار کرنے کی تعلیم دی[1]۔ انسان جو بھی نیکی کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی خامی رہ جانے کا امکان ہے۔ کوتاہیاں رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا استغفار کیا کرو تاکہ کوتاہیاں اور تقصیریں معاف ہوں۔ استغفار تسبیح سے بھی مقدم ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کشف المحجوب[2] والوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی شخص نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہ میں تسبیح یعنی سبحان اللہ، الحمد للہ کا وظیفہ زیادہ کروں یا استغفار کا۔ انہوں نے کہا استغفار زیادہ کیا کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے صابن کی۔ جس طرح صابن کپڑے کی میل کچیل دور کرتا ہے۔ اسی طرح استغفار دل کی میل کچیل دور کرتا ہے۔ اور سبحان اللہ الحمد للہ کی مثال تو خوشبو

---

[1] ترمذی صفحہ ۔۔

کی ہے۔ اگر کپڑا پاک صاف ہے تو تھوڑی سی خوشبو بھی کارآمد ہوگی۔ اور اگر کپڑا ہی گندا ہے۔ تو خوشبو لگانے سے اُس کی بدبو میں اضافہ ہوگا۔ اسی لئے حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ رَبِّ اغْفِرْ ذَنْبِ عَلَیَّ اے اللہ مجھے معاف کر دے۔ یا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ میں اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔ اور پھر سید الاستغفار بھی ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ یہ اتنا کارگر وظیفہ ہے کہ فرمایا[2] اگر کسی کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا، استغفار کے جتنے بھی کلمات ہیں، کہتے رہنا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ دل کی توجہ بھی ہونی چاہیئے۔ کہ اے مولا کریم! مجھ سے کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ انہیں اپنی مہربانی سے ڈھانپ لے۔ غفر کر دے۔ غفر کا معنی معاف کر دینا۔ ڈھانپ دینا ہے۔ لہٰذا استغفار کثرت سے کیا کرو۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے[3] کہ استغفار تنقیہ ہے۔ اگر آدمی تنقیہ کرتا ہے۔ تو اس کے بدن میں فضلات نہیں رہیں گے اور وہ صحت مند ہوگا۔ بالکل اسی طرح کہ اگر جسم میں خون، بلغم، خوراک کے فضلات جمع رہیں گے، قبض رہے گی اور آدمی بیمار رہوگا۔ اگر اس کی تنقیہ ہوتی رہے تو صحت بحال رہے گی۔ اسی طرح استغفار کے ذریعے سے انسان کی غلطیوں کی تنقیہ ہوتی رہے گی اور اس کی روحانی صحت قائم رہے گی۔

تو فرمایا اللہ سے بخشش طلب کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ معافی مانگتا ہے۔ التجا کرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔

---

[1] ابی داؤد صہ ۲۱۲ ج ۱ [2] ترمذی صہ ۴۸۹ [3] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۲۹ صہ ۲۰۶

سورۃ المدثر

(مکّی)

درس اوّل ۱ (آیت ۱ تا ۴)

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ مدثر مکی ہے اور یہ چھپن آیتیں ہیں اور اس سورت میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④

اے لحاف اوڑھنے والے ① آپ اٹھ کھڑے ہوں اور مخلوق کو ڈرائیں ② اور اپنے رب کی بڑائی بیان کریں ③ اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھیں ④

کوائف سورۃ اس سورۃ کا نام سورۃ المدثر ہے۔ پہلی آیت میں مدثر کا لفظ مذکور ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی چھپن ۵۶ آیات اور دو سو چھپن الفاظ ہیں۔ یہ سورۃ ایک ہزار دس ۱۰۱۰ حروف پر مشتمل ہے۔

زمانہ نزول مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ مدثر نازل ہوئی مگر صحیح بات یہ ہے۔ جیسا کہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر اتقان[1] میں اور بعض دوسرے مفسرین نے بھی بیان کیا ہے کہ سورۃ علق کی ابتدائی آیتوں کے بعد متصلاً سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا گیا۔ اس کے بعد سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نازل ہوا۔ اور بعض فرماتے ہیں[2] کہ سورۃ ق

۱؎ روح المعانی صـ ۱۱۵ / ج ۲۹، تفسیر اتقان صـ ۲۴ / ج ۱، تفسیر مظہری صـ ۱۲۳ / ج ۱۰

۲؎ ~~روح المعانی صـ ۱۲۸ / ج ۲۹~~ - تفسیر طبری صـ ۲۵۲، ۲۵۳ / ج ۳۰

نازل ہوئی، اور درمیان میں کچھ عرصہ تک وحی منقطع رہی۔ اس عرصہ کو فترتِ وحی کا زمانہ کہا جاتا ہے جس کی مقدار تین سال تک بتائی جاتی ہے۔ اس دوران میں نبی علیہ السلام کو وحی کے انقطاع کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ آپ اس کے لیے بہت زیادہ مشتاق تھے۔ لہٰذا آپ غارِ حرا میں ایک مہینہ تک اعتکاف بیٹھے تھے۔ اُسی غارِ حرا میں جسے آج کل جبل نور کہتے ہیں۔ اور جہاں آپ نبوت ملنے سے پہلے اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ آپ کا رُخ اندرِ غار کعبہ کی طرف ہوتا تھا۔ اسی حالت میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی فَجَاءَ الْحَقُّ وَهُوَ فِي الْحَرَا یعنی حضور علیہ السلام کے پاس حق آ گیا اور آپ غارِ حرا میں تھے۔ نبوت ملنے کے بعد فترتِ وحی کے زمانہ میں آپ ایک دفعہ پھر غارِ حرا کی طرف متوجہ ہوئے اور توشہ وغیرہ لے کر مہینہ بھر کے لیے اعتکاف کیا۔

وجہ تسمیہ

اس اعتکاف کے بعد جب آپ پہاڑ سے نیچے اُترے تو آپ نے ایک آواز سُنی۔ آپ کو یہ آواز اُسی فرشتے کی معلوم ہوئی جو پہلی دفعہ وحی لایا تھا آپ نے دائیں بائیں دیکھا، مگر کچھ نظر نہ آیا، وہی آواز جب دوبارہ آئی تو آپ نے نگاہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، تو فرشتہ زمین و آسمان کے درمیان فضا میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور ساری فضا اُس سے پُر تھی۔ اُسے دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دہشت کی کیفیت سی طاری ہوئی۔ آپ گھر تشریف لائے اور گھر والوں سے فرمایا دَثِّرُونِي[1] مجھ پر کپڑا ڈال دو، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ دثار موٹے کپڑے یا کمبل کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق لحاف پر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ ہر اُس کپڑے پر ہوتا ہے۔ جو اوپر اوڑھا جاتا ہے۔ جو کپڑا جسم کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے اُسے شِعار کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتا ہے[2] جس میں فرمایا اَلْاَنْصَارُ شِعَارٌ وَّالنَّاسُ دِثَارٌ یعنی عام لوگ دثار (بیرونی کپڑے) کی مانند ہیں اور انصارِ مدینہ شعار (اندرونی کپڑے) کی طرح ہیں۔ مدینہ کے لوگوں کو اسلام کے ساتھ ایسا ہی قریبی تعلق ہے۔ جیسا اندرونی کپڑے کو جسم کے ساتھ۔ چنانچہ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اسی لفظ دثار سے مدثر ہے۔ یعنی کمبل اوڑھنے والے اور اسی لفظ کو سورۃ کا عنوان بنایا گیا ہے۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ مدثر، تدثیر کا معنی ہلاک کرنا بھی ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[1] روح المعانی ج ۲۹ ص ۱۱۵ مظہری ج ۱۰ ص ۱۲۳ [2] کنز العمال ج ۱۳ ص ۴

نے فرمایا[1] میرے بہت سے نام ہیں۔ میں محمد بھی ہوں۔ احمد بھی ہوں۔ میں مقفّی بھی ہوں، سب سے پیچھے آنے والا، عاقب کا معنیٰ آخر میں آنے والا۔ اور میں حاشر ہوں اَلَّذِیْ یُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی قَدَمِیْ" لوگ میرے قدموں میں اکٹھے کئے جائیں گے یعنی دنیا میں مختلف قومیں اور آخرت میں سارے لوگ۔ فرمایا اَنَا الْمَاحِیْ" میں ماحی بھی ہوں یعنی مٹانے والا، مہلک اَلَّذِیْ یَمْحُ اللّٰہُ بِیَ الْکُفْرَ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹا دے گا۔ تو گویا آپ کا لقب کفر کو مٹانے والا بھی ہے۔ مدثر کا بھی یہی معنیٰ ہے۔ یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا، مدثر کا پہلا معنیٰ کمبل یا لحاف اوڑھنے والا اور دوسرا معنیٰ کفر و شرک کو مٹانے والا ہے۔ تو فرمایا یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ، قُمْ فَاَنْذِرْ اے لحاف اوڑھنے والے یا کفر و شرک کو مٹانے والے آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور مخلوق خدا کو ڈرائیں۔

پہلی منزل ذاتی تکمیل

مفسرین کرام اس سورۃ کی تطبیق سابقہ سورۃ مزمل کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ وہاں ارشاد تھا یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور مزمل کے بھی دو معنیٰ ہیں۔ ایک شَمَّلَ کمبل اوڑھنے والے اور دوسرا ساتھی اکٹھا کرنے والے۔ وہاں یہ دونوں معنیٰ درست ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں یہی حکم تھا۔ کہ پہلے ساتھی اپنے ساتھ ملائیں تاکہ اس پروگرام کو آگے بڑھایا جاسکے۔ غیر محدود لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنا اکیلے نبی کا کام نہیں، بلکہ ساتھ جماعت بھی درکار ہے، لہٰذا جماعت کا تذکرہ ہوا، اور تربیت کا پروگرام وضع ہوا۔ کہ قُمِ الَّیْلَ "آپ خود بھی رات کو قیام کریں" وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ" اور ایک گروہ بھی جو آپ کے ساتھ ہے۔ قیام لیل کا سب سے بڑا مقصد قرآن پاک میں غور و فکر کرنا ہے۔ "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا" اور قرآن کو ترتیل سے پڑھیں، پروگرام سمجھ میں آجائے گا۔ یہ ضروری ہے۔ کیونکہ آگے دنیا میں انقلاب برپا کرنا ہے۔

تو گویا پہلی منزل ذاتی کمال کی ہے، تربیت کی ہے۔ اسی لیے پہلی سورۃ میں فرمایا کہ آپ رات کو کھڑے ہوں، اس سے تہذیب نفس حاصل ہوگی، کمال حاصل ہوگا، روحانیت حاصل ہوگی۔ اور تعلق باللہ مضبوط ہوگا۔ جس کی ضرورت ہے۔ اور جس کے بغیر کوئی حالت درست نہیں ہوسکتی۔ تو فرمایا پہلے آپ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تکمیل کے لیے قیام لیل کریں۔ جب ذاتی تکمیل کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔ تو

---

[1] مسلم ص ۲۶۱/۲ بخاری ص ۵۰۱/۱

دوسروں کی تکمیل کا موقع آئے گا۔ کیونکہ دوسروں کو کامل بنانے کے لیے پہلے خود کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں جو یہ فرمایا ہے "هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" یعنی ہم نے انسان کو دو اونچے راستے دکھلائے یا دو گھاٹیوں کی طرف راہنمائی کی، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان خود اپنی ذات میں کامل ہو اور کمال حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا رات کا کچھ حصہ قیام کرو "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا" اور قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھو۔ اس کے بعد فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ اپنے رب کے نام کو یاد کرو، کیونکہ یہ تعلق باللہ اور کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ "وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا" اور یہ تعلق تنہائی میں پیدا ہونا زیادہ آسان ہے۔ اللہ کے ساتھ تنہائی میں تعلق جوڑو۔ اور اسی کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرو۔ اس کے بعد فرمایا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا" یعنی خدا کو ہی کارساز بناؤ، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ عقیدے کو مضبوطی سے پکڑو۔ اور کسی چیز پر بھروسہ نہ کرو۔ مادی اسباب ایک درجے تک استعمال کرو۔ تاثیر اللہ نے پیدا کرنی ہے۔ چاہے تو تاثیر پیدا کردے، چاہے تو نہ کرے۔ یہ تمام باتیں ذاتی تکمیل کی تربیت کے لیے ہیں۔ اس کے بعد جب مخالفین سے مقابلہ ہوگا تو وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ جو وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کرو، اپنے اندر برداشت پیدا کرو۔ ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلو، مگر اچھے طریقے سے۔ یہ سب تربیت کے اصول ہیں، جو ذاتی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

قول و فعل میں مطابقت

جب ان اصولوں پر کسی جماعت کی تکمیل ہوجائے گی تو پھر دوسرا پروگرام شروع ہوگا۔ جس کا مقصد دوسروں کی تکمیل ہے۔ سورۃ مزمل میں ذاتی تکمیل کا پروگرام تھا۔ اس سورۃ میں دوسروں کی تکمیل ہے۔ وہاں بھی لفظ قُمْ سے ابتدا کی گئی، اور یہاں بھی قُمْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں پر حکم تھا کہ رات کو قیام کریں اور اس میں قرآن پاک تلاوت کریں۔ اب جب کہ قرآن پڑھ لیا، سمجھ لیا، روحانیت میں کمال حاصل کرلیا تو اس سورۃ میں فرمایا قُمْ فَاَنْذِرْ کہ آپ اٹھ کھڑے ہوں اور ذاتی تکمیل کے بعد دوسروں کی تکمیل کا ذمہ اٹھائیں، مخلوقِ خدا کو ان کے انجام سے ڈرائیں۔ گویا دوسروں کو راہِ راست کی دعوت دینے سے پہلے ذاتی تکمیل ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہوگا۔ تو قول و فعل میں تضاد واقع ہوگا۔ اور یہ کسی صورت میں مستحسن نہیں ہے۔

اسی تضاد کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی مذمت فرمائی۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ پہلے خود نیکی کرو، پھر دوسروں کو تلقین کرو، تو اس کا اثر ہوگا۔ اگر خود عمل نہیں کرو گے تو تمہاری بات رائیگاں جائے گی۔ تمہاری نصیحت بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ اسی لیے بزرگان دین فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا اور محض دوسروں کو نصیحت کرتا ہے۔ اس میں کماحقہٗ کامیابی نہیں ہوتی اگرچہ محض اچھی بات کہنے کو بھی ایک درجے تک اچھا مان لینا چاہیے۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ جو خود عمل نہیں کرتا، صرف اچھی بات کہہ دیتا ہے۔ وہ بھی کسی حد تک قابل قبول ہے۔ مگر اس میں کمال نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا اُس کی نصیحت اسی طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ جس طرح چٹان پر پڑی ہوئی مٹی بارش سے اُتر جاتی ہے۔ اور وہاں کوئی فصل نہیں ہو سکتی۔

انبالے والے سائیں توکل شاہؒ مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ نیک اور صالح مرد تھے۔ کسی حد تک مجذوب بھی تھے۔ ایک عورت بچے کو آپ کے پاس لائی کہ حضرت! یہ گڑ بہت کھاتا ہے اسے دم کر دیں۔ اس کے دانت خراب ہو گئے۔ مگر یہ گڑ کھانے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے فرمایا، اس بچے کو کل میرے پاس لانا، دم کروں گا۔ وہ عورت چلی گئی تو شاگردوں نے پوچھا کہ کیا بات تھی آپ نے اُس عورت کو کل آنے کو کہا۔ فرمایا، آج تو میں نے خود گڑ کھایا ہوا تھا، بچے کو دم کیسے کرتا۔ تو گویا یہ اُن کے کمال کا معیار تھا۔ کہ جو کام خود کیا ہے۔ اُس سے دوسرے کو کیسے منع کروں۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کامل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود اُن کی تربیت فرماتا ہے۔ اُن کی تربیت نبوت سے پہلے بھی کمال درجے کی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مکروہات اور بری باتوں سے بچاتا ہے۔ انہیں مکمل گارنٹی حاصل ہوتی ہے۔ وہ بذاتہٖ کامل ہوتے ہیں کیونکہ انہیں دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بننا ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں۔

دوسری منزل
اصلاحِ عالم

ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے یٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ اے لحاف اوڑھنے والے یا کفر و شرک کو مٹانے والے قُمْ فَاَنْذِرْ آپ اٹھ کھڑے ہوں اور مخلوق خدا کو اُنکے مستقبل کے بُرے انجام سے ڈرائیں۔ ہر نبی منذر یعنی ڈرانے والا ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ یعنی رسول خوشخبری

بھی سناتے ہیں اور ڈراتے بھی ہیں۔ جس زمانے میں یہ سورۃ نازل ہوئی، اُس زمانے میں کفر و شرک کی بہتات تھی، لہٰذا موقع کی مناسبت سے انذار کا حکم دیا۔ کہ ساری دنیا بُرائی سے پُر ہے انہیں برائی کے انجام سے ڈرائیں۔ ہاں جب نیکی کا دور دورہ ہوگا، تو انہیں بشارت بھی سنائی جائے گی۔ "بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" یعنی جو لوگ ایمان قبول کر چکے ہیں توحید کو مان چکے ہیں۔ نیکی کے کام انجام دیتے ہیں، اُن کو بشارت بھی سنائیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ سورۃ مزمل میں قیام لیل کے آداب ہیں اور سورۃ مدثر میں قیام نہار کے آداب ہیں۔ یعنی رات کو قیام لیل کے ذریعے تعلق باللہ کو مضبوط کریں۔ اور دن کی روشنی میں مخلوق خدا کو ڈرائیں۔ کہ اصلاح عالم کے لیے ضروری ہے۔

رب کی بڑائی

اس کے بعد فرمایا وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ یعنی اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے۔ کہ کوئی بادشاہوں کی تعریف کرتا ہے، کوئی شہنشاہوں کی اور کوئی سرمایہ داروں کی۔ کوئی کسی ڈکٹیٹر کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور کوئی اپنی قوم کی بڑائی بیان کر رہا ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ وہی بڑا ہے اَللّٰهُ اَكْبَرُ چنانچہ نماز جس میں اِخبات اور طہارت دونوں عناصر شامل ہیں، اُس کی ابتدا اَللّٰهُ اَكْبَرُ سے ہی ہوتی ہے۔ یہ تکبیر تحریمہ فرض ہے۔ اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ یہ نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى"۔ حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ كَبِيْرٌ، اَللّٰهُ الْكَبِيْرُ یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وغیرہ (اللہ کے ناموں) ان میں سے کوئی بھی لفظ کہہ سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایسا لفظ ہونا چاہیئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی پر دلالت کرتا ہو۔ اس سے آدمی نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ کہ صرف اَللّٰهُ اَكْبَرُ ہی کہہ سکتے ہیں اور کسی لفظ کی اجازت نہیں دیتے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر کے علاوہ اَللّٰهُ الْكَبِيْرُ یا اَللّٰهُ اَكْبَرُ

لہ جامع صغیر ص۱۴ ہدایہ اولین ص۱۰۱

کہہ سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

الغرض آپ کو حکم ہوا۔ کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ کسی شہنشاہ، سرمایہ دار یا خاندان یا قبیلے کی بڑائی بیان نہ کریں۔ بلکہ خدا تعالےٰ ہی بڑا ہے۔ "وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" ارض و سما میں بڑائی کے لائق صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ البتہ نبی کی تعظیم ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ نبی کی تعظیم رسالت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کسی بادشاہ، استاد، ماں باپ کی تعظیم ہوگی، تو اللہ تعالےٰ کے حکم کے مطابق ہوگی، کہ اس نے تعظیم کا حکم دیا ہے۔ ان کو بھی چاہیئے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری کریں۔ اگر حاکم خدا کا فرمانبردار ہو، تو فرمایا اس کی اطاعت کرو۔ اگر نافرمان ہے۔ اس کی اطاعت مت کرو۔ کیونکہ[1] لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ یعنی اگر کوئی امیر خدا کی نافرمانی کا حکم دے، تو مت مانو۔ انکار کر دو، کیونکہ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ اس لیے یہ بات قانون کے طور پہ بتا دی، کہ خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرو یہی اِخبات ہے۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ کہ بڑائی کا مالک وہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کی بڑائی بذاتہٖ نہیں۔ اگر حکم خداوند کے تابع ہوگا، تو احترام کیا جائے گا۔ ورنہ نہیں تو گویا اِخبات یعنی خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا پہلا خلق ہے۔

لباس کی پاکیزگی

دوسرا خلق لباس کی پاکیزگی ہے۔ فرمایا وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یعنی اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔ لباس کی پاکیزگی بدن کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اور بدن کی پاکیزگی ماحول کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اسی طرح ظاہری پاکیزگی باطنی پاکیزگی کی خواہش مند ہوتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پاکیزگی کی ضرورت ہر مقام پہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرماتے ہیں[2]۔ کہ باطن کو پاک کرو۔ اگر باطن میں شرک یا کوئی شائبہ، نفاق، الحاد، شک، تردد یا بدعقیدگی کا ہوگا تو بدن ناپاک ہوگا۔ اسی لیے مشرکوں کے متعلق فرمایا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ "اور منافقوں کے متعلق فرمایا اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ" یعنی وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ لوگ ظاہر میں اگر نہ بھی پلید ہوں مگر باطن میں پلید ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ اپنے باطن کو کفر و شرک سے پاک کرو۔ اپنے دل کو نور

---

[1] مشکوٰۃ ص۳۲۱ بحوالہ شرح السنۃ [2] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۲۹ ص۲۱۱

ایمان و توحید سے منور کرو، تو ظاہر میں بھی پاکیزگی آ جائے گی۔

ماحول کی پاکیزگی

جس طرح لباس اور بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح مکان کی طہارت بھی لازمی ہے گندی جگہ پہ نماز بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مکان کو صاف رکھو، اس کے بعد گلیوں کو صاف رکھو، ورنہ گندگی پھیلے گی، اپنے شہر کو صاف رکھو، میونسپلٹی کو صاف رکھو کہ بیماری نہ پھیلنے پائے۔ پھر آگے بڑھ کر اسمبلی کو صاف رکھو تاکہ گندے اور غلیظ آدمی وہاں نہ جا سکیں۔ وہاں اچھے لوگوں کو بھیجو جن کا ظاہر اور باطن پاک ہو نجس لوگ اسمبلیوں میں جائیں گے تو گندگی پھیلائیں گے۔ ملک کو پاک رکھنے کا مطلب یہی ہے۔ کہ اس کے قانون ساز اداروں میں اچھے لوگ جائیں جو ایسے قانون وضع کریں جن کی وجہ سے ملک سے غلاظت دور ہو۔ برائی، عیاشی اور فحاشی سے طہارت حاصل ہو۔ اگر ایک ملک میں پاکیزگی کا دور دورہ ہوگا۔ تو اس کے اثرات دوسرے ملکوں تک بھی پہنچیں گے۔

خوراک کی پاکیزگی

اسی طرح ہر شخص کے لیے خوراک کی پاکیزگی بھی ضروری ہے اگر لباس اور بدن تو صاف ہو مگر کھانا حرام کمائی کا ہو یعنی رشوت، دھوکے فریب، ناجائز تجارت کا ہو، تو طہارت نہیں ہو گی۔ لہٰذا اپنی غذا کو پاک بنانا بھی ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] مَنْ نَبَتَ لَحْمُهٗ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ یعنی جس شخص کا گوشت حرام مال سے پلے گا، وہ دوزخ میں جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ لہٰذا لباس کے ساتھ ساتھ خوراک کی طہارت بھی ضروری ہے۔

علیٰ ہذا القیاس خیالات کی پاکیزگی، ریاست کی پاکیزگی، مذہب کی پاکیزگی بھی لازمی ہے طہارت کا مطلب صرف استنجاء اور وضو کر لینا نہیں یا کپڑے دھو لینا اور نہا لینا نہیں، بلکہ طہارت اپنے وسیع تر معنوں میں ہر جگہ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ" اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے۔ نجس آدمی پاکیزہ مقام میں بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں پہ پاک ہو کر پاک لوگ ہی جائیں گے۔

بہر حال وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ میں طہارت کا اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ طہارت کس طرح اختیار کرنی چاہیئے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے اظہار کی تعلیم دی۔ اور فرمایا کہ بڑائی صرف اللہ ہی کی بیان کرو، اُسی کے سامنے عاجزی اختیار کرو اور طہارت حاصل کرو۔

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۲۴۶ بحوالہ بیہقی

درس دوم (آیت ۵ تا ۱۰)

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝۸ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝۹ عَلَى الْكٰفِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝۱۰

ترجمہ :- اور گندگی سے دور رہیں ۝۵ اور کسی پر احسان مت کرو کہ اس سے زیادہ مفاد حاصل کرو ۝۶ اور اپنے رب کے لیے صبر کریں ۝۷ پھر جب پھونکا جائے گا ناقور کے اندر ۝۸ پس وہ دن بڑا سخت ہو گا ۝۹ کافروں پر وہ سخت دشوار ہو گا ۝۱۰

گذشتہ سے پیوستہ

یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ اے لحاف اوڑھنے والے، قُمْ آپ اُٹھ کھڑے ہوں، فَاَنْذِرْ اللہ کی مخلوق کو بُرے انجام سے ڈرائیں۔ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اُسی کو سب سے بلند اور برتر خیال کریں۔ اور اس بات پر یقین رکھیں۔ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھیں۔

اخلاق کی پاکیزگی

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ثیاب سے مراد جسم پر پہننے والے ظاہری کپڑے بھی ہیں۔ اور ان کا اطلاق اخلاق پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اخلاق کو پاک رکھو۔ جیسا کہ محاورے کے طور پر کہتے ہیں فُلَانٌ نَقِیُّ الذَّیْلِ طَاھِرُ الثَّوْبِ یعنی فلاں شخص پاکیزہ کپڑے والا ہے یعنی اچھے اخلاق کا مالک ہے پاک دامن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عمدہ اخلاق کا حامل ہے۔ تو گویا طہارت سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طہارتیں ہیں، اور اسلام نے دونوں کا حکم دیا ہے۔

ظاہری طہارت

ظاہری طہارت تو یہ ہے کہ انسان کے جسم کے ساتھ کسی قسم کی نجاست نہ لگی ہوئی ہو یعنی بول و براز، خون یا پیپ، یا قے وغیرہ۔ نیز اُس کا لباس بھی صاف ستھرا ہو۔ کیونکہ جسم اور لباس کی پاکیزگی کے بغیر انسان اپنے مالک کے حضور نماز میں بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ نماز کے شرائط میں داخل ہے۔ اسی طرح مکان کا پاک ہونا بھی ضروری ہے کہ ناپاک جگہ پر نماز نہیں ہوتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز کی جگہ کے متعلق فرمایا نَظِّفُوْھَا یعنی اسے پاک رکھو۔ وہاں کسی قسم کی گندگی نہیں

ہونی چاہیے۔ اسی لیے بوچہ ؒخانہ جیسی نجاست آلود جگہوں پہ نماز پڑھنے کی ممانعت فرما دی۔ اسی طرح راستے میں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا، کہ وہ بھی نجاست سے آلودہ ہوسکتا ہے گھر کے صحن کے متعلق فرمایا[1] نَظِّفُوْا اَفْنِیَتَکُمْ اپنے صحنوں کو پاک رکھو۔ اور یہودیوں سے مشابہت اختیار نہ کرو۔ خیبر اور دوسرے علاقوں کے یہودی کاشتکاری کرتے تھے، اُن کے صحن اکثر گندگی اور گوبر وغیرہ سے بھرے رہتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اُن کی مشابہت وغیرہ سے منع فرما دیا۔ مگر آج کل تو اُلٹی حالت ہے۔ یہود و نصاریٰ صفائی کی پابندی کرتے ہیں، اور مسلمان نجاست میں آلودہ ہوگئے ہیں۔ اس زمانے میں ظاہری اور باطنی گندگی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے، حالانکہ طہارت دین اسلام کا ایک اہم ترین اصول ہے۔

باطنی طہارت

باطنی طہارت، ظاہری طہارت سے بھی اہم ہے۔ جس شخص کا عقیدہ گندہ ہے وہ حظیرۃ القدس تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ کفر، شرک، نفاق، بدعات جیسی چیزوں سے انسان کا دل و دماغ ناپاک ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی روح ناپاک ہو جاتی ہے حالانکہ اُس کی طہارت سب سے پہلے ہونی چاہیئے۔ باطنی طہارت کے لیے ضروری ہے۔ کہ کمائی حلال ہو، لباس مشکوک اور حرام مال سے مبرا ہو، خوراک حلال اور طیب مال سے ہو۔ اسی لیے اللہ جل شانہٗ نے فرمایا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ "یعنی پاک اور طیب چیزوں کو اپنی خوراک کا جزو بناؤ۔ عبادت کی قبولیت کا یہی ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا "یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ" یعنی اللہ کا پیغمبر طیب چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے۔ اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہ ایک عام قانون بنا دیا کہ طیب چیزیں استعمال کرو، اور حرام، مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرو۔ طہارت سے محبت فرشتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے

گندگی سے پرہیز

تیسرا خلق یہ بیان فرمایا وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ یعنی گندگی سے دور رہیں۔ اس گندگی سے مراد بھی بدعقیدگی کی گندگی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" یعنی شرک وکفر کی گندگی سے بچو۔ اسی طرح ایک جگہ رجز کا اطلاق عذاب پر بھی ہوا ہے جیسا کہ فرمایا فَاَنْزَلْنَا عَلَیْھِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ "یعنی بنی اسرائیل پر آسمان سے طاعون کی صورت

---

[1] ترمذی ص۳۹۷

میں رجز اتاری گئی جس سے آناً فاناً ہزاروں لوگ موت کا شکار ہو گئے۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ گندگی کو اپنے قریب نہ آنے دیں، اسے دور ہی رکھیں۔ خاص طور پر بدعقیدگی اور اخلاق رذیلہ کی گندگی سے بچیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اسے سماحت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ اپنے اندر سماحت کا اخلاق پیدا کریں۔ سماحت کا لفظ حدیث میں آتا ہے جس کے عام معنی تو فیاضی ہے۔ مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے۔ کہ انسان پر بہیمیت اور خسیس خواہشات غالب نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ یہ چیزیں غالب آجائیں تو انسان میں حرص، لالچ اور خودغرضی جیسی قبیح عادات پیدا ہونگی۔ لہذا انسان کے اندر سماحت کی صفت پیدا ہونی چاہیے، سارے انبیاء علیہم السلام اس کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔ اس کے بغیر انسان اجتماعی حیثیت کے حامل کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ اعمال کی درستگی حقوق کی ادائیگی اور خوش معاملگی کے لیے صفتِ سماحت کا ہونا لازمی ہے۔

احسان

اخلاق عالیہ میں چوتھا خلق یہ بیان فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ یعنی کسی پر ایسا احسان نہ کریں جس کا بدلہ زیادہ طلب کریں۔ کسی کے ساتھ احسان کرنا نوع انسانی کا تقاضا ہے، مگر اس احسان کے عوض میں کوئی مفاد حاصل کرنا یا اس کی خواہش ہی دل میں رکھنا نفس احسان کے خلاف ہے۔ احسان کر کے جتلانا احسان کو ضائع کر دیتا ہے۔ اور یہ عدل کے بھی خلاف ہے۔ کہ مہربانی کرے اور پھر اس کا معاوضہ یا بدل طلب کرے۔ اور عدل ہی ایسی چیز ہے جس سے اجتماعی کام آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ اگر عدل نہیں ہوگا، تو اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ اور سارا نظام ہی خراب ہو جائے گا۔

شادی کی رسوم میں نیوندرے کا کیا مقصد ہے۔ یہ دیا ہی اس نیت سے جاتا ہے۔ کہ اس سے بڑھکر وصول کیا جائے گا۔ اور اگر دوسرا شخص نہ دے سکے تو گلہ شکوہ شروع ہو جاتا ہے۔ غیبت ہوتی ہے ناراضگی تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ سب مکروہ ہے۔ اور صفت عدل کے منافی ہے۔ لہذا کسی پہ احسان کرنے کے بعد نہ اُسے جتلاؤ۔ نہ اُس سے مفاد حاصل کرو۔ یہ صفت عدالت کے خلاف ہے۔ حالانکہ یہ صفت تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت کا جزو رہی ہے اور دین حق کی ایک اہم ترین صفت ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۵۴ ج۱ طبع رشیدیہ دہلی۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ نیکی کرنے کے بعد اس کا احسان مت جتلاؤ۔ خدا کے سامنے اس بات کا اظہار کہ بہت زیادہ نیکی کی ہے، کسی طرح مناسب نہیں۔ کیونکہ کیا معلوم وہ نیکی شرائط کے مطابق تھی یا نہیں۔ اور کیا وہ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی ہے یا نہیں۔ لہٰذا عجز و انکساری سے بارگاہ رب العزت میں درخواست کرو کہ وہ اسے قبول فرمالے۔ یہ کبھی نہ کہو کہ ہم نے بہت نمازیں پڑھی ہیں یا روزے رکھے ہیں یا صدقہ خیرات کیا ہے۔ یہ سب اسی کی توفیق سے ہے۔ اور ان نیکیوں کے مفید ہونے کا انحصار ان کی قبولیت پر ہے۔

دین کا خلاصہ

یہ چاروں اخلاق دین کا لب لباب ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] کہ دین کے تمام شرائع اور احکام انہی کے تحت آتے ہیں۔ کوئی حکم اخبات کے تحت آتا ہے، کوئی سماحت کے، کوئی عدالت کے تحت۔ (کوئی طہارت کے تحت۔)

حکم انذار کے تحت جب ان لوگوں کو ڈرایا جائے گا، تو ظاہر ہے۔ کہ ان میں سے ایسے خود غرض مغرور، اور نجس لوگ ہوں گے جو مخالفت کریں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قرآن پاک میں فرعون کا حال بیان ہوا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ خدا کون ہے جسے تم بار بار پکارتے ہو، مجھ سے بڑا کون ہے "وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ" میں ہی تمہارا الٰہ ہوں۔ میرے سوا اور کون ہے۔ آج بھی بڑے لوگ اپنی ہی بڑائی کے خواہشمند ہیں۔ یہ کسی اور کی بڑائی کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو کہا جائے کہ رب کی بڑائی بیان کرو تو ان کو غصہ آجاتا ہے۔ مقابلہ کرتے ہیں اور حقیقت کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے۔ کہ نجاست اور گندگی سے دور رہو، گندے عقیدے کو چھوڑ دو تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اس پر ڈٹے رہتے ہیں۔ جب انہیں انصاف کی بات بتائی جاتی ہے تو اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی غلط روش پر قائم رہتے ہیں۔

ظلم کی بیخ کنی

شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں[2]۔ کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد ظلم کا خاتمہ ہے رَفْعُ التَّظَالُمِ مِنْ بَیْنِ النَّاسِ۔ انسانیت پر جو بھی ظلم ہوتا ہے۔ وہ حق تلفی ہوتی ہے۔ جب تک ظلم کا دور دورہ رہے گا، حق تلفی ہوتی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام کا فرض رہا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵۳ تا ۵۵ / ج ۱

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۱ / ج ۱

کہ وہ جور و ستم کے خلاف جہاد کریں۔ لہٰذا آج بھی مظلوم کا حق دلانا انبیاء علیہم السلام کی سنت پر عمل کرنا ہے۔ مزدور اور کسان کا حق دلانا، کمزور طبقہ کی مدد، ظلم کو دفع کرنا بہترین عمل ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کسی پر احسان مت جتلاؤ کہ اس سے مفاد حاصل کرو، مفاد پرستی انصاف کے خلاف ہے۔ ہر شخص کو انصاف میسر آنا چاہیئے انسانیت سے ظلم کو دور کرنا ضروری ہے۔

صبر کی تلقین

اس کے بعد فرمایا کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ یعنی اپنے رب کے لیے صبر کریں۔ اس راستے میں تکالیف آئیں گی، مخالفت ہوگی مگر اس کے باوجود صبر کا دامن نہیں چھوڑنا پچھلی سورۃ میں بھی اللہ تعالےٰ نے نبی علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو تسلی دلائی تھی کہ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ "یہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر صبر کریں۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے واقعہ میں بھی صبر کی تلقین کی تھی۔ یہاں بھی یہی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی ایذا رسانی پر برداشت کریں، استقلال سے کام لیں صبر ملّت ابراہیمی کا ایک اہم ترین اصول ہے۔ جس طرح اللہ کی وحدانیت، ذکر الٰہی، نعمتوں پر شکر، نماز اور تعظیم شعار اللہ بڑے بڑے اصول ہیں۔ اسی طرح صبر بھی اہم اصول ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" صبر و نماز سے کام لیں، گھبرائیں نہیں۔ سورۃ ن میں بھی گذر چکا ہے "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ" یعنی مچھلی والے کی طرح بے صبری نہ کرنا۔ انہوں نے بھی ذرا سی بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں امتحان میں ڈال دیا۔ نبی علیہ السلام کو خطاب کر کے ساری امت کو صبر کی تلقین کی جا رہی ہے۔ تکلیف اور مصیبت کو برداشت کرنا، اطاعت پر جمے رہنا اور ناگوار حالات میں بھی صبر کا دامن نہ چھوڑنا۔

شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ عام صبر اور اللہ کے لیے صبر کرنے میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے صبر کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان میں ایسی قوت برداشت پیدا ہو جائے جس میں امیر اور غریب کا امتیاز ختم ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے۔ کہ امیر آدمی کی طرف سے زیادتی ہو تو صبر کرے اور غریب کی طرف سے تعدی ہو تو صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے۔ یہ رب کے لیے صبر نہیں ہوگا۔ رب کے لیے صبر وہ ہوگا، جو سب کے لیے یکساں ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ یعنی اپنے رب کے لیے صبر کریں۔

لے تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۲۹ ص ۲۱۲

قیامت کی ہولناکیاں

قیامت کا ذکر ہر شخص کے ایمان کا جزو ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیامت کی ہولناکی کا ذکر فرمایا یعنی جو کچھ پیچھے بیان ہو چکا ہے اس کا نتیجہ آگے چل کر نکلے گا۔ فرمایا فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ پھر جب پھونکا جائے گا اُس ناقور کے اندر۔ ناقور کا معنی کھوکھلی چیز جیسے بگل ہوتا ہے یا سینگ جو اندر سے خالی ہوتا ہے تو فرمایا جب اس کریدی ہوئی چیز میں پھونکا جائے گا یعنی قیامت برپا ہو جائے گی فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ پس یہ دن بڑا سخت دن ہوگا۔ جنہوں نے اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا نہیں کئے اور جنہوں نے صبر نہیں کیا انہیں پتہ چل جائے گا۔ کہ یہ کتنا دشوار دن ہے۔ اور خاص طور پر عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ کافروں پر یہ دن سخت دشوار ہوگا۔ جنہوں نے حق کے مشن کی مخالفت کی ان کے لیے بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ اُن کے لیے آسانی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے دنیوی زندگی میں دشواری کے کام ہی سرانجام نہیں دیے تھے۔ لہٰذا اُس روز ایسا ہی بدلہ دیا جائے گا۔

البتہ ایمان والوں پر یہ دن نرم ہو جائے گا۔ کیونکہ ایمان کی بدولت انہیں فلاح حاصل ہونے والی ہے۔ اُن کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام بھی اُن کی سفارش کریں گے۔ ایمان اور توحید کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی بھی اُن کے شاملِ حال ہو جائے گی۔ لہٰذا اس دن ایسے لوگوں کی سختیاں کم ہو جائیں گی۔ مگر کافروں پر یہ دن بہت ہی دشوار ہوگا۔

درس سوم ۳ (آیت ۱۱ تا ۲۵)

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

ترجمہ:۔ مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیں جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ﴿۱۱﴾ اور میں نے اُسے لمبا چوڑا مال دیا ﴿۱۲﴾ اور (مجلس میں) حاضر ہونے والے بیٹے دیئے ﴿۱۳﴾ اور ہموار کر دیا میں نے اس کے لیے ہر قسم کا دنیوی سامان ﴿۱۴﴾ پھر وہ طمع کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں ﴿۱۵﴾ ہرگز نہیں بیشک یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھتا تھا ﴿۱۶﴾ میں اسکو بڑی چڑھائی چڑھاؤں گا ﴿۱۷﴾ بیشک اس نے غور و فکر کیا اور اندازہ لگایا ﴿۱۸﴾ پس یہ مارا جائے اس نے کیسا اندازہ لگایا ﴿۱۹﴾ پھر مارا جائے اُس نے کیسا اندازہ لگایا ﴿۲۰﴾ پھر اُس نے دیکھا ﴿۲۱﴾ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا ﴿۲۲﴾ پھر اس نے پشت پھیری اور تکبر کیا ﴿۲۳﴾ پس اس نے کہا یہ جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے ﴿۲۴﴾ یہ تو انسان کا ہی کلام ہے ﴿۲۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذاتی تکمیل کے بعد بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی کے لیے انذار کا حکم دیا۔ فرمایا یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ”یعنی اے لحاف یا کپڑا اوڑھنے والے آپ اُٹھ کھڑے ہوں۔ اور اللہ کی مخلوق کو بُرے انجام سے خبردار کریں۔ اس کے بعد اس راستے کی سختیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے فرمایا وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ“ اس راستے میں اپنے رب کے لیے صبر کریں۔ درمیان میں اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ بنیادی اصول بتا دیئے گئے۔ اور مشن کی بات کو واضح کر دیا گیا۔ نیز فرمایا کہ اس حالت میں ”وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ“ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ وہی سب سے بڑا ہے۔

سابقہ سورۃ سے مطابقت

پچھلی سورۃ میں یہ اصول بیان کیا گیا تھا کہ "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا" یعنی مشرق و مغرب کا رب وہی اللہ ہے۔ لہذا اُسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اُسی کے بھروسے پر کام کریں۔ وہاں تھا "فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا" اور یہاں اس سورۃ میں فرمایا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ کیونکہ عظمت و کبریائی اُس کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں۔ کسی قوم، قبیلے، خاندان یا سردار کے لیے بڑائی نہیں ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ" اپنے لباس کو پاک صاف رکھیں۔ اپنے ماحول کو پاک رکھیں اور اس طرح طہارت کا اصول اختیار کریں۔

یہ بھی فرمایا "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" گندگی کو دور پھینکیں۔ یہ گندگی خواہ کفر و شرک کی ہو یا حرص و لالچ کی، خود غرضی کی ہو یا نفاق کی، ہر قسم کی نجاست سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ "وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ" اور کسی پر ایسا احسان نہ کریں، جس کا بدلہ زیادہ طلب کریں۔ یہ عدل کے خلاف ہے۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے احسان کریں کہ یہ انسانیت کا تقاضا ہے۔ "أَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ" جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے۔ اسی طرح تم مخلوق خدا پر احسان کرو۔ اُن سے کسی معاوضہ یا تعریف کی امید نہ رکھو اللہ تعالیٰ نے ابرار کی صفت میں فرمایا "لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا" یعنی ہم جو احسان کرتے ہیں، ہم اُس کے عوض میں شکریہ یا بدلہ نہیں چاہتے۔

یہ چار بنیادی اخلاق بیان کرنے کے بعد اس راستے میں سختی برداشت کرنے کا حکم دیا۔ اور قیامت کے متعلق آگاہ کیا۔ "فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ" یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ بڑا سختی کا دن ہو گا۔ خاص طور پر کافروں کے لیے بڑی دشواری ہو گی۔

گذشتہ سورۃ میں تھا "ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ" یعنی ان دولت مند مکذبین کو چھوڑ دیں۔ یہ حق و صداقت کی مخالفت کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور پاکیزگی کے پروگرام میں حائل ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑ دیں اور یہاں فرمایا "ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا" یعنی مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیں جسے میں نے اکیلے پیدا کیا۔ وہاں پر بھی دولت مند طبقے کی ذہنیت بیان کی گئی تھی، اس سورۃ میں بھی دولت مندوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ وہاں بھی انہیں مہلت دینے کا ذکر تھا، یہاں بھی مہلت کا ذکر کر کے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

ولید ابن مغیرہ

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں۔ کہ یہاں جس دولت مند شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ولید ابن مغیرہ ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ ان آیات میں مذکورہ باتیں اسی شخص کے ساتھ ہوئی تھیں ارشاد ہوتا ہے ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا آپ چھوڑ دیں مجھے اور اس شخص کو جس کو میں نے پیدا کیا وَحِیْدًا۔ اکیلا وَحِیْدًا اگر فاعل سے حال بنایا جائے تو اس کا معنیٰ ہوگا، جس کو پیدا کیا میں نے تنہا۔ کیونکہ پیدا کرنے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ "ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ میں نے اس شخص کو پیدا کیا ہے۔ اس کی پیدائش میں کوئی شریک نہیں۔ لہٰذا میں وحید ہوں، یگانہ ہوں۔ میں اس سے نپٹ لوں گا۔

وَحِیْدًا مَنْ سے بھی حال بن سکتا ہے۔ یعنی جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا ہے۔ جب انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تو بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی فوج یا جتھہ نہیں ہوتا۔ کوئی مال و دولت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ لباس تک نہیں ہوتا۔ بالکل برہنہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ آج یہ انسان مال و دولت اور فوج و قبیلہ پر فخر کرتا ہے۔ حالانکہ پیدائش کے وقت یہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ یہ سب کچھ اُسے اللہ نے عطا کیا۔

مال کی کثرت

وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا میں نے اُسے لمبا چوڑا مال و دولت دیا۔ مال کی تمام اقسام اُسے عطا کیں۔ ولید ابن مغیرہ مکے کے رؤسا میں سے تھا، اُس کے پاس زمین اور باغات تھے۔ تجارت اور نقدی بھی۔ اور مویشی بھی تھے۔ مَمْدُوْدًا سے مراد وہ مال جس سے امداد ملتی رہتی ہے یُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ جس مال سے امداد آتی ہے۔ یہ تینوں قسم کے مال ولید کے پاس تھے طائف میں اُس کا باغ تھا۔ سال بھر موسم کے مطابق اس کی پیداوار آتی رہتی تھی۔ کوئی موسم ایسا نہ تھا جس میں کوئی نہ کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو۔ تجارت بڑی وسیع تھی۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں[1] کہ مجموعی طور پر ایک کروڑ پاؤنڈ سالانہ اُس کی آمدنی تھی۔ اُس دور میں اتنی بڑی آمدنی والا شخص بڑی پوزیشن کا مالک تھا۔ آج کل تو ارب پتی لوگ بھی موجود ہیں۔ مگر اس زمانے میں ایک کروڑ پونڈ کی آمدنی بہت بڑی بات تھی۔ تجارت میں ہر وقت لاکھ دو لاکھ پونڈ کی سرمایہ کاری ہوتی تھی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سو غلام ہوتے

---

[1] تفسیر مظہری صفحہ ۱۲۷، روح المعانی صفحہ ۱۴۲، ابن کثیر صفحہ ۴۴۲

تھے۔ کوئی شام سے قافلہ آرہا ہے کوئی یمن سے آرہا ہے۔ کوئی کہیں جارہا ہے۔ کہیں سے اناج آرہا ہے کہیں کپڑے کی تجارت ہو رہی ہے۔ کہیں کھالوں کا کاروبار ہے، کہیں دوسرے سامان کا لین دین ہے۔ غرض مال و دولت کی ہر وقت فراوانی تھی جس سے امداد ملتی رہتی تھی۔ مولیشی بھی بہت تھے۔ بھیڑ بکریوں کے کئی گلے تھے۔ یہ سب مَالًا مَّمْدُوْدًا میں آتا ہے۔ کہ ہم نے اُس کو لمبا چوڑا مال دے رکھا تھا۔

ولید کے بیٹے

وَبَنِيْنَ شُهُوْدًا اور مجلس میں حاضر ہونے والے بیٹے بھی دیے۔ وہ بیٹے جو عزت و وقار کا موجب تھے۔ اور کام کاج میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ بیٹوں کی تعداد بعض روایات[۱] میں تیرہ ہے۔ مگر عام مشہور دس کی تعداد ہے۔ ولید خود اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وراثت میں بھی کافی مال تھا۔ خود بھی خوب کمایا۔ بڑا چوہدری اور سردار تھا۔ ہر کوئی احترام کرتا تھا۔ مال اور اولاد اس کی عزت میں اضافہ کا باعث تھیں۔ ولید خود اور اس کے بعض بیٹے کفر کی حالت میں مرے۔ البتہ اُس کے چار بیٹوں نے اسلام قبول کیا[۲]۔ خالد بن ولید اِسی ولید کے بیٹے تھے۔ جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا[۳] سَيْفٌ مِّنْ سُيُوْفِ اللهِ یعنی یہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔ یہی خالد بن ولید عظیم المرتبت جرنیل تھے، جنہوں نے شام فتح کیا۔ یرموک کی لڑائیاں سر کیں۔ عراق کی مہمات پر غلبہ پایا، کفار کو مغلوب کیا جنگ احد تک تو اسلام کے مخالفین کے ساتھ رہے۔ مسلمانوں کو احد کے میدان میں انہی کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اِن کے دِل کو اسلام کی طرف پلٹ دیا تو پھر اللہ کی تلوار ثابت ہوئے۔ دوسرے بیٹوں میں ولید بن ولید اور عمارہ بن ولید ہیں۔ ولید بن ولید مکی زندگی میں قید تھے۔ برادری نے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے باپ سخت سزائیں دیتا تھا۔ انہوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ حضور علیہ السلام کافی عرصہ تک ان کی رہائی کے لیے نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے رہے اور ان کا نام لے کر رہائی کی دعائیں کرتے رہے۔ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ وَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدِ وَعَیَّاشَ بْنَ رَبِیْعَةَ وَهِشَامَ بْنَ سَلَمَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ صحیح بخاری[۴]

---

[۱] روح المعانی ص ۱۲۲ / ۲۹، تفسیر ابن کثیر ص ۴۴۲ / ۴، [۲] روح المعانی ص ۱۲۲ / ۲۹، تفسیر عزیزی ص ۲۱۵ / پارہ ۲۹
[۳] بخاری ص ۵۳۱ / ۱، ترمذی ص ۵۴۷، مسلم ص ۲۳۷ / ۱، [۴] بخاری ص ۱۴۱ / ۱ و ص ۹۴۶ / ۲)

کی روایت کے مطابق آپ دعا کرتے کہ اے اللہ! ولید بن ولید، عیاش بن ابی ربیعہ، ہشام بن سلمہ اور دوسرے کمزور مسلمانوں کو نجات دے۔ وہ کافروں کے ہاتھ سے بڑی تکلیف اٹھا رہے ہیں جب آپ نے قنوت نازلہ پڑھنا چھوڑ دی تو ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور! آپ نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے، اب آپ نے چھوڑ دی۔ فرمایا وَمَا تَرٰهُمْ قَدِمُوْا کیا تم دیکھتے نہیں کہ جن کے بارے میں پڑھتے تھے، وہ آ گئے ہیں۔ اللہ نے ان کو کافروں کی قید سے رہائی دے دی ہے اور وہ پہنچ گئے ہیں۔[1]

ولید بن ولید کا حال بھی عجیب لکھا ہے[2]۔ کہتے ہیں کہ یہ بدر کی لڑائی میں کفار کی طرف سے آئے تھے۔ مگر—— لڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سمجھتے تھے۔ کہ یہ غلط کام ہے۔ دل سے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر چکے تھے، مگر اس کا اظہار ابھی نہیں کیا تھا۔ بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے قیدی بنے اور فدیہ دے کر رہائی حاصل کی۔ مگر معاً بعد اسلام قبول کر لیا۔ کسی نے کہا کہ پہلے اسلام کا اظہار کر دیتے تو فدیہ سے بچ جاتے۔ کہا اگر ایسا کرتا تو لوگ سمجھتے کہ فدیہ سے بچنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے حالانکہ میں نے تو محض رضائے الٰہی کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔ ولیدؓ ابن ولید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ہی فوت ہو گئے[3]۔ حضور علیہ السلام نے اپنی قمیص مبارک انہیں کفن کے طور پہ پہنائی اور دفن کیا۔

مال و دولت کی حرص

فرمایا یہ مال اور اولاد ہی دو چیزیں ہیں، جن کی وجہ سے اکثر لوگ غافل ہو جاتے ہیں۔ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا" یعنی ہمارے پاس مال و دولت بہت ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ اور ہمیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ یہ دونوں چیزیں ولید ابن مغیرہ کو حاصل تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا کہ میں نے بھی اس کے لیے تیاری کی ہے، خوب تیاری کی، یہ شخص مال و دولت بیٹے، خاندان، عزت ہر چیز میسر ہونے کے باوجود ایسا حریص ہے کہ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ طمع کرتا ہے۔ کہ میں اُسے اور زیادہ دوں، مال چیز ہی ایسی ہے۔ کہ لالچی کی آنکھ

---

[1] مسلم صـ ۲۳۷ ج ۱ [2] تفسیر عزیزی صـ ۲۱۵ پارہ ۲۹ [3] تفسیر عزیزی صـ ۲۱۵ پ ۲۹

نہیں بھرتی۔ وہ ننانویں کے چکر میں رہتا ہے۔ کہ جس طرح بھی ہو اور زیادہ مال جمع ہو۔ جیسا فرمایا "جَمَعَ فَاَوْعٰی"۔ جمع کرنے میں حلال و حرام کی تمیز بھی نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار ہوتی ہے کہ مال میں اضافہ ہو۔ یہی سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ مستحقین کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ غرباو مساکین کا خیال نہیں رکھتا۔ مزدور اور کمزور کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ عبادات پہ خرچ نہیں کرتا۔ حج پہ نہیں جاتا۔ عمرہ ادا نہیں کرتا، قربانی نہیں کرتا۔ مساجد و مدارس پہ خرچ نہیں کرتا بلکہ اپنے بنک بیلنس کی طرف دھیان رکھتا ہے۔ یا رسم و رواج پر خرچ کرتا ہے۔ شادی بیاہ میں کنجریاں نچاتا ہے۔ ٹیلی ویژن اور کھیل تماشے پہ خرچ کرتا ہے۔ مکانوں کی ٹیپ ٹاپ کی طرف توجہ ہے مگر تبلیغ اسلام کی طرف دھیان نہیں وہ چاہتا ہے۔ کہ نہ اس کی کمائی پہ کوئی پابندی ہو، نہ خرچ کرنے پر قدغن لگے۔ عیش و آرام کی چیزوں پہ خرچ کرنا چاہتا ہے۔ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ۔ چاہتا ہے کہ اور زیادہ مال آئے۔ تاکہ میں اور زیادہ عیاشی کروں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت پہلے بھی تھی اور آج بھی موجود ہے۔ ننانویں فیصدی لوگ حقوق ادا نہیں کرتے۔ کوئی خال خال انسان ہی ایسا ہے۔ جو پورے طور پہ حقوق ادا کرتا ہو۔ ورنہ تجزیہ کرکے دیکھیں کہ دولت کی کثرت کس جگہ پہ صرف ہو رہی ہے

ولید کی بدبختی

انسان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مال و دولت کی حرص کو بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ کَلَّا ہرگز نہیں یعنی جاہ و مال کے حاملین کو دوام ہرگز حاصل نہیں۔ جو مالک الملک کوئی چیز عطا کرسکتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا، ولید بن مغیرہ کی زندگی کا آخری دور روبہ تنزل تھا۔ اُسے موت ذلّت کی حالت میں آئی۔ جوان اور قابل بیٹے مسلمان ہوگئے۔ جس کی وجہ سے اُسے بڑا صدمہ پہنچا۔ اور مال و دولت میں بھی زوال آنے لگا۔ اس کے علاوہ آخرت کی گرفت تو بہرحال قائم ہے۔

فرمایا کَلَّا اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا۔ یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھتا تھا۔ وہ اس بات کا سخت دشمن تھا کہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مشن کامیاب ہو جائے۔ وہ تو اپنی سرداری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی فیصلہ کرلیا کہ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا کہ ہم اِس کو چڑھائی پر چڑھائیں گے یعنی دوزخ کے پہاڑوں پر چڑھا کر نیچے گرادیں گے۔ اس کی سزا یہ ہوگی۔ یہاں اِس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ مکذبین آج جس چیز کو ترقی سمجھ رہے ہیں وہی اُن کے لیے آخرت میں تنزل کا سبب ہوگی، ترقی تو ایمان، اعمال صالحہ، توحید اخلاص

بنی نوع انسان کی ہمدردی میں ہے، نہ کہ مال جمع کرلے میں۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ اس بدبخت نے ان تمام امور پہ غور و فکر کیا اور اس بات کا اندازہ لگایا کہ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو مشن پیش کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے یا غلط ہے۔ فَقُتِلَ پس یہ مارا جائے كَيْفَ قَدَّرَ اس نے کیا اندازہ لگایا ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ پھر مارا جائے اس نے کیسے اندازہ لگایا۔ سوچ بچار کے بعد ثُمَّ نَظَرَ پھر اس نے دیکھا۔ جیسے غرور و تکبر سے دیکھتے ہیں ثُمَّ عَبَسَ پھر تیوری چڑھائی وَبَسَرَ اور منہ بسورا۔ ترش رو ہوا۔ ثُمَّ أَدْبَرَ پھر پشت پھیری وَاسْتَكْبَرَ اور تکبر کیا۔ کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا بات کرتے ہیں۔ اُن کی بات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ تکبر کیا جیسے سورۃ قیامت میں آئے گا ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ گھر کی طرف جا رہا ہے جیسا کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے کر جا رہا ہو، حالانکہ اس نے تکذیب کی۔ نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ نہ ہی نیکی کی۔ بلکہ اکڑتا ہوا جا رہا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پروگرام کے مطابق وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اپنے رب کی بڑائی بیان کرتا۔ طہارت اور پاکیزگی کو اختیار کرتا، حلال و حرام میں تمیز کرتا، برخلاف اس کے اس نے کفر اور غرور کیا۔

اسلام کے خلاف پراپیگنڈا

حق کو تسلیم کرنے کی بجائے کہتا ہے فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ یعنی یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جادو کی بات کرتا ہے۔ پہلے بھی جادوگر ہوا کرتے تھے۔ جو اپنے جادو کے ذریعے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی جادو کر رہا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا ایک دولت مند اسلام کے پروگرام کے خلاف کر رہا ہے۔ اس پروگرام کو جادو اس لیے کہتے تھے۔ کہ اور کوئی بات درست نہیں بیٹھتی تھی جیسا کہ پہلی سورت میں گذر چکا ہے۔ کبھی شاعر کہتے مگر شاعری والی بات نہ پاتے۔ پھر کاہن کہتے تو اس میں کامیاب نہ ہوتے، جادوگر کہتے۔ تو اس کا ثبوت بھی پیش نہ کر پاتے۔ اور سوچتے کہ آخر کیا بات ہے۔ کہ آپ کی بات لوگوں کو اپیل کرتی ہے۔ لوگ کیوں گرویدہ ہوئے جاتے ہیں اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ یہ تو انسان کا کلام ہے۔ کلام الٰہی نہیں۔ اسلام کی مخالفت میں یہ آخری حربہ استعمال کرتے کہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے سے انکار کر دیتے۔ اس بات

سے ثابت کرنا یہ مقصود تھا۔ کہ اسلام کا پروگرام، اللہ کا پروگرام نہیں بلکہ انسانی ذہن کی تخلیق ہے
اور یہ قابل عمل نہیں۔ اس طرح گویا لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرتے۔ تا کہ
ایمان اور اسلام کا مشن یہیں ختم ہو جائے۔ مگر یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا بھیجا ہوا پروگرام
ہے۔ یہ ضرور کامیاب ہو گا۔ اور مکذبین اور دولت مند کو اپنے مشن میں ناکامی ہو گی۔ اسی لیے پہلے
فرمایا کہ فَاصْبِرْ یعنی اے نبی علیہ السلام! آپ ان کی ایذا رسانیوں پہ صبر کریں۔ ہم ان کو
ضرور سزا دیں گے۔ آئندہ آیات میں کفار کے لیے سزا کا بیان آئے گا۔

درس چہارم ۴ (آیت ۲۶ تا ۳۱)

سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبۡقِیۡ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلۡنَا عِدَّتَهُمۡ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ۙ لِیَسۡتَیۡقِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَیَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا وَّلَا یَرۡتَابَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَلِیَقُوۡلَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡكٰفِرُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكۡرٰی لِلۡبَشَرِ ﴿۳۱﴾

ع ۱۳ / ۱۵

ترجمہ: عنقریب میں اس کو سقر میں ڈالوں گا ﴿۲۶﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ سقر کیا ہے ﴿۲۷﴾ نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے ﴿۲۸﴾ انسانوں کو جھلسا دینے والی ہے ﴿۲۹﴾ مقرر ہیں اس پر انیس فرشتے ﴿۳۰﴾ اور ہم نے نہیں مقرر کیے دوزخ کے کارکن مگر فرشتے اور ہم نے یہ تعداد کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے۔ تاکہ اہلِ کتاب یقین کر لیں اور اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو اور تاکہ اہلِ کتاب اور مومن اس میں شک نہ کریں اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے یا جو کافر ہیں وہ کہیں گے اس مثال کو بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کیا منشا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسی طرح سے بہکاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ تو انسانوں کے لیے یاد دہانی ہے ﴿۳۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اُن بنیادی اصولوں کا ذکر کیا جن پر یقین رکھنا اور عمل پیرا ہونا ہر ایک شخص کے لیے ضروری ہے۔ وہ پاکیزہ اصول اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، اس کی بڑائی کا تذکرہ، طہارت اور پاکیزگی کا اختیار کرنا۔ ہر قسم کی گندگی اور نجاست سے پرہیز اور ظلم و تعدی سے پاک رہنا ہیں۔ اِن اصولوں کی مخالفت کرنے والے عام طور پر دولت مند لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِن آسودہ حال لوگوں کی ذہنیت کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ صحیح پروگرام کی کس کس طرح مخالفت کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے۔ کبھی کہتے ہیں۔ کہ یہ انسان کا کلام ہے۔ اس کے الٰہی

پروگرام ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ آپ صبر کریں۔ انتقام لینے میں جلدی نہ کریں ہم خود ایسے لوگوں سے نمٹ لیں گے اور ان کو سزا دیں گے۔

مکذبین کے لیے سزا

آگے ان مکذبین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ۔ یقین جانیں عنقریب میں ان کو سقر میں ڈالوں گا۔ سقر دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسے لظیٰ، جہنم، نار، ھاویہ اسی طرح سقر بھی ایک نام ہے، جس کا معنیٰ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ بعض مفسرین[1] فرماتے ہیں کہ سقر دوزخ کے طبقات میں سے پانچواں طبقہ ہے۔ جو لوگ دنیا میں عناد، تکبر اور تکذیب کی آگ اپنے اندر اکٹھی کرتے رہے، قیامت کو وہ اسی میں ڈالے جائیں گے۔

سقر کی حقیقت

پھر فرمایا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ آپ کو کس نے بتلایا کہ سقر کیا ہے۔ قرآن پاک کا یہ انداز ہے کہ بعض اوقات بات استفہام کی صورت میں سمجھائی جاتی ہے جیسے اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ اسی طرح یہاں فرمایا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ یعنی سقر کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی بیان فرمایا لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ یعنی سقر ایسی چیز ہے۔ جو نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے۔ یعنی کوئی بھی مکذب اس کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ وَلَا تَذَرُ اور نہ چھوڑنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جلانے کے بعد بالکل فنا نہیں کر دے گی، بلکہ انسان پلٹ کر اپنی اصلی حالت پہ آجائے گا۔ اس طرح انہیں مسلسل سزا ملتی رہے گی۔ دوسری جگہ اس کی تفصیل یوں بیان کی[2] كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ جب ان کی کھالیں جل جائیں گی۔ تو اس کی جگہ نئی کھال دے دی جائے گی۔ اور وہ اپنے کئے ہوئے کا وبال چکھتے رہیں گے۔ جب تک ان کے جسموں میں کفر، شرک اور تکذیب کا بھرا ہوا زہر نکل نہ جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی شخص کے جسم میں صفرا کا مادہ ہو، جب تک وہ موجود رہے گا۔ بخار آتا رہے گا۔ اگر بلغم کا مادہ گل سڑ جائے تو بلغمی بخار آئے گا۔ اور جب تک وہ مادہ خارج نہیں ہو گا، بخار نہیں اترے گا۔ ان لوگوں نے اپنے جسموں میں پاکیزہ اخلاق پیدا نہیں کئے بلکہ زہریلا مادہ پیدا کیا۔ جب تک وہ مادہ باقی رہے گا ان کے جسموں کو سزا ملتی رہے گی اور اس سے رہائی ممکن نہیں ہو گی۔

---

[1] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۲۲ پارہ ۲۹ [2] نساء آیت ۵۶ پ ۵

اور وہ آگ ایسی ہے کہ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ انسان کو جھلسا کر رکھ دے گی، جلا ڈالے گی۔ بشر انسان کو کہا جاتا ہے اور بشرہ جسم پر بولتے ہیں۔ ظاہری کھال کو بشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں معنی یہاں مراد ہو سکتے

سزا کے لیے انیس فرشتے

سقر کے انتظام کے متعلق فرمایا عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ یعنی دوزخ میں سزا دینے کے لیے انیس فرشتے مقرر ہیں۔ یہ دوزخ کے بڑے بڑے دروغے یا آفیسر ہیں، جو سزا دینے پر مامور ہیں۔ اس پر مشرکین نے اعتراض کیا۔ ان میں ابوالاسود بن کلدہ جمحی پہلوان تھا۔ انیس کے عدد پر مذاق کرتا تھا۔ کہنے لگا کہ انیس میں سے سترہ فرشتوں کو تو میں خود پچھاڑ دوں گا اور تم سب مل کر بھی باقی دو سے نہیں نمٹ سکو گے، اس قسم کا ٹھٹا کرتا تھا۔ ابوجہل بھی کہتا تھا۔ کہ دوزخ پر مقرر انیس فرشتوں کا مقابلہ ہم کر سکتے ہیں۔

فرشتے روحانی مخلوق ہے۔ جن اور فرشتے انسانوں کی نسبت بہت زیادہ طاقتور ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی طاقت بخشی ہے۔ کہ ایک فرشتہ ایک کروڑ آدمی کو ہتھیلی پر رکھ کر جہاں چاہے پھینک دے لہٰذا سزا دینے کے لیے تو ایک فرشتہ بھی کافی ہے۔ احادیث میں فرشتوں کے متعلق جو تفاصیل آئی ہیں، اُن میں فرشتوں کی خوفناکی بھی پائی جاتی ہے۔ اور خوبصورتی بھی۔ مثلاً موت کے وقت جو فرشتے مومنوں کے پاس آتے ہیں۔ وہ نہایت حسین شکلوں میں ہوتے ہیں۔ اور کافروں اور منافقوں کے پاس آنے والے فرشتے خوفناک شکلوں میں آتے ہیں، اُن کی شکلیں سیاہ ہوتی ہیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا[1] کہ کافر یا منافق شخص سے قبر میں جب فرشتے سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے، تو وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔ ہا ہا کرتا رہے گا۔ لَا اَدْرِیْ یعنی میں نہیں جانتا۔ افسوس! میں نہیں جانتا۔ لوگ کچھ کہا کرتے تھے مگر میں نہیں جانتا۔ اس پر فرشتے انہیں مختلف قسم کی سزائیں دیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بعض کے سروں پر ہتھوڑے پڑیں گے۔ اور بعض پر قبر سمٹ جائے گی۔ بعض کے متعلق فرمایا کہ اُن پر ننانویں سانپ مسلط کر دیے جائیں گے۔ حالانکہ ڈسنے

---

[1] مسند احمد ص ۲۸۸ ج ۴ ابوداؤد ص ۲۵۸ ج ۲

کے لیے ایک سانپ بھی کافی ہے۔ مگر یہاں ننانویں سانپوں کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا بعض پر بچھو چھوڑے جائیں گے۔ بعض پر درندے مسلط ہوں گے، اور بعض کو دوسرے طریقوں سے سزا ملے گی۔

ننانویں کے عدد کی حکمت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانویں نام ہیں مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا یعنی ایک کم سو۔ جس شخص نے ان اسمائے پاک کو مانا، اُن پر ایمان لایا اور ان کو پڑھتا رہا۔ بہشت میں داخل ہو گا۔ برخلاف اس کے منافق اور کافر اللہ تعالیٰ کے کسی نام پر بھی ایمان نہ لایا۔ لہذا ہر نام کے بدلے میں ایک سانپ اُسے ڈستا رہے گا۔ اور اُسے سزا ملتی رہے گی۔

انیس کی حکمت

اسی طرح انیس کے عدد میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوزخ پر انیس فرشتے کیوں مقرر فرمائے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی[2] فرماتے ہیں کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اُن کی تعداد انیس ہے۔ لہذا ہر ایسی چیز کے مقابلہ میں باز پرس کے لیے ایک فرشتہ ہو گا۔ مثلاً جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت[1] سر فہرست ہے۔ اس جہان کے حادث[2] ہونے پر ایمان لانا کہ یہ ہمیشہ سے نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔ ایک وقت آئے گا جب یہ پھر فنا ہو جائے گا۔

اسی طرح ملائکہ[3] اور کتب سماویہ[4] پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تمام انبیاء[5] علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تقدیر[6] پر ایمان لانا یعنی کائنات میں جو کچھ ہو چکا ہے اور جو آئندہ ہو گا، سب کا سب اللہ تعالیٰ کے علم، ارادے اور مشیت کے مطابق ہو گا۔ اسی طرح قیامت[7]، جنت[8] اور دوزخ[9] پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہ کل نو ایمانیات ہو گئیں، جن پر ایمان لانا لازم ہے۔

پانچ چیزوں کا تعلق عملیات سے ہے۔ مثلاً توحید و رسالت کا اقرار[1] زبان سے کرنا، اور اس پر یقین رکھنا۔ باقی چار عبادات ہیں یعنی نماز[2]، روزہ[3]، زکوٰۃ[4] اور حج[5]۔ ان سب پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح پانچ چیزیں منہیات سے متعلق ہیں، یعنی وہ چیزیں جن سے منع کیا گیا ہے ان پر بھی یقین رکھنا ضروری ہے۔ ان میں زنا[1] حرام ہے، چوری[2] حرام ہے۔ قتل نفس[3] حرام ہے۔ کسی پر

---

[1] ترمذی ص ۵۰۵ مسلم ص ۲/۳۴۲ بخاری ص ۲/۹۴۹ ص ۲ بیان القرآن ص ۱۲/۵۷ مطبوعہ تھانہ بھون۔

بہتان باندھنا حرام ہے۔ اور نبی کے کام میں مخالفت کرنا بھی حرام ہے۔ یہ تمام باتیں بیعت والی آیت جس میں عورتوں سے بیعت کرنے کی شرائط بیان ہوئی ہیں سورۃ ممتحنہ میں موجود ہیں۔ تو گویا یہ سب مل کر انیس ہوگئے۔ جن میں سے ہر ایک کے بدلے میں اللہ تعالےٰ نے ایک ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے

حکمائے اسلام اور مفسر مہائمیؒ کہتے ہیں کہ دوزخ پر انیس فرشتے مقرر کرنے میں حکمت یہ ہے۔ کہ انسان کے حواس ظاہرہ اور باطنہ پانچ پانچ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو قوتیں رکھی ہیں، ان کی تعداد نو ہے۔ اس طرح کل انیس ہیں سے ہر ایک قوت کے مقابلہ میں ایک ایک فرشتہ مقرر ہے۔ حواس ظاہرہ میں آنکھ یعنی قوت باصرہ ہے۔ سونگھنے کے لیے قوت الگ ہے۔ چکھنے کی قوت جدا ہے ٹٹولنے کی قوت جدا ہے۔ اور پانچویں قوت سننے کی علیحدہ ہے۔ ان سب کے محکمے جدا جدا ہیں۔ اسی طرح باطنی حس مشترک ہے۔ وہم، خیال، حافظہ اور قوائے متخرکہ باطنی حواس ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کے جسم میں جو قوتیں رکھی ہیں۔ اُن میں جذب کرنے والی قوت ہے۔ غذا اور دیگر ضروریات زندگی کو اپنے اندر روکنے والی طاقت ہے۔ ہضم کرنے والی قوت ہے۔ فضلات کو دفع کرنے اور باہر نکالنے والی قوت ہے۔ جسم کی ساختوں کو غذا پہنچانے والی قوت ہے اور نشوونما دینے والی طاقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تولید و تناسل کے لیے بھی قوت رکھی ہے۔ اس طرح حواس ظاہرہ اور باطنہ کی کل انیس قوتیں ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے انسان کے جسم میں رکھی ہیں۔ ہر ایک قوت کے مقابلہ میں ایک فرشتہ مقرر ہے۔ ہر فرشتے کا محکمہ الگ ہے، دوسرے محکمے سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ کان کو آنکھ کے محکمہ سے کوئی تعلق نہیں، اور آنکھ کو لمس کے محکمہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر ایک کا محکمہ جدا جدا ہے۔ فرشتے اپنے اپنے محکمہ کے مطابق سزا دیں گے۔

انسانی مشین کو چلانے والے فرشتے

جسم انسانی کی بیرونی حفاظت اور اندرونی ساخت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ صرف جگر کی ساخت پر غور کریں جہاں انسانی جسم کے لیے خون پیدا ہوتا ہے۔ انسان جس قدر غذا استعمال کرتا ہے۔ وہ معدے سے ہو کر باریک نالیوں کے ذریعے جگر میں پہنچتی ہے اور جگر اس کو خون میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ خون بڑی نالیوں کے ذریعے قلب میں پہنچتا ہے۔ اور قلب اس کی پمپنگ کر کے سارے جسم میں بھیجتا ہے۔ فضلات کو باہر نکالتا ہے۔ سانس کے ذریعے

ؔ تیسیر الرحمن و تیسیر المنان صـ ۲۷۵/۲۷

آکسیجن اندر داخل کرتا ہے۔ اور تازہ دم ہو کر انسان کو غذا ملتی ہے۔ صرف ایک جگر کی ساخت میں اتنی بڑی فیکٹری لگی ہوئی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کارخانہ اس کے عشر عشیر کے برابر بھی نہیں، ہندوستان میں ٹاٹا کے فولاد کے کارخانے میں دس لاکھ مزدور کام کرتے ہیں۔ مگر جگر کی فیکٹری کے مقابلہ میں ٹاٹا کمپنی بھی گرد ہے۔ وہاں تو کروڑ ہا فرشتے کام کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ نے اتنا بڑا کارخانہ قائم کر دیا ہے۔ باقی ساختوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک تولید و تناسل کے اجزاء کے لیے اللہ نے بڑا وسیع سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ بے شمار فرشتے اپنی اپنی ڈیوٹیاں انجام دے رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کی توجیہ

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انیس فرشتوں کی حکمت یہ ہے۔ کہ انسانیت انیس چیزوں پہ مشتمل ہے[۱]۔ ایک تو ظاہری جسم ہے۔ یہ انسان کا خاکی ڈھانچہ ہے۔ اندر نسمہ ہے، روح

---

[۱] حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مفسر قرآن حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور بعض دیگر محققین کی تحقیق کے مطابق یہ چند سطور حسب مقام علمی استفادہ کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

الآتِ کسب نفس میں انیس ۱۹ ہیں۔ دو ہاتھ، دو پاؤں۔ زبان۔ دل۔ اعضاءِ تناسل شکم پشت (حواس خمسہ ظاہرہ) باصرہ، لامسہ، سامعہ، شامہ۔ ذائقہ (حواس باطنہ) حسِ مشترک۔ وہم۔ خیال۔ فکر، عقل، قوت شہوانیہ۔ قوت غضبیہ ان آلات کے استعمال میں جو بھی تقصیر کرے گا یا ان کو غیر محل میں صرف کرے گا۔ دوزخ میں ہر ایک پر اللہ تعالےٰ سزا کے لیے الگ الگ مؤکل مقرر کرے گا۔

اگر انسان کے جسم میں اخلاط (HUMOURS) سڑ جائیں تو بدن میں بخار اور حرارت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کا جسم جل جاتا ہے گا۔ اسی طرح انسان میں نسمہ (NESMIC BODY) جو اس مادی (فزیکل) جسم میں پرورش پا رہا ہے۔ اگر انسان کے اخلاق، عقائد، افکار و آراء بگڑ جائیں تو اعمال سوء کے نتائج اس میں جمع ہوتے رہتے ہیں یہ زہریلے مواد ہیں۔ جب ایسے انسان جہنم کے قریب جائیں گے تو یہ مواد بھڑک اٹھیں گے۔

انسانی روح کے مراکز بھی انیس ہیں۔ حواس ظاہرہ و باطنہ۔ روح۔ سر (قلب و عقل کا بطن) خفی (سر کا بطن) اخفیٰ (خفی کا بطن) انانیت کبریٰ، نور القدس۔ الحجر البحت (انانیت کبریٰ اور نور القدس کا بطن جو تجلی الٰہی کا نمونہ ہے) ان مراکز کے ذریعہ انسان اپنی تکمیل کرتا رہتا ہے اور کر سکتا ہے۔ نفس سے مراد انسان کی انانیت ہے جس کو انا (میں) سے تعبیر کرتا ہے۔

باقی حاشیہ ص ۳۶۲ پر

ہے۔ الغرض یہ کل انیس چیزیں ہیں۔ ہر ایک جزو نہایت لطیف ہے۔ اس میں دس تو قوائے ظاہرہ اور باطنہ ہیں، اس کے علاوہ نفس ہے، قلب، عقل اور روح ہے۔ روح کا بطن سر ہے۔ سر کا بطن

بقیہ حاشیہ :- جنہوں نے دنیا میں راستی کو اپنا شعار بنالیا۔ اور نامۂ اعمال ان کو دائیں ہاتھ میں ملا۔ وہ تمام حقوق واجبات کو ادا کرکے جنت کی طرف روانہ ہوگئے اور "زبانیہ" کی گرفت سے بچ گئے۔ انہیں دخول جنت کا ویزا مل گیا

انسان کی ساخت ہی ایسی ہے، انسان اپنے قصد و ارادہ سے جو کام کرتا ہے۔ اس کی جوابدھی کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان تمام قوتوں (الٰہی قوتوں) کو جو فطرت کے مطابق کام میں لاتا ہے تو ان قوتوں کو جلا ملتی ہے۔ اور اعمال صالحہ کے ثمرات اس کے نسمہ میں جمع اور محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اصحاب الیمین جنہیں کامیابی کی سند یمین میں ملے گی یہ اصحاب المیمنہ بھی کہلاتے ہیں (مبارک، برکت والے)

(الف) یہ آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے دائیں طرف سے اخذ کئے گئے تھے۔

(ب) راستی شعار۔

(ج) موقف میں عرش کی دائیں طرف۔

(د) اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔

(د) جانب راست جنت کی طرف روانہ ہونے والے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (حسن بصریؒ)

ان کے مقابل اصحاب الشمال (مشئمہ۔ نحوست والے نامبارک لوگ)۔ جہنمی لوگ جب وہاں پہنچیں گے تو ان سے اصحاب یمین پوچھیں گے۔ اس لیے کہ مجرم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کس جرم کی سزا اس کو مل رہی ہے وہاں خود بخود مجرم کو معلوم ہوجائے گا۔ اصحاب الشمال جواب دیں گے۔ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انسانی بھلائی کے اس پروگرام پر عمل نہیں کرتے تھے۔ جو انسانوں میں اتحاد فکر، اجتماعیت، مساوات، اخلاص سے

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز   (اقبال)

طہارت و پاکیزگی۔ وقت کی پابندی۔ تنظیم و ڈسپلن جیسی بیسیوں بھلائیاں سکھلاتا تھا اور جس کی آخری کڑی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے (تعلق باللہ انسان کی ذاتی ضرورت ہے) اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ انسان کے دل میں خدا پرستی اور خدا شناسی کی قوت پوشیدہ ہے۔ جب انسان نماز کے ذریعہ اس کو ترقی دیتا ہے تو انسان میں آخر کار ایسی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔ گویا اس آئینے میں تجلی الٰہی کو دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کے

باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۳ پر

خفی ہے۔ اخفیٰ کا بطن اخفیٰ ہے۔ اور اخفیٰ سے آگے باریک اور لطیف چیز انانیت کبریٰ ہے اس سے آگے نور قدس ہے، اور آخر میں حجر مجنت ہے۔ جو کہ تجلی الٰہی کا نمونہ ہے۔ جو روح انسانی پہ پڑتی ہے

بقیہ حاشیہ :- تقاضوں کو خدا کا حکم سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ ایسا انسان خدا کے کمزور اور مسکین بندوں کے حقوق ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے آپ کو ان کا خادم جانتا ہے کسی کا حق چھیننے کا کوئی عزم نہیں کرتا۔ لیکن نماز سے پہلے اپنے نفس کو کفر، شرک، نفاق، الحاد، شک، عقائد باطلہ، نیات فاسدہ۔ اخلاق ذمیمہ۔ بدباطنی (غل) کینہ (حقد) دغابازی (فراڈ) حسد و تکبر سے پاک کرنا ضروری ہے۔ پھر جسم و بدن، لباس کو بول و براز خون۔ پیپ۔ مواد متوبہ مذی وغیرہ سے پاک کرے حدث اصغر و اکبر سے بدن کو وضوء۔ وغسل اور تیمم کے ذریعے پاک کرے۔

ظاہری جسم کو فضلات غیر طبعی بال بغل۔ زیر ناف، ناخن، میل کچیل سے۔

مال کو زکواۃ و صدقات ادا کرنے سے۔ اور حرام کی آمیزش سے پاک کرے۔ سود، رشوت، جوا، بدکاری کی کمائی۔ انشورنس۔ قمار۔ دغا۔ فریب، چوری وغیرہ حرام کی کمائی سے پاک صاف کرنا ضروری ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی

نماز میں بھی انیس ۱۹ باتیں ہیں | طہارت بدن، جامہ، طہارت اصغر و اکبر، تکبیر تحریمہ۔ استقبال قبلہ۔ ستر عورت قیام۔ قرأت، رکوع سجود، قعودہ۔ اذکار و تسبیحات و تکبیرات، تشہد، درود۔ دعا، حضور قلب (دل) نیت، اسلام طمانینت ارکان، ترک کلام و عمل منافی۔ و ترک التفات دائیں بائیں طرف۔ رکعات نماز بھی انیس ۱۹ ہیں، دو فجر، چار ظہر چار عصر، تین مغرب، چار عشاء، اور رکعت رات کی نماز اس پر ایک عدد اضافہ برائے رعائت عدد طاق یعنی وتر۔

سنن و نوافل تو مکملات و متممات ہیں۔

ساعات بھی انیس ۱۹ ہیں۔ پانچ نماز کے لیے وضع کر لیے گئے۔ باقی کی باز پرس سے انسان بچ جائیں گے ورنہ انیس ۱۹ زبانیہ سزا کے لیے مسلط ہوں گے۔ ہر ہر ساعت کے لیے ایک ایک عَلَیْھَا تِسْعَۃَ عَشَرَ

طعام مسکین ——— وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ

اگر ہم محتاجوں کو کھانا کھلاتے تو انیس ۱۹ گھنٹے وہ فراغت سے بسر کرتے اور ان کی انیس ۱۹ قوتیں تازہ دم اور بحال ہوتیں۔ اگر وہ ان انیس ۱۹ گھنٹوں میں ان طاقتوں کو اطاعت میں مصروف رکھتے تو ہمارے نامہ اعمال میں بھی نیکیاں درج ہوتی رہتیں۔

کھانا کھلانے میں بھی انیس ۱۹ باتیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہل چلانا تخم پاشی۔ آب پاشی حفاظت، گنا

باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۴ پر

انسانیت ان اجزا سے مرکب ہے۔ کافر و مشرک نے ان انیس اجزا کو خراب کر دیا۔ یہ خدا پرستی کے مرکز تھے۔ لہٰذا سزا دینے کے لیے ہر ایک سنٹر کے مقابلہ میں ایک فرشتہ ہوگا۔

بقیہ حاشیہ :۔ مثلاً صاف کرنا۔ کھلیان کی حفاظت کرنا، حمل و نقل، پیسنا چھاننا۔ گوندھنا، پکانا، نمک و سالن ملانا، اٹھا کر محتاج کے سامنے عزت سے رکھنا، رخصت کرنے میں عجلت نہ کرنا۔ احسان نہ جتلانا۔ بار بار اس کو یاد نہ کرنا۔ ایک مسکین کو کھانا کھلانے سے انیس[19] زبانیہ کے مقابلے میں انیس[19] عمل ہوتے ہیں۔

(التعظیم لِاَمرِ اللّٰہِ وَالشَّفقَةُ علٰی خَلقِ اللّٰہِ)

غرض ـــــ کُنَّا نَخُوضُ مَعَ الخَآئِضِینَ

بیہودہ باتیں کرتے تھے (مثلاً حسن زنان کا ذکر، عیش و دولت منداں، نخوت بادشاہاں اور ان کے اسباب اقتدار کے تذکرے، جنگ و مشاجرات کے قصے۔ مذاہب باطلہ کا تذکرہ۔ فاسقوں کے فسق کی کہانیاں۔ نکتہ چینی و طعن دوسروں کے کلام پر اور اس کی خرابیاں اور خلل کا تذکرہ۔ نزاع و جدال۔ مذاہب و اقوال میں تعصب و خصومت اپنے حقوق سے زیادہ کی وصولی کے لیے سخن پروری و سخن سازی۔ شعر و شاعری، ہجو و مدح سے تلذذ۔ فحش و اعضاء مستورہ کا ذکر اور پردہ نشینوں کا ذکر۔ ایک دوسرے کے ساتھ سخت گوئی بے حیا۔ احمق و جاہل لوگوں کی طرح۔ گالی دشنام سب و شتم اور آبرو میں قدح کرنا۔ لعنت غیر مستحق پر۔ حد سے زیادہ مزاح و ہنسی، دل لگی۔ انبساط مقدار سے زیادہ جو موجب رنج و ملال ہمنشیں ہو سکتا ہے۔ تہمت و بہتان اور بے گناہوں کو امور قبیحہ کے ساتھ متہم کرنا۔ استہزاء اور تمسخر اور بیہودہ خندہ زنی، مسلمانوں سے وعدہ خلافی۔ دروغ گوئی و مبالغہ آرائی۔ لوگوں کے اسرار و رموز کا افشاء اور امور مستورہ اور خانگی امور کا برملا اظہار کرنا، بددعا کرنا۔ غیبت۔ سخن چینی اور غمازی (چغلخوری) روبرو مدح سرائی کرنا، فخر و مباہات کا اظہار، قومی و نسلی برتری۔ اپنے بڑوں کے غرور کا طمطراق۔ لایعنی سمیناد فضول قسم کے کلوکیم۔ ڈرامے، ثقافتی شو۔ عشقیہ ناول، اشعار خوانی اسینما، فلم ایکٹرسوں کے گانے ساز باجے، مضحکہ خواہ ـــــ سکولوں، کالجوں، بازاروں، جلسوں، میلوں، عرسوں میں ہو۔ یا سینما، تھیٹر وغیرہ میں۔

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِهَا وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ

(۱) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم مسلمانوں کی جانب یہ حکم قرآن میں نازل کر چکا ہے کہ جب تم کسی مجلس میں یہ سنو کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کی آیات کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو تم ان لوگوں کے پاس اس وقت تک نہ

باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۵ پر

انیس کا عدد ایمان کی آزمائش کے لئے ہے

بعض فرماتے ہیں، دوزخ کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر ایک فرشتہ مقرر ہے۔ دوزخ کے ایک طبقے میں گنہگار مومن بھی جائیں گے وہ بھی دوزخ کا فرشتہ دیکھے گا کہ اس مومن نے تصدیق

یقیہ حاشیہ :- حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۖ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ (پ النساء ۱۴۰)

بیٹھو جب تک وہ کوئی اور بات شروع نہ کردیں ورنہ تم بھی ایسی حالت میں انہی جیسے ہوگے۔

(۲) وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (پ الانعام)

(۲) اور اے مخاطب جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں میں بے ہودہ نکتہ چینی کررہے ہوں تو تو ان لوگوں سے کنارہ کش رہ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں بحث شروع کردیں اور اگر شیطان تجھ کو کبھی یہ حکم بھلا دے تو یاد آنے پر پھر ایسے ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔

تکذیب قیامت —— وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ

اس میں بھی انیس (۱۹) باتیں ہوں گی۔ آسمان کا پھٹنا۔ زلزلۂ زمین۔ انتشار کواکب۔ آفتاب و ماہتاب کا بے نور ہونا۔ پہاڑوں کی حرکت۔ سمندروں کا گرم ہونا۔ لوگوں کا زندہ ہو کر فوج در فوج حاضر ہونا۔ پسینے کا بدلوں سے بہنا۔ سایہ کا نہ ملنا۔ طول قیام۔ تجلیٔ قہری کے ظہور پر سوال و حساب، وزن اعمال، یمین و یسار اعمال ناموں کا ملنا۔ بہشت یا دوزخ کی طرف روانگی پل صراط سے گذرنا۔ جنت یا دوزخ میں داخل ہونا۔

وقوع موت —— حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ

آخر موت و ہلاکت کے انقلاب نے ہماری آنکھیں کھول دیں (اَمَّا هٰذَا فَقَدْ جَاءَهُ الْيَقِينُ) کمزوروں، محتاجوں، مظلوموں کی اپیل کے آخری دن اور فیصلے پر ہم یقین نہیں رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو کسی کے آگے جوابدہ نہیں خیال کرتے تھے۔ اور اس ذمہ داری کا جو احساس دلانے والے تھے۔ ہم ان کو بھی جھٹلاتے تھے۔

قومی اور بین الاقوامی انقلاب کے اصولوں کا خلاصہ

(۱) انقلاب کا پہلا اہم اصول وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

باقی حاشیہ صہ ۳۶۶

لہ تفسیر عزیزی صہ ۲۲۶ پ ۲۹

قلبی میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ اور اقرار لسانی اور عمل ارکان میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ تین تو وہاں مقرر ہوں گے اور ایک فرشتہ یہاں ان تینوں پہ ہوگا۔ باقی ہر ایک دروازے میں تین تین فرشتے ہوں گے۔ وہ کافروں کے لیے ہوگا۔ اس لیے انیس فرشتوں کی تعداد مقرر فرمائی ہے۔

بقیہ حاشیہ :۔ (۲) تمام اقوام میں عدل و انصاف قائم کرنے کا پختہ ارادہ،

(۳) اپنے اندر اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا۔

(۴) تعلق باللہ کا قیام

(۵) ظاہری پاکیزگی کے ساتھ خیالات و افکار و افعال کی پاکیزگی۔

(۶) انسانی سوسائٹی میں زر پرستی و سرمایہ پرستی کا استیصال

(۷) مساکین و غرباء کی خدمت

(۸) ہر شخص کا اقامت دین کی تبلیغ و تنظیم میں اپنی ذمہ داری سے حصہ لینا۔

(۹) اللہ تعالیٰ کو ہی تمام طاقتوں سے اوپر جاننا اور اسی پہ بھروسہ کرنا۔

(۱۰) سچا مسلمان نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم کو برداشت کرتا ہے (لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ)

(۱۱) ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو مٹانا۔ اور سوسائٹی کو تمام گندگیوں سے پاک و صاف کرنا۔ اور ذاتی مفاد کو قربان کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرنا۔

(۱۲) انسان جب تک تمام نفسانی (نفسیاتی سائیکالوجیکل) غلاظتوں سے۔ غصہ۔ بھوک، پیاس اور تمام بری خواہشات سے اپنے مزاج و طبیعت کو پاک و صاف نہ کرے۔ تو اس کو آرام و سکون کبھی میسر نہ ہوگا، اس طرح جب تک اس کو بری باتیں سوچنے اور برے کاموں کے کرنے سے نفرت نہ ہو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔

امام ولی اللہؒ کی وصیت۔

حضرت مولانا شیخ نور اللہ پھلتیؒ کو امام ولی اللہؒ نے بیعت کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی!

"يَدُهٗ فِىْ كُلِّ ذٰلِكَ يَدِىْ" "اس کا ہاتھ ان سب باتوں میں میرے ہاتھ کی طرح ہے"۔

لِسَانُهٗ لِسَانِىْ۔ اور اس کی زبان میری زبان ہے"۔

اُوْصِيْهِ فِىْ خَاصَّةِ نَفْسِهٖ بِتَقْوَى اللّٰهِ "میں سے وصیت

باقی حاشیہ ص۳۶۷

بعض مفسرین نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے۔ کہ نہیں مقرر فرمایا ہم نے دوزخ والے ان فرشتوں کو مگر ملائکہ۔ یہ انیس ملائکہ ہیں، سزا دینے کے لیے بڑے بڑے آفیسر ہیں۔ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً اس کی حکمت قرآن پاک نے خود بیان فرمائی وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی ہم نے یہ تعداد کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے۔ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے۔ کیونکہ اہل کتاب کو علم ہے۔ کہ ان کی کتابوں میں بھی انیس کا ذکر آیا ہے۔ اب جب کہ قرآن پاک بھی یہی تعداد بیان کر رہا ہے۔ تو انہیں اس تعداد پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ یقین آجانا چاہیئے۔ اس کی دوسری حکمت یہ ہے کہ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا یعنی اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ ان کا ایمان تازہ ہو۔ کہ پہلی کتابوں میں بھی یہی بات ہے۔ اور ہماری کتاب میں بھی یہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اہل کتاب اور مومن کسی غلط بات سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ البتہ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے یا جو کافر ہیں، وہ کہیں گے مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

بقیہ حاشیہ:۔ وَمُجَانَبَةِ الْهَوٰى وَالْقِيَامِ بِالْاَذْكَارِ۔ وَكَظْمِ الْغَيْظِ لِلّٰهِ فِي اللّٰهِ وَلُزُوْمِ جَادَّةِ السُّنَّةِ۔ وَتَرْكِ السُّؤَالِ مِنَ النَّاسِ۔ وَاَنْ يَّعْتَقِدَ فِي الْمُحَدِّثِيْنَ وَفُقَهَاءِ الْاِسْلَامِ وَمَشَائِخِ الصُّوْفِيَةِ خَيْرًا وَاُوْصِيْهِ بِمَنْ مَّعَهُ اَنْ يَّاْمُرَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحَضِّهُمْ عَلٰى طَاعَةِ اللّٰهِ وَيَجْتَهِدُ فِيْ اِصْلَاحِ اَمْرِ الْفُقَرَاءِ وَالْغُرَبَاءِ"

(تفہیمات الٰہیہ ص ۱۲۴)

مطبوعہ حیدر آباد سندھ

کرتا ہوں اس کے اپنے نفس کے بارہ میں کہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہے۔ اور خواہشات سے کنارہ کشی کرتا ہے اور اذکار میں مشغول رہے اور اللہ تعالےٰ کی رضا کے لیے غصے کو دباتا ہے۔ اور سنت کے راستے کو لازم پکڑے اور لوگوں سے سوال نہ کرے اور محدثین۔ فقہاء اسلام اور مشائخ کرام صوفیہ کے بارہ میں نیک گمان رکھے۔ اور اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر برانگیختہ کرتا ہے اور فقراء اور غرباء (کمزور طبقوں) کے معاملہ کی ہمیشہ اصلاح کرتا ہے۔ (سواتی)

ھٰذَا مَثَلًا اس مثال کو بیان کرنے میں اللہ کا کیا منشا ہے ۔ دوسری جگہ فرمایا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مکھی اور مچھر کی مثال بیان کی ہے ۔ کیا خدا کے پاس اور کوئی مثال نہ تھی ۔ یہاں بھی انہوں نے یہی اعتراض کیا ۔ کہ انیس کی تعداد بیان کر کے اللہ تعالےٰ نے کون سی مثال بیان کی ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ان کے اعتراضات کی وجہ سے ان کی گندگی اور نجاست بڑھتی رہے گی ، مگر سمجھدار اہل کتاب یقین کر لیں گے کہ واقعی کلام الٰہی کا بیان پہلی کتابوں کے مطابق ہے ۔ ایمانداروں کا تو ہر حکم پر ایمان ہے ۔ اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ۔

تو فرمایا کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اللہ تعالےٰ جسے چاہتا ہے ، اسی طرح سے بہکاتا ہے ، گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے اللہ تعالےٰ نے اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری طرف آنا چاہیں گے ، ہم ان کے لیے راستے واضح کر دیں گے ۔ نیز فرمایا ۔ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ، ظالموں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح گمراہ کرتا ہے ۔ یعنی جو آدمی ظلم کرتا ہے ۔ اس نے اسی بات پر کمر باندھ لی ہے کہ سچی بات نہیں مانے گا تو اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی " ایسا شخص دوزخ کی طرف ہی جانا چاہتا ہے ۔ تو ہم اُسے ادھر ہی لے جائینگے ۔

ہدایت یا گمراہی کسی سبب کی بنا پر ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۔ جو ظالم عنادی اور ضدی ہوتے ہیں ۔ البتہ جو لوگ ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ان کو ہدایت سے نوازتا ہے ۔ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ کا یہی مطلب ہے ۔

یہ انسانوں کے لیے باعث نصیحت ہے

انیس فرشتوں کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے ۔ کہ فرشتوں کی کل تعداد صرف انیس نہیں ہے ۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ یعنی تیرے رب کے ان لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے ۔ اور کسی کے علم میں نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق ، مالک اور علیم کل ہے ۔ فرشتوں کی تعداد کو وہی جانتا ہے ۔ مگر دوزخ کے یہ انیس بڑے بڑے فرشتے خاص حکمت کے تحت مقرر کئے گئے ہیں ۔ اور ان فرشتوں اور ان کی تعداد اور ان کے فرائض وغیرہ کا ذکر محض بے فائدہ نہیں ہے ۔ بلکہ وَمَا ھِیَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ یہ تو انسانوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے ۔ تاکہ وہ برے افعال سے بچ جائیں ۔ اور اپنے مستقبل کو خراب نہ کریں ۔

درس پنجم ۵ (آیت ۳۲ تا ۴۲)

کَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَی الْکُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ ﴿۳۹﴾ فِیْ جَنّٰتٍ ۛ یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾

مع ۱۶ عشر الثالث عشر ۱۲

ترجمہ: ہرگز نہیں اور چاند کی قسم ہے ﴿۳۲﴾ اور رات کی قسم ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے ﴿۳۳﴾ اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے ﴿۳۴﴾ بے شک یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک ہے۔ ﴿۳۵﴾ یہ بنی نوع انسان کو ڈرانے والی ہے ﴿۳۶﴾ تم میں سے جو چاہتا ہے آگے بڑھے یا پیچھے ہٹ جائے ﴿۳۷﴾ ہر شخص اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے ﴿۳۸﴾ مگر — دائیں ہاتھ والے ﴿۳۹﴾ یہ لوگ جنت میں (داخل) ہونگے اور پوچھیں گے ﴿۴۰﴾ دوزخیوں سے ﴿۴۱﴾ کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے ڈالا ہے ﴿۴۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

پہلی آیات میں ذکر آچکا ہے۔ کہ اے نبی کریم یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی ان مخالفت کرنے والوں، سرمایہ داروں کو ڈرائیں، ان پر قرآن حکیم کا پروگرام پیش کریں۔ اور پھر یہ پاکیزہ اصول بھی بتلا دیا۔ کہ ان لوگوں سے انتقام لینے میں جلد بازی نہ کریں۔ آپ ان کو چھوڑ دیں، میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔ اور ان کو سزا دوں گا۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ یہ مکذبین قرآن پاک کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں۔ "اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ" کہ یہ تو انسان کا کلام ہے، گویا انہوں نے قرآن پاک کے پروگرام کا انکار کر دیا۔ مگر جیسا کہ پہلی آیات میں گزر چکا ہے، ان کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ایسے لوگوں کو میں سقر میں ڈالوں گا، جو کہ دوزخ کے طبقات میں سے ایک طبقہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "اِنَّهٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا" ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھنے والے ہیں۔ ان کو جہنم میں ڈالونگا جس پر انیس فرشتے مقرر ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ اس میں بھی حکمت ہے، یہ بات پہلی کتابوں میں بھی

موجود ہے۔ لہٰذا اہلِ کتاب اس کو دیکھ کر یقین کر لیں گے۔ اور اہلِ ایمان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے گا۔ البتہ نافرمان لوگ محض اعتراض ہی کرتے رہیں گے۔

اسلام کی کامیابی گواہی

اِن آیات میں فرمایا کَلَّا یعنی ہرگز نہیں۔ مکذبین کو خبردار کیا جا رہا ہے۔ کہ تم کہتے ہو کہ قرآن پاک انسان کا کلام ہے، نیز یہ کہ دوزخ پر انیس فرشتوں کی تعداد کم ہے، ہم اِن سے مقابلہ کر لیں گے اور قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت کریں گے تو فرمایا کَلَّا ہرگز ایسا نہیں۔ مشرکین خیال خام میں مبتلا ہیں، انہیں اپنے کیے کی سزا ضرور چکھنی ہو گی۔

قرآن پاک کے پروگرام کی کامیابی پر یہاں تین چیزوں کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے فرمایا وَالْقَمَرِ یعنی چاند کی قسم ہے۔ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ اور رات کی قسم ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے۔ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔

سیاسی غلبہ

چاند کی قسم کھانے سے مراد یہ ہے۔ کہ دیکھئے چاند کس طرح آہستہ آہستہ بدر کامل بنتا ہے، یعنی اپنے پورے کمال تک پہنچتا ہے حالانکہ پہلے دن وہ بالکل ہلال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آج اگر اسلام اور مسلمان تم کو کمزور نظر آتے ہیں۔ تو یاد رکھو، وہ دن دور نہیں جب یہی لوگ اپنے کمال تک پہنچیں گے چنانچہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم قریش نے آپ کی مخالفت کی، مگر انہیں میں سے ایسے لوگ بھی تھے، جو ابتدا ہی میں حضور علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ یہی لوگ آپ کے دست و بازو بنے، حتیٰ کہ بدر کے معرکہ میں قریش کلیۃً مغلوب ہو گئے۔ عرب کے باقی قبائل منتظر تھے۔ کہ دیکھیں ان لوگوں کا کیا بنتا ہے، جن کو قریش نے مکہ سے نکال دیا تھا۔ پہلے ہی مقابلہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی جس سے مسلمانوں کی کامیابی کی منزل قریب آگئی۔ معاہدہ حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا اور پھر فتح مکہ کے بعد عرب قبائل دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہو گئے۔ عام طور پر لڑائی کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح پہلے قریش مغلوب ہوئے، پھر باقی عرب قبائل اور پھر ان لوگوں کے ذریعے باقی دنیا نے اسلام قبول کیا ایران فتح ہوا، روم اور سپین فتح ہوا۔ حتیٰ کہ نصف دنیا پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ گویا پچاس سال کے عرصہ میں آدھی دنیا اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور باقی آدھی دنیا میں مقابلہ کی ہمت نہ رہی اس طرح عملی طور پر ساری دنیا میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسلام کے پروگرام کے سامنے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" تمام ادیان کے مقابلے میں اسلام کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا۔ یہ صرف دلیل کا غلبہ نہیں تھا، کیونکہ دلیل کا غلبہ تو اسلام کو اول روز سے حاصل تھا، اور آج اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہے۔ مگر یہ سیاسی غلبہ تھا، کہ اسلام کے مقابلہ میں باقی تمام ادیان فی الواقع مغلوب ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ گویا جس طرح ہلال سے بدر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ابتداء میں مسلمانوں کی بے سروسامانی صرف پچاس سال کے عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی قوت بن گئی۔ چاند کی قسم کھانے سے یہی مراد ہے۔

اسلام کی روشنی

ان آیات میں غلبہ اسلام کے ثبوت میں دوسری گواہی رات کی پیش کی گئی وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ یعنی رات جب پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے کفر و شرک کو عام طور پر رات کی تاریکی سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر اپنی کتاب اس لیے نازل فرمائی کہ "لِيُخْرِجَهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" تاکہ لوگوں کو کفر و شرک اور برائی کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور اسلام کی روشنی کی طرف لائے۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔ "اَفَمَنْ كَانَ مَيْتًا" یعنی جو مردہ تھا، کفر و شرک میں مبتلا تھا، اس کو نور ایمان دے کر زندہ کر دیا۔ وہ لوگوں کے اندر روشنی کے ساتھ پھر رہا ہے۔ کیونکہ اسلام روشنی دیتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تاریکی سے نکال لیتی ہے۔ الجھاؤ اور تذبذب ختم ہو جاتا ہے، ہر چیز واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ انسان اندھیروں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ "كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" آج انسان کفر و شرک اور معاصی کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں سے سوا چار ارب انسان آج بھی اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، کیونکہ ان کے پاس روشنی والی چیز موجود نہیں۔ ادھر مسلمانوں کو لیجیے۔ دنیا میں اسی کروڑ بلکہ ایک ارب کے قریب آبادی ہے، مگر حالت تمام قوموں سے بدتر ہے۔ حتیٰ کہ افریقہ کے وحشیوں سے بھی حالت گری ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے قرآن پاک کے پروگرام سے روگردانی اختیار کر لی۔ آج کسی مسلمان سے دریافت کر کے دیکھ لیں کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔ بس دنیا کمانا، محنت و مشقت کرنا، تجارت کرنا، کھانا پینا، اور بلڈنگیں بنانا۔ آج مسلمان اپنا پروگرام بھی بھول چکے ہیں۔ اس کے اشارات اگلی آیات میں ملتے ہیں۔

جہنم کی ہولناکی

الغرض وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ سے مراد یہ ہے۔ کہ اسلام صبح کی روشنی کی طرح دنیا میں

پھیلے گا جس طرح سورج نکل آتا ہے۔ اور ہر ایک کو بیدار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی روشنی ہر ایک تک پہنچے گی۔ اس سے کوئی محروم نہیں رہے گا۔ یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ قرآن پاک جادو ہے۔ انسان کا قول ہے۔ اور اس کا پروگرام ناکام ہو جائے گا۔ کَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ بلکہ جس طرح چاند ہلال سے بدر بنتا ہے اسی طرح اسلام پھلے پھولے گا اور بدر کامل بنے گا۔ اور جس طرح طلوع فجر پر رات کی تاریکی چلی جاتی ہے اسی طرح دنیا میں اسلام کی روشنی سے کفر و شرک کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ کفر مغلوب ہو جائے گا اور اسلام غالب ہو گا۔

ان تینوں چیزوں کی قسم اٹھا کر فرمایا۔ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ۔ یعنی یہ ایک بہت بڑی شے ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اِنَّهَا کی ضمیر سقر کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی یہ دوزخ بہت بڑی چیز ہے جس میں منافقین کو ڈالا جائے گا۔ مکذبین کو قسم اٹھا کر باور کرایا جا رہا ہے۔ کہ جہنم بڑی ہی خوفناک چیز ہے۔ جس سے مفر نہیں۔ لہذا وہ قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت کر کے اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیں کیونکہ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ۔ یہ بنی نوع انسان کو ڈرانے والی ہے۔ کہ اس سے بچ جائیں۔ اور قرآن کریم کی مخالفت چھوڑ دیں۔ گویا یہ لوگوں کو خبردار کر رہی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر قریش مکہ کو اکٹھا کیا، اور فرمایا[1] اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری جانب دشمن آرہا ہے، تو کیا تم میری بات کو سچا سمجھو گے، قریش کہنے لگے مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم نے آپ پر جھوٹ کا کبھی تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے فَاِنِّیْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ بے شک میں بڑے سخت عذاب کے سامنے تم کو خبردار کر رہا ہوں۔ اگر میرے پروگرام کی مخالفت کرو گے تو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گے اور یہی ہے اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ۔

تاریخ انسانی کا بڑا واقعہ

بعض مفسرین فرماتے ہیں اِحْدَى الْكُبَرِ سے مراد حضور علیہ السلام کا وہ پروگرام ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہہ کر آپ کے سپرد کیا۔ فرمایا اے لحاف اوڑھنے والے آپ اٹھ کھڑے ہوں اور بنی نوع انسان کو آنے والے خطرناک مستقبل سے آگاہ کریں۔ گویا قرآن پاک کے پروگرام کو دنیا میں جاری کرنا تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا واقعہ یعنی لَاِحْدَى الْكُبَرِ ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے۔

---

[1] مسلم صـ ۱۱۴/۱ بخاری صـ ۷۰۲/۲

کہ حضور علیہ السلام کے انقلاب سے بڑھ کر دنیا میں کبھی اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنا بڑا انقلاب برپا نہیں ہوا۔ اتنے قلیل عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہوگئیں، ان کے تمام پروگرام ختم ہوگئے۔ اور قرآنی پروگرام کو عالمی غلبہ حاصل ہوا۔ یہ انسانی تاریخ کا اہم واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی لیے لَإِحْدَى الْكُبَرِ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

پوری نوع انسانی کے لیے دعوت

اگلی آیت نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ میں یہ اشارہ موجود ہے۔ کہ قرآن کا پروگرام صرف قومی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔ یہ تمام نوع انسانی کو ڈرانے والا ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک جگہ، ایک ملک اور ایک قوم سے نہیں بلکہ یہ پوری نوع انسانی کا پروگرام ہے، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا یعنی آپ فرما دیجئے میں پورے بنی نوع انسان کی طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ یہاں پر "نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ" کا بھی یہی مفہوم ہے۔ ابتدا میں اولین مخاطبین یعنی عرب ایمان لائیں گے اور پھر ان کے ذریعے یہ پروگرام پوری دنیا میں پھیلے گا۔ اس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اس پروگرام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے مشکلات کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔ جنگیں بھی لڑنی پڑیں گی۔ قادسیہ اور یرموک جیسے بڑے بڑے معرکے ہوں گے اور اقوام عالم کے ساتھ بڑی بڑی لڑائیاں لڑنا ہوں گی۔

دین کے لیے قربانی

فرمایا، بات واضح ہوگئی ہے کہ دین اسلام کو کس طرح غالب کرنا ہے۔ قرآن کے پروگرام کو کس طرح دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا ہے۔ جب اس پروگرام کی سمجھ آگئی تو لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ اب تم میں سے جو چاہتا ہے۔ اس پروگرام کو لے کر آگے بڑھے۔ یا اگر وہ اس قدر ہمت نہیں پاتا تو پیچھے ہٹ جائے۔ دین کے پروگرام کو بہر حال دنیا کے سامنے پیش ہونا ہے۔

لِمَن شَاءَ سے مراد یہ ہے کہ اپنی رضا و رغبت سے جو اس پروگرام میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ وہ آگے بڑھے۔ کیونکہ مرتعش کی حرکت سے جو کام ہوتا ہے۔ اس پر مؤاخذہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص اپنی مرضی اور اختیار سے اس پروگرام میں حصہ لے گا، اسی میں عبادت، پاکیزگی، اخلاق، عدالت اور سماحت ہے۔ اس پروگرام کو اختیار کرنے والے کی اگلی منزل بہشت ہے۔ مرنے کے بعد حظیرۃ القدس ہے۔

آگے بڑھنے والوں کی مثال ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ، سعیدؓ، بلالؓ، صہیبؓ اور سلمانؓ وغیرہ ہیں۔ کوئی روم کا ہے، کوئی ایران کا، کوئی کسی جگہ کا، کوئی کسی مقام کا مگر جب

اس پروگرام کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، تو ان کی منزل بہشت ہے، قرب خداوندی ہے اور تجلی اعظم کے ساتھ اتصال ہے۔

پیچھے رہنے والوں کی مثال ابوجہل، ابولہب، عتبہ، شیبہ وغیرہ ہے۔ جو پیچھے رہ گئے، پروگرام کی مخالفت کی، مقابلہ کیا اور جہنم رسید ہو گئے۔ یہ دو ہی ٹھکانے ہیں۔ جو آگے بڑھ گئے، وہ جنت میں پہنچ گئے۔ اور جو پیچھے رہ گئے وہ جہنم کا نشانہ بنے۔ تو یہاں یہ اشارہ فرمایا کہ جس نے اپنی خوشی سے اس قرآنی پروگرام میں حصہ لیا۔ وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو پیچھے رہ گیا، وہ ناکام ہوا۔

اعمال کی جزا و سزا

اس کے بعد اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ یعنی ہر نفس اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے اسی میں بند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت ہی اس قسم کی بنائی ہے۔ کہ اس میں ملکیت اور بہیمیت دونوں قوتیں رکھ دی ہیں۔ ان کی کش مکش انسان کے اندر برابر جاری رہے گی۔ انسان اپنے اعمال میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں سے نکل نہیں سکے گا۔ جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث شریف میں وضاحت[1] ہے لَا تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ یعنی انسان کا قدم آگے حرکت نہیں کر سکے گا۔ جوابدہی کرنا ہو گی، اِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ۔ البتہ صرف دائیں ہاتھ والے لوگ ایسے ہوں گے۔ جو بچ نکلیں گے امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2]۔ یاد رکھو! کہ اعمال انسان کے نفس سے نکلتے ہیں، پھر پلٹ کر آتے ہیں اور نفس کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کو شمار کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ان کا نتیجہ کل قیامت کو ہی نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اس نے نفس کا دامن پکڑا ہوا ہے۔ انسان اس میں پھنسا ہوا ہے۔ اس میں سے نکلنے کی اجازت اسی کو ملے گی، جو قرآن کے پروگرام کو ماننے والا اور چلانے والا ہوگا۔ اور یہ دائیں ہاتھ والے لوگ ہوں گے۔ اس کی تشریح میں آتا ہے۔ کہ عالم ذر میں یہ لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے ذرات کی شکل میں اُن کی دائیں طرف سے نکالے گئے تھے۔ قیامت کے روز انہیں لوگوں کو اعمالنامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے۔ یہی لوگ اصحاب یمین ہیں، جو کامیاب ہوں گے۔ یہ لوگ دنیا میں بھی اچھے کام کرتے تھے۔ کہ اچھے کام داہنے ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔ انہیں کے متعلق فرمایا فِي جَنّٰتٍ یہ لوگ

---

[1] ترمذی صـ ۳۴۸ [2] حجۃ اللہ البالغہ صـ ۲۸ ج ۱ مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔

جنت میں داخل ہوں گے۔ آرام سے بیٹھیں گے جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے "عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ" تختوں پہ بیٹھ کر نظارے دیکھیں گے۔ آرام اور راحت نصیب ہو گی۔ غم و فکر دور ہو جائیں گے تو پھر يَتَسَآئَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ یعنی جنت والے دوزخیوں سے پوچھیں گے۔ ان لوگوں سے سوال کریں گے جنہوں نے دنیا میں الہٰی پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ نبی کا مقابلہ کیا تھا۔ لڑائی کے لیے آئے تھے قرآن پاک کو جادو اور انسانی کلام کہا تھا۔ اور کفر و شرک پر جمے رہے تھے۔ ان سے سوال ہو گا، مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ آج تم کو اس سقر، اس جہنم میں کس چیز نے ڈالا۔ اصحاب الیمین یعنی جنت والے دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں یہ سزا کیوں ملی، اُن کا جواب اگلی آیات میں آئے گا۔

درس ششم ۶ (آیت ۴۳ تا ۴۸)

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۴۶﴾ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے ﴿۴۳﴾ اور ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے ﴿۴۴﴾ اور ہم (باطل میں) گھسنے والوں کے ساتھ گھس جاتے تھے ﴿۴۵﴾ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے ﴿۴۶﴾ یہاں تک کہ ہمارے پاس یقینی بات (موت) آ گئی ﴿۴۷﴾ پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی کام نہیں دے گی ﴿۴۸﴾

گذشتہ سے پیوستہ

قرآن کریم کے پروگرام کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔ اس کے بعد اسلام کی ترقی اور اس کے حد کمال تک پہنچنے کا ذکر ہوا۔ اور اس کے بعد نتائج اعمال کا ذکر آتا ہے "کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ" یعنی ہر نفس نے جو کچھ کمایا ہے وہ اس میں رہن رکھا ہوا ہے۔ اس میں پھنسا ہوا ہے، اس نے جو بھی نیک و بد عمل کیا ہے، وہ اسمیں ماخوذ ہے۔ "اِلَّا اَصْحٰبَ الْيَمِينِ" سوائے داہنے ہاتھ والوں کے، جو اس قید سے نکل جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ باقی سب اپنے عمل کے نتیجہ میں مقید رہیں گے۔

اصحاب الیمین کا دوزخیوں سے سوال

دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والوں کو جنت کی راحت نصیب ہوگی۔ اور وہاں پہنچ کر انہیں مجرمین کا خیال آئے گا "فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ" اور وہ ان سے براہ راست پوچھیں گے "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" تم کو سقر یعنی دوزخ میں کس چیز نے ڈالا۔ یہ مقام تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مقام ہے۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔

دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ اگر کوئی جنتی شخص دوزخی سے بات کرنا چاہے گا، تو باوجود ایک دوسرے سے کروڑوں میل کی دوری کے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور کلام بھی کر سکیں گے۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں موجود ہے۔ کہ بہشت میں آرام کرنے والا شخص جب اپنے ساتھی کا تصور کرے گا، کہ دنیا میں وہ میرا ساتھی تھا۔ تو وہاں یہ آتا ہے۔ کہ وہ ساتھی دوزخی تھا "فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ" اُس نے جھانک کر دیکھا، تو دوزخ کے درمیان میں پڑا ہوا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ کہ اللہ نے مجھ پہ مہربانی کی، ورنہ تم تو مجھے بھی ہلاک کر ڈالتے۔ تمہاری حالت ایسی تھی۔ میں بھی تمہاری بات سے متاثر ہو جاتا، مگر اللہ تعالےٰ نے مہربانی فرمائی اور مجھے بچا لیا۔ اس طرح گویا آپس میں مکالمہ کریں گے، گفتگو کر سکیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔

جرم کے بغیر سزا نہیں دی جاتی

"مَاسَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ" میں سوال کا لفظ بتا رہا ہے کہ مجرم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ اگر اُسے جرم کا علم ہی نہ ہو، تو سزا دینا زیادتی کے مترادف ہو گا۔ دنیوی قانون بھی یہی ہے۔ کہ کسی شخص کو اس پہ جرم واضح کئے بغیر سزا نہیں دینی چاہیے۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں ہے۔ کہ کسی شخص کو شبہ کی بنا پہ گرفتار تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر تفتیش کے بعد اُسے روکنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوتا ہے تو اُسے سزا دو، ورنہ رہا کرو۔ انگریز کا وضع کردہ سیفٹی قانون سخت خبیث قانون ہے۔ جس کے تحت بغیر جرم عاید کیے سالہا سال تک محض شبہ کی بنیاد پہ قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔

الغرض وہاں ایسا قانون نہیں ہو گا۔ بلکہ مجرمین کو معلوم ہو گا۔ کہ انہیں کن جرائم کی سزا دی جا رہی ہے۔ وہاں پر بست ویک والا قانون نہیں چلے گا۔ کہتے ہیں کہ امیر امان اللہ خاں مرحوم جب کابل میں تخت نشین ہوا۔ تو جلال آباد کا جیل خانہ دیکھنے کے لیے گیا۔ جب ایک قیدی کے پاس سے گذرا، تو وہ قیدی رونے لگا۔ امیر نے وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا، حضور! اڑھائی سال سے اس جیل خانہ میں بست ویک کے جرم میں پڑا ہوں۔ امیر حیران ہوا کہ بست ویک کون سا جرم ہے۔ اُسے بتایا گیا۔ کہ یہ قیدی دھوبی ہے۔ اڑھائی سال قبل یہ بیچارہ اپنے گدھے پر کپڑے لادے جا رہا تھا۔ سُنی

---

[1] ترمذی ص ۲۲۳

راستے پر پولیس والے بعض مجرموں کو لے جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک چشمے کے کنارے ٹھہرے، وہاں ایک مجرم بھاگ گیا۔ اور اکیس میں سے بیس رہ گئے۔ انہوں نے اکیسواں پورا کرنے کے لیے گدھے والے کو پکڑ کر شامل کر لیا۔ اور اس طرح انہوں نے لسٹ وَن یعنی اکیس کی گنتی کو پورا کر لیا۔ اور وہ دھوبی بغیر جرم کے اڑھائی سال تک قید کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔

قیامت کے روز اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہوگا۔ جس کے تحت کسی کو بلا جرم سزا دی جائے۔ بلکہ ہر مجرم کو بتایا جائے گا۔ کہ اُسے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں ایک شخص کو شبہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ مگر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا، کہ بے گناہ ہے۔ لہٰذا چھوڑ دیا گیا۔

دوزخیوں کا جواب

جب جنتی مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کس جرم کی بنا پر دوزخ میں پہنچے تو وہی لوگ جو دنیا میں قرآن پاک کو جھٹلاتے تھے، کہتے تھے یہ جادو ہے، انسان کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ کہ میں ان کو دوزخ میں ڈالوں گا۔ چنانچہ ان کو واصل جہنم کر دیا۔ تو اب یہ لوگ خود ہی اپنے جرائم کی تفصیل بیان کریں گے قَالُوْا جواب دیں گے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے۔ یہ ہمارا جرم تھا نیز یہ کہ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ تیسرا جرم یہ بتائیں گے وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ہم باطل میں گھسنے والوں کے ساتھ باطل میں گھس جاتے تھے۔ اور چوتھی بات یہ کہ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہ چار جرائم ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم جہنم رسید ہوئے۔

نماز کی اہمیت

پہلا جرم یہ ہے۔ کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ نمازیوں کی جماعت میں شامل ہونا تو درکنار ہم ان کی مخالفت کرتے تھے، انہیں ٹھٹا کرتے تھے۔ حالانکہ نماز ایک ایسا پروگرام ہے۔ جس کی وجہ سے اتحاد فکر، اجتماعیت، طہارت، وقت کی پابندی، ڈسپلن، تنظیم اور اس قسم کے بیسیوں فوائد ہیں، جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں۔ جہنمی کہیں گے افسوس کہ ہم نے اس پروگرام کو نہ اپنایا۔ جس میں تعلق باللہ جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے عقیدے کی طہارت سے لے کر ہر قسم کی ظاہری طہارت منجملہ لباس، مکان، بدن، قلب، روح، خوراک غرض ہر چیز کی

ؔ ترمذی ص۲۲۳

طہارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی بدقسمتی ہے۔ کہ ایسی اعلیٰ و ارفع باتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے حالانکہ یہ چیزیں مسلمانوں کو فطرۃً حاصل ہیں۔ نماز پنجگانہ اور جمعہ کے اجتماعات مسلمانوں کی اجتماعیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہی اجتماعیت ہمدردی کا درس دیتی ہے۔

امیر حبیب اللہ خان مرحوم دِلّی آیا۔ نماز کے لیے گیا تو جماعت کھڑی ہو چلی تھی۔ آکر شریک ہو گیا۔ وہاں ایک بہشتی بھی تھا۔ پانی کی مشک ادھر رکھی اور وہ بھی امیر کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا۔ لوگوں نے روکنا چاہا۔ کہ امیر کے ساتھ کھڑا نہ ہو۔ مگر امیر نے ڈانٹ دیا کہ غلطی میری ہے۔ کہ میں پہلے آکر اگلی صف میں نہیں پہنچ سکا۔ اب اس بہشتی بیچارے کو کیوں روکتے ہو۔ یہ اسلام کی برکت ہے۔ کہ کابل کا بادشاہ اور ایک بہشتی شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ اسی مساوات کا نتیجہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

نماز کے ذریعے تعلق باللہ

جب انسان نماز پڑھتا ہے۔ اور روحانی ترقی حاصل کرتا ہے۔ تو اس کے قلب میں کسی درجے تک اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح میں یہ تجلی اصل میں روح اعظم کی تجلی ہوتی ہے، اُس کا عکس پڑتا ہے۔ اور اس کے واسطے سے انسان کا تعلق خدا کی تجلی اعظم کے ساتھ قائم رہتا ہے تو قابلِ غور یہ بات ہے۔ کہ جس نمازی کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو گا چاہے وہ کسی بھی درجہ میں ہو کیا ایسا شخص کسی دوسرے پر زیادتی کر سکے گا۔ وہ تو اللہ کے بندوں کو اپنے جیسا ہی سمجھے گا۔ کسی کا حق تلف نہیں کرے گا، بلکہ مخلوقِ خدا کی خدمت کرے گا۔ اپنے آپ کو اُن کا خادم سمجھے گا۔ وقت ضائع کرنے والا نہیں بنے گا۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر[1] میں فرماتے ہیں۔ کہ دین کا خلاصہ دو چیزیں ہیں یعنی اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ ایک اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور دوسری اللہ کی مخلوق پر شفقت۔ یہ دونوں چیزیں نماز سے حاصل ہوتی ہیں۔ دِل میں خدا تعالیٰ کی عظمت، اعضاء و جوارح سے ادب اور زبان سے حمد و ثنا۔ یہ تینوں چیزیں نماز کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ نماز میں اجتماعیت کی بنا پر مساوات کا تصور اور اللہ کی مخلوق پر شفقت پیدا ہو گی۔ اور جب دِل و دماغ میں یہ بات آگئی کہ

---

[1] تفسیر کبیر ص ج

تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ تمام مومن جسدِ واحد کی طرح ہیں کسی کو ایک دوسرے پر برتری حاصل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر اور نہ امیر کو غریب پر، تو شفقت علی خلق اللہ خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ یہ نماز کی برکات ہیں۔

الغرض مشرک اور کافر لوگ دوزخ میں کہیں گے، افسوس! ہم نے قرآن پاک کے پروگرام پر عمل نہ کیا، جماعت میں شریک نہ ہوئے، افسوس! ہم نماز کی حقیقت کو نہ پا سکے۔

نماز کے دنیوی فوائد

نماز کے دنیوی فوائد میں وقت کی پابندی اور طہارت جیسی چیزیں ہیں۔ کافر گندے رہتے ہیں۔ ان کا لباس پاک نہیں رہتا۔ وضو اور استنجا نہیں ہوتا۔ جسم پاک نہیں ہوتا۔ نمازی مومن کو طہارت، اجتماعیت، اور مساوات کا سبق ملتا ہے۔ دنیا کی دیگر اقوام کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی اجتماعیت کی وہ روح حاصل نہیں کر سکتیں، جو مسلمان کو ہر روز نصیب ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ درد میں اس اجتماعیت کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم نے نماز کی حقیقت کو نہیں پایا۔ اسی لیے تو اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ" ایسے نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔ بربادی اور ہلاکت ہے "الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ" جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔ "وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ" اور ایک دوسرے کو برتنے کی چیزیں بھی دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں ہمدردی کا ذرہ بھی باقی نہیں رہا۔ ایسے بدبختوں نے نماز کی روح کو نہیں پایا۔ ایسے نمازی "هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ" اپنی نماز سے غافل ہیں۔ انہیں نماز کی ہوا تک نہیں لگی۔ وہ تو محض ایک عادت پوری کر رہے ہیں۔ اگر نماز کی حقیقت کو پا لیتے، تو ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ ظلم کو مٹاتے۔ کیونکہ تعلق باللہ کا لازمی نتیجہ خدمت خلق اور عدل و انصاف کی بالا دستی ہے۔

قرآن پاک کا کُل عالمی پروگرام

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ قرآن پاک کا کل عالمی پروگرام یہ ہے۔ "قُمْ فَأَنذِرْ" یعنی چار بنیادی چیزیں عدالت، اخبات، طہارت اور سماحت ہیں۔ ہمارے دین کے یہ چار بنیادی اخلاق کبھی منسوخ نہیں ہوئے اور نہ کبھی منسوخ ہوں گے۔ اسلام کا عالمی پروگرام یہی تعلیم دیتا ہے۔ نماز کے بارے میں جتنی باتیں میں نے عرض کیں وہ سب اس پروگرام کے تحت آتی ہیں۔ یہ پروگرام قرآن پاک نے دنیا کی تمام اقوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس پروگرام میں سب سے

---

[1] حجۃ اللہ ص ۵۳ تا ۵۵ ج ۱

پہلا نمبر نماز کا ہے۔ جس کے ذریعے یہ ساری چیزیں نصیب ہوتی ہیں۔ دوسرا نمبر تعلق باللہ اور مخلوق کے ساتھ شفقت کا ہے۔

مساکین کو کھانا کھلانا

دوزخیوں نے اپنا پہلا جرم تو یہ بتایا کہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ دوسرا جرم یہ کہا کہ کُنَّا نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ جہنم میں آنے کی دوسری وجہ یہ ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیئے۔ محض اپنے عیش و آرام میں زندگی نہیں گزار دینی چاہیئے۔ بلکہ محتاجوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ مسلم شریف کی روایت[1] میں آتا ہے۔ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ کسی نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اسلام کی باتوں میں افضل بات کون سی ہے۔ آپ نے چند چیزیں بیان فرمائیں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے اَنْ تُطْعِمَ الطَّعَامَ۔ کہ محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ نطعم المسکین کا یہ معنی ہرگز نہیں۔ کہ بھکاری پیدا کیے جائیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے۔ کہ مسکین کی ہر جائز ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ آپ ناداروں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ انہیں روزگار مہیا کر سکتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو کر قوم کے معزز افراد میں شامل ہو سکیں۔ اگر ہماری قوم کے افراد ذلیل و رسوا ہوں گے، تو بحیثیت مجموعی قوم کو عزت نصیب نہیں ہو گی۔ لہٰذا مساکین کو کھانا کھلانے سے مراد ان کی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا ہے۔ بھیک مانگنا تو ویسے ہی حرام ہے۔ شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ[2] میں فرماتے ہیں۔ کہ اکساب ضارہ یعنی مضر پیشوں میں چوری، ڈاکہ اور گداگری بھی شمار ہوتی ہے۔ چند شرائط کے ساتھ تھوڑے وقت کے لیے سوال کرنا اسلام نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس کو پیشے کے طور پر اپنا لینا کسی صورت جائز نہیں۔ بلکہ حرام ہے۔ سُحْتًا یا کُلُہَا صَاحِبُہَا[3] جو شخص غنی ہے، کام کاج کرنے کے قابل ہے۔ معذور نہیں ہے، مجبور نہیں ہے۔ ایسا شخص اگر بھیک مانگتا ہے۔ تو حرام ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا بھی جائز نہیں۔

دوزخ میں سزا کی ایک اور وجہ بھی پہلے گزر چکی ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ" یعنی وہ اللہ پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اس کا تعلق باللہ درست نہیں تھا، توحید نہیں تھی۔ فکر پاک

۱۔ مسلم ص ۴۸ ج ۱ ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۴۳ ج ۱ ۳۔ مسلم ص ۳۳۴ ج ۱

نہیں تھی۔ اور دوسری بات یہی کہ "وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ" مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتا تھا۔ انسانی ہمدردی مفقود تھی۔ جن کی وجہ سے دوزخ کا مستحق ٹھہرا۔

بیہودہ باتوں میں شمولیت

دوزخ میں جانے والے اپنا تیسرا جرم یہ بیان کریں گے۔ کُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ یعنی ہم بیہودہ اور لغو باتوں میں گھسنے والوں کے ساتھ گھس جاتے تھے۔ ہر کھیل تماشے میں شامل ہو جاتے تھے۔ مسلمان کے لیے یہ شایان شان نہیں کہ وہ ایسی فضولیات کی طرف توجہ دے۔ وہ تو ایسا کام کرتا ہے جو دنیا و آخرت میں اس کے لیے مفید ہو۔ وہ کھیل تماشے کو پسند نہیں کرتا۔ غیبت، عیب جوئی، چغل خوری سے اجتناب کرتا ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ یہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کیا ہے۔ خبروں اور بعض محدود باتوں کو چھوڑ کر باقی سب بیہودہ گانے، کنجریوں اور فلم ایکٹرسوں کے ناچ، عریانی اور فحاشی ہے تھیٹروں اور سینما گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ ان واروں میں بیٹھتے تھے۔ اس زمانے میں یہ لعنت ہر گھر میں پہنچ گئی ہے۔ ہر شخص اس میں شریک ہو گیا ہے الا ماشاء اللہ۔ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ کا یہی مطلب ہے۔ کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم فسق و فجور میں دوسروں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

انکارِ آخرت

چوتھی بات یہ کی کہ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ کہ ہم قیامت کے دن یعنی انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یوں کہتے تھے۔ کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ کوئی حساب کتاب نہیں ہو گا۔ کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ دنیا میں ہم جو جی میں آتا کرتے تھے۔ قیامت کا انکار کرتے رہے۔ یہ ہمارے جرائم ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم دوزخ میں داخل کئے گئے۔

محاسبے کا تصور

قرآن پاک تمام اقوام عالم میں قیامت کی فکر پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ فکر ہے۔ جس سے محاسبے اور باز پرس کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اگر قیامت کا تصور باقی نہ رہے۔ تو محاسبہ کا تصور خود بخود ختم ہو گیا۔ اور انسان اس دنیا میں شتر بے مہار کی طرح جدھر چاہا، چلا جائے گا۔ انگریز نے اسی تصور کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ چاہا کہ انہیں کھیل کود کی طرف راغب کر دو۔ فحاشی اور عیاشی میں مبتلا کر دو۔ فلم ہی دیکھتے رہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن سے دل بہلاتے رہیں۔ ان کا سارا وقت لہو و لعب میں گزر جائے اور یہ محاسبے کے تصور سے بے نیاز ہو جائیں۔

تو کافر یہی کہیں گے۔ کہ ہم یوم الدین کی تکذیب کرتے رہے۔ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ یہاں تک

کہ موت کا وقت آگیا۔ ہم اسی وہم میں ہے۔ کہ یہ زندگی اس دنیا تک محدود ہے۔ کوئی قیامت نہیں۔
کوئی باز پرس نہیں۔ ہم یہی سوچ رہے تھے۔ کہ یقینی بات یعنی موت آگئی اور دنیا کا دور ختم ہوگیا۔

شفاعت کا تصور

فرمایا فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ پس ایسے لوگوں کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی کام نہیں دے گی۔ اول تو کوئی سفارش کرنے والا ہی نہیں ہوگا۔ اور اگر سارے نبی اور سارے مومن بھی سفارش کریں۔ تو ان کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے۔ کہ کافر و مشرک کے حق میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ مومن، نبی، شہید، گنہگاروں کے حق میں سفارش کریں گے۔ اور انہیں جہنم سے رہائی حاصل ہو جائے گی۔ مگر آخر میں یہ چار قسم کے مجرمین رہ جائیں گے۔ ان کے بارے میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ لَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ کیونکہ سفارش کے لیے شرط ہے۔ کہ ایمان ہو، تعلق باللہ ہو، تکذیب نہ ہو اور قیامت کے دن کو برحق تسلیم کیا جائے۔ چونکہ ان لوگوں نے ان شرائط کو پورا نہ کیا۔ لھذا یہ دائمی جہنمی ٹھہرے۔ ان کے حق میں کوئی شفاعت مفید نہ ہوگی۔

درس ہفتم ۷ (آیت ۴۹ تا ۵۶)

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

ع ۲ ۲۵ ۱۶

ترجمہ: پس ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں ﴿۴۹﴾ جیسے کہ وہ جنگلی گدھے ہیں ﴿۵۰﴾ جو بھاگ رہے ہیں شیر سے ﴿۵۱﴾ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے ﴿۵۲﴾ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں ﴿۵۳﴾ ہرگز نہیں یہ قرآن تو سراسر نصیحت ہے ﴿۵۴﴾ جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے ﴿۵۵﴾ اور لوگ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ وہی ہے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ﴿۵۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

مومنین جنت میں پہنچ کر خیال کریں گے کہ دوزخ والوں کا حال دریافت کیا جائے اور ان سے دریافت کیا جائے۔ کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لائی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں گزر چکا ہے۔ دوزخ والے جواب دیں گے کہ چار جرائم کی وجہ سے وہ یہاں آئے۔ وہ چار جرم یہ ہیں۔ کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے۔ مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ ہم لایعنی باتوں کے اندر گھستے تھے، اور ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہ ہمارا قصور ہے۔ جس کی وجہ سے جہنم واصل ہوئے۔ دنیا میں اس قسم کی باتوں میں مبتلا تھے یہاں تک کہ موت آگئی۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے بارے میں سفارش کرنے والوں کی سفارش مفید نہیں ہوگی

نصیحت سے اعراض

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے انذار کی بات کی تھی یعنی "يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ" اے لحاف اوڑھنے والے اٹھ اور ان کو ان کے برے انجام سے ڈرا۔ اب سورۃ کے آخری حصہ میں انذار کا دوبارہ ذکر ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ان لوگوں کو کیا

ہو گیا ہے۔ کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اللہ کا نبی تو تذکرہ نصیحت اور قرآن پیش کرتا ہے۔ جو نہایت پاکیزہ باتیں ہیں۔ اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔ ان میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ مگر یہ لوگ ان باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ انہیں تو اس پروگرام کو تسلیم کر لینا چاہیئے تھا۔ مگر نہ معلوم یہ اس سے کیوں اعراض کرتے ہیں۔

قرآن پاک یاددھانی کراتا ہے

جب انسانوں میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو قرآن یاد دلاتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اپنا تعلق درست کرو۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ قیامت کے محاسبے کو پیش نظر رکھو۔ قرآن پاک تذکرہ ہے۔ قرآن پاک کے جہاں اور نام مثلاً ذکر، شفا، ہدایت اور بیان ہیں، منجملہ ان کے تذکرہ بھی ہے۔ آج کل جدید عربی میں تذکرہ گاڑی وغیرہ کے ٹکٹ کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جو ڈائری لکھی جاتی ہے۔ اس کو بھی تذکرہ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ بھی یاددہانی ہوتی ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نصیحت سے اعراض کرنے والے لوگ ایسے ہیں کَاَنَّھُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ جیسے جنگلی گدھا ہوتا ہے۔ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ جو شیر کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے قسورہ شیر کو کہتے ہیں۔ جنگلی گدھا اگر شیر کو دیکھ پائے تو جس طرح وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ نصیحت سن کر دوڑ پڑتے ہیں۔ گویا قرآن ان کے سامنے ایسا ہے جیسے شیر ہو جس کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوں۔ قسور کا لغوی معنی شور کرنا یا گرجنا ہے۔ چونکہ شیر میں گرجنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لیے جبشی زبان میں اسے شیر کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا متبادل لفظ اسد ہے۔

اعراض کی وجوہات

اعراض کی کئی وجوہات ہیں۔ یا تو یہ نافہمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ انسان نافہم ہے۔ جس طرح بچے نافہمی کی وجہ سے تعلیم سے اعراض کرتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہوتا، فہم و ادراک نہیں ہوتا کہ تعلیم کس قدر اچھی چیز ہے۔ یا پھر اعراض طبعی نفرت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جس طرح بیمار دوائی پینے سے نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ یہ اُس کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اور شفا کا سبب ہوتی ہے۔ مگر وہ طبعی نفرت کی وجہ سے اعراض کرتا ہے۔

بعض اوقات انسان کسی چیز سے نفرت محض وہم کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی بیمار کا فصد کرتے ہیں، خون نکالتے ہیں۔ تو اُسے وہم ہو جاتا ہے۔ کہ خون نکالنے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اُس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خون کا نکالنا، اُسے بیماری سے نجات دلانے کے لیے

ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی کی بقا کی خاطر کیا جاتا ہے۔ الغرض اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مشرکین کیوں اعراض کرتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہیں۔ جیسے جنگلی گدھے ہوں جو شیر کا نام سُن کر بھاگ جائیں۔ انہیں تو چاہیئے تھا۔ کہ قرآن کی بات تسلیم کر لیتے، نہ کہ اس سے دور بھاگتے۔

کفار کی ہٹ دھرمی

اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے کفار کی ایک اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کیا فرمایا بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے۔ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً کہ اُسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے۔ بعض کافر ہٹ دھرمی کی وجہ سے کہتے تھے لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ ہمیں ایسی کتاب نہ دی جائے۔ جیسی اللہ کے رسول پر کتاب نازل ہوتی ہے۔ یعنی ہر شخص کے ہاتھ میں ایک نوشتہ دیا جائے۔ جس میں یہ حکم موجود ہو کہ تمہیں نبی کی بات کو مان لینا چاہیئے۔ ایک اور جگہ وضاحت سے بیان کیا کہ یہ کفار چاہتے ہیں۔ کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ یعنی ہمیں بھی ویسے ہی کتاب دی جائے جس طرح اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔ بعض کفار یوں کہتے تھے۔ کہ ہم اُس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ ہمارے سامنے کتاب نازل نہ کریں۔ آپ ہمارے سامنے آسمان پر جائیں۔ وہاں سے کتاب اتاریں، تب ہم مانیں گے۔

ہر شخص پر کتاب نہیں اتاری جاتی

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كَلَّا یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کیا ہر شخص رسولوں کی طرح ہے۔ کہ اُسے کتاب دی جائے۔ اُس پر وحی نازل کی جائے۔ ہر شخص تو اس کی استعداد ہی نہیں رکھتا۔ کہ اُسے براہ راست مخاطب کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کے — انکار کی اصل وجہ یہ ہے بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ کہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں۔ اس پر یقین نہیں رکھتے۔ جیسا کہ پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔ "وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ" یعنی ہم قیامت کے دن کی تکذیب کرتے تھے، ساری خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے۔ جب انسان کی نگاہ محاسبے کے عمل پر نہ ہو، تو پھر وہ من مانی کرتا ہے۔ ان کے انکار کی اصل وجہ یہی ہے۔ کہ یہ یوم آخرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر اب مطالبہ یہ پیش کر رہے ہیں۔ کہ ہم پر بھی کتاب اتاری جائے جس طرح رسولوں پر اتاری جاتی ہے۔ فرمایا ایسا کرنا فطرت کے خلاف، عقل اور نقل کے خلاف ہے۔ ہر ایک آدمی کو اُس کی مرضی کے مطابق صحیفہ نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ كَلَّا اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ

قرآن پاک تو ایک یاد دہانی اور نصیحت ہے۔ جو شخص چاہے۔ اس کو تسلیم کرے ہر شخص کے لیے علیحدہ علیحدہ صحیفہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ صحیفہ کا مقصد تو امت کی اجتماعی تعلیم و تربیت ہوتا ہے۔ اور سوسائٹی کے ہر شخص کو فرداً فرداً تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ یہ کام تو جماعت بندی کے ذریعے اجتماعی صورت میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ کافر چاہتے ہیں۔ کہ ہر شخص کو الگ الگ صحیفے کے ذریعے اس کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، یہ ناممکن ہے۔

ہدایت کا مدار طلب پر ہے

اس نصیحت یعنی قرآن پاک کے متعلق فرمایا۔ وَمَا یَذْکُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ حقیقت یہ ہے۔ کہ لوگ قرآن پاک سے نصیحت حاصل نہیں کر سکتے "مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے چاہنے کے متعلق قرآن پاک میں اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ کہ جو شخص اپنی مرضی اور اختیار سے ہدایت کا طالب ہو گا اُسے ہدایت حاصل ہو گی۔ اور جو شخص اپنی خواہش سے ہدایت طلب نہیں کریگا۔ اُسے یہ نعمت میسر نہیں آئے گی سے یہ یاد دہانی مفید نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس کے اندر طلب اور خواہش نہیں پائی جاتی۔ ہدایت کے حصول کے لیے طلب، خواہش اور ارادے کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ ہدایت مفید نہیں ہو گی۔

دوسری جگہ فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّاٰتٰھُمْ تَقْوٰھُمْ "مطلب یہ کہ جو ہدایت کی طرف آنا چاہے ہم اُس کے لیے راستہ کھول دیتے ہیں اور ان کے لیے ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور تقویٰ سے سرفراز کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ عناد، ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں "بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ" (النساء ۱۵۵) اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے انکے دلوں کو بند کر دیتے ہیں۔ مقصد یہ کہ طالبانِ ہدایت کے لیے ہدایت کے راستے کھلے ہیں، اور جو شخص اس کی خواہش ہی نہ رکھے۔ اُسے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اہل تقویٰ اور اہل مغفرت

ہدایت کا یہ اصول بیان کرنے کے بعد فرمایا ھُوَ اَھْلُ التَّقْوٰی وَاَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ یعنی وہی ہے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت۔

مفسرین نے اس کی تفسیر دو طرح سے بیان کی ہے۔ عام تفسیر تو یہ ہے۔ کہ خدا تعالےٰ ہی اہل

تقویٰ اور اہل مغفرت ہے ۔ حدیث قدسی میں[1] ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے اَنَا اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰی!
یعنی میں ہی اس کا اہل ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے ۔ اور تقویٰ اختیار کیا جائے ______

______ فَمَنِ اتَّقَانِیْ فَلَمْ یَجْعَلْ مَعِیَ اِلٰهًا فَاَنَا
اَهْلُ اَنْ اَغْفِرَلَهٗ[2] پس جب بندہ مجھ سے تقویٰ اختیار کرے گا ۔ مجھ سے ڈرے گا شرک نہیں کریگا
تو میں اس کا اہل ہوں کہ اُسے بخش دوں ، معاف کر دوں ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی انہیں لوگوں پر ہوتی
ہے ، جو شرک نہیں کرتے اور اس کی سزا سے ڈرتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت
سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے ۔

بعض کہتے ہیں ۔ کہ ھُوَ کا مرجع اللہ کی طرف نہیں بلکہ انسانوں کی طرف ہے ۔ یہ انسان دو قسم
کے ہیں ۔ بعض اہل تقویٰ ہیں ، جو نیکی اور عدل کا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے
غنیۃ الطالبین[3] میں تقویٰ کی تعریف اس آیت سے کی ہے اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی تقویٰ سے مراد یہ ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے قرابت داروں
کے حقوق کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے ۔ اور تین چیزوں سے منع کرتا ہے ۔ وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ فحش ، منکرات اور سرکشی سے منع کرتا ہے ۔ مقصد یہ کہ اہل تقویٰ وہ لوگ ہیں ، جو عدل
پر عمل پیرا ہیں ۔ اور اہل مغفرت وہ ہیں ، جن سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ
ہیں ۔ ایک تو وہ جن سے گناہ سرزد ہوا اور پھر وہ اُس پر جمے رہے ۔ ایسے لوگوں کی فلاح کی کوئی صورت
نہیں ۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے ۔ انہوں نے پوری زندگی اصلاح کی کوشش نہ کی حتیٰ کہ انہیں موت آگئی ۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں ۔ جن سے غلطی ہوئی ، گناہ سرزد ہوا ۔ مگر وہ سنبھل جاتے ہیں ۔
فوراً تائب ہو جاتے ہیں ۔ اور اس کے بعد اعمال صالح کرنے لگتے ہیں ۔ بُرے اعمال پر نادم ہوتے
ہیں ۔ اور اس کی تلافی کرتے ہیں ۔ جیسے کہ ارشاد ربانی ہے اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا یعنی جن لوگوں
نے توبہ کی اور پھر اچھے عمل کیے ، اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا ۔ خدا تعالیٰ سے معافی مانگی ایسے ہی لوگ
اہل مغفرت ہیں ۔

---

[1] ترمذی ص ۴۸۰ [2] ترمذی ص ۴۸۰

حضرت ابو سفیانؓ اپنے خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے بڑی کوتاہیاں کی ہیں انیس سال تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے دین کی نعمت عطا فرمائی تو سابقہ کوتاہیوں پر نادم ہوئے۔ اور عمر بھر اس کی تلافی کرتے رہے۔ اپنے خاندان کو بھی تلقین کرتے رہے۔ اور خدمتِ اسلام کی طرف راغب کرتے رہے۔ اور انہیں اسلام کی صفِ اوّل میں خدمت کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ خود ہمیشہ جہاد و قربانی میں پیش پیش رہے۔ جہاد میں ایک آنکھ بھی جاتی رہی مگر بوڑھا ہونے کے باوجود معرکہ یرموک میں شریک ہوئے۔ تلوار تو چلا نہیں سکتے تھے۔ مگر مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ان کو ہدایت دیتے رہے۔ جرأت اور بہادری کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔ کہتے تھے۔ کہ بھائی آج تم جس جگہ کھڑے ہو۔ لَہٗ مَا بَعْدَہٗ اس دن کو لوگ تاریخ میں یاد رکھیں گے۔ چنانچہ اس معرکہ میں شام فتح ہوا۔ ایسے ہی لوگ اہل مغفرت ہیں۔

الغرض اہل تقویٰ سے وہ لوگ مراد ہیں، جو ابتداء سے عدالت اور نیکی پر قائم رہتے ہیں۔ اور اہل مغفرت وہ ہیں۔ کہ کوتاہی ہوتی مگر تائب ہو کر اصلاح کر لی۔ اللہ تعالیٰ اشارۃً یہ بات سمجھا رہے ہیں۔ کہ کفر و شرک کرنے والے اب بھی باز آجائیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے دروازے کھلے ہیں۔ انکی غلطیاں معاف ہو جائیں گی۔ اگر یہ لوگ اہل تقویٰ میں شامل نہیں ہو سکے تو کم از کم اہل مغفرت میں تو شامل ہو جائیں۔ قرآن پاک سے اعراض کسی صورت بھی مفید نہیں، بلکہ ناکامی کا ذریعہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

لہ محاضرات ص ۱۹۲/۱ح

سورۃ القیمۃ

(مکمّل)

درس اوّل ١ — (آیت ١ تا ١٥)

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ قیامت مکی ہے اور یہ چالیس آیتیں ہیں اور اس سورت میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿١﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿٣﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿٤﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿٥﴾ يَسْــَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿٦﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿٩﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿١٣﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿١٥﴾

ترجمہ:- میں قسم اٹھاتا ہوں قیامت کے دن کی (١) اور میں قسم اٹھاتا ہوں نفس لوامہ کی (٢) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز اکٹھا نہیں کریں گے (٣) کیوں نہیں۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے پور پور کو برابر کر دیں (٤) بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے (٥) وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئیگا (٦) پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی (٧) اور چاند بے نور ہو جائے گا (٨) اور سورج اور چاند کو یکجا کر دیا جائے گا (٩) انسان کہے گا اس دن کہ اب بھاگ کر کہاں جائے (١٠) خبردار اب بچاؤ کی کوئی جگہ نہیں (١١) ٹھہرنے کی جگہ اس دن تیرے رب کی طرف ہی ہوگی (١٢) اس دن انسان کو اس سے خبردار کر دیا جائیگا جو اس نے آگے بھیجا تھا اور جو پیچھے چھوڑا تھا (١٣) بلکہ انسان اپنے نفس پر خوب بصیرت رکھتا ہے (١٤) اگرچہ وہ اپنے کتنے ہی حیلے بہانے کرے (١٥)

کوائف اور مضامین

اس سورۃ کا نام سورۃ القیامۃ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں قیامت کا ذکر ہے۔ اس سورۃ کی چالیس ۴۰ چھوٹی چھوٹی آیتیں اور دو ۲ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ننانویں ۹۹ الفاظ اور چھ سو باون ۶۵۲ حروف پر مشتمل ہے۔ اس سورۃ کا مرکزی مضمون قیامت کا واقع ہونا اور جزائے عمل کا پیش آنا ہے۔ اس میں منکرین قیامت کو تنبیہ کی گئی ہے اور ان کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

یہ سورۃ اس سے پہلی سورۃ مدثر کے ساتھ مربوط ہے۔ اُس سورۃ میں بھی قیامت پہ ایمان کا ذکر تھا، اس میں بھی ہے۔ پہلی سورۃ میں سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی تھی، اس میں قدرے نرمی پائی جاتی ہے۔ مگر مضمون آپس میں ملتا جلتا ہے۔ سورۃ مدثر میں فرمایا تھا "ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا" آپ چھوڑ دیں مجھے اور اُسے جسے میں نے تنہا پیدا کیا، وہی شخص جسے میں نے مال اور اولاد دی اور دیگر سامان زندگی مہیا کیا۔ یہ شخص ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ "سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا" ہم اُس کو مشکل چڑھائی پر چڑھائیں گے۔ اور پھر اس کی حالت یوں بیان فرمائی۔ "اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ" یعنی اس نے غور فکر کیا فَقُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ پس یہ تباہ و ہلاک کیا جائے اس نے کیسا اندازہ کیا۔ پھر اُس نے تیوری چڑھائی اور پشت پھیری، اُس نے غرور و تکبر کیا۔ ہم اُس کو چھوڑیں گے نہیں۔ اور یہ سب کچھ کب ہوگا فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ جب ایک کھوکھلی چیز کے اندر پھونک ماری جائے گی یعنی صور پھونکا جائے گا۔ یقیناً وہ دن بڑا دشوار ہوگا۔ ہم اُسے ضرور سزا دیں گے، اُسے چھوڑیں گے نہیں۔

سورۃ کے آخر میں اُن لوگوں کا ذکر فرمایا جو قرآن کریم کے پروگرام اور قیامت سے غفلت اختیار کرتے ہیں، اور اعراض کرتے ہیں۔ اُن کے متعلق سختی سے فرمایا "كَاَنَّهُمۡ حُمُرٌ مُّسۡتَنۡفِرَةٌ" گویا کہ یہ بدکنے والے گدھے ہیں۔ اس کے بعد ان کا دوزخ کا حال بیان کیا جب ایمان والے اُن دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ تم کس گناہ کی پاداش میں جہنم واصل ہوئے، تو وہ اپنا حال بیان کریں گے۔

اس سورۃ قیامت میں بھی منکرین قیامت کو تنبیہ کی گئی ہے، مگر ذرا نرمی کے ساتھ، جیسے فرمایا "اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ"، کیا انسان یوں گمان کرتا ہے۔ کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو دوبارہ جمع نہیں کر سکیں گے۔ یا یوں کہتا ہے یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَةِ۔ "یعنی بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ پوچھتا ہے۔ کہ قیامت کب آئے گی۔ یہ واقع کیوں نہیں ہو جاتی۔ پچھلی سورۃ میں قیام قیامت کا ابتدائی منظر بیان کیا گیا تھا۔ کہ صور پھونکے جانے کے بعد یہ واقعات پیش آئیں گے

مگر اس سورۃ میں قیامت کی ابتدا اور انتہا دونوں بیان کر دیں۔ مثلاً ابتدا میں فرمایا "فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ" یعنی قیامت کی ابتدا اس وقت ہوگی جب آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ جب اللہ تعالیٰ کی تجلی نازل ہوگی تو حالات درہم برہم ہو جائیں گے، ہر شخص حیرت و استعجاب کے دریا میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اور حالت یہ ہوگی کہ "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ"۔ اس دن بعض چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔ نیز "وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ" بعض چہرے اداس اور ترش ہوں گے۔ اس قسم کی حالت اس دن ہوگی۔ سورۃ مدثر میں صور پھونکنے کا ذکر کیا جس سے کان متاثر ہوں گے۔ اس سورۃ میں "بَرِقَ الْبَصَرُ" کہہ کر آنکھ متاثر ہونے کا ذکر فرمایا یعنی جب قیامت کے حیرت انگیز مشاہدات اس کی نگاہ کے سامنے آئیں گے تو انسان حیرت اور خوف و دہشت کے عالم میں کہے گا۔ "اَيْنَ الْمَفَرُّ" کہ کہاں بھاگ جائے اور کہاں پناہ حاصل کرے۔ الغرض اس سورۃ مبارکہ میں بھی وقوعِ قیامت کے منکرین اور جزائے عمل کے منکرین کا ذکر فرمایا۔ اور ان کا رد فرمایا۔

لفظ لا کی تشریح

اس سورۃ مبارکہ کی ابتدا قسم سے کی گئی ہے۔ اور اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے "لا" یا تو قسم کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ اور یا اس کا معنی "نہیں" ہوتا ہے یعنی لا نفی کا ہوتا ہے۔ اس مقام پر "لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ" کا معنی یہ ہے۔ کہ میں قسم اٹھاتا ہوں، قیامت کے دن کی۔ کسی چیز کی قسم اٹھانے سے مراد اس چیز کو گواہ بنانا ہوتا ہے یا قسم اٹھانے سے اس چیز کا مشاہدہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس جگہ قسم سے تعظیم والا معنی مراد نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی دوسری چیز کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے[1]۔ کیونکہ ایسا کرنے سے شرک میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شان جدا ہے۔ وہ جب کسی چیز کی قسم اٹھاتا ہے، تو اس چیز کو بطور گواہ پیش کرتا ہے۔ اور یہاں پر "لا" تاکید کے لیے ہے یہ "لا" کسی چیز میں تاکید اور پختگی پیدا کرنے کے لیے آتا ہے۔ ایسا ہی "لا" قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ جس سے مراد نفی نہیں بلکہ تاکید ہے، جیسے "لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" یا "فَلَا اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ" اسی طرح "لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ" وغیرہ۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ "لا" نافیہ ہی ہے۔ نہ کہ تاکید قسم کے لیے۔ اس مقام پر

---

[1] ترمذی صفحہ ۲۴۰، بخاری صفحہ ۹۸۳ و ۹۸۴ ج ۲، مسلم صفحہ ۴۶ ج ۲۔ [2] تفسیر کبیر صفحہ ۲۱۵ ج ۲۹۔

مطلب یہ ہے۔ کہ یہ نفی کفار کے اُس خیال کی ہے۔ کہ قیامت یا جزائے عمل کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اس خیال باطل کی تردید فرما رہے ہیں۔ کہ نہیں! ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں، جو یہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ بلکہ قیامت ضرور بالضرور واقع ہونے والی ہے۔ تو ان معنوں میں یہ لَآ نافیہ ہی ہے۔

الغرض ابتدائے سورۃ میں دو چیزوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اور میں قسم کھاتا ہوں نفس لوامہ کی۔ کہ یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قیامت ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ آگے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

نفس کی تین حالتیں

حضرت شاہ عبد القادرؒ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ نفس کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی حالت نفس امّارہ کی ہے۔ یہ حالت عام طور پر بچپن کی ہوتی ہے۔ جب انسان کھیل کود اور لہو و لعب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ زیادہ تر انسان کا دھیان باطل باتوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کو نفس امارہ کہتے ہیں۔ جب شعور کی منزل آتی ہے۔ تو انسان کا نفس کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور برائی کی ملامت کرتا ہے۔ اور بعض اوقات برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ملامت کرنے والی منزل نفس لوامہ کی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں[۲] کہ قیامت کے دن ہر نفس النفس لوامہ بن جائے گا۔ نیکو کار بھی اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں اور زیادہ نیکی کیوں نہ کمائی اور بدکار بھی اپنے نفس کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں برائی کو کیوں نہ چھوڑا۔ اگر میں نے نیکی کو اختیار کیا ہوتا تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ مقصد یہ کہ نفس لوامہ کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ نیکی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ اور برائی پر نفس ملامت کرتا ہے۔

نفس کی تیسری حالت نفس مطمئنہ ہے۔ اگر نفس میں وہ کیفیت پیدا ہو جائے، جس سے اُسے اطمینان حاصل ہو جائے، قوانین الٰہی کے ساتھ تعلق پیدا ہو جائے اور برائی سے ہٹ جائے۔ نہ تو وسوسہ شیطانی اُسے برائی کی طرف مائل کرے اور نہ خواہشات نفسانی ہی اُسے برائی پر آمادہ کر سکیں، تو یہ نفس مطمئنہ کہلاتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے۔ کہ نفس لوامہ کو قیامت کے ساتھ کیوں جمع کیا ہے۔

---

[۱] موضح القرآن سورۃ قیامت پ ۲۹ مطبوعہ تاج کمپنی [۲] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۴۲ پ ۲۹

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی تنبیہ کے لیے ہیں اور برائی سے روکنے کا ذریعہ ہیں قیامت کے ذکر کرنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ انسان اس کی ہولناکی سے ڈر جائے اور برائی سے بچ جائے۔ اور اسی طرح نفس لوامہ بھی انسان کو برائی اختیار کرنے پر تنبیہ کرتا ہے۔ گویا انسان کو برائی سے روکنے اور نیکی پہ چلنے میں یہ دونوں چیزیں مدد دیتی ہیں۔ لہذا ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے۔ کہ جدید تمدن نے انسان کی اخلاقی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اذہان کو کھیل تماشے، لہو و لعب ریڈیو، ٹیلیویژن، فلم اور آرٹ گیلری میں اس طرح محو کر دیا ہے کہ نیکی کی طرف دھیان دینے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ایسی ہی حالت میں انسان کا نفس لوامہ اُسے ملامت کرتا ہے۔ گویا قیامت اور نفس لوامہ دونوں انسان کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔ لہذا اُن کو اکٹھا ذکر کیا ہے۔

بعث بعد الموت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے۔ کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کریں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ کہ مشرک اور کافر کہتے ہیں۔ "أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی۔ یا یوں کہتے ہیں۔ "إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ" جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے ہمارے ذرات منتشر ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے! "هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ" یہ تو بڑی بعید سی بات ہے۔ عقل نہیں مانتی۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔ بلیٰ کیوں نہیں قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ، ہم اس پہ قادر ہیں۔ کہ اس کے پور پور کو درست کر دیں۔ یہ پور پور کا لفظ یہاں پہ محاورے کے طور پہ استعمال ہوا ہے۔ جس طرح کوئی کہتا ہے۔ کہ میرے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ تکلیف ہو رہی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس کے پور پور کو درست کر دیں گے۔ یعنی انسان کو بالکل اُسی حالت میں دوبارہ لے آئیں گے۔ جس طرح یہ دنیا میں تھا۔ قیامت کے روز انسان کا جسم انہیں اجزاء کا مرکب ہو گا، جن کا وہ دنیا میں تھا۔ کوئی دوسرا جسم عطا نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنا انصاف کے خلاف ہو گا۔ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انسان کو انہیں عناصر کے ساتھ دوبارہ زندہ کرے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ کیسے جمع کرے گا۔ تو اس کے دلائل مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ علیم کل ہے اور قادر مطلق ہے۔ اُسے علم ہے۔ کہ کسی انسان کے جسم کا کوئی ذرہ کہاں پہ ہے۔

اور پھر وہ انہیں اکٹھا کرنے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا انسان کو بالکل اسی حالت پر دوبارہ قائم کر دینا اللہ تعالیٰ کے لیے نہایت آسان ہے۔ اُس نے فرمایا ہے کہ میں اس کا جوڑ جوڑ ٹھیک کر دوں گا۔

وقوعِ قیامت

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ انسان چاہتا ہے کہ قیامت کا انکار کر کے دنیوی زندگی میں ڈھٹائی اور بے حیائی کرتا رہے۔ اگر قیامت کے وقوع کا عقیدہ ہو گا تو پھر برائی سے رُکنا پڑے گا، مگر یہ تو چاہتا ہے۔ کہ اس کی برائی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ جو چاہے کرتا پھرے۔ اور اب یہ بے حیائی سے پوچھتا ہے۔ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کہ قیامت کب آئے گی۔ مگر صورتِ حال یہ ہے۔ کہ جب قیامت آئے گی فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ تو آنکھیں چندھیا جائیں گی وَخَسَفَ الْقَمَرُ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ سورج اور چاند کو یکجا کر دیا جائے گا۔ ان کے بے نور ہو جانے پر معاملہ درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ اور پھر کیا ہو گا۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ انسان کہے گا کہ اب بھاگ کر کہاں چلا جائے۔ فرمایا کَلَّا خبردار لَا وَزَرَ اب بچاؤ کی کوئی جگہ نہیں۔ بلکہ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ۔ کہ جائے مستقر صرف تیرے رب کی طرف ہی ہے۔ وہیں جا کر ٹھہرنا ہے۔ اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اب رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔

اعمال نامہ پیش کیا جائے گا

اس کے بعد انسان جس چیز کا مستحق ہو گا اسی کی طرف جانا ہو گا، یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ اس دن انسان کو اس چیز سے خبردار کر دیا جائے گا، جو اُس نے آگے بھیجا ہے۔ اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔ اچھائی، برائی، نیکی، بدی ہر چیز اس کے سامنے ہو گی۔ جو اچھی بُری رسم پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ بھی سامنے آ جائے گی۔ کفر و شرک اور بدعت جو کچھ بھی پیچھے چھوڑ کر آیا ہے۔ سب حاضر کر دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ انسان اپنے نفس پر بصیرت رکھتا ہے۔ وہ اپنے اعمال سے باخبر ہو گا۔ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ اگرچہ وہ کتنے ہی حیلے بہانے کرے۔ اُسے معلوم ہو گا کہ کیا کام کر کے آیا ہے لہٰذا اُسے کہا جائے گا "اِقْرَاْ کِتٰبَكَ کَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا"۔

درس دوم ۲

(آیت ۱۶ تا ۳۰)

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ ع

ع ۳۰ / ۱۷

ترجمہ ۱۶: آپ اپنی زبان اس قرآن پاک کے ساتھ نہ چلائیں تاکہ آپ اس کو جلدی سیکھ لیں ﴿۱۶﴾ بیشک اس کا آپ کے دل میں جمع کرنا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے ﴿۱۷﴾ پس جب ہم اس کو پڑھیں (یعنی ہمارا فرشتہ) تو اس کے پڑھکر فارغ ہونے کے بعد آپ پڑھیں ﴿۱۸﴾ پھر بیشک اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے ﴿۱۹﴾ خبردار! بلکہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو ﴿۲۰﴾ اور چھوڑتے ہو تم آخرت ﴿۲۱﴾ اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے ﴿۲۲﴾ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے ﴿۲۳﴾ اور اس دن کئی چہرے اداس ہوں گے ﴿۲۴﴾ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائیگا ﴿۲۵﴾ خبردار جب انسان کی روح ہنسلی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے ﴿۲۶﴾ اور کہا جاتا ہے کون ہے راق (یعنی جھاڑ پھونک کرنے والا) ﴿۲۷﴾ اور انسان گمان کرتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آپہنچی ہے ﴿۲۸﴾ اور پنڈلی پنڈلی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے ﴿۲۹﴾ اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوتا ہے ﴿۳۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ کی ابتداء میں قیامت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منکرین قیامت کا رد فرمایا۔ اور ان لوگوں کی توجہ دلائی جو بعث بعد الموت اور جزائے عمل کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ قیامت اور نفس لوامہ کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ ہم انسان کی ہڈیوں کو جمع کریں گے اور اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے پور پور کو برابر کر دیں۔ درمیان میں قرآن حکیم کے متعلق کچھ ارشادات ہیں اور اس کے بعد

پھر قیامت کا ذکر ہے "کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ" یعنی تم جلدی کی زندگی کو پسند کرتے ہو "وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ" اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ یہ آیات اور اس کے بعد والی آیات قیامت سے متعلق ہیں۔

حفاظت قرآن کی ذمہ داری

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن پاک کے متعلق فرمایا "لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ" یعنی آپ اپنی زبان قرآن پاک کے ساتھ جلدی جلدی نہ چلائیں کیونکہ "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" اس کا جمع کرنا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ" پس جب ہم یعنی ہمارا فرشتہ پڑھے تو آپ اس کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ "فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" اس کے پڑھ کر فارغ ہو جانے کے بعد آپ پڑھیں، کیونکہ اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ اس میں سے کوئی چیز چھوٹنے نہیں پائے گی اور نہ ہی آپ بھولیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی اس کے معنی اور مطالب بھی آپ کی زبان سے بیان کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

وقوع قیامت اور حفاظت قرآن میں مناسبت

بظاہر وقوع قیامت اور حفاظت قرآن میں مناسبت معلوم نہیں ہوتی، مگر حقیقت میں ان دونوں کے درمیان ربط ہے۔ وقوع قیامت کے متعلق منکرین بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھتے تھے کہ قیامت کب آئے گی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس قیامت کی خبر دے رہے ہیں، وہ جلدی آجائے۔ گویا جلدبازی کرتے ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی تو حالات خطرناک ہو جائیں گے۔ آنکھیں چندھیا جائیں گی، چاند بے نور ہو جائے گا، سورج اور چاند کو اکٹھا کر دیا جائے گا اور پھر انسان کہے گا کہ اب بھاگنے کی کون سی جگہ ہے۔ تاکہ بھاگ کر اپنی جان بچا سکے مگر اس وقت کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ اور انسان کے سامنے ہر چیز پیش کر دی جائے گی یعنی جو کچھ بھی اس نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔

"لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ" کا تعلق بھی جلدبازی سے ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک یاد کرنے میں جلدی کرتے تھے۔[1] جب جبرائیل علیہ السلام قرآن پاک پڑھتے تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دل میں جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ اسے یاد کر لیں، کوئی چیز چھوٹنے نہ

---

[1] بخاری صفحہ ۷۳۳ / ۲۲، ترمذی صفحہ ۴۸۰

پائے اور کوئی چیز بھول نہ جائے۔ چونکہ یہ ایک مشقت کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیں۔ کیونکہ قرآن پاک کو حرف بحرف جمع کر دینا اور اسے آپ کی زبان پہ چڑھا دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ لہٰذا آپ جلد بازی نہ کریں۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ جب اللہ تعالےٰ علیم کل اور قادر مطلق ہے اور اُس کا اعلان ہے۔ کہ انسان کی بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کر دے گا۔ اور انسان کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر دے گا اور اس کے پور پور کو درست کر دے گا۔ تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے۔ کہ وحی آسمانی کے الفاظ کو محفوظ کر دے۔ اور اس کا کوئی لفظ یا کوئی حرف چھوٹنے نہ پائے۔ لہٰذا آپ جلدی نہ کریں۔ تو گویا حفاظت قرآن کو وقوع قیامت کے ساتھ یہی جلد بازی کی مناسبت ہے۔

قبول ہدایت میں جلدی کی خواہش

بعض فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ خواہش بھی تھی۔ کہ لوگ جلدی سے ہدایت قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا، آپ جلد بازی نہ کریں۔ کیونکہ ہدایت تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ "اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ" یعنی اے نبی کریم! آپ اپنی پسند کے مطابق کسی کو ہدایت پر مجبور نہیں کر سکتے بلکہ ہدایت دینا تو اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے۔ حقیقی مربّی اور ہادی تو ذات خداوندی ہی ہے۔ لہٰذا تربیت کے سلسلے میں جلد بازی بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ انسان فطرۃً تدریج پسند ہے آہستہ آہستہ بات کو سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کو اختیار کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق تربیت حاصل کرے گا اور ہدایت پائے گا۔ لہٰذا آپ جلد بازی نہ کریں۔ دوسری جگہ یہ بھی موجود ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک پڑھنے میں جلدی نہ کریں "مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ" قبل اس کے کہ وحی پوری ہو جائے۔ "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا" اور یہ دعا کریں کہ اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ قرآن پاک کو پڑھنے والا بمنزلہ اُستاد ہوتا ہے۔ اور بوقت تعلیم شاگرد کو غور سے سننا چاہیئے، درمیان میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی اشکال باقی رہ جائے، تو بعد میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ درمیان میں مخل نہیں ہونا چاہیئے۔

حفاظت قرآن کی تائید میں سورۃ اعلیٰ میں فرمایا "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" کہ آپ ہرگز نہیں بھولیں گے۔ سوائے اس چیز کے کہ جسے اللہ بھلانا چاہے۔ یعنی کوئی ایسی بات

جس کو اللہ تعالےٰ منسوخ کردے۔

حفظ قرآن کے ذرائع

حفاظت قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" یعنی قرآن حکیم کو ہم نے ہی نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اسباب حفاظت کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ فتح الرحمان[1] میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا سبب قرآن پاک کا جمع کرنا ہے۔ قرآن پاک کی تدوین شیخینؓ کے زمانہ میں ہوئی جب کہ اسے کتابی صورت میں لایا گیا۔ حفاظت کا دوسرا بڑا سبب اس کا مسلسل پڑھنا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہر زمانے میں قرآن پاک کے حافظ اور قاری پیدا کئے۔ جہاں تک اسے یاد کرنے کا تعلق ہے۔ اسماء الرجال والے لکھتے ہیں کہ دس ہزار صحابہؓ کو قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ اس کے بعض حصص تو ہر مسلمان کو یاد تھے اور ابتدائے اسلام کے اس دور میں کوئی بھی مسلمان ایسا نہ تھا، جسے قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد نہ ہو، تاہم ایک کثیر تعداد مکمل حفاظ کی بھی موجود تھی۔ اس کے بعد جوں جوں اسلام کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا گیا، حفاظ کی تعداد میں اسی نسبت سے اضافہ ہوتا رہا۔

جہاں تک قرآن پاک کے بیان کا تعلق ہے، اس کے معانی و مطالب اور معارف و وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں مفسرین کرام کو مقرر فرمایا، جنہوں نے اس کے معارف کو کھول کھول کر بیان کیا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2]، کہ اللہ تعالےٰ نے اپنا وعدہ اس طور پر پورا کیا کہ ہر زمانے میں مفسرین کرام کی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ اور اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ جنہوں نے مختلف زبانوں میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کی۔ گویا قرآن پاک کے الفاظ اور اس کی تجوید بھی محفوظ ہے اور اس کے معانی و مطالب بھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ جلد بازی نہ کریں اس کا جمع کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھانا ہماری ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد فرمایا فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ یعنی جب ہم پڑھیں یعنی ہمارا فرشتہ جبرائیل قرآن پاک کو پڑھے۔ تو اس کے بعد آپ اس کا اتباع کریں۔ حقیقت میں معلم اور مربی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، فرشتہ تو ایک ذریعہ ہے، وہ معلم نہیں بلکہ درمیان میں پیغام رسانی کا

---

[1] فتح الرحمان و ازالۃ الخفاء ص ۲۴ و ص ۲۵ ج ۱ [2] ازالۃ الخفاء ص ۲۵ ج ۱

کام کرتا ہے۔ لہٰذا جب وہ پڑھے تو اس کے بعد آپ پڑھیں۔

تشریح قرآن کے ذرائع

جہاں تک قرآن پاک کی تشریح کا تعلق ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کی تشریح خود قرآن میں موجود ہے۔ اگر کسی مقام پر کسی مسئلہ کا اجمال ہے۔ تو کسی دوسرے مقام پر اس کی تفصیل موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، امام شافعیؒ، امام ابن تیمیہؒ، مولنا گنگوہیؒ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی وہ تمام احادیث جو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں۔ وہ سب قرآن پاک کی شرح ہیں۔ اگر کوئی چیز حدیث رسول میں بھی نہ ملے۔ تو خلفائے راشدینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کے اقوال میں مطلوبہ تشریح مل جاتی ہے۔

بعض لوگ قرآن پاک کی اس تشریح کا انکار کرتے ہیں۔ جو کہ گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ان میں پرویزی چکڑالوی اور دیگر منکرین حدیث شامل ہیں۔ ان سے پوچھنا چاہیئے۔ کہ وہ بیان کہاں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان یا آئمہ مجتہدینؒ کے اجتہاد میں ہی موجود ہے۔ یہ سب قرآن پاک کی تشریح ہی تو ہے جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن پاک نازل فرمایا اور اس کی تفصیل بھی۔ تو یہ سب تفصیل ہے۔

حُب دنیا یا حُب آخرت

اس کے بعد منکرین کے انکار کی وجہ بیان کی جا رہی ہے مگر اللہ تعالیٰ ان کو خطاب فرماتے ہیں كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ کہ انکار قیامت کی وجہ یہ ہے۔ کہ تم جلدی کی زندگی پسند کرتے ہو۔ اور جو آدمی جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی میں منہمک رہتا ہے۔ کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ چونکہ تمہارا مقصود تو محض دنیوی زندگی ہے۔ اگر دنیا کی محبت کم ہوتی تو آخرت کی محبت بھی پیدا ہوتی۔ مگر تمہیں تو صرف یہ جلد بازی کی زندگی ہی محبوب ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[5] ہے مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ یعنی جو دنیا سے محبت کرے گا، وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا اور جو آخرت سے محبت رکھے گا اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ اس کے لیے لامحالہ دنیا میں کچھ کمی آئے گی حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى یعنی تم

ا ۲

۳ فتاوی کبریٰ لابن تیمیہؒ صہ ۱۳۸ ج ۲ طبع ریاض ۴ لطائف رشدیہ صہ ۸ و ۹ ۵ موارد الظمآن صہ ۶۱۲ مسند احمد ج ۴ صہ ۴۱۲

فانی کی بجائے باقی رہنے والی چیز کو ترجیح دو۔ دنیا سے زیادہ محبت نہ کرو، یہ فانی ہے۔ اے محقق قبول کہہ لو، زیادہ محبت نہ کرو۔ مگر بالکل ترک بھی نہ کرو اَللّٰھُمَّ[1] لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا یعنی محض دنیا کو ہی مقصود نہ بنا لینا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے[2]۔ کہ یاد رکھو! دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی مانند ہیں۔ اگر ایک کو راضی کرے گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی لہذا دنیا کے انہماک اور اس کی محبت کی اجازت نہیں دی گئی۔ فرمایا رَاْسُ[3] کُلِّ خَطِیْئَةٍ حُبُّ الدُّنْیَا یعنی ہر برائی کی جڑ دنیا کی محبت ہے دنیا کی محبت اس حد تک نہیں چلی جانی چاہیئے کہ دین، شریعت، آخرت اور موت یاد ہی نہ رہے۔ ایسا انہماک ناجائز اور قبیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ محبانِ دنیا کی ترجمانی اس طرح فرمائی۔ کہ وہ کہتے ہیں "رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ" یعنی ہم آخرت کو کچھ نہیں جانتے ہمیں جو کچھ دینا ہے اے پروردگار ابھی دے دے۔ ایسے ہی دنیا داروں کے متعلق فرمایا کہ وہ کہتے ہیں "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا" اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں ہی جو کچھ دینا ہے دے دے۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ دنیا کی جلد بازی کی زندگی پسند کرتے ہیں لہذا یہ آخرت کے منکر ہیں وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ اور چھوڑتے ہو تم آخرت۔

رؤیت الٰہی۔

مگر یاد رکھو! جب آخرت آئے گی تو وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ کہیں فرمایا سفید ہوں گے، نورانی ہوں گے۔ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہوں گے، اُن کو رویت الٰہی بھی نصیب ہوگی۔ جو انتہائی خوشی اور مسرت کی بات ہوگی۔ اہل سنت والجماعت متفقہ طور پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنت میں پہنچنے والوں کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ اس کا ذکر صحیح احادیث[4] میں موجود ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیات بھی اس بات پر شاہد ہیں۔ کافروں کے متعلق فرمایا "کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ" اُن کو اُس دن حجاب میں رکھا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ مومن حجاب میں نہیں رہیں گے۔ اُن کو رویت

---

[1] ترمذی صـ ۵۰۴، [2] تفسیر عزیزی صـ ۲۴۷/۱ پ ۲۹، [3] بیہقی فی شعب الایمان درزین بحوالہ مشکوٰۃ صـ ۴۴۴،
[4] بخاری صـ ۹۷۳/۲، مسلم صـ ۱۰۰/۱، ترمذی صـ ۳۶۹

الٰہی نصیب ہوگی۔ اس عقیدے کا انکار کرنے والے گمراہ ہیں۔

اس کا انکار یا تو شیعہ کرتے ہیں یا معتزلہ۔ اُن کا اشکال یہ ہے کہ اگر خدا کو دیکھیں گے تو خدا محدود ہو جائے گا (العیاذ باللہ) اور جہت کے اندر ہوگا، کیونکہ دیکھنا جہت کے اندر ہوتا ہے۔ مگر اہل سنت والجماعت کہتے ہیں۔ کہ دیدارِ الٰہی ہوگا۔ البتہ وہ اس کے ساتھ ایک لفظ کا اضافہ کرتے ہیں۔ کہ دیدار ہوگا، مگر بے کیف یعنی اس کی کیفیت کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح ہوگا۔ یہ دیدار کسی عام چیز کو دیکھنے کی مانند نہیں ہوگا۔ یہاں تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ جہت سے بے نیاز ہے۔ تاہم دیدار ضرور ہوگا مگر بے کیف۔

منکرین قیامت کی مایوسی

اس کے بعد فرمایا وَوُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ اُس دن کئی چہرے اُداس اور ترش رو ہوں گے۔ دوسری جگہ فرمایا، ان پہ گرد و غبار چڑھا ہوا ہوگا یا وہ سیاہ ہوں گے۔ اور اُن کی حالت یہ ہوگی تَظُنُّ اَنۡ يُّفۡعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ انہیں یقین ہوگا کہ اُن کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائیگا۔ فاقرہ کمر کے مہرے کو کہتے ہیں۔ وہ یقین کریں گے کہ اب اُن کے ساتھ بہت ہی بُرا سلوک ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے قیامت اور جزائے عمل کا انکار کیا۔ فرمایا آج تو یہ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔ کوئی قیامت نہیں۔ یہ اساطیر الاولین یعنی پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ مر کر کسی کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راق کا مفہوم

فرمایا كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِىَ خبردار! جب انسان کی روح اور جان ہانسلی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے۔ اور انسان اس دنیا سے جانے لگتا ہے۔ تو پھر وَقِيۡلَ مَنۡ ۜ رَاقٍ اور کہا جاتا ہے، کون ہے راق مفسرین کرام نے رَاقٍ کے دو معنے بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک معنیٰ ارقیہ سے ہے یعنی جھاڑ پھونک کرنیوالا یا تعویذ گنڈا کرنیوالا مقصد یہ کہ جب انسان کی جان اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور طبیب تو ناکام ہو گئے، اُن کا کوئی حیلہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ اب کسی جھاڑ پھونک والے کو تلاش کرو۔ کوئی دم کرنے والا دم ہی کرے۔ کسی کے تعویذ گنڈے سے مریض کو فائدہ پہنچے۔ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ تو گویا راق سے مراد وہ جھاڑ پھونک کرنے والے ہیں۔ جو مریض کی آخری سٹیج پر طلب کیے جاتے ہیں۔ تو "راق" سے مراد انسان کی وہ حالت ہے، جب اُس کے بچاؤ کے تمام ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ لفظ راق، رقیہ سے نہیں بلکہ رقیؒ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔ گویا راق سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو انسان کے پاس آخری وقت میں آتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ کہ اس شخص کی روح کو لے کر کون اوپر جائے گا۔ یعنی عذاب والے فرشتے اس کو لے جائیں گے یا رحمت والے۔ اس وقت دونوں قسم کے فرشتے وہاں پر موجود ہوتے ہیں۔ اگر مرنے والا مومن ہے۔ تو اُسے علّیّین والے فرشتے لیجاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ علّیّین ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، جہاں بہشت ہے۔ پس نیکوکار انسان کی براہِ راست وہاں حاضری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُسے واپس برزخ یا عالم قبر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرنے والا کافر یا منافق ہے۔ تو فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں۔ مگر وہ آسمان دنیا سے ہی پلٹا دیا جاتا ہے۔ اوپر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو سجین میں لے جایا جاتا ہے۔ جو ساتوں زمینوں کے نیچے جہنم کے طبقات میں سے ایک طبقہ ہے۔ تو گویا اس لحاظ سے راق سے مراد اوپر چڑھنے والے فرشتے ہیں۔ خواہ وہ عذاب کے فرشتے ہوں یا رحمت کے۔

مجرمین کے زندگی کے آخری لمحات

وَظَنَّ اور انسان گمان کرتا ہے۔ یہاں پر ظن بمعنی یقین ہے یعنی مرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے أَنَّهُ الْفِرَاقُ کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اور پنڈلی، پنڈلی کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یعنی جب جان نکل جاتی ہے۔ تو پھر اس میں حرکت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ یا پھر اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکو کفن میں جوڑ دیا جاتا ہے یہ جدائی انسان کے لیے دو طرح سے باعث تکلیف ہوتی ہے اولاً یہ کہ جس مال ومتاع اور اولاد واقارب میں وہ مبتلا تھا، انہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ آگے برزخ میں نامعلوم کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ دنیا میں تو عیش کرتے رہے۔ اب آگے کیا صورت حال ہو گی۔ اس طرح گویا یہ جدائی کا وقت انسان کے لیے دوہری اذیت کا باعث ہوتا ہے۔

اس کے بعد انجام کار یہ ہے کہ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ۔ اُس دن اپنے رب کی طرف چلنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مرنے کے ساتھ ہی انسان کی دوسری زندگی کی پہلی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ آج تم جلد بازی کرتے ہو۔ انکار اور استہزاء کرتے ہو مگر آگے یہ سلسلہ پیش آنے والا ہے۔ جس وقت تمہاری جان ہانسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے گی تو پتہ چل جائے گا کہ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

درس سوم (آیت ۳۱ تا ۴۰)

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ﴿۳۱﴾ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ﴿۳۳﴾ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ﴿۳۵﴾ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ﴿۳۶﴾ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ﴿۳۹﴾ اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِ َۧ الْمَوْتٰی ﴿۴۰﴾

ع ۲ / ۱۸

ترجمہ:۔ پس نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی ﴿۳۱﴾ بلکہ اس نے تکذیب کی اور اعراض کیا ﴿۳۲﴾ پھر اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا گیا ﴿۳۳﴾ ہلاکت ہے تیرے لیے پھر ہلاکت ہے ﴿۳۴﴾ پھر ہلاکت ہے تیرے لیے پھر ہلاکت ہے ﴿۳۵﴾ کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿۳۶﴾ کیا انسان ایک قطرۂ منی نہیں تھا جسے رحم کے اندر ٹپکا دیا جاتا ہے؟ ﴿۳۷﴾ پھر وہ جما ہوا خون تھا پس خدا نے اس کو پیدا کیا اور ٹھیک ٹھاک بنایا ﴿۳۸﴾ پھر بنایا اس سے جوڑا نر اور مادہ ﴿۳۹﴾ تو کیا وہ خدا اس بات پر قادر نہیں کہ مُردوں کو (دوبارہ) زندہ کر دے ﴿۴۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

پہلی آیات میں منکرین قیامت کا رد اور ان کے بُرے انجام کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان آیات میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے منکرین قیامت کے بارے کچھ دلائل اشارةً بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کی کوتاہی اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ منکرین قیامت بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہیں۔ کہ قیامت کب آئے گی، اور اس کو بعید سمجھتے ہیں، یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس غفلت کا سبب بالعموم ان کے مال و اسباب ہیں (پہلی سورتوں میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ اور یہاں بھی ذکر ہو چکا ہے "كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ" یعنی انکار قیامت کی وجہ یہ ہے۔ کہ تم جلد بازی یعنی دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہو۔ اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ یہ دنیوی زندگی میں انہماک اور اس کے مال و اسباب کی محبت ہی انسان کو آخرت سے غافل کرتی ہے۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ موت آجاتی ہے۔ اور

اگلی منزل یکایک سامنے آجاتی ہے۔

صدق کا مفہوم

فرمایا فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی افسوس کا مقام ہے کہ منکرین قیامت نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ صَدَّقَ سے مراد تصدیق کرنا ہے۔ یعنی انہوں نے اُن باتوں پر یقین نہیں کیا جن پر یقین کرنا ضروری ہے اور ان میں ایک قیامت بھی ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیا علیہم السلام کی رسالت، ملائکہ، کتُب سماویہ یہ تمام شرائع الٰہیہ ہیں جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے اگر یہ شخص تصدیق کرتا تو صحیح اعتقاد اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور جو صحیح اعتقاد لے کر جاتا ہے، آخرت میں فرشتے بھی اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام بھی اُن کے سفارشی بنتے ہیں۔ قرآن بھی اُن کا شفیع ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اُن پر مہربانی فرماتے ہیں۔

مگر صورت حال یہ ہے۔ کہ اُس نے تو تصدیق ہی نہیں کی فَلَا صَدَّقَ نبی کو سچا ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کی باتوں کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ اساطیر الاولین ہیں پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں۔ نہ کوئی قیامت ہے نہ کوئی جزائے عمل ہے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ صَدَّقَ کا معنی صدقہ خیرات کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی کہ نہ اُس نے صدقہ خیرات کیا نہ نماز پڑھی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں "فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ" گنہگار کہے گا کہ اے اللہ! مجھے تھوڑی سی مہلت دے دے تاکہ میں صدقہ خیرات کر کے نیکو کاروں میں شامل ہو جاؤں۔ مگر جب موت کا وقت آجاتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالےٰ مؤخر نہیں کرتے۔

صدقہ میں زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ پچھلی سورت میں گذر چکا ہے۔ کہ انسانی ہمدردی جس میں صدقہ خیرات شامل ہے۔ اور معاد یہ بنیادی چیزیں ہیں۔ وہاں ذکر آیا تھا۔ کہ جنت والے لوگ دوزخ والوں سے سوال کریں گے "مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ" تمہیں اس جہنم میں کون سی چیز لائی۔ تو وہ کہیں گے۔ "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ" یعنی ہم نمازیں نہیں پڑھتے تھے۔ "وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ" اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ کھانا کھلانا نوع انسانی خاص طور پر ہم مذہبوں کے

---

[1] تفسیر بیضاوی صفحہ ۴۰۲ ج ۱

ساتھ ہمدردی کرنا ہے۔ جس میں اوّل نمبر پر زکوٰۃ ہے۔ تو گویا تعلق باللہ کے لیے نماز ضروری تھی، وہ نہ پڑھی اور بنی نوع انسان کے ساتھ تعلق کے لیے صدقہ خیرات ضروری تھا، وہ بھی نہ کیا، نہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوا۔ اور نہ لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم ہوا۔ کیونکہ مسکین پروری نہ کی۔

صدقہ اور نماز کی اہمیت

اسی لیے فرمایا فَلَا صَدَّقَ نہ اُس نے صدقہ خیرات کیا وَلَا صَلّٰی اور نہ نماز پڑھی۔ یا نہ اُس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ نماز ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے متعلق حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[1] اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ الصَّلٰوۃُ یعنی سب سے پہلی چیز جس کے متعلق انسان سے پوچھا جائے گا، وہ نماز ہے۔ محاسبے میں پہلا نمبر نماز کا ہے۔ نماز پڑھی ہے یا نہیں نماز مومن اور کافر کے درمیان علامت فارقہ ہے۔ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ[2] ہمارے اور مشرکین کے درمیان فیصلہ کن چیز نماز ہے۔ جس نے نماز ترک کی، اُس نے کفر میں قدم رکھ دیا۔ اگر بالکل انکار کر دیا، تو کافر ہو گیا، ورنہ فاسق تو ہے ہی۔ نماز اور زکوٰۃ دو ایسی علامتیں ہیں، جن کے ذریعے انسان کا ایمان ثابت ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص مومنین کی جماعت کا آدمی ہے۔ سورۃ توبہ میں فرمایا "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ اگر یہ لوگ کفر و شرک سے توبہ کر لیں، نماز پڑھنے لگ جائیں، زکوٰۃ دینے لگیں، تو تمہارے بھائی بن گئے۔ جھگڑا ختم ہو گیا۔ تمام حقوق جو تمہیں حاصل ہیں انہیں بھی مل گئے۔ دوسری آیت میں فرمایا "فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ" پھر چھوڑ دو انہیں۔ ان سے لڑائی نہ کرو۔ گویا نماز اور زکوٰۃ دو ایسی علامتیں ہیں، جن سے مسلمان کی پہچان ہوتی ہے۔ ایمان تو باطنی چیز ہے، جو نظر نہیں آتی۔ مگر ظاہری علامات یہی ہیں۔

نماز کی ایک اور خوبی یہ ہے۔ کہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ ہے جس طرح کوئی بھاگا ہوا غلام اپنے مالک کے سامنے دست بستہ حاضر ہو جائے تو اس کا غصہ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غضب کو کم کرنے کے لیے نماز کی حالت میں اس کے حضور دست بستہ حاضر ہو جانا بہت کافی ہے۔

---

[1] سنن دارمی صفحہ ۲۵۴ ج ۱، سنن نسائی صفحہ ۸۱ ج ۱ [2] ترمذی صفحہ ۳۷۶
مسند احمد صفحہ ۰

تکذیب اور اعراض

الغرض نہ تو اس نے نماز پڑھی اور نہ صدقہ کیا۔ کہ جس کی وجہ سے تعلق باللہ درست ہوتا۔ اور مخلوق خدا کے ساتھ بھی تعلق پیدا ہوتا بلکہ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی کیا یہ کہ رسول، قرآن پاک اور قیامت کی تکذیب کی۔ اور نماز پڑھنے کی بجائے منہ پھیر لیا۔ اعراض کر لیا۔ گویا رحمت خداوندی سے مزید دور ہو گیا۔

منکرین کی اکڑ

پھر کیا ہوا ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا یا انگڑائی لیتا ہوا گیا۔ مطاط ربڑ کو کہتے ہیں۔ جس کے کھینچنے سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] اِذَا مَشَتْ اُمَّتِیْ الْمُطَیْطِیَا جب میری امت کے لوگ اکڑ والی چال چلیں گے۔ ابنائے فارس اور ابنائے روم ملوک اُن کی خدمت کرنے لگیں گے۔ اس وقت میری امت پر مصیبت اتر آئے گی یہ اکڑ والی چال اللہ تعالےٰ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو عاجزی پسند ہے۔ اسی لیے اپنے بندوں کی تعریف میں فرمایا "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" یعنی رحمٰن کے بندے وہ ہیں۔ جو زمین پر وقار اور آہستگی سے چلتے ہیں۔ اکڑ والی چال نہیں چلتے۔ اگر اکڑ والی چال چلوگے تو "اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا" تمہارا سر آسمان سے نہیں ٹکرا جائے گا۔ بلکہ وہی پانچ چھ فٹ کے انسان رہو گے۔ نہ زمین پھٹ جائے گی اور نہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جاؤ گے۔

فرمایا۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا گیا۔ جیسا کہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہے۔ اُسے تو شرم اور ندامت ہونی چاہیئے تھی کہ اس نے اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا۔ نماز پڑھنے اور اپنے مالک کے حضور حاضر ہونے کی بجائے اس نے الٹی اکڑ دکھائی۔ اور منہ موڑ کر سرکشی اور بدبختی پر اتراتا ہوا اپنے متعلقین کی طرف لوٹا۔

منکرین کی ہلاکت

ارشاد ہوتا ہے اَوْلٰى لَكَ ہلاکت ہے تیرے لیے فَاَوْلٰى پھر ہلاکت ہے۔ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى پھر ہلاکت ہے، پھر ہلاکت ہے، چار مرتبہ ذکر کیا۔ لفظ اَوْلٰى اگر ولی سے ہو، تو اس کا معنی ہے قریب ہونا۔ ساتھ لگا تو اس کا پورا مطلب یہ ہوا اَوْلٰى الْهَلَاكُ لَكَ یعنی ہلاکت تیرے قریب ہو اور اگر اولی کا مادہ وَیل ہے تو اس کا معنی تباہی اور بربادی ہوگا۔ گویا چار مرتبہ فرمایا تیرے لیے تباہی اور بربادی ہے۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ لفظ ہلاکت کا چار مرتبہ دہرانا، انسان کی چار کوتاہیوں کی وجہ سے ہے۔ کہ اولاً اس نے تصدیق نہ کی یا صدقہ خیرات نہ کیا۔ ثانیاً اُس نے

---

[1] ترمذی صہ ۳۲۹، موارد الظمآن صہ ۴۶۱

نماز نہ پڑھی، ثالثاً اس نے تکذیب کی اور رابعاً یہ کہ اُس نے اعراض کیا۔ اسی طرح اگر اولی کا مادہ اَوۡل" سے ہو تو اس کا معنی "انجام" ہے۔ تو اس لحاظ سے بھی مطلب یہ ہو گا کہ تیرا انجام تباہی و بربادی ہے۔

قیامت کے روز لازماً باز پرس ہو گی

آگے اللہ تعالےٰ نے وقوعِ قیامت کے متعلق دو دلائل بھی اشارۃً بیان فرمائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی کیا انسان گمان کرتا ہے۔ کہ اُسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا "سُدًی" کا معنی مہمل اور بیکار ہے۔ مقصد یہ کہ کیا انسان پہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔ اگر اُس کا خیال ایسا ہی ہے۔ تو یہ باطل خیال ہے۔ انسان کی فطرت، سرشت یا مزاج میں ملکیت اور بہیمیت کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ اور اس کا تقاضا ہے کہ انسان مکلف ہو۔ اور جو مکلف ہو گا اس کے ساتھ جزائے عمل کا ہونا لازمی ہے۔ تو مقصد یہ ہوا۔ کہ انسان کو مہمل نہیں چھوڑا جائے گا۔ اسے قانون کا پابند بنایا جائے گا۔ اس پابندی کے بغیر انسان ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ" یا یوں ارشاد ہے لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَیۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ یعنی فلاں کام کرو۔ فلاں سے رک جاؤ۔ اگر قانون کی پابندی نہیں کرو گے تو حظیرۃ القدس یعنی پاک مقام کی طرف تمہارا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ اور تم کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں عقل و شعور، قویٰ ظاہرہ و باطنہ اور دیگر تمام اسباب دے کر قانون کا پابند بنایا ہے۔ یہی پابندی انسان کے لیے ترقی کا زینہ ہے۔ اگر انسان پابندی نہیں کرے گا۔ تو تنزل کا شکار ہو جائے گا۔ ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا۔ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ لہٰذا انسان کو مہمل نہیں بلکہ مکلف بنایا گیا ہے۔ اور اس کا محاسبہ ہو گا۔

انسانی کی تخلیق حقیر قطرۂ آب سے

وقوعِ قیامت کی دوسری دلیل اللہ تعالیٰ نے انسان کے مادۂ تخلیق کو بنایا ہے۔ انسان سمجھتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کی ہڈیوں اور اعضا کو دوبارہ جمع نہیں کریں گے مگر اس نے اعلان فرما دیا کہ ہم اس بات پہ قادر ہیں کہ انسان کے پور پور کو برابر کر دیں۔ اس مرحلہ پہ انسان کی توجہ اُس کی تخلیق کی طرف دلائی گئی۔ فرمایا اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً۔ کیا انسان ایک قطرۂ آب نہیں تھا۔ نطفہ شفاف پانی کو کہتے ہیں، جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ انسان کے نطفے میں بھی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے یہ خالص ہوتا ہے۔ فرمایا اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی کیا یہ منی کی ایک بوند

نہیں تھی جسے رحم کے اندر ٹپکا دیا جاتا ہے۔ یعنی انسان ایک حقیر فضلے کی پیدائش نہیں ہے۔ جیسا کہ اگلی سورۃ میں آئے گا اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ کیا تم کو ہم نے ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا ایسا ناپاک پانی کہ کپڑے کو لگ جائے تو وہ بھی ناپاک ہو جائے۔ نگاہ پڑے تو آدمی نفرت کرے۔

اطبا کہتے ہیں۔ کہ مادہ منویہ ہضم کا چوتھے درجے کا فضلہ ہے۔ جب کوئی آدمی غذا کھاتا ہے۔ تو پہلے معدے میں وہ کیلوس بنتا ہے۔ پھر آنتوں میں پہنچ کر کیموس بنتا ہے۔ وہاں سے چل کر جب جگر میں پہنچتا ہے تو خون بنتا ہے۔ جب ہر ہر عضو میں خون کی تقسیم ہوتی ہے۔ تو اُس عضو کا مطلوبہ مادہ بنتا ہے۔ چنانچہ خون جب اعضائے تناسل میں پہنچتا ہے تو مادہ منویہ بنتا ہے۔ یہ فضلہ کا چوتھا درجہ ہے۔ یہ ایسا عجیب و غریب مادہ ہے کہ سفید ہے مگر دودھ جیسا نہیں۔ کیونکہ دودھ ایک پاکیزہ چیز ہے اور نشوونما میں کام آتی ہے۔ یہ پھل سے مشابہ بھی نہیں کہ پھل درخت کا خلاصہ اور نچوڑ ہوتا ہے۔ اور اگر اُسے درخت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو زندگی سے بعید ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر ٹہنی درخت سے کاٹ دی جائے تو وہ بے جان ہو کر سوکھ جاتی ہے۔ مگر اس مادہ منویہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے۔ کہ اپنے اصل سے کٹ کر بھی انسان جیسی اشرف المخلوقات چیز کی پیدائش کا سبب بنتا ہے

انسانی نشوونما کے مختلف مدارج

قطرہ آب ٹپکائے جانے کے بعد کیا ہوا۔ ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً پھر وہ لہو کے ایک ٹکڑے میں تبدیل ہوا۔ چالیس دن تک یہ قطرہ آب اسی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد تبدیلی شروع ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو خون کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں۔ مزید چالیس دن کے بعد اسے گوشت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگلے چلے میں اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسانی ڈھانچہ بنتا جاتا ہے۔ اس طرح جب چار چلے پورے ہو جاتے ہیں۔ تو اُدھر سے روح آسمانی آجاتی ہے۔ جو روح حیوانی سے ملکر پورا انسان بنتا ہے۔ اسی لیے فرمایا ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً وہ جما ہوا خون تھا۔ فَخَلَقَ پس خدا نے اُس کو پیدا کیا فَسَوّٰی اور ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اس کے تمام ظاہری و باطنی اعضاء کمال درجے کے بنائے۔ پھر اس حقیر قطرۂ آب سے پیدا کیے ہوئے انسان سے اللہ تعالیٰ نے نر اور مادہ کا جوڑا بنا دیا فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى۔

یہ جنسی تفریق کس طرح ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کہ یہ کیسے ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی توجیہہ بیان نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت ہے۔ کہ ایک مرحلہ

ایسا آتا ہے۔ جب بچے کو نر یا مادہ بنا دیا جاتا ہے۔ فرمایا وہ ذات خداوندی جس نے انسان کو قطرہ آب سے تبدیلیاں اور پلٹیاں دے کر پیدا کیا۔ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی کو کیا وہ خدا اس بات پر قادر نہیں کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کو دلیل کے طور پر پیش فرمایا۔ کہ جو خداوندکریم ایک حقیر قطرہ آب سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ کون سی بعید بات ہے۔ کہ وہ مرنے کے بعد انسان کو پھر وہی شکل وصورت دے دے۔ اللہ تعالیٰ پر نہ پہلی تخلیق دشوار تھی، نہ قیامت کو دوبارہ جلا اٹھانا بعید ہوگا۔

مقامِ غور وفکر

اِن دلائل سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ انسان کو اپنی ابتدائی تخلیق پر غور کرنا چاہیئے۔ ایسا کرے گا تو اُسے ایک طرف خدا تعالیٰ کی وحدانیت سمجھ میں آئے گی۔ اور دوسری طرف قیامت کے وجود کا انکار نہیں کر سکے گا۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ تلاوت قرآن پاک کے وقت جب انسان اس مقام پر پہنچیں، تو کہیں سُبْحَانَکَ فَبَلٰی یعنی اے پروردگار! تو پاک ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ بے شک تو اس بات پر قادر ہے کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔ صرف بلٰی کہہ دینا بھی کافی ہے۔ سورۃ قیامت کی یہ آخری آیت خواہ نماز کے دوران پڑھی جائے یا بغیر نماز کے سُبْحَانَکَ فَبَلٰی کہنا چاہیئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں[2] کہ اگر نماز کے دوران کہے تو آہستہ سے کہے، زور سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ سورۃ ملک کے آخر میں "اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کہے۔ اور جیسا کہ اگلی سورۃ آرہی ہے۔ اس میں بھی جب یہ آیت پڑھی جائے "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ" تو کہنا چاہیے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ۔

---

[1] درمنثور صفحہ ۲۹۶/۶ ابن کثیر صفحہ ۴۵۲/۴ [2] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۵۶ پارہ ۲۹

سورۃ الدھر

(مکمل)

درس اوّل ۱ — (آیت ۱ تا ۶)

سُوْرَۃُ الدَّھْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِحْدٰی وَثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورۃ دھر مکی ہے اور یہ اکتیس ۳۱ آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالےٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا ① اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖۗ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ② اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ④ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ⑥

ترجمہ :- تحقیق آیا ہے انسان پہ ایک وقت زمانے میں سے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا ① بیشک ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرۂ آب سے پیدا کیا تاکہ ہم اس کو آزمائیں پس ہم نے اسے سننے والا دیکھنے والا بنایا ② بیشک ہم نے اسے (ٹھیک) راستے کی طرف راہنمائی کی، یا وہ شکر گذار ہوگا یا ناشکر گزار ③ بے شک ہم نے تیار کر رکھی ہیں کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ ④ بے شک ابرار پئیں گے ایسے پیالے سے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی ⑤ یہ ایک چشمہ ہے اس سے اللہ کے (خاص) بندے پئیں گے اللہ کے وہ بندے (اپنی مرضی سے جہاں چاہینگے) اس چشمہ کو چلالینگے ⑥

وجہ تسمیہ — اس سورۃ کا نام سورۃ الدھر ہے۔ دھر زمانے کو کہتے ہیں، اس کی پہلی آیت میں زمانے کا ذکر ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا نام سورۃ الدھر ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سورت

لہ روح المعانی صفحہ ۱۵۰ پارہ ۲۹، التفسیر عزیزی صفحہ ۲۵۶ پارہ ۲۹

کے متعدد نام ہیں۔ دہر کے علاوہ سورۃ ھَل اَتیٰ جوکہ اس سورۃ کے پہلے لفظ سے موسوم ہے اس کا نام سورۃ امشاج بھی آتا ہے۔ جوکہ دوسری آیت میں مذکور ہے، لہٰذا سورۃ انسان بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کی تخلیق کا ذکر ہے۔

کوائف

اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق مفسرین کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے[1]۔ بعض فرماتے ہیں۔کہ یہ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ بعض دوسرے فرماتے ہیں۔کہ یہ مکی سورۃ ہے، ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض کہتے ہیں۔کہ پہلا رکوع مکی زندگی میں نازل ہوا، اور دوسرا مدنی زندگی میں۔ تاہم اکثر مفسرین کے مطابق یہ سورۃ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس کی اکتیس[۳۱] آیات دو[۲] رکوع، دو سو چالیس[۲۴۰] الفاظ ہیں اور یہ ایک ہزار چون[۱۰۵۴] حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اور پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

اس سورۃ مبارکہ کا موضوع پہلی سورۃ قیامت کے ساتھ ملتا ہے۔ پہلی سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے۔ تو اس سورۃ کا بھی زیادہ تر حصہ قیامت سے متعلق ہے۔ البتہ پہلی سورۃ میں جو بات اجمال کے ساتھ بیان ہوئی، اس سورۃ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس سورۃ میں قیامت کے ذکر کے ساتھ دو گروہوں یعنی شکر گزار اور ناشکر گزار کے انجام سے متعلق تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں۔کہ اس سورۃ کا موضوع (SUBJECT) ابرار اور اشرار کا انجام ہے۔

پہلی سورۃ میں ابتدائے قیامت کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اُس سورۃ میں تھا فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ یعنی جب قیامت کا وقوع عمل میں آئے گا، تو آنکھیں چندھیا جائیں گی اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ سورج اور چاند اکھٹے کر دیئے جائیں گے، ایک عظیم ہنگامہ ہوگا اور پھر یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ اَیْنَ الْمَفَرُّ انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔ یہ گویا ابتدائے قیامت کا حال تھا۔ اِس سورۃ میں وقوع قیامت کے آخر میں اشرار اور ابرار کا جو انجام ہوگا، اس کی تفصیل ہے۔ اشرار اپنے مرکز یعنی جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ اور ابرار اپنے مقام جنت میں پہنچیں گے، جو رحمت کا مقام ہے۔ وہاں پر اُن کو حاصل ہونے

---

[1] دیکھئے روح المعانی صفحہ ۱۵۰ ج ۲۹

والے انعام واکرام کا ذکر ہے۔

پہلی سورۃ میں بھی انسان کی تخلیق کا ذکر تھا۔کہ دیکھو! انسان کو اللہ تعالےٰ نے قطرہ آب سے پیدا کیا۔ نر اور مادہ بنائے۔اس کے باوجود "اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی" کیا انسان گمان کرتا ہے۔کہ اُسے مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔اور دنیا میں اُس کو مکلف نہیں بنایا جائے گا۔آخرت میں اس سے کوئی سوال وجواب نہیں ہوگا۔انسان کا یہ گمان غلط ہے۔یہاں بھی انسان کی تخلیق کے ذکر کے بعد فرمایا "نَبۡتَلِیۡهِ" ہم اُن کو آزمائش میں ڈالتے ہیں وہاں تھا مہمل نہیں چھوڑا جائے گا،اور یہاں ہے۔کہ آزمائش میں ڈالا جائے گا۔

پہلی سورۃ میں ابرار کے متعلق تھا "وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ" اُس دن بعض چہرے تروتازہ ہوں گے۔اور یہاں پر ہے۔"وَلَقّٰهُمۡ نَضۡرَةً وَّسُرُوۡرًا" یعنی ہم انہیں تروتازگی اور سرور عطا کریں۔

پہلی سورۃ میں فضائل قرآن پاک کے متعلق تھا "اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ" یعنی قرآن پاک کا جمع اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔اور اس سورۃ کے آخر میں بھی ہے "اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا" یعنی قرآن پاک ہم نے ہی آپ پر نازل کیا۔الغرض ان دونوں سورتوں میں مذکورہ مضامین میں مماثلت پائی جاتی ہے۔تاہم زیادہ تر ذکر قیامت کا ہی ہے

فضیلت سورۃ

اس سورۃ کی فضیلت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت[1] ہے کہ جمعہ کے دن حضور علیہ السلام سورۃ دہر اور سورۃ سجدہ فجر کی نماز میں تلاوت فرماتے تھے۔اس ضمن میں سورۃ صٓ کا ذکر بھی آتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں جو شخص ان سورتوں کو جمعہ کے روز صبح کی نماز میں پڑھے گا۔تو اُس کو زیادہ اجر ملے گا۔ایک اور روایت میں[2] ہے۔کہ حضور علیہ السلام اس سورۃ مبارکہ کی تلاوت فرما رہے تھے۔اور بھی کئی حضرات پاس بیٹھے تھے۔ان میں سے ایک سیاہ رنگ کا آدمی تھا۔جب نبی علیہ السلام نے اس سورۃ میں واقع جنت کا حال تلاوت فرمایا تو اُس سیاہ رنگ کے حبشی نے زور سے ایک ہچکی لی اور اُس کا دم نکل

---

[1] مسلم ص ۲۸۸/۱ ترمذی ص ۱۰۱ بخاری ص ۱۲۲/۲ [2] روح المعانی ص ۱۶۵/۲۹ ابن کثیر ص ۴۵۳/۴ درمنثور ص ۲۹۷/۶

گیا حضور علیہ السلام نے فرمایا اُخرِجَ نفسُ صَاحِبِکُمُ الشَّوقُ اِلَی الجَنَّۃِ یعنی تمہارے بھائی کی جان جنت کے شوق میں نکل گئی۔ حدیث کے ایک راوی صالح المریؒ قاضی ہیں[1] جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ تو اس میں اس قدر جذب ہوتا تھا۔ کہ انسانوں پر دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ (یہاں تک کہ بعض آدمی ہلاک ہو جاتے)

الغرض سورۃ دہر، سورۃ انسان، سورۃ ھل اتٰی اور سورۃ امشاج سب اسی سورۃ کے اسمائے مبارکہ ہیں۔

انسان کی حیثیت

سورۃ کی ابتدا، لفظ ھَلْ سے ہوئی ہے۔ یہ ھل استفہام کے لیے بھی آتا ہے۔ اور تحقیق کے لیے بھی۔ ھَلْ اَتٰی یعنی قَدْ اَتٰی تحقیق آیا ہے عَلَی الْاِنْسَانِ انسان پر حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ ایک وقت زمانے میں سے لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا کہ انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا انسان سے مراد خاص انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی لیا جا سکتا ہے کہ آپ تمام بنی نوع انسان کے جد امجد ہیں۔ اور انسان سے مراد عام انسان بھی ہیں۔ کہ یقیناً ہر انسان پر ایک ایسا دور آیا ہے جب یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ کیونکہ موجودہ نسل انسانی تو بعد میں شروع ہونے والا سلسلہ ہے اس سے پہلے انسان کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ نہ اِن کے خاندان تھے، نہ اِن کے سلسلے تھے اور نہ یہ مکانات تھے۔ اگر کچھ ہوتا تو باقی مخلوق کے ذہن میں ان کا کچھ وجود ہوتا، وہ بھی جانتے۔ مگر یہ انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بلکہ معدوم تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں تخلیق انسان کا ہی ذکر فرمایا ہے پھر انسان کو مکلف بنانے کا ذکر ہے۔ کہ اسے قوانین و شرائع کا پابند بنایا۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ ہم نے انسان کو پانی کی ایک ایسی بوند سے پیدا کیا جو ملا جلا ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ امشاج، مَشِیْج کی جمع ہے۔ جس کا معنیٰ خلط ملط ہونا ہے۔ نطفہ شفاف پانی کو کہتے ہیں۔ چونکہ انسان کی تخلیق میں مرد اور عورت کا پانی ملا جلا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے نُطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ فرمایا۔ کہ اس سے انسان کو پیدا کیا۔

امام زمخشریؒ فرماتے ہیں[2]۔ کہ امشاج کا لفظ مفرد ہے۔ اس کی کوئی جمع نہیں ہوتی۔ جیسے

---

[1] نووی شرح مسلم صفحہ ۱۷/۱

[2] تفسیر کشاف صفحہ ۶۶۶/۴

لفظِ قوم مفرد ہے مگر جمع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ امشاج بھی مفرد ہونے کے باوجود جمع کے معنوں میں مستعمل ہے۔ گویا امشاج کا ایک معنیٰ تو یہ ہوا۔ کہ اس میں مرد اور عورت کا مادہ تولید ملا ہوا ہوتا ہے۔ اور دوسرا معنیٰ یہ کہ اس پانی میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ جو انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں۔

انسانی جسم کے عناصر

یونانی فلسفیوں کے ایک گروہ کا خیال تھا۔ کہ انسان چار عناصر آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے مرکب ہے۔ بعض نے پانچ اور بعض نے سات عناصر بتائے۔ تاہم چار عناصر زیادہ مشہور ہوئے۔ موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ سائنس دانوں کا تجزیہ یہ ہے کہ انسانی جسم کے عناصر چار یا سات نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں۔ اب تک ایک سو دس سے زیادہ عناصر تجربہ گاہوں میں دریافت ہو چکے ہیں۔ عنصر ایک بسیط چیز ہے۔ خارجی دنیا کے تمام عناصر جن میں آکسیجن، ہائیڈروجن، نائیٹروجن، گولڈ، سلور، سلیکا (ریت) وغیرہ انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان کی تخلیق باقی تمام مخلوق سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ جنات کی تخلیق میں صرف دو عناصر آگ اور ہوا شامل ہیں۔ جب کہ ملائکہ کے وجود میں صرف ایک عنصر ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق میں تین عناصر پائے جاتے ہیں۔ مگر انسان ایک واحد مخلوق ہے۔ جس کے جسم میں تمام خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] کہ اللہ تعالےٰ نے تمام سطح ارض کی مٹی اکٹھی کر کے اس سے آدم علیہ السلام کا خمیر بنایا۔ چونکہ مختلف جگہ کی مٹی مختلف ہے کہیں ریت والی ہے، کہیں چکنی ہے، کہیں کھردری، کہیں سیاہ ہے، کہیں سُرخ ہے۔ اسی لیے نسلِ انسانی کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ بعض لوگ سخت مزاج ہیں، بعض نرم اخلاق والے ہیں۔ بعض گورے ہیں۔ بعض کالے ہیں۔ بغرض تخلیق انسانی میں اُن تمام عناصر کا اثر موجود ہے۔ جو اس میں شریک ہیں۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی صفات، ان کی صلاحیتیں اور قوتیں وغیرہ بھی مختلف ہیں۔ یہ سب مختلف عناصر کی وجہ سے ہے۔

مقصد تخلیق انسانی

جیسا کہ بیان ہوا، انسان کی تخلیق کا مقصد نَبْتَلِیہِ یعنی اس کو آزمانا ہے۔ اُسے امتحان

---

[1] ابوداؤد ص ۲۸۸ ج ۲ باب القدر

میں ڈالتا ہے ۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم انسان کو خیر و شر کے ذریعے آزماتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کا تقاضا ہے ۔ کہ اسے امتحان میں ڈالا جائے ۔ تاکہ وہ اپنی زندگی کے اچھے یا بُرے اعمال کی جزا یا سزا حاصل کر سکے ۔ آگے فرمایا فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا کہ ہم نے انسان کو سننے اور دیکھنے والا بنایا یعنی اس کو قوائے سماعت و بصارت سے نوازا ، فہم و بصیرت عطا کی ۔ تاکہ وہ اس بات پر غور کرے کہ انسان کی پیدائش کس حقیر قطرۂ آب سے ہے ۔ دوسری جگہ فرمایا " لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ " یعنی ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ۔ ایسی امتیازی اور حسین صورت جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی اور پھر اسے سمیع اور بصیر بنایا ۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسی حسین و جمیل شکل و صورت اور عقل و شعور جیسی صفات سے موصوف انسان کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا ۔ " اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى " نہیں بلکہ ہم اپنی عطا کردہ نعمتوں کا حساب لیں گے ۔ اور اسے آزمائش میں ڈالیں گے ۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں ۔ کہ نَبْتَلِيْهِ سے مراد آزمائش نہیں ۔ بلکہ پلٹیاں دینا ہے شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں ۔ کہ ہم نے ملے جلے قطرہ آب کو پلٹیاں دے کر اس سے سمیع و بصیر ہستی کو پیدا کیا ۔ کہتے ہیں ۔ کہ انسانی جسم میں روح الٰہی پھونکے جانے تک کے عرصہ میں انسان چالیس مراحل سے گزرتا ہے ۔ تب اللہ تعالیٰ اُسے عظیم انسانی ہستی میں ظاہر کرتا ہے ۔ یہ تو اُس کا مادی پہلو ہے ۔ جہاں تک روحانی پہلو کا تعلق ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمہ صفت موصوف بنایا ۔ اس میں وہ تمام صفات و کمالات رکھ دیے جو انسان کے لیے باعث فخر اور اس کی نجات کا ذریعہ ہیں ۔ اگر وہ ان اوصاف حمیدہ سے فائدہ اٹھا کر اس جسم کو انسانیت کے کمال تک پہنچاتا ہے ۔ تو یقیناً انسان کہلانے کا حقدار ہے ۔ اور اگر وہ ان اخلاق حسنہ سے اعراض کر کے اخلاق رذیلہ کو اختیار کرتا ہے ۔ تو پھر یقیناً وہ خسارے میں ہے ۔

بعض احادیث[2] میں آتا ہے ۔ کہ جب یہ آیت حضرت عمرؓ کے سامنے پڑھی گئی " لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا " یعنی انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا تو آپ فرمانے لگے لَيْتَهَا تَمَّتْ کاش

---

[1] تفسیر کشاف صـ ۲۶۶ جـ ۴ درمنثور صـ ۲۹۸ جـ ۶ روح المعانی صـ ۱۵۲ جـ ۲۹ [2] روح المعانی صـ ۲۵۲ جـ ۲۹ درمنثور صـ ۲۹۷ جـ ۶

کہ یہی صورت حال رہتی یعنی ہم عدم سے وجود میں نہ ہی آتے کیونکہ ہوسکتا ہے۔ کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ اس لیے لَمْ یَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا والی حالت میں ہی رہتے تو اچھا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے منقول ہے۔ کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا یا ایک تنکا لے کر فرمایا کاش کہ میں یہ تنکا ہوتا یا گھاس کا ایک ادنیٰ پتہ ہوتا۔ تاکہ آزمائش سے بچ جاتا۔ بحیثیت انسان شاید ہم اپنے فرائض کو ادا نہ کر سکیں۔ اگر مقصدِ تخلیق کو پورا نہ کر سکے تو سخت مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میر تقی میرؔ نے بھی کہا ہے۔

خوشا حال اُس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

الغرض! رب العزت نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو ملے جلے قطرۂ آب سے پلٹیاں دے دے کر پیدا کیا اور پھر اسے سمیع و بصیر بنایا تاکہ ہم اس کی آزمائش کریں۔ اس پر قانون کی پابندی لازم قرار دی تاکہ اس کے نتائج اس کے سامنے آئیں۔

انسان کے لیے ہدایت کی فراہمی

تخلیق انسانی کے مختلف مدارج بیان فرمائے۔ اور اُسے سمیع و بصیر کے بلند مرتبے تک پہنچانے کے بعد فرمایا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ ہم نے اُسے (ٹھیک) راستے کی طرف ہدایت دی یا اُسے راستہ سمجھا دیا۔ لہٰذا اب انسان کا کام یہ ہے۔ کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ چاہے تو وہ شکر گذار بن جائے، چاہے تو ناشکر گزار ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں خواہ ابرار کی صف میں شامل ہو جائے یا اشرار کی صف میں۔ راستہ ہم نے بتا دیا ہے۔ اگر صحیح راستے پر چلے گا تو شکر گذار بن کر ابرار میں داخل ہو جائے گا۔ اگر اس راستے سے روگردانی کرے گا۔ تو ناشکر گزاروں میں شامل ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" ہم نے انسان کو خیر و شر کی دو گھاٹیاں یا دو راستے سمجھا دیے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام نے ایک دفعہ حضرت کعبؓ بن عجرہ سے فرمایا کہ اے کعب اللہ تعالیٰ تمہیں بے وقوفوں یعنی سفہا کی حکومت سے بچائے۔ انھوں نے عرض کیا۔ حضور! سفہا کی حکومت سے کیا مراد ہے۔ فرمایا۔ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے، جو

---

[1] کنز العمال ص۳۶ ج ۲۷، مواردالظمآن ص۳۷۸، تفسیر ابن کثیر ص۴۵۳ ج ۴

میری ہدایت کو اختیار نہیں کریں گے۔ اور میری سنت کو نہیں پکڑیں گے۔ ظلم و زیادتی کریں گے۔ فرمایا جس شخص نے ایسے لوگوں کے ظلم پر اُن کی اعانت کی، اُن کے جھوٹ کو سچ سمجھا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اور میرے حوض پر نہیں آئے گا۔ اور جس نے اُن کی تصدیق نہ کی، اعانت نہ کی، وہ مجھ سے ہے۔ اور میرے حوض پہ آئے گا۔ پھر فرمایا اے کعب! یاد رکھو اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ روزہ ایک ڈھال ہے۔ یعنی دنیا میں گناہوں کے سامنے ڈھال کی مانند ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے بچ جاتا ہے ——— اور صدقہ غلطیوں کو مٹاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالصَّلٰوۃُ قُرْبَانٌ ایک روایت میں قربان[۱] کا لفظ آتا ہے۔ اور دوسری میں برہان[۲] آتا ہے۔ یعنی نماز مومن کے ایماندار ہونے کی دلیل ہے۔ یا برزخ اور آخرت میں کامیابی کی دلیل ہے۔ قُرْبَان سے مراد تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یعنی اس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ پھر فرمایا۔ اے کعب! یاد رکھو کُلُّ لَحْمٍ وَّدَمٍ نَبَتَا مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰی بِہٖ جو جسم مالِ حرام سے پلتا ہے، دوزخ کی آگ اس کے ساتھ زیادہ حقدار ہے مقصد یہ کہ مال حرام سے پرورش پلنے والا جسم دوزخ میں جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ پھر فرمایا اے کعب! یاد رکھو ہر انسان صبح کرتا ہے۔ اور اپنے نفس کو بیچتا ہے۔ اور بیچنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر اس نے ایمان اور نیکی کو خریدا تو فلاح میں چلا گیا۔ اور اگر اُس نے بُرائی، کفر، شرک اور غلطیوں کو خریدا تو وہ ناکامی کی طرف چلا گیا اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا کا یہ مطلب ہے۔

ایک دوسری روایت میں یوں[۳] آتا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آدمی جو روزمرہ اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ دو جھنڈوں میں سے کسی ایک کے نیچے ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور پسندیدہ کاموں میں لگاتا ہے۔ تو دروازے سے نکلنے کے بعد ایک فرشتہ جھنڈا لیے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ کے فرشتے کے جھنڈے میں چلا جاتا ہے اور اگر وہ شخص اپنے آپ کو خدا کی نامرضیات اور ناپسندیدہ کاموں میں لگاتا ہے۔ تو شیطان بھی جھنڈا لیے دروازے میں کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ شیطان کے جھنڈے

---

[۱] مجمع الزوائد [۲] کنز العمال [۳] ابن کثیر ص ۴۵۳ ج ۴

کے نیچے چلا جاتا ہے۔ غرض ہر انسان یا تو شکر گزار ہو گا یا ناشکر گزار۔

اشرار کا انجام

اب آگے انجام کا ذکر ہے۔ جو پہلی سورۃ کا موضوع ہے۔ فرمایا۔ یاد رکھو! اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ۟ بے شک ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ سلاسل یعنی زنجیریں جن کی تفصیل پچھلی سورتوں میں آچکی ہے ستر ستر گز لمبی زنجیریں ہوں گی۔ بڑی بڑی آہنی زنجیریں جن کے ساتھ جکڑ کر جہنم میں گھسیٹا جائے گا۔ نیز فرمایا وَاَغۡلٰلًا اور گلے میں طوق ہوں گے جب کہ ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ اور اُدھر وَسَعِیۡرًا بھڑکتی ہوئی آگ ہو گی جس میں انہیں ڈالا جائے گا۔ یہ ہے اشرار کا انجام۔ جو کہ اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ابرار کیلئے انعامات

اب ابرار کا ذکر ذرا تفصیل سے ہوتا ہے۔ فرمایا اِنَّ الۡاَبۡرَارَ ابرار بَرّ کی جمع ہے بے شک نیک شخص وہ ہو گا جو اچھے کاموں کے ساتھ موسوم ہو گا۔ جس میں توحید اور ایمان ہو گا اور جس کا عقیدہ درست ہو گا۔ اعمال صالحہ انجام دیتا ہو اور مرضیات الٰہی پر چلنے والا ہو۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں[1]۔ ابرار اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے، جو اپنے نفس کے حقوق، مخلوق کے حقوق اور اپنے خالق کے حقوق ادا کرتے ہوں۔ فرمایا اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ بے شک ابرار پئیں گے پیالے سے کَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا جس میں کافور کی ملاوٹ ہو گی۔ جو لوگ دنیا میں رنج و الم برداشت کرتے رہے، تکلیفیں جھیلتے رہے، خدا کی توحید، اس کی محبت اور ایمان کو سینوں سے لگائے رکھا، آخرت میں ان کا یہ انجام ہو گا۔ کہ اللہ تعالیٰ اُن کو شراب طہورہ کے جام پلائیں گے۔ اس دنیا میں بھی جو لوگ شراب پیتے ہیں، اُس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں شفاف پانی یا خوشبو وغیرہ ملا کر اُسے شراب ریحانی بناتے ہیں۔ مگر آخرت کی شراب تو پاک ہو گی۔ اس میں سرور پیدا کرنے کے لیے کافور ملایا جائے گا یہ دنیا والا ٹھنڈا کافور نہیں بلکہ کوئی اعلیٰ درجے کا کافور ہو گا۔ یہاں صرف اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔

آگے کافور کی تفصیل بتائی کر یہ گیا ہے۔ فرمایا۔ عَیۡنًا یہ ایک چشمہ ہے یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ اس سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ وہ بہت ہی اعلیٰ مرتبے والا ہو گا۔ اور اعلیٰ درجے کا سرور والا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اسی کافور کے چشمہ سے پانی پلائیں گے۔ اور جو ابرار ہوں گے ان کے شراب طہور میں بھی یہ کافور ملا ہوا ہو گا۔ تاکہ لطف دوبالا ہو جائے

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۶۲، ۲۶۳ پ ۲۹

اور سرور حاصل ہو جائے۔ البتہ اللہ کے خاص بندے جو اس کافور کے چشمہ سے پئیں گے اُن کا تو کیا ہی کہنا۔ وہ تو بڑے عالی مرتبت ہوں گے۔ اور پھر کیا ہو گا یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا وہ اللہ کے بندے اس چشمہ کو چلائیں گے۔ دراصل وہ چشمہ کیا ہو گا شراب طہور کی نہریں ہوں گی۔ جیسا کہ سورۃ قتال میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور امام سیوطیؒ نے درمنثور[1] میں بھی بیان کیا ہے۔ کہ جنت کی نہروں کا حال عجیب و غریب ہو گا۔ جو آج انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ایک تو یہ بات ہے کہ جنت کی نہریں سطح ارضی پہ چلیں گی، مگر پانی میں گڑبڑ نہیں ہو گی۔ دوسری یہ کہ اہل جنت کے ہاتھوں میں سونے کی چھڑیاں ہونگی، اور مومن جس طرف اشارہ کرے گا، نہر اسی طرف رُخ پھیرے گی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں[2]۔ کہ یہاں جس نہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا منبع حضور علیہ السلام کا قصر مبارک ہو گا ـــــــــــــــــــــــــــ آپ کا محل ہو گا جس سے یہ چشمے نکل کر مومنوں کے گھروں میں پہنچیں گے۔ مومن جس طرف چاہے گا، نہر اسی طرف مڑ جائے گی۔ جیسا کہ سورۃ قتال میں فرمایا۔ کہ یہ ایسا پانی ہو گا جو گلنے سڑنے والا نہ ہو گا۔ یہ دودھ اور عسل مصفا کی نہریں ہوں گی۔ اور ابرار کے اشارے پہ یہ نہریں رُخ بدل لیں گی۔

اشرار اور ابرار کے انجام کے بعد آگے ابرار کی بعض صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ کون لوگ ہیں۔

---

[1] درمنثور ص ۲۹۸ ج ۶، روح المعانی ص ۱۵۵ ج ۲۹ [2] روح المعانی ص ۱۵۵ ج ۲۹

درس دوم ۲ (آیت ۷ تا ۱۲)

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾

ترجمہ: - وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی ⑦ وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین، یتیم، اور قیدی کو ⑧ (اور وہ کہتے ہیں) بے شک ہم ــــ تم کو ــــ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلہ مانگتے ہیں اور نہ شکریے کے طالب ہیں ⑨ بیشک ہم اپنے رب سے اس دن کا ڈر رکھتے ہیں۔ جو بڑا ترش رو اور سخت ہوگا ⑩ پس بچالے گا اللہ تعالیٰ اُن کو اس دن کے شر سے اور دے گا ان کو تروتازگی اور خوشی ⑪ اور ان کے صبر کی وجہ سے انکو جزا دے گا، جنت اور ریشمی لباس ⑫

ربط آیات

سورۃ دہر کی پہلی آیات میں انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے، اور اس کے بعد ابرار اور اشرار کا انجام بیان کیا ہے۔ اس سے پہلی سورۃ میں بھی دونوں گروہوں کا ذکر ہے۔ مگر وہاں زیادہ تفصیل نہیں ہے۔ تاہم اس سورۃ میں ابرار کے انجام کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ یعنی جب ابرار اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچیں گے، تو وہاں اُن کو کیا کیا انعامات ملیں گے اس سے پہلے ایک ہی آیت میں اشرار کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔

پہلے درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ ابرار کے متعلق فرمایا "اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا" یعنی ابرار اُس پیالے سے پئیں گے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی یہ دنیا والا ٹھنڈا اور خوشبودار کافور نہیں بلکہ فرمایا کہ کافور جنت میں چشمہ ہے جس کا پانی اللہ تعالیٰ

کے خاص الخاص بندے پییں گے۔ تاہم ابرار کو بھی اس کا کچھ حصہ ضرور نصیب ہو گا۔ جس سے اُن کی خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ "یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا" ابرار کے ہاتھوں میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی، وہ جدھر اشارہ کریں گے، چشمے کا پانی اُسی طرف بہنے لگے گا۔

ابرار کی صفات

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے ابرار کی بعض صفات بیان فرمائی ہیں۔ اور ان انعامات کا ذکر کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کو ملنے والے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں اُن کی چند ایک علامات بیان کی ہیں۔ پہلے نمبر پر فرمایا۔ کہ ابرار کی نشانی یہ ہے کہ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ یعنی وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا وہ اُس دِن سے ڈرتے ہیں جس دن کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی۔ تیسری علامت یہ بیان کی۔ کہ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ وہ کھانا کھلاتے ہیں عَلٰی حُبِّهٖ اس کی محبت پر مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا مسکین، یتیم اور قیدی کو۔ چوتھی صفت ابرار کی یہ بیان کی کہ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ کہ ہم کھانا جو کھلاتے ہیں یہ محض اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ہم نہ تم سے بدلہ مانگتے ہیں۔ اور نہ شکریہ کے طالب ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا ہم اپنے رب سے اُس دِن سے ڈرتے ہیں جو عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا بڑا ترش رو اور سخت دِن ہوگا۔ ہمیں اُس دِن کا خطرہ لاحق ہے۔ کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی گرفت میں نہ آجائیں۔ تو بہرحال اللہ تعالےٰ نے ابرار کی یہ صفات بیان کی ہیں۔ جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

نذر کا معنیٰ

پہلی صفت نذر کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ نذر منت کو کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا کام انسان خود اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ جو شریعت یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر فرض یا واجب نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص کہتا ہے۔ کہ اگر میرے فلاں بیمار کو شفا ہو گی تو میں اللہ تعالےٰ کے لیے ایک بکرا یا گائے ذبح کروں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری نہیں تھا۔ مگر اُس شخص نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اسے نذر یا منت کہتے ہیں۔ اور اس کا پورا کرنا اصل کام کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ مثلاً اگر بیمار شفایاب ہو گیا، تو بکرا یا گائے ذبح کرنا واجب ہو گیا۔ نذر سے متعلق احادیث میں تفصیلات موجود ہیں۔ نذر جائز بھی ہوتی ہے۔ اور ناجائز بھی، صحیح بھی ہوتی ہے، اور غلط بھی، حلال بھی حرام بھی۔ فقہائے کرام نے اس کی تفصیلات فقہ

کی کتابوں میں بیان کی ہیں۔

نذر کا مسئلہ

نذر یا منت کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک[1] ہے لَا تَنْذِرُوْا نذر نہ مانا کرو۔ کیونکہ اِنَّ النَّذْرَ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْقَدْرِ شَیْئًا یعنی نذر اللہ کی تقدیر میں سے کسی چیز کو نہیں روکتی۔ وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ اور اس نذر کے ذریعے بخیل آدمی سے مال نکالا جاتا ہے، اکثر کنجوس لوگ ہی منت مانا کرتے ہیں۔ کوئی مقدمہ پیدا ہو گیا یا کوئی بیماری آ گئی یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا تو گھبرا کر منت مانتے ہیں۔ تو اس طرح اللہ تعالےٰ بخیل سے مال نکالتے ہیں۔ ویسے یہ پسندیدہ فعل نہیں کیونکہ یہ سودے بازی بن جاتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ کام کریں تو ہم اُس کی رضا کے لیے فلاں عبادت کریں گے۔ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی عبادت خالص اُس کے لیے بغیر معاوضہ کے کرنی چاہیئے۔ تاہم اگر کوئی شخص منت مان ہی لیتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[2] مَنْ نَذَرَ اَنْ یُّطِیْعَ اللّٰہَ فَلْیُطِعْہُ جس نے منت مانی ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اُس کو وہ جائز کام انجام دینا چاہیئے۔ جائز نذر کو پورا کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا وَمَنْ نَذَرَ اَنْ یَّعْصِیَہٗ اور جس شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا یعنی ناجائز منت مانی فَلَا یَعْصِہٖ تو اس کو نافرمانی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اس نذر کو پورا نہیں کرنا چاہیئے توڑ دینا چاہیئے۔ اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اور اس نذر کے بدلے وہی کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ جو قسم توڑنے کا کفارہ ہے

ناجائز اور حرام منت

اس زمانے میں اکثر لوگ ناجائز اور حرام منت مانتے ہیں۔ مثلاً اگر فلاں کام ہو گیا، تو ہم داتا صاحب کی قبر پہ چادر چڑھائیں گے، یا وہاں دیگ دیں گے یا بکرا ذبح کریں گے۔ اس قسم کی منت غیر اللہ کی منت بن جاتی ہے اور شرک ہے۔ اگر شرک نہ بھی ہو ——— اور اس سے داتا صاحب یا غیر اللہ کا تقرب مراد نہ ہو تو وہاں پہ صرف مجاوروں کو کھلانا بھی جائز نہیں کیونکہ مجاور اکثر مالدار ہوتے ہیں۔ اور وہ نذر کا مال کھانے کے اہل نہیں ہوتے۔ اس کے حقدار تو مساکین ہوتے ہیں۔ جو لوگ زکوٰۃ و صدقات لینے کے حقدار ہیں۔ وہی نذر کا مال کھانے کے مستحق ہیں۔

---

[1] ترمذی ص ۲۴۱، بخاری ص ۹۹ ج ۲، مسلم ص ۴۴ ج ۲ [2] بخاری ص ۹۹۱ ج ۲، ابو داؤد ص ۱۱۱ ج ۲، ترمذی ص ۲۳۹، سنن دارمی ص ۱۰۵ ج ۲

اگر کوئی یہ کہے کہ داتا صاحب کی قبر پہ نذر پوری کرنے سے ان کا تقرب مراد نہیں بلکہ محض ان کی خوشنودی اور رضا مطلوب ہے۔ تو یہ شرک اور قطعی طور پر حرام ہے۔ ایسی منت کا پورا کرنا درست نہیں، اسے توڑ دینا چاہیئے، اور قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔

ناجائز منت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں[1]۔ کہ ناجائز منت واقع ہی نہیں ہوتی تاکہ اس کو پورا کرنا ضروری ہو بلکہ اگر اس نے مانی ہے تو اس کا توڑنا ضروری ہے۔ اور اس کا کفارہ بھی ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ اور بہت سے دیگر فقہائے کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ حدیث شریف کے مطابق جس شخص نے معصیت کی نذر مانی، وہ اسے توڑ دے اور وَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ[3] اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جو وہ ادا کرے۔ حدیث[4] شریف میں آتا ہے۔ کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ وہ برہنہ سر پیدل حج کرے گی بشرطیکہ اس کا فلاں کام ہو جائے۔ جب حضور علیہ السلام کو اس بات کا علم ہوا۔ تو آپ نے فوراً منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ عورت کو سر کھولنا حرام ہے۔ اگر اس کا چوتھائی سر کھلا ہے تو تنہائی میں بھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ باقی رہی دوسری بات پیدل چلنے والی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ پیدل چلنے کی طاقت نہیں رکھتی، لہٰذا اس کو سوار ہونا چاہیئے۔ سر بھی ڈھانپنا چاہیئے۔ کہ عورت کے سب بال ستر میں داخل ہیں۔ اور اللہ کے راستے میں ایک جانور قربانی کرے۔

جائز منت

اگر کوئی جائز منت مانے تو اس کا پورا کرنا فرض ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو حج کروں گا یا عمرہ کروں گا یا سو رکعت نفل ادا کروں گا ــــــــ تو جب وہ کام ہو گیا تو اب نذر کا پورا کرنا بھی واجب ہو گیا۔ ایسی چیزیں منت ماننے والا خود اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے، قدرت کی طرف سے اس کا التزام نہیں ہوتا۔

ابرار کی پہلی صفت نذر پورا کرنا

تو فرمایا کہ ابرار کی پہلی صفت یہ ہے کہ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وہ جائز نذر کو پورا کرتے ہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں[5] کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ اپنے اوپر خود ایک کام کو لازم کر لیتے

---

[1] بعض سے امام مالکؒ و شافعیؒ مراد ہیں دیکھیے ترمذی ص۲۳۹ [2] ترمذی ص۲۳۹ [3] ابوداؤد ص۱۱۱ ج۲ مسلم ص۴۵ ج۲ ترمذی ص۲۳۹ [4] سنن دارمی ص۱۰۴ ج۲، ابوداؤد ص۱۱۱ ج۲، [5] روح المعانی ص۱۵۵ ج۲۹۔

ہیں اور پھر اُس کو پورا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض و واجبات بدرجہ اولیٰ پورا کریں گے۔ مقصد یہ کہ ابرار تمام فرائض و واجبات اہتمام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ جنت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور انعام واکرام پاتے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ابرار وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے نفس کا حق، اللہ کا حق اور بندوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

دوسری صفت خوفِ آخرت

ابرار کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا اور اُس دن سے ڈرتے ہیں، جس دن کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی۔ یعنی اُس کے خوف و شر سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ ہر آدمی پر وحشت طاری ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا[1] حشر کے میدان میں ایسا وقت بھی آئے گا، جب اللہ کے نبی بھی رَبِّ سَلِّمْ، رَبِّ سَلِّمْ پکاریں گے یعنی اے اللہ! آج بچالے، آج بچالے۔ جب انبیاء کی یہ حالت ہوگی تو عام مخلوق کا کیا حال ہوگا، مقصد یہ کہ ابرار اُس دن سے ڈرتے ہیں۔ خدا کی معصیت اور ناراضگی سے وہی شخص بچنے کی کوشش کرے گا، جس کے دل میں خوف ہوگا، اور وہ اسی ڈر کی وجہ سے فرائض و واجبات کو پورا کرے گا۔ یہ ابرار کی دوسری صفت ہے۔

تیسری صفت کھانا کھلانا

ابرار کی تیسری صفت یہ ہے وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ وہ کھانا کھلاتے ہیں عَلَىٰ حُبِّهِ اُس کی محبت کے ساتھ۔ ضمیر ہٖ کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف بھی لوٹ سکتا ہے اور طعام کی طرف بھی۔ تو معنیٰ یہ ہوا کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کھانے کی محبت کے ساتھ کہ کھانے کی خود بھی ضرورت ہے۔ اُس کے ساتھ محبت ہے مگر دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم اس طرح بھی ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ تم اعلیٰ درجے کی نیکی کو نہیں پا سکتے، جب تک اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ کھانے کے ساتھ محبت ہے اپنا بھی دل چاہتا ہے۔ مگر اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کو کھلاتے ہیں، مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کا خیال رکھتے ہیں۔

اگر ہٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائی جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں عَلَىٰ حُبِّهِ

---

[1] مسلم صفحہ ۱۰۱ ج ۱

اللہ کی محبت کے ساتھ۔ یعنی اُن کے دِل میں خدا تعالٰے کی محبت موجود ہے۔ اور اِس محبت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھلاتے ہیں مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا مسکینوں یتیموں اور اسیروں کو۔

مسکین: مسکین وہ شخص ہے۔ جس کے پاس تھوڑا بہت مال ہو، مگر اُس سے اُس کی جائز ضروریات بھی پوری نہ ہوتی ہوں۔ مثال کے طور پر اس زمانہ میں ایک مزدور کے دس بچے ہیں، اور اس کو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ تو اُس کے بچوں کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ اُن کی بنیادی ضروریات دال، روٹی اور کپڑا بھی مہیا نہیں ہوتا تو اس قسم کا شخص مسکین ہے۔ اور فقیر وہ ہوتا ہے۔ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یعنی کم از کم ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔

یتیم: یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے، جس کا سرپرست فوت ہو گیا ہو، اور جس کا کمانے والا کوئی نہ ہو۔ یتیمی کا اطلاق سن بلوغت سے پہلے پہلے ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے لَا یُتْمَ بَعْدَ الْبُلُوْغِ یعنی کوئی فرد بلوغت کے بعد یتیم نہیں رہتا، بلکہ خود اپنا سرپرست بن جاتا ہے۔ اور اس پر تمام فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔

اسیر: اسیر سے مراد قیدی ہے، خواہ مسلمان ہو یا کافر۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں اکثر قیدی غیر مسلم ہی ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ[2] قبیلہ عُقَیل کے ایک قیدی کو دشمن سمجھ کر پکڑ لائے۔ اور اُسے زنجیروں میں جکڑ دیا۔ حضور علیہ السلام کا اُدھر سے گذر ہوا، تو اُس قیدی نے آپ کو آواز دی اور عرض کیا، حضور! میں تو عمرہ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ آپ کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا، میرا کیا قصور ہے۔ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے تیرے حلیفوں کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ انہوں نے ہمارے آدمی مارے ہیں۔ اُس جرم میں تمہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا، اگر اسلام کا اظہار گرفتاری سے پہلے کرتے تو ہمارے ساتھی تمہیں قید نہ کرتے۔ اب تمہارا اسلام تو قبول ہو گا، مگر تمہیں رہائی نہیں ملے گی بلکہ ضابطے کی کارروائی ہو گی۔

حضور علیہ السلام واپس ہوئے تو اُس قیدی نے دوبارہ آواز دی، اور عرض کیا مجھے رہا

---

[1] شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۸۴ [2] مسلم ص ۴۴ ج ۲

کردیں۔ آپ نے فرمایا، نہیں۔ اُس نے تیسری دفعہ آواز دی اور آپ پھر متوجہ ہوئے۔ اچھا مجھے کھانا ہی کھلا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم تو بڑے مہربان تھے، اس کی بات سنتے ہی فرمایا، ہاں! یہ تیرا حق ہے۔ تجھے کھانا ضرور کھلایا جائے گا۔

غرضیکہ قیدی خواہ کافر ہو یا مسلمان، اس کو کھانا کھلایا جائے گا۔ قیدی اگر ظالم بھی ہے، جیسے اُس نے قتل کیا ہے۔ اور اسیر ہے۔ تو اُس کو قتل کی سزا ملے گی، وہ قصاص میں قتل کیا جائے گا، اُس کو پھانسی دی جائے گی یا سولی پر لٹکایا جائے گا، تاہم اس کو بھوکا نہیں رکھا جائے گا۔ اور بنیادی طور پر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کہ قیدیوں کے کھانے کا بندوبست کرے۔ جنگ بدر کے موقع پر جو کفار قید ہو کر آئے تھے انہیں مختلف مسلمانوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ کسی مسلمان کی ذمہ داری میں ایک قیدی تھا کسی کے پاس دو تھے۔ ہر قیدی کی حفاظت اور اس کا خورد و نوش سپردار کے ذمہ تھا۔ صحابہ کا حال یہ تھا۔ کہ خود بھوکے رہتے تھے مگر قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

اطعام طعام وسیع معنوں میں

حدیث شریف میں آتا ہے[1] کھانا کھلانا کوئی معمولی بات نہیں، کھانے کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو ایک وقت کا یا دو وقت کا کھلا دیا بلکہ کھانا کھلانے کا مقصد یہ ہے۔ کہ سوسائٹی کے نادار افراد کی دستگیری کی جائے، انہیں سوسائٹی کا اچھا رکن بننے میں مدد دی جائے۔ اور جب تک ایسے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو جائیں، اُن کی جائز امداد جاری رکھی جائے۔ کھانا کھلانے سے محض بھکاری بنانا مقصود نہیں۔ بھیک مانگنا تو ویسے بھی ناجائز اور حرام ہے۔ اصل مقصد غرباء و مساکین کو سوسائٹی میں اِن کا جائز مقام دلانا ہے۔ کیونکہ اگر سوسائٹی کے ارکان تباہ ہو گئے تو ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی تباہ حال ہوگی۔ اور اسے عزت کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ آج کی دنیا میں ترقی یافتہ قومیں اپنے بیکار باشندوں کو گذارہ الاؤنس دیتی ہیں۔ برطانیہ جیسے ملک میں جب تک کسی شخص کو کام مہیا نہیں کر دیا جاتا، اُسے گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ اِس طرح وہ اپنی سوسائٹی کو تباہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے۔ کہ کسی کی مدد کر کے اُس پر احسان مت جتلاؤ۔ بلکہ اس کے ساتھ عزت کے ساتھ احسان کرو، یہ تمہارا فرض ہے۔

---

[1] بخاری ص ج ۱ ایُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ

حضرت علیؓ کے پاس کوئی محتاج آکر سوال کرتا تھا۔ تو خوش ہو کر فرماتے تھے[1]۔ مَرْحَبًا لِمَنْ یَّحْمِلُ زَادَنَا بِغَیْرِ اَجْرٍ خوش آمدید اس آدمی کے لیے جو ہماری آخرت کا توشہ ہمارے طلب کرنے کے بغیر ہی اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ کسی محتاج کو دینا، اپنے لیے آخرت کا توشہ بھیجنا ہے۔ بخاری شریف[2] اور مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا اَیُّ خِصَالِ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ حضور! اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا اطعام الطعام یعنی محتاجوں کو کھانا کھلانا بہترین خصلت ہے۔ غرضیکہ ابرار کی یہ صفت ہے۔ کہ وہ اپنی ضرورت اور محبت کے باوجود، محتاجوں، یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

چوتھی صفت خالص اللہ کی رضا کی طلب

ابرار کا یہ خاصہ ہے۔ کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ یعنی ہم کھانا صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ہم نہ اس کے لیے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، اور نہ شکر گزاری کے خواہشمند ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق روایت[3] ہے۔ کہ کسی محتاج کو صدقہ یا خیرات بھیجتی تھیں تو فرماتی تھیں، پتہ کرو، انہوں نے کیا کہا۔ اگر ان لوگوں نے شکریہ ادا کیا، تو آپ ان کے لیے بھی دعا کرتی تھیں۔ تاکہ آخرت کا اجر خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ آپ لِوَجْهِ اللّٰهِ کا اتنا اہتمام کرتی تھیں، کہ کہیں اس میں احسان کا عنصر نہ پایا جائے۔

خوف خدا اور اس کے بدلے انعامات

ابرار یہ بھی کہتے ہیں اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ہم اپنے پروردگار سے اس دن سے ڈرتے ہیں، جو بڑا اداس، ترش رو اور سخت ہوگا۔ قمطریر سخت کو کہتے ہیں اگر اونٹنی دودھ دینے سے انکار کردے، تو دم اٹھا لیتی ہے، اور جسم کو سکیڑ لیتی ہے، تو کہتے ہیں یہ قمطریر ہو گئی ہے۔ بڑی سخت ہو گئی ہے۔ اسی طرح ابرار کہتے ہیں۔ کہ ہم اس دن سے ڈرتے ہیں، جو بڑا سخت ہوگا۔

آگے فرمایا فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ پس بچالے گا اللہ تعالیٰ ان کو اس دن کے شر سے جو ایسے نیک ہیں وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا اور دے گا ان کو تروتازگی

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۱۱ پارہ ۲۹، [2] بخاری ص ۶ ج ۱، مسلم ص ۴۸ ج ۱ [3] تفسیر عزیزی ص ۲۶۵ پارہ ۲۹۔

اور خوشی۔ یعنی چہروں پر تر و تازگی ہوگی اور اُن کے دل میں خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کو دونوں چیزیں عطا کرے گا۔ کامل الایمان آدمی کے چہرے پر نور ہوگا، رونق ہوگی۔ برخلاف اس کے ہر فاسق و فاجر کے چہرے پر سیاہی ہوگی جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے۔ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا اور اُن کے صبر کی اُن کے لیے جزا ہوگی جَنَّةً وَّحَرِيْرًا جنت اور ریشمی لباس مطلب یہ کہ ان لوگوں نے اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر محتاجوں کی ضروریات کو مقدم رکھا اور اس پر صبر کیا، لہٰذا اس صبر کی جزاء کے طور پر انہیں جنت عطا کی جائے گی اور نہایت عمدہ ریشمی لباس پہنایا جائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوسرے انعامات اور اُن کی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔

درس سوم ۳ | (آیت ۱۳ تا ۲۲)

مُتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ:۔ بہشت میں تکیے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ دھوپ کی شدت یا سخت سردی اس میں نہیں دیکھیں گے ﴿۱۳﴾ اور جھکے ہوئے ہوں گے ان پر درختوں کے سائے اور پست کر دیئے جائیں گے درختوں کے پھل لٹکا کر ﴿۱۴﴾ اور ان پر چاندی کے برتن پھیرے جائیں گے اور آبخورے جو شیشے کے ہوں گے ﴿۱۵﴾ اور شیشہ چاندی کا ہوگا اور وہ (اہل بہشت یا خدام) اس کا اندازہ کریں گے اندازہ کرنا ﴿۱۶﴾ اور انہیں اس میں (بہشت میں) ایسے پیالے پلائے جائینگے جن میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی ﴿۱۷﴾ وہ ایک چشمہ ہے اس میں جس کو سلسبیل کہتے ہیں ﴿۱۸﴾ اور ان کے سامنے بچے پھریں گے جو ہمیشہ رہیں گے۔ جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتیوں جیسا خیال کریگا ﴿۱۹﴾ اور جب تو دیکھے گا اس مقام پر تو دیکھیگا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی ﴿۲۰﴾ اہل جنت کے اوپر سبز رنگ کے باریک ریشم کی پوشاک ہوگی اور موٹے ریشم کی۔ اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سیراب کرے گا ان کو ان کا پروردگار شراب طہور سے ﴿۲۱﴾ بیشک یہ تمہارے کیئے کی جزا ہے اور جو محنت تم نے (دنیا میں) کی اس کی قدردانی کی گئی ہے ﴿۲۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ابرار کا ذکر فرمایا، اُن کی صفات اور بدلے کا ذکر کیا جو ان کو اللہ کے ہاں حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ ابرار وہ لوگ ہیں جو فرائض اور واجبات کو پورا کرتے ہیں۔ کھانے کی محبت کے باوجود محتاجوں کو کھلاتے ہیں۔ انہیں کسی بدلے یا شکر گزاری کا لالچ بھی نہیں ہوتا، بلکہ محض روزِ قیامت ـــــ کے خوف کے سبب ایسا کرتے ہیں۔ ایسا دن جو بڑا ترش رُو اور سخت ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابرار کو اس دن کی سختی سے بچالے گا اور انہیں وہاں تروتازگی اور سرور حاصل ہوگا۔ یہ اُن کے صبر کا بدلہ ہوگا۔ کہ انہیں جنت اور اس میں ریشمی لباس پہنایا جائے گا۔ گویا جو لوگ دنیا میں مصائب پر صبر کرتے ہیں، تکالیف کو برداشت کرتے ہیں، وہ آخرت میں کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہوں گے۔

بڑا تختوں پر بڑے آرام سے بیٹھنے والے ہونگے

اب ان آیات میں اُس اچھے صلے کی کچھ تفاصیل ہیں، جو ابرار کو اللہ کے ہاں حاصل ہوگا جن لوگوں نے دنیا میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں وہاں وہ نہایت آرام اور سکون سے رہیں گے۔ فرمایا مُتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ بہشت میں تکیے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوں گے، ارائک، اریکہ کی جمع ہے جس کے معنی ڈولی کے ہوتے ہیں، اوپر پردہ لگا ہوتا ہے۔ اور بنچ یا عمدہ قسم کا صوفہ جو اِس زمانہ میں ہوتا ہے۔ ان پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوں گے، اور انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یا اس کی مثال ایسی ہے، جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھا ہو۔ جنت میں جانے والا ہر شخص بادشاہ ہوگا، اُس کو ایسی سہولتیں اور آرام و آسائش میسّر ہونگے جو دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہ ہوں۔ اور یہ نعمتیں بغیر کسی خدشے کے حاصل ہوں گی، دنیوی انعامات کے تو ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر وہاں کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے۔ کہ جنت میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے لیے بھی ایک ہزار خدام ہوں گے، بعض جگہ اسی ہزار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کم از کم ایک ہزار نوکر چاکر ہوں گے، ہر کوئی اپنا اپنا فرض ادا کر رہا ہوگا۔ اپنے کام میں مشغول ہوگا۔ الغرض کسی انسان کے عیش و آرام کے لیے جس قدر لوازمات بھی چاہئیں، وہ سب وہاں میسّر ہوں گے۔

---

[1] تفسیر مظہری صہ ۱۵۹ ج ۱۰، روح المعانی صہ ۱۶۱ ج ۲۹۔

دھوپ اور سخت سردی سے محفوظ ہونگے

فرمایا لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا اور ابرار جنت میں دھوپ کی شدت یا سخت سردی نہیں دیکھیں گے۔ سورج قریب ہو تو تپش میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور انسان تنگ ہو جاتا ہے اور اگر سورج دور منطقہ بارد میں چلا جائے، تو سردی بڑھ جاتی ہے۔ سردی کی لہر بھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ فرمایا جنت میں یہ دونوں تکالیف نہیں ہوں گی۔ گرمی کی لہر سے بھی جانوں اور فصلوں کا نقصان ہوتا ہے اور کڑاکے کی سردی بھی زندگی اور پھلوں کے اتلاف کا باعث بنتی ہے۔ مگر جنت کا موسم نہایت معتدل ہو گا، نہ سخت سردی ہوگی اور نہ سخت گرمی۔

اُن پر سایہ ہو گا

نیز یہ بھی فرمایا وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا قریب ہوں گے، جھکے ہوئے ہوں گے اُن پر سائے۔ ظلال ظل کی جمع ہے جس کے معنے سایہ کے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ جب جنت میں سورج ہی نہیں ہو گا جیسا کہ پڑھ چکے ہیں "لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا" تو پھر سائے کا کیا مطلب۔ فرمایا اس کا ایک معنیٰ تو یہ ہے۔ کہ ظلال کا اطلاق درختوں پر کیا گیا ہے، نہ کہ درختوں کے سائے پر۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ اہل جنت پہ درخت جھکے ہوئے ہوں گے یا اُن کے قریب ہوں گے تاکہ جنتیوں کو اُن کے پھل حاصل کرنے میں دقت نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ سورج کی عدم موجودگی کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ وہاں کوئی دوسرے روشن اجسام بھی نہیں ہوں گے۔ سورج کے علاوہ بھی تو اجسام نیرہ ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے سایہ کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جیسے عرش الٰہی کا سایہ۔ اگرچہ اس کا سایہ سورج کی مانند نہیں ہو گا، مگر سایہ تو ہو گا۔ ترمذی شریف[2] کی روایت میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا افضل صدقہ کون سا ہے، فرمایا ظِلُّ فُسْطَاطٍ اسی طرح جب مجاہدین جہاد کے لیے نکلتے ہیں تو ان کے سفر و حضر میں خیمہ کا سایہ مہیا کرنا افضل صدقہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث[3] میں ایسے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے۔ جو سائے والی جگہ پر بول و براز کریں۔ سایہ خواہ کسی مکان کا ہو، یا چھت کا ہو۔ ایسی جگہ پر گندگی پھیلانے سے منع فرمایا گیا، کیونکہ گرمی میں وہاں لوگ آرام کرتے ہیں۔ مگر بہشت میں نہ تو سورج ہو گا، اور نہ اس کی تپش، تو وہاں سائے سے کیا مراد ہو گا مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی طبیعت کو ہمہ گیر بنایا ہے۔ اس کے دل میں مختلف الانواع

---

[1] تفسیر عزیزی صفحہ ۱۷۲ پارہ ۲۹ [2] ترمذی صفحہ ۲۵۲ ج ۱ [3] مسلم صفحہ ۱۳۲ ج ۱۔

اشیا کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ یعنی بغیر ضرورت کے بھی اگر کسی جنتی کی خواہش ہو گی کہ وہ سائے میں بیٹھے۔ تو اس کیلئے سایہ موجود ہو گا۔ اسی لیے فرمایا وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا اُن پر سائے جھکے ہوئے ہوں گے۔

اُن پر پھل جھکے ہوئے ہونگے

نیز فرمایا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا اور پست کر دیے جائیں گے، تابع کر دیے جائیں گے۔ قریب کر دیے جائیں گے درختوں کے پھل درختوں سے پھل اتارتے ہیں جس طرح دنیا میں مشقت کرنی پڑتی ہے، اس طرح وہاں نہیں کرنی پڑے گی۔ کھجور کے درخت سے پھل اتارنے کے لیے نہ پیٹی باندھنے کی ضرورت ہو گی اور نہ سیڑھی لگانے کی، بلکہ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا۔ درخت کا سایہ ان اہلِ جنت پر ہو گا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا۔ اور درختوں کے پھل اُن پر جھکے ہوئے ہوں گے جنتی خواہش کرے گا تو درخت جھک کر سامنے آجائے گا۔ اور وہ حسبِ خواہش پھل توڑ کر استعمال کرے گا۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے۔ کہ ـــ پھل توڑنے سے پھلوں میں کمی واقع نہیں ہو گی بلکہ اُسی جگہ دوسرا پھل موجود ہو گا۔ الغرض فرمایا۔ کہ پھل قریب کر دیے جائیں گے ٹہنیاں جھکی ہوئی ہونگی، جس حالت میں کوئی جنتی خواہش کرے گا، بیٹھے بیٹھے، لیٹے ہوئے، چلتے پھرتے ہر حالت میں بغیر مشقت اٹھائے اُسے مطلوبہ چیز میسر ہو جائے گی۔

چاندی کے برتن

وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ اور اُن پر چاندی کے برتن پھیرے جائیں گے اور گلاس یا آبخورے كَانَتْ قَوَارِيرَا جو شیشے کے ہوں گے۔ قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ اور شیشہ چاندی کا ہو گا قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا اور اہلِ بہشت یا خدام اس گلاس کا اندازہ کریں گے اندازہ کرنا۔ یعنی جنتی کی خواہش کا اندازہ کریں گے اس کے مطابق انہیں گلاس میں مشروب پیش کیا جائیگا کمی بیشی نہیں ہو گی۔ اور برتن چاندی کے ہوں گے، دوسری جگہ سونے کا ذکر بھی آتا ہے۔ یعنی مختلف درجات کے مطابق سونے کے برتن بھی ہوں گے۔ تاہم یہاں صرف چاندی کا بیان ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ کہ وہ چاندی شیشے کی ہو گی یعنی شیشے کی طرح شفاف ہو گی۔ گویا ان برتنوں میں چاندی اور شیشے کی خصوصیات بیک وقت موجود ہوں گی، ایسے مرکب کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ جنت میں ہی میسّر ہوں گے۔

اس دنیا میں سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا منع ہے۔ مسلم شریف

کی حدیث[1] میں ہے کہ سونے چاندی کے برتن استعمال کرنے والا شخص اِنَّمَا یُجَرْجِرُ فِی بَطْنِہٖ نَارَ جَھَنَّمَ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ البتہ عورت سونے چاندی کے زیور استعمال کرسکتی ہے۔ مرد کے لیے صرف چاندی کی ایک انگوٹھی جو ایک مثقال سے کم یعنی تقریباً تین ماشہ کی ہو۔ استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اور سونا مطلقاً حرام ہے۔ سونے چاندی کے برتن کسی صورت میں بھی استعمال نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ سلائی اور پاندان بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے سونا، اور ریشم ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا[2]۔ اللہ تعالےٰ نے میری امت کے مردوں کے لیے اِسے حرام قرار دیا ہے۔ اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔ تاہم بہشت میں یہ چیزیں سب کو میسّر آئیں گی۔

زنجبیل کے مشروب

ابرار کے دیگر انعامات کے متعلق فرمایا وَیُسْقَوْنَ فِیْھَا کَاْسًا اور انہیں ایسے پیالے پلائے جائیں گے کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا جن میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی۔ زنجبیل سونٹھ کو کہتے ہیں۔ یہ جو ادرک خشک ہو کر سونٹھ بن جاتی ہے۔ یہ بہت عمدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کمال درجے کی خصوصیات رکھی ہیں دماغ اور جسم کی حرارت عزیزی کو ابھارتی ہے۔ لطافت پیدا کرتی ہے، حافظے پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹر اس کے بے شمار فوائد سے خوب واقف ہیں۔ پہلی آیت میں کافور کا ذکر آیا تھا، اُس کی خوشبو، لطافت اور برودت کا بیان تھا، اس آیت میں زنجبیل کا ذکر ہے۔ اُس آیت میں کافور سے مراد وہ چشمہ تھا، جس کا پانی گلاس میں ملا کر جنتیوں کو دیا جائے گا، یہاں زنجبیل کا بیان ہے۔ کہ ان پیالوں میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی۔ مگر زنجبیل سے مراد سونٹھ نہیں ہے۔ بلکہ عَیْنًا فِیْھَا ایک چشمہ مراد ہے تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا جس کو سلسبیل کہتے ہیں۔ جس طرح کوثر ایک چشمہ ہے تسنیم ایک چشمہ ہے، اِسی طرح سلسبیل بھی ایک چشمہ کا نام ہے جس کی خاص خصوصیات ہوں گی۔ ابرار کو جب مشروبات پیش کئے جائیں گے۔ تو ان میں سلسبیل کی ملاوٹ ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دنیا میں شربت کا گلاس بنایا جاتا ہے تو اس میں روح کیوڑہ یا کوئی دوسری خوشبو دار چیز ملادی جاتی ہے۔ اسی طرح کافور، زنجبیل یا سلسبیل کا پانی مِلا دیا جائے گا، جس سے مشروب کی لطافت دوبالا ہو جائے گی۔

---

[1] مسلم ص $\frac{187}{2}$ ، [2] موارد الظمآن ص ۳۵۴ ، ابوداؤد ص $\frac{205}{2}$ ،

دنیا میں جس قدر مشروبات استعمال کیے جاتے ہیں، وہ پیاس بجھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور وہ شخص دنیا میں پیاس کی شدت برداشت کرتا ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ بہشت میں ایسا مشروب پلائے گا جس سے اُس کا سرور دوبالا ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص روزہ کی حالت میں پیاس برداشت کرتا ہے۔ یا نماز کی حالت میں پیاس محسوس ہوتی ہے۔ مگر وہ اسی حالت میں نماز پوری کرتا ہے۔ یا کسی وقت پانی کی نایابی کی وجہ سے پیاس کو برداشت کرتا ہے، تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے ہاں زنجبیل یا سلسبیل کے چشمے کا مشروب حاصل ہوگا، جس سے دنیا کے مشروبات کا کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔

خدمتگار بچے

منجملہ انعامات کے فرمایا یَطُوفُ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ان کے سامنے بچے پھریں گے، جو ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ اور یہ بچے جنتیوں کی خدمت کریں گے۔ اور ان کا نقشہ یہ ہوگا۔ إِذَا رَأَيۡتَهُمۡ جب تو اُن کو دیکھے گا حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنثُورًا تو انہیں بکھرے ہوئے موتیوں جیسا پائے گا۔ یہ نہایت حسین و جمیل بچے جنتیوں کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ بچے کون ہوں گے۔ کوئی دنیا کی مخلوق ہوگی یا انہیں اللہ تعالیٰ نے بہشت میں ہی پیدا کیا ہے۔ تو اس کے متعلق دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک تصور یہ ہے۔ کہ کفار کے وہ نابالغ بچے جو سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں، یہ وہ ہوں گے کیونکہ وہ مکلف نہ ہونے کی وجہ سے دوزخ میں تو نہیں جائیں گے، لہٰذا انہیں جنت میں خدمت پر مقرر کر دیا جائے گا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو بہشت میں ہی پیدا کرے گا اور اہل ایمان کی خدمت پر مامور کر دے گا۔

ملک اور حکومت

وَإِذَا رَأَيۡتَ اور جب تو دیکھے گا ثَمَّ اس مقام پر رَأَيۡتَ نَعِيمًا وَمُلۡكًا كَبِيرًا تو دیکھے گا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی۔ یعنی بہشت میں ہر شخص بادشاہ ہوگا، جس کی اپنی حکومت ہوگی۔ اور بادشاہوں والی تمام نعمتیں اُسے میسر ہوں گی۔ نَعِيمًا وَمُلۡكًا كَبِيرًا کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ ہر جنتی کو ہر قسم کا آرام و راحت اور ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہوں گی جیسے کہ بادشاہوں کو دنیا میں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے وَزَوَّجۡنَٰهُم بِحُورٍ عِينٍ ہم حور عین کے ساتھ اُن کا نکاح کر دیں گے۔

حکومت کرنے اور غصہ نکالنے کا جذبہ انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر جنتی کے پاس ہزار ہا نوکر چاکر ہوں گے۔ جن سے خدمت لے گا اور اُن پر حکم

چلائے گا۔ اس کے علاوہ انسان کے لیے ذہنی اور خیالی تصور بھی ہوا کرتا ہے، جس کو حب مال اور حب جاہ کہا جاتا ہے۔ جب یہ بڑھ جاتا ہے، تو مہلک بن جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہنی تصور بھی انسان کے لیے بہشت میں پورا کیا جائے گا۔

روحانی نعمتیں

اس کے علاوہ جنت میں کمال درجے کی روحانی نعمتیں بھی حاصل ہوں گی، انبیاء، صدیقین اور صلحا کی رفاقت نصیب ہوگی "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ" انکو پاکیزہ لوگوں کی مجلسیں نصیب ہوں گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت نصیب ہوگی۔ اُس کی تجلیات کا مشاہدہ ہوگا اور یہ عروج ہمیشہ جاری رہے گا، اس میں کبھی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ الغرض بہشت میں مادی اور روحانی ہر قسم کی نعمتیں میسّر ہوں گی۔

البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ وہاں تک پہنچنا بڑا دشوار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] کہ دیکھو بھائی اللہ کا سودا بڑا مہنگا ہے۔ اس کو تلاش کرو، اس کے حصول کے لیے کوشش کرو۔ یہ سودا بہشت کا سودا ہے۔ وہاں پہنچ کر حظیرۃ القدس کا ممبر بن جانا بڑی بات ہے۔ دنیا میں لوگ پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرتے ہیں، مگر حقیقی کامیابی حظیرۃ القدس کا ممبر بن جانا ہے۔ اصل کامیابی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ "جس کو دوزخ کی آگ سے بچا لیا گیا اور بہشت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ حقیقی کامیابی یہی ہے۔ اس سے کم تر کوئی کامیابی نہیں۔

ریشمی لباس

ابرار کے لیے لباس کا حال اس طرح بیان فرمایا عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ ان کے اوپر باریک ریشم کی پوشاک ہوگی خُضْرٌ جو سبز رنگ کی ہوگی وَّاِسْتَبْرَقٌ اور موٹے ریشم کی۔ انسان کا مزاج متنوع واقع ہوا ہے۔ کبھی باریک کپڑا پسند کرتا ہے، کبھی موٹا۔ ریشم دنیا میں اگرچہ مرد کے لیے حرام ہے۔ مگر بہشت میں یہ بھی حاصل ہوگا۔ ہاں یہ مصنوعی ریشم (ARTIFICIAL SILK) جائز ہے۔ کیونکہ یہ دوسرے مادوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ مردوں کے لیے بھی منع نہیں ہے۔ وہ

---

[1] ترمذی صـ ۳۵۳

اصلی ریشم حرام ہے۔ جو ڈوڈی سے بنایا جاتا ہے۔ ریشم کا کیڑا خوراک کھا کر جو لعاب نکالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کو ریشم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر اس سے طرح طرح کے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں، کوئی گاڑھا ہوتا ہے۔ کوئی باریک اور کوئی موٹا۔

چاندی کے کنگن

فرمایا وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ دوسری جگہ سونے کا بھی ذکر آیا ہے، مگر وہ مقربین کے لیے ہیں۔ فرمایا مقربین کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور موتیوں کے ہار اُن کے گلے میں پڑیں گے۔ کنگن کا رواج اگرچہ موجودہ دور میں نہیں ہے، تاہم یہ قدیم زمانے کا رواج ہے۔ کہ بڑے لوگ بادشاہ وغیرہ یہ زیور پہنتے تھے۔ تصور وہی ہے، بادشاہی والا عرب بھی اس سے واقف تھے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے حضرت عدی ؓ بن حاتم طائی کو جو جلیل القدر صحابی تھے، فرمایا تھا کہ وہ وقت آئے گا جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھ میں ڈالے جائیں گے۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی جب ایران فتح ہوا۔ تو تھوڑی دیر کے لیے یہ کنگن حضرت عدی ؓ کو پہنائے گئے۔ الغرض قدیم زمانے میں مردوں کے زیور پہننے کا تصور پایا جاتا تھا، مگر بہشت میں یہ کنگن ہر شخص کو نصیب ہونگے۔

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا اور سیراب کریگا انکو انکا پروردگار شراب طہور سے

جزائے عمل

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً اللہ تعالیٰ اہل بہشت سے فرمائیں گے یہ تمہارے کیے کی جزاء ہے۔ تمہارے اُس ایمان اور نیکیوں کا بدلہ ہے۔ جو تم نے دنیا میں اختیار کیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا "بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ" یعنی گذشتہ دنوں میں جو نیکیاں تم نے کیں، یہ اُن کا بدلہ ہے۔ "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" ہر ایک کے عمل کے مطابق اس کا درجہ ہوگا۔ بنیادی چیز یہ ہے۔ کہ انسان دنیا میں ایمان کی دولت حاصل کرے، اعمال صالحہ کا ذخیرہ کرلے اور آخرت میں ان کا بدلہ حاصل کرلے فرمایا وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا" اور جو کوشش اور محنت تم نے دنیا میں اللہ کے دین کی خاطر کی، اُس کی قدر دانی کی گئی ہے۔ تمہاری نیکیوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا گیا۔ تم نے اعمال صالحہ اختیار کرنے میں جو سعی و کوشش کی، یہ انعامات اُس کے نتیجے میں ہیں۔

درس چہارم ۴ (آیت ۲۳ تا ۲۷)

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ﴿۲۳﴾ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ﴿۲۴﴾ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِیۡلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَسَبِّحۡهُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ وَیَذَرُوۡنَ وَرَآءَهُمۡ یَوۡمًا ثَقِیۡلًا ﴿۲۷﴾

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے آپ پر قرآن پاک کو آہستہ آہستہ اتارا ہے ﴿۲۳﴾ پس آپ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کریں آپ ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکر گزار کی بات نہ مانیں ﴿۲۴﴾ اور صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں ﴿۲۵﴾ اور رات کے وقت اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور رات کے ایک لمبے حصے میں اس کی تسبیح بیان کریں ﴿۲۶﴾ بیشک یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (قیامت کا) بوجھل دن چھوڑ رہے ہیں ﴿۲۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا، اور اس کے بعد ہدایت کے راستے کا اجمالاً ذکر کیا "اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا" فرمایا چونکہ انسان کی آزمائش مطلوب ہے اس لیے ہم نے اُسے سمیع و بصیر بنا کر اُس پر ہدایت کا راستہ واضح کر دیا کہ یا تو انسان شکر گزار بن جائے یا ناشکر گزار۔ اگر ہدایت کا راستہ اختیار کیا اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کیا، تو شکر گزار بن گیا، ورنہ بصورت دیگر ناشکر گزاروں کی فہرست میں شامل ہوا۔

اس کے بعد ناشکر گزاروں کا انجام اجمالی طور پر بیان فرمایا "اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغۡلٰلًا وَّسَعِیۡرًا"۔ یعنی ایسے لوگوں کے لیے ہم نے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے پھر ہدایت یافتہ ابرار کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ پہلے رکوع میں "اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ" سے لے کر رکوع کے اختتام یعنی "كَانَ سَعۡیُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا" تک اُن نعمتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جو نیک لوگوں کو اللہ کے ہاں حاصل ہونے والی ہیں۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ تمام انعامات تمہاری نیکی اور ایمان کا بدلہ ہیں۔ تمہاری کوشش ٹھکانے لگی۔ اور اُس کی قدر دانی کی گئی۔ وہ رائیگاں نہیں گئی۔ اس کے بعد ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں کے حق میں تنبیہ

ہے۔ نبی علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے تسلی کا سامان ہے۔ اور حکم ہے۔ کہ حالات کیسے بھی ناخوشگوار ہوں آپ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں۔

تنزیل قرآن

چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ناموافق حالات سے گزر رہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تسلی کے طور پر سب سے پہلے قرآن پاک کا ذکر فرمایا، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا بے شک ہم نے آپ پر قرآن پاک کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ جس کی ایک خاص حکمت ہے۔ لہٰذا آپ مشرکین کے اعتراضات کی پرواہ نہ کریں اور قرآن پاک کے پروگرام پر عمل کرتے رہیں۔

پچھلی سورتوں میں بھی ذکر ہو چکا ہے۔ کہ جب نبی علیہ السلام اللہ کا کلام پیش کرتے تھے۔ تو مشرک اور کافر طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے کوئی کہتا یہ شاعری کرتے ہیں کوئی کہتا کہ نعوذ باللہ آپ کاہن ہیں کوئی کہتا کہ یہ اپنی طرف سے کلام گھڑ کر لائے ہیں یعنی اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ "آپ افترا کرتے ہیں حالانکہ "مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ" اللہ نے کسی انسان پر کوئی وحی نازل نہیں کی۔ آپ خواہ مخواہ جھوٹ بولتے ہیں، اور محض اپنی چودھراہٹ چاہتے ہیں۔ مشرکین آپ سے ٹھٹا مذاق بھی کرتے تھے۔ اللہ کے کلام کو بھی جھٹلاتے تھے۔

بخاری شریف کی روایت میں[1] ہے۔ کہ جب کفار آپ کی زبان مبارک سے قرآن پاک سنتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ، جبرائیل اور خود حضور علیہ السلام کو گالیاں دیتے تھے۔ ایسے حالات میں نبی علیہ السلام کھلے بندوں نماز بھی نہیں پڑھا سکتے تھے، چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا "یعنی آپ اتنا بلند آواز سے قرآن نہ پڑھیں کہ کفار سن کر گالیاں دیں، اور نہ اتنا آہستہ پڑھیں کہ آپ کے صحابہ بھی نہ سن سکیں، "وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا" بلکہ آپ درمیانی راہ اختیار کریں۔

ترمذی شریف کی روایت[2] ہے۔ کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کے کسی درّے میں نماز ادا کر رہے تھے۔ کوئی مشرک وہاں سے گزر رہا تھا کلام پاک

---

[1] بخاری صفحہ ۲۸۶/۲ [2] جمع الوسائل فی شرح الشمائل صفحہ ۱۹۴/۲

سن کر وہ لڑنے مارنے پہ آمادہ ہو گیا۔ حضور علیہ السلام کے ماموں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وہاں موجود تھے۔ ان کے قریب اونٹ کے جبڑے کی ہڈی پڑی تھی انہوں نے وہی اٹھا کر کافر کو دے ماری جس سے وہ زخمی ہو گیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مقصد یہ کہ اس قسم کے حالات تھے، جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا ذکر بیان کرکے آپ کو اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی۔ اور فرمایا کہ قرآن پاک کوئی من گھڑت کلام نہیں ہے۔ بلکہ اسے ہم نے آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ دوسری جگہ اسی بات کو یوں بیان کیا تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی یہ کلام تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور مشرکین کے اعتراضات لغو اور بیہودہ ہیں مشہور روایت[1] ہے۔ کہ قرآن پاک لوح محفوظ سے ایک ہی دفعہ نازل ہوا۔ آسمانوں میں بیت المحرم ایک باعزت مقام ہے وہاں موجود رہا، اور وہاں سے زمین پہ آہستہ آہستہ ۲۳ برس میں نازل ہوا۔ اس کی ابتدا رمضان المبارک میں ہوئی، جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ہے "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ" یعنی رمضان کا وہ مبارک مہینہ ہے۔ جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی اور پھر بتدریج تھوڑا تھوڑا اتارا گیا۔

بتدریج نزول کی حکمت

سورۃ فرقان میں قرآن پاک کے بتدریج نزول کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے۔ "لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا" تاکہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو پختہ کریں اور یہ اچھی طرح یاد ہو جائے۔ کیونکہ جو چیز بتدریج حاصل ہوتی ہے۔ وہ مستحکم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے سابقہ کتابیں یکدم نازل ہوئیں، تو وہ اتنی مستحکم نہ ہوئیں بلکہ قرآن انسانوں کے قلوب و اذہان میں بتدریج نازل ہونے کی وجہ سے زیادہ مستحکم ہوا۔ قرآن پاک حضور علیہ السلام پہ نازل ہوا۔ آپ نے اپنے صحابہؓ کو آہستہ آہستہ اس کی تعلیم دی اور اس طرح یہ اولین مخاطبین کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ ہو گیا۔ اور پھر ان کی معرفت آئندہ نسلوں تک پہنچا۔

امام جلال الدین سیوطیؒ تفسیر اتقان[2] میں لکھتے ہیں۔ یاد رکھو! کہ آخرت کے معاملے کو سمجھنے کے لیے انسان عام طور پہ طفل مکتب ہیں۔ جس طرح چھوٹے بچوں کو اگر ساری کتاب ایک نشست میں پڑھا دی جائے تو کچھ پلے نہیں پڑتا، اور اگر تھوڑا تھوڑا سبق دیں گے تو وہ یاد کر لیتے

---

[1] روح المعانی ص ۲/۱۱۶ تفسیر اتقان ص ۱/۳۹، ۴۰۔ [2] تفسیر اتقان ص ۱/۴۰ تا ۴۲

ہیں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی ذات، اس کی صفات اور معاد کو سمجھانے کیلیے قرآن پاک تھوڑا تھوڑا نازل کیا گیا۔ تاکہ مخاطبین کے ذہن نشین ہو جائے۔ کیونکہ اس معاملہ میں پوری نوع انسانی طفلِ مکتب کی مانند ہے۔ اگر پورا قرآن پاک بیک وقت پیش کر دیا جاتا، تو ان کے ذہن اُسے دل و دماغ میں راسخ کر لینے کی قوت نہ پاتے۔ اسی لیے فرمایا "وَاُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا القُرْاٰنُ" ہم نے یہ قرآن آپ پر وحی کے ذریعے نازل کیا۔ یہ گویا قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کا بیان ہے۔

قرآن پاک ذریعہ ہدایت ہے

پہلے جتنی آیات گزر چکی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن پاک ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان حق و ناحق کو پہچانتا ہے۔ اور کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہے۔ فرمایا ہم نے انسان کی تخلیق کی، پھر اس کو مکلف بنایا، اس کو آزمائش میں ڈالا اور اس کے سامنے ہدایت اور گمراہی دونوں راستے واضح کر دیے تاکہ وہ ان میں سے اپنی پسند کا راستہ اختیار کر لے۔ یہ سب چیزیں قرآن پاک سے ہی معلوم ہوئیں۔ پھر اس کا انجام بھی بیان کر دیا۔ کہ ناشکر گزار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ ہو گی اور نیکوکاروں کے لیے "نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا" ترو تازگی اور خوشی کی خوشخبری ہے۔ انہیں جنت میں بہترین لباس پہنایا جائے گا۔ شراب طہور کے جام پیش کیے جائیں گے۔ تو یہ باتیں اس قرآن کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتی ہیں، جس کو اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا۔ لہٰذا اگر فلاح مطلوب ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کے نازل کردہ قرآن پاک کا دامن تھام لو، کہ یہی ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔

حدیث، قرآن پاک کی تشریح ہے

ہدایت کے سلسلے میں قرآن پاک کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کی تشریح حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ فرمایا "فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ" اس کی آیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ جب کہ خود قرآن پاک متن ہے تفصیل کے سلسلے میں حضور علیہ السلام کے ارشادات، آپ کا عمل مبارک اور پھر آپ کے صحابہؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کا عمل حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر قرآن حکیم کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور نہ اس پر عمل کے راستے واضح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجتہدین کا اجتہاد بھی تفصیل قرآن پاک میں شامل ہے۔ زمانے کے حوادثات غیر محدود ہوتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ تو جو چیز حدیث نبوی اور خلفائے راشدینؓ کے اقوال سے

معلوم نہ ہو سکے اُسے اقوال مجتہدین سے تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس لحاظ سے یہ اجتہاد قرآن پاک کی تشریح میں شامل ہوگا۔ گویا قرآن پاک کے ذریعے ہی اچھے انجام تک پہنچا جا سکتا ہے۔

اشاعت قرآن انسانی فریضہ ہے

اشاعت قرآن کے سلسلے میں دو قسم کے فرائض عاید ہوتے ہیں یعنی فرائض عام اور فرائض خاص۔ عام فرائض میں قرآن کریم اور اسلام کی ترویج شامل ہے۔ جیسے اللہ تعالے نے ارشاد فرمایا بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ "جو چیز آپ پر نازل کی گئی، اسے پہنچا دیں۔" اسی طرح حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ اٰیَةً "میری طرف سے پہنچا دو، اگرچہ ایک آیت بھی ہو۔" گویا قرآن پاک کی تعلیم اور دین کی تبلیغ تمام انسانیت کے لیے عام فریضہ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2] کہ دنیا میں کسی شخص نے جس قدر قرآن کریم کی اشاعت میں حصہ لیا ہوگا، اُسی قدر اُسے نبی کریم کے حوض کوثر سے پانی نصیب ہوگا۔ دنیا میں قرآن پاک اور آخرت میں حوض کوثر دونوں مربوط چیزیں ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ حتی الامکان قرآن پاک کی اشاعت میں حصہ لے۔ قرآن پاک خود پڑھیں دوسروں کو پڑھائیں اس کے مطابق عقیدہ درست کریں اور دوسروں تک بھی اس کو متعدی بنائیں۔

تکالیف پر صبر کریں

آگے فرمایا فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ آپ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کریں۔ رب کا حکم یہ ہے۔ کہ قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں حصہ لیں۔ اس سلسلہ میں آپ کو مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، کیونکہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا "ہم ایک بوجھل بات آپ پر ڈالنا چاہتے ہیں، اس کے لیے پہلے سے تیاری کر لیں۔ بوجھل بات قرآن پاک پر عمل اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہے اور اس راستے میں مشکلات پیش آنے پر صبر کی تلقین کی جا رہی ہے۔ کفار کی بدزبانی اُن کے بیہودہ اعتراضات، ان کے ساتھ لڑائی، قرآنی پروگرام کی ناکامی کی کوشش وغیرہ ایسے امور ہیں جن کے لیے صبر و استقامت کی ضرورت ہے سورۃ عصر میں فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ "آخرت میں خسارے سے بچنے کیلیے یہ چار سنہری اصول بتائے یہ اصول ریاضی کے اصول کی طرح مسلم ہیں جسطرح ریاضی کا اصول غلط ثابت نہیں ہوتا، دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ چار اصول یعنی ایمان، اعمال صالحہ، حق کی تلقین اور صبر بالکل اٹل ہیں۔ انہیں

---

[1] سنن دارمی صہ ۱۱۱ ج ۱ ترمذی صہ ۳۸۲ [2]

میں صبر ایک اصول ہے۔ جو غلط نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر مصیبت پر صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1]۔ اَیُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْاَنْبِیَاءُ یعنی سب سے زیادہ مصیبتیں اللہ کے نبیوں پر آئیں۔ اور اس کے بعد اُن پر جو نبیوں کے قریب تھے۔ جتنا کسی کو نبی کی اتباع میں حصہ ملا اُسی قدر اُسے تکالیف آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے یُفْتَنُ الرَّجُلُ عَلٰی قَدْرِ دِیْنِہٖ ہر شخص کو اُس کے دین کے مرتبے کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ جو آدمی دین میں مضبوط ہوتا ہے، اُس پر آزمائش بھی سخت آتی ہے۔ اگر کوئی دین کے معاملے میں کمزور ہے تو اس پر آزمائش بھی کم آتی ہے۔ الغرض اشاعت دین ایک متعدی فریضہ ہے اور ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے۔

منکرین کی بات نہ مانیں

فرمایا کہ اس اعلیٰ و ارفع اصول کے مقابلے میں وَلَا تُطِعْ مِنْھُمْ اٰثِمًا اَوْ کَفُوْرًا آپ ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکر گزار کی بات نہ مانیں۔ ابوجہل، ولید ابن مغیرہ، عتبہ جیسے لوگ آپ کو تبلیغ دین سے باز رکھنا چاہتے ہیں، سورۃ نون میں ذکر ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ان معبودوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ شرک و کفر کی تردید نہ کریں، آپ اپنی پوجا پاٹ کرتے رہیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی پارٹی کی بات نہیں ماننی اسلام کے پروگرام کو ترک نہیں کرنا، توحید کی اشاعت لازمی ہے۔ کفر کے ساتھ کسی صورت بھی مصالحت نہیں کرنی۔ لہٰذا گنہگار اور ناشکر گزار، کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، دین کے اصولوں پہ سمجھوتا نہیں کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ولید ابن مغیرہ جیسے لوگوں کو مال دولت عطاء کی ہے، لاکھوں میں کھیلتے ہیں مگر پھر بھی وہ شکر گزار ہونے کی بجائے اللہ کے دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اے نبی کریم! آپ ان تمام مصائب پر صبر و شکر کریں اور ایسے کسی گنہگار، پاپی یا ناشکر گزار کے کہنے میں نہ آئیں۔

صبح و شام ذکر الٰہی کریں

اشاعت قرآن کے متعلق فریضہ عام بیان کرنے کے بعد فریضہ خاص کا ذکر کیا جس کا تعلق خاص اپنی ذات سے ہے۔ فرمایا وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں، یہ تمام پریشانیوں اور مصائب کا علاج ہے۔ نیز فرمایا وَمِنَ

---

[1] موارد الظمآن صفحہ ۱۸۰ ابن ماجہ صفحہ ۲۹۱

اللَّیلِ فَاسْجُدْ لَہٗ اور رات کے وقت اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اس آیت کو مفسرین کرام دو معنوں پر محمول کرتے ہیں[1]۔ اس کا ایک معنی تو پانچ نمازیں ہیں بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا یعنی صبح اور پچھلے پہر۔ اس میں صبح، ظہر اور عصر کی تین نمازیں آتی ہیں۔ وَمِنَ اللَّیْلِ میں مغرب، عشاء اور تہجد کی نمازیں آتی ہیں۔ تہجد کی نماز اگرچہ امت کے لیے فرض نہیں مگر سنت اور سب سے مقدس نماز ہے تو فرمایا کہ نماز ادا کرتے رہیں تاکہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم رہے۔ جب تعلق باللہ درست ہو جائے گا۔ تو مصائب ہلکے ہو جائیں گے، پریشانیاں کم ہو جائیں گی اور آپ تکالیف کا مقابلہ اچھے طریقے سے کر سکیں گے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا "وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" یعنی صبر و نماز کے ساتھ مدد چاہو۔ جب بھی کوئی تکلیف پہنچے، اس کا مقابلہ صبر اور نماز کے ساتھ کرو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر ہے۔ اسی لیے فرمایا "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ نماز، دل، زبان اور اعضا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ انسان طہارت کے ساتھ مؤدب ہو کر اللہ کے حضور کھڑا ہو کر اس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے تو اس کا دل اللہ کی تعظیم سے لبریز ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں تم میں پیدا ہو جائیں تو مصائب کا مقابلہ بہتر طریقے پر کر سکو گے نماز ام العبادات المقربہ ہے۔ یہ انسان کو اللہ کے سب سے زیادہ قریب کرنے والی عبادت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں فرمایا[2] اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ یعنی نماز کا خیال رکھنا اور غلام اور کمزور طبقے کا خیال رکھنا، ان پر ظلم نہ کرنا، یہ آپ کی آخری وصیت تھی۔ گویا نماز میں اللہ کا ذکر، تسبیح اور تعظیم ہوتی ہے۔ اخبات اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عجز و انکسار ہوتا ہے۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کی روحانیت ہے۔ اس کے علاوہ نماز کے دنیوی فوائد بھی ہیں۔ منجملہ ان کے مساوات، طہارت، وقت کی پابندی، اتحادِ فکر جیسے فوائد حاصل ہیں۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا نماز ایک بہت بڑی چیز ہے۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ کا دوسرا مفہوم مفسرین یہ بیان کرتے ہیں[3] کہ اس سے مراد صرف نمازیں نہیں، بلکہ عام ذکر مراد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں یہ سورتیں نازل ہوئیں، اس

---

[1] تفسیر کبیر ص ۲۵۹ ج ۳۰ [2] البدایہ والنہایہ ص ۲۳۸ ج ۵ [3] روح المعانی ص ۱۶۶ ج ۲۹، تفسیر کبیر ص ۲۵۹ ج ۳۰

زمانے میں پانچ نمازیں تو فرض نہیں تھیں۔ فجر، عصر اور رات کی صرف تین نمازیں تھیں۔ پانچ نمازیں معراج کے موقع پر نبوت کے دسویں سال میں فرض ہوئیں۔ لہٰذا ذکر سے مراد خدا تعالےٰ کا عام ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر گویا خود خدا تعالےٰ کا ذکر ہے، خدا تعالیٰ کی ذات تو بلند و برتر ہے۔ انسان کی براہِ راست اس تک رسائی نہیں لہٰذا اُس کا نام اور اس کی صفات کے ذکر کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں[1] ہے اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مِأَۃً اِلَّا وَاحِدَۃً مَنْ اَحْصٰھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے ننانوے اسمائے پاک ہیں۔ جس نے اُن کو یاد کیا، اُن کا ورد کرتا رہا، جنت میں داخل ہوگا۔

قرآن پاک میں آتا ہے کہ کافر لوگ رحمان کے نام سے بدکتے ہیں۔ کہتے ہیں وَمَا الرَّحْمٰنُ رحمان کون ہے، وہ اللہ کے لفظ سے تو واقف تھے مگر رحمان سے ناواقف تھے۔ قرآن پاک میں آتا ہے وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی "اللہ تعالےٰ کے بہت سے اسمائے حسنہ ہیں۔ اُسے جس نام سے بھی یاد کرو گے، وہ راضی ہوگا۔ رحیم، کریم، ستار، غفار، رزاق، رحمان بہت سے اسمائے پاک ہیں۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد اُس کی رضا کا ذریعہ ہے۔ ذاتی نام صرف اللہ ہے، باقی سب صفاتی نام ہیں۔ تو فرمایا، پچھلے پہر بھی، صبح بھی اور رات کی گھڑی میں بھی اللہ تعالےٰ کے نام کا ذکر کرو۔ جس کے متعلق قرآن پاک میں تفصیل موجود ہے۔

ہر عبادت کی کوئی نہ کوئی حد (LIMIT) ہوتی ہے۔ مثلاً نماز خاص وقت پر ادا ہوگی، روزے مقررہ مہینہ میں فرض ہیں، حج کا وقت معین ہے، زکوٰۃ کا نصاب مقرر ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کا ذکر ایک ایسی عبادت ہے، جس کے لیے زمان و مکان کی کوئی حد مقرر نہیں یہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ربانی ہے "اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا"۔ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ مسند شریف کی روایت میں[2] ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو۔ کہ دیکھنے والے پاگل کہنے لگیں۔ حضور علیہ السلام ایک سفر پر تھے۔ ایک پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا[3] سِیْرُوْا ھٰذَا جُمْدَانُ یعنی یہ جمدان پہاڑ ہے سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ چلے چلو!

---

[1] مسلم صفحہ ۳۴۲ ج ۲ بخاری صفحہ ۱۰۹۹ ج ۲
[2] مسند احمد صفحہ ۶۸ ج ۳
[3] مسلم صفحہ ۳۴۱ ج ۲ ترمذی صفحہ ۵۱۸

مفرد لوگ سبقت لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! مفرد لوگ کون ہیں۔ فرمایا مُسْتَھتِرُوْنَ فِیْ ذِکْرِ اللّٰہِ یعنی اللہ کے ذکر میں فریفتہ ہونے والے یعنی کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والے۔ قیامت کے روز کثرت ذکر بوجھ کو ہلکا کر دے گا۔ ایسے لوگ ہلکے پھلکے گزر جائیں گے۔ اللہ کے ذکر سے روگردانی کرنے والے اپنے آپ کو سخت بوجھل محسوس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ[1] آتے ہیں۔ مَا مِنْ شَیْءٍ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ اللہ کے عذاب سے نجات دینے والی چیزوں میں سب سے بڑھ کر اللہ کا ذکر ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2] کہ ہر وہ مجلس جس میں مومن اللہ کا ذکر نہیں کرتا اور آپ پر درود نہیں پڑھتا، وہ مجلس اُس کے لیے قیامت کے روز حسرت کا باعث ہوگی۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے[3]۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی ہر مجلس کی ابتدا بھی اللہ کے ذکر سے ہوتی تھی اور اس کا اختتام بھی اُس کے ذکر سے ہوتا تھا۔

اسی لیے فرمایا کہ صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کریں۔ اور رات کے وقت اس کو سجدہ کریں۔ رات کے وقت میں تہجد کی نماز بھی داخل ہے اگرچہ یہ فرض نہیں ہے۔ تاہم نفلی نمازوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بہت سے فضائل ہیں۔ سورۃ مزمل میں تفصیل موجود ہے

اس کے بعد فرمایا وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا اور رات کے ایک لمبے حصے میں اس کی تسبیح بیان کریں۔ نیند میں زیادہ وقت صرف نہ کریں۔ بلکہ اپنے رب کی تسبیح اور پاکی بیان کرتے رہیں اس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ فرماتی[4] تھیں یَا بُنَیَّ لَا تُکْثِرِ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ یعنی اے بیٹے! رات کو نیند زیادہ نہ کیا کر۔ کیونکہ قیامت کے روز زیادہ نیند انسان کو محتاج بنا دے گی۔ ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[5]۔ کہ اُس شخص کی مثال گدھے کی ہے۔ جو رات کو غروب آفتاب کے ساتھ سو گیا حتیٰ کہ سورج طلوع ہو گیا۔ نہ بیدار ہوا، نہ اللہ کا ذکر کیا، نہ نماز پڑھی۔ اگر رات کو اٹھ کر نماز پڑھتا، ذکر الٰہی کرتا، اُسکی تسبیح بیان کرتا تو اس کے لیے

---

[1] ابن ماجہ ص۲۶۸ کنز العمال ص۱۵۷ ج۲ [2] ترمذی ص۴۸۷ مجمع الزوائد ص۷۹ ج۱۰ [3] شمائل ترمذی مع الترمذی ص۵۹۵
[4] الزہر الفائح ص۷ للامام محمد بن محمد یوسف الجزری الدمشقی المتوفی سنہ ۸۳۳ھ [5]

کفایت ہوتی۔

دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے

اس کے بعد وہ وجہ بیان کی جس کی بنا پر مشرکین اور منکرین اسلام کے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسے فیل کرنا چاہتے ہیں فرمایا اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں۔ عاجلہ جلدی آنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ دنیا چونکہ آخرت کی نسبت جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسے عاجلہ کہا گیا ہے فرمایا وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَھُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا یہ لوگ اپنے پیچھے قیامت کا بوجھل دن چھوڑ رہے ہیں۔ دنیا کی ایسی محبت جو انسان کو صحیح عقیدے، فرائض اور عمل سے غافل بنا دے، وہ مہلک ہے بیہقی شریف[1] کی روایت میں ہے حُبُّ الدُّنْیَا رَاْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ ہر گناہ کی جڑ اور بنیاد دنیا کی محبت ہے۔ انسان ہر وقت جب دنیا میں منہمک ہے اُسے قیامت کی فکر ہی نہیں۔ اس زمانے میں دنیا کا عام ماحول یہی ہے۔ دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں متمدن ممالک ہوں یا غیر متمدن، روس اور چائنہ ہوں یا امریکہ اور فرانس ہر جگہ دنیا کی محبت کار فرما ہے، آخرت کا کسی کو فکر نہیں۔ بلکہ جدید تمدن نے ایسا کام خراب کر دیا ہے۔ کہ انسان چوبیس گھنٹے کھیل تماشے میں مشغول ہے۔ اور آخرت کا تصور تک اذہان سے نکل چکا ہے۔ ٹیلیویژن، سینما، پکچر، آرٹ گیلری کی طرف رجوع ہے۔ فحش گانے، بیہودہ باتیں اور لغویات اس کے ذہن پر سوار ہیں۔ آخرت سے غافل ہے۔ یہ جدید تہذیب ترقی کی بجائے تنزل کا پیش خیمہ ہے۔ یہ تمدن خدا فراموشی کا تمدن ہے۔ اکثر لوگ دنیا کی ایسی ہی محبت میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے[2] اے اللہ! لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اس دنیا کو ہمارا بڑا مقصود اور مبلغ علم نہ بنا۔ دنیا کی مثال تو ایک گزرگاہ یا پل کی ہے۔ جس نے یہاں پر نیکی اور ایمان کا سودا خریدا اور آگے کی فکر کی، اُسے کامیابی حاصل ہوگی۔ جو دنیا کی محبت میں منہمک ہو گیا، وہ ناکام ہو گیا۔

دنیا کی محبت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر انہیں محاسبے کا یقین ہو کہ ایک دن باز پرس ہوگی تو یہ لوگ مخالفت سے باز آ جائیں اور آخرت کی فکر کرنے لگیں۔

---

[1] فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۳۶۸ ج ۳ بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان [2] ترمذی ص ۵۰۴

درس پنجم ۵ (آیت ۲۸ تا ۳۱)

نَحۡنُ خَلَقۡنٰهُمۡ وَشَدَدۡنَاۤ اَسۡرَهُمۡ ۚ وَاِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۳۰﴾ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۳۱﴾ ع ۲۰

ترجمہ :- ہم نے ہی انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی جوڑ بندی کو مضبوط کیا۔ اور جب ہم چاہیں گے ان کی جگہ ان جیسے اور لے آئیں گے ﴿۲۸﴾ بیشک یہ یاد دلانے والی باتیں ہیں۔ پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ پکڑ لے ﴿۲۹﴾ اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ — کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے ﴿۳۰﴾ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت ——— میں داخل کرتا ہے۔ اور ظالموں کے لیے اس نے عذاب الیم تیار کیا ہے ﴿۳۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے یہ بیان ہوا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا۔ اور یہ کلام الٰہی ہے اس کے منکرین متعصب اور عنادی لوگ ہیں جو محض ضد اور عناد کی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو صبر کا پیغام دیا گیا۔ اور حکم ہوا کہ کسی گنہگار اور ناشکرگزار کی بات نہ مانیں، کیونکہ وہ قرآن کریم کے پروگرام کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں۔ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور اس کی تسبیح بیان کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کا دل مضبوط ہو گا۔ اور اللہ کے ساتھ تعلق درست ہو گا، روحانی ترقی حاصل ہو گی، اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو گا۔ اور اس کے مقابلے میں تمام تکالیف ہیچ نظر آئیں گی۔

منکرین کے انکار کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ" یہ دنیا سے محبت کرنے والے لوگ ہیں یہ محض دنیوی زندگی کو دیکھتے ہیں اور اسی کو پسند کرتے ہیں، دنیا کی محبت ان کے دلوں میں رچی بسی ہے اور آخرت پر ایمان بالغیب نہیں رکھتے یہی وجہ ہے۔ کہ توحید، نبوت قرآن اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل بنا دیتی ہے۔ نیز فرمایا کہ ان کا انکار کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہ بالکل بے وقوفی کی بات کرتے ہیں۔ قیامت

کا وقوع بالکل ایسا ہی ممکن ہے جیسا مشاہدے میں آنے والی چیزیں یقینی ہوتی ہیں۔ فرمایا تم اپنی پیدائش سے کیوں انکار نہیں کرتے۔ جب کہ اپنے وجود کو خود محسوس کر رہے ہو۔ پہلے کچھ نہ تھے۔ پھر پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے، اگر دو و پیش کی تمام چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔

انسان اپنے سامنے تمام حوادثات کو دیکھ رہا ہے۔ ایک موسم میں زمین خشک ہوتی ہے دوسرے موسم میں بارش ہوتی ہے۔ زمین سیراب ہوتی ہے۔ سبزی اور اناج پیدا ہوتا ہے پودے اور درخت اُگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارتاً سمجھائی کہ ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود انسان قیامت کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی پیدائش کا انکار نہیں کرتے۔

پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے کس طرح انسان کو وجود بخشا "فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ" خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ جس نے انسان کو حقیر قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ اس مضمون کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا۔ اس سورۃ کے آغاز میں بھی آیا ہے "اِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ" ہم نے انسان کو مرد و زن کے ملے جلے مادے سے پیدا کیا۔ اگلی سورۃ میں "مِن مَّاءٍ مَّهِينٍ" آ رہا ہے یعنی حقیر قطرۂ آب سے تخلیق کیا۔ اسے سمیع و بصیر بنایا تو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا دے "بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ" کیوں نہیں؟ وہ تو عظیم خالق ہے۔ جب چاہے گا، انسان کو لوٹائے گا۔ بالکل اسی طرح "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ" جس طرح ابتداء میں مخلوق کو پیدا کیا۔ قیامت کے روز یہی لوگ اسی وجود اور انہی عناصر کے ساتھ موجود ہوں گے۔ جزائے عمل قطعی طور پر یقینی ہے۔

اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے

فرمایا "نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ" ہم نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اور جب چاہیں گے دوبارہ اٹھا دیں گے۔ کافر کہتے ہیں کہ اگر قیامت حقیقت ہے۔ تو پھر آتی کیوں نہیں ہم نے تو مر کر کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا۔ تو یہ ان کی ناسمجھی کی بات ہے۔ ہر چیز اپنے وقت اور موسم پر پیدا ہوتی ہے "قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ اُسی کے مطابق تمام کام انجام پاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ موسم بہار سے پہلے درخت کیوں نہیں پھوٹتے ان کے پتے اور شاخیں کیوں نہیں نکلتیں، تو یہ اُس کی بیوقوفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت برپا کرنے کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ "لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ" اسے وہ اپنے وقت پر ہی ظاہر کرے گا۔ قبل از وقت کوئی کام نہیں ہوگا۔ جس طرح ایک فرد

واحد کی پیدائش اور اس کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اسی طرح تمام عالم کی موجودگی اور پھر اس کے فنا کا وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آئے گا۔ تمام جہان فنا ہو جائے گا۔ اور پھر جب اللہ کا حکم ہو گا، دوبارہ قائم ہو جائے گا۔

فرمایا نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ "اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" ہر چیز کا خالق اللہ ہے۔ یہ تو کافر اور مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں۔ آپ اُن سے پوچھیں کہ انسان کو اور ساری کائنات کو کس نے پیدا کیا، کہیں گے، اللہ نے پیدا کیا۔ ہندو کہے گا۔ بھگوان نے یا ایشور نے پیدا کیا۔ ہر مذہب کا پیروکار اپنی اپنی زبان میں خدا کا نام لے گا۔ اس لحاظ سے تمام مذاہب والے متفق ہیں۔ سوائے دہریوں کی ایک قلیل تعداد کے، جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کو بھی نہیں مانتے تاہم باقی تمام ملل والے اللہ تعالےٰ کو خالق مانتے ہیں۔

انسانی جسم کی جوڑ بندی

فرمایا انسان کو پیدا کیا وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ اور ان کی جوڑ بندی کو مضبوط کیا۔ اَسَرَ کا معنی ضبط، گرفت یا پکڑ ہوتا ہے۔

اسیر اسی لیے قیدی کو کہا جاتا ہے۔ کہ اُسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں یا رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اُسُر عربی زبان میں پیشاب بند ہو جانے کی بیماری کو کہتے ہیں۔ تو اَسر کا معنے ہے باندھنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھو! ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اُن کی جوڑ بندی مضبوط بنائی ہے۔ یعنی اس کے اعضاء، اعصاب، پٹھے اور اس کے رباط کمال درجے کے پیدا کئے ہیں ہر جوڑ کو دوسرے کے ساتھ باندھنے کے لیے کمال درجے کے تسمے بنائے ہیں۔ انسانی جوڑ بندی میں ایسا مادہ رکھا ہے، جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یہ مشینیں ہیں۔ کچھ عرصہ تک ان کے پرزے چلتے ہیں، پھر گھس جاتے ہیں، ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور مشین ناکارہ ہو جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے جسم انسانی کی ایسی مشینری تیار کی ہے جو اسی[۸۰] سال، سو سال بلکہ بعض اوقات ڈیڑھ سو[۱۵۰] سال تک چلتی رہتی ہے۔ انسانی اعضاء آپس میں اس قدر مربوط اور مضبوط ہوتے ہیں کہ لمبے عرصہ تک کام کرنے کے باوجود ان میں خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان گریس نما مادہ پیدا کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ الغرض تمام انسانی قویٰ کمال اعتدال کے ساتھ پیدا کئے ہیں۔

انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے[۱] کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص رات گذار کر صبح کرتا ہے

[۱] مسلم صنہ ۲۵ / ۱

اور صحت و سلامتی کے ساتھ اٹھتا ہے، اس کے ہر ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں کُل تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، ہر جوڑ دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے، ایک ہڈی دوسرے کے ساتھ مرتبط ہے۔ پھر فرمایا، ہر آدمی اگر ایک ایک پیسہ فی جوڑ بھی صدقہ کرے تو ہر روز کتنا خرچ کرنا ہوگا۔ جس کی ہر انسان طاقت نہیں رکھتا۔ فرمایا جب کوئی انسان کوئی پاکیزہ کلمہ زبان سے نکالتا ہے۔ تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ تسبیح کرتا ہے۔ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر یا لاالہ الا اللہ کہتا ہے، کوئی نصیحت کی بات کرتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتا ہے تو یہ سب اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے، اگر یہ بھی میسّر نہ ہو، تو فرمایا چاشت کے وقت دو نفل ہی پڑھ لیں، وہ بھی صدقہ بن جائیں گے۔ چاشت کا وقت تو دس بجے کا وقت ہوتا ہے جب دھوپ خوب اٹھ جاتی ہے۔ سورج نکلنے کے جلدی بعد جو نوافل ادا کئے جاتے ہیں، انہیں اشراق کہا جاتا ہے۔ تاہم چاشت کا وقت بعد میں ہوتا ہے۔ اِسے ضحیٰ کا وقت بھی کہتے ہیں۔ اسی کو صلوٰۃ الاوابین بھی کہا جاتا ہے۔ الغرض یہ دو رکعت پڑھ لینا، تمام اعضا کا صدقہ بن جاتا ہے۔

بعث بعد الموت

انسان کو پیدا کرنے اور اس کی جوڑ بندی کرنے والے خداوند قدوس کا ارشاد ہوتا ہے۔ وَاِذَا شِئْنَا جب ہم چاہیں گے بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا۔ ان کی جگہ ان جیسے اور لے آئیں گے۔ یعنی جب انسان مر کر فنا ہو جائیں گے۔ تو ان جیسے وجود دوبارہ لے آئیں گے، اُن کے عناصر بھی ایسے ہی ہوں گے، اسی طرح کا ظاہر باطن ہوگا، گویا بعث بعد الموت کا وعدہ پورا ہو جائے گا اگر انسان کی تخلیق اور اس کی جوڑ بندی ہمارا کام ہے، تو انہیں دوبارہ زندہ کر دینا بھی ہماری قدرت کاملہ میں ہے۔ ہم ان کو ضرور دوبارہ لے آئیں گے یہ خواہ مخواہ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بُرے لوگوں کے بدلے اچھے لوگ

بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر یہ کفار و مشرکین اپنی رذیل حرکتوں سے باز نہ آئے، تو ہم ان لوگوں کی جگہ دوسرے اچھے لوگ پیدا کر دیں گے۔ دوسری قوموں کو کھڑا کر دیں گے۔ جو فرمانبردار ہوں گی۔ یہ لوگ جن کو آج مال و دولت، اہل و اولاد اور جاہ و اقتدار نصیب ہے، یوں نہ سمجھیں کہ یہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے، بلکہ فرمایا جب ہم دیکھیں گے کہ ان کے ظلم حد سے بڑھ رہے ہیں۔ تو ان کی جگہ دوسروں کو تبدیل کر دیں گے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالےٰ

نے سورۃ قتال میں یوں بیان فرمایا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ یعنی اگر تم روگردانی کروگے ہدایت کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔ تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کھڑا کریں گے۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا، مکے کے قریش جو اسلام کے بدترین دشمن تھے، اُن کو اللہ تعالیٰ نے نابود کر دیا اور اُن کی جگہ انصارِ مدینہ کو کھڑا کر دیا، جو اسلام کے سچے شیدائی تھے۔ عربوں کی جگہ عجمیوں کو پیدا کیا جب عربوں میں صلاحیت باقی نہ رہی تو اقتدار سلجوقیوں کے پاس منتقل کر دیا، جب وہ بھی اس امانت کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے تو تُرک آ گئے اور اسلام کا جھنڈا تھام لیا۔ تو فرمایا، قوموں کا یہی حال ہے۔ جب ایک قوم اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے، تو اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔

افراد کا بھی یہی حال ہے۔ جو افراد انفرادی طور پر حق کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ ان کی بجائے بہتر افراد کو لے آتا ہے۔ مکّہ کے لوگوں میں سے بعض سخت دشمن تھے۔ جن میں ابوجہل سرفہرست ہے۔ ولید ابن مغیرہ بھی سخت کینہ پرور تھا۔ اللہ نے اُسے بڑا دولت مند بنایا تھا۔ کروڑوں روپے کا کاروبار تھا، ہزاروں جانور تھے، طائف میں باغات تھے، دس جوان بیٹے تھے جن پر فخر کرتا تھا۔ خاندانِ قریش میں عتبہ بھی نامور شخص تھا، جو جنگ بدر میں مارا گیا۔ اُس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے بیٹے خذیفہؓ کو مامور کیا۔ جو مہاجرین اولین میں سے ہے۔ اعلیٰ درجے کا فرمانبردار اور مطیع تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کو اسلام کا شیدائی بنایا۔

ولید ابن مغیرہ کی جگہ اس کا بیٹا خالدؓ آیا۔ یہ وہی خالدؓ بن ولید ہے۔ جسے حضور علیہ السلام نے سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کا خطاب دیا۔ انہوں نے یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں فتح حاصل کی۔ اسلام کے اس قدر فدائی تھے کہ ساری جائداد اللہ کے راستے میں وقف کر دی اور اپنے لیے کچھ باقی نہ رکھا، اس قسم کے جذبہ ایمان کے حامل تھے۔ ابوجہل جیسے دشمنِ اسلام کا بیٹا عکرمہؓ ایمان لایا تو ہر معاملہ میں پیش پیش تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں، اُن میں حضرت عکرمہؓ اوّل نمبر پہ تھا۔ آخر کار قادسیہ کے بعد ایک معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔

انسانی شکلوں کی تبدیلی

بَدَّلْنَآ اَمْثَالَھُمْ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ دشمنانِ دین کی شکلیں ہی تبدیل

لہ بخاری ص ۵۳۱ مسلم ص ۲۲۴ ترمذی ص ۵۴۶

کر دیتا ہے۔ قرآن پاک میں مذکور ہے کہ جب کوئی قوم نافرمانی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے، تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کی شکلیں تبدیل کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کا حال پڑھ لیں وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ دریا کے پاس رہنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا تھا۔ وہ لوگ بڑے سازشی اور نافرمان تھے۔ نبیوں کے مخالف اور قانونِ خداوندی کو توڑنے والے تھے۔ ان کا کیا حشر ہوا جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ ان کو بندروں اور سوروں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اس امت میں بھی ایسا ہی ہو گا، مگر نہایت قلیل۔ حضور علیہ السلام نے قیامت کی نشانیوں میں ایسے واقعات کی نشاندہی فرمائی[1]۔ نیز فرمایا کہ انسان زمین میں دھنس جائیں گے جیسا قارون دھنس گیا تھا۔ اور اسی طرح شکلیں بھی تبدیل ہوں گی۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں[2] کہ جب انسان شرِ ثالث میں داخل ہو جائیں گے، تو شکلیں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ شرِ ثالث سے مراد یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں خراب ہو جائیں۔ شر تین قسم کے ہیں۔ شرِ اول معمولی نوعیت کا ہے۔ ہم لوگ اوسط درجے کے شر میں مبتلا ہیں اور جب شرِ ثالث آئے گا تو شکلوں کی تبدیلی میں بھی دیر نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے عیسٰی علیہ السلام کے بعض واقعات کی نشاندہی فرمائی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بھی بعض ایسے ہی واقعات پیش آئے اور یہ آئندہ بھی آ سکتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا۔ جب ہم چاہیں گے، ایسے دشمنان کی شکلیں بھی تبدیل کر دیں گے۔

قرآن پاک یاد دہانی ہے

سورۃ کے آخری حصہ میں قرآن پاک کا ذکر کیا۔ اور فرمایا اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ یہ یاد دلانے والی یا نصیحت کی باتیں ہیں هٰذِهٖ کا اشارہ ان آیات کی طرف ہے۔ جو اس سورۃ مبارکہ میں نازل کی گئی ہیں۔ یا جو باقی سورتوں میں نازل ہوئیں۔ یہاں تَذْكِرَةٌ کا لفظ آیا ہے، کہیں فرمایا هٰذِهٖ بَصَائِرُ یعنی یہ بصیرت پیدا کرنے والی چیزیں ہیں ان آیات کو پڑھ کر دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کی دولت اور کمال درجے کی روحانیت نصیب ہوتی ہے۔ فرمایا یہ آیات کسی قوم کا رسم و رواج یا بڑوں کی باتیں نہیں ہیں بلکہ تَذْكِرَةٌ یعنی یاد دلانے والی نصیحت کی باتیں ہیں۔ آج کل عربی زبان میں تذکرہ ریل یا بس کے ٹکٹ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی یاد دہانی

---

[1] ترمذی صد ۳۲۲ مرادُ النظام آں صد ۶۶ [2] البدور البازغہ صد ۱۳۴ طبع قدیم۔

ہوتی ہے۔ کہ یہ شخص بس یا ریل میں سفر کر سکتا ہے۔ ایک قسم کی سند ہوتی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مبدا، معاد اور وسط تینوں چیزوں کا ذکر فرما دیا۔ مبدا سے مراد انسان کی ابتدا ہے۔ کہ انسان "لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا۔ اور پھر اسے سمیع و بصیر بنایا۔ تو انسان یا تو شکر گذار بن کر جنت کی نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ یا ناشکر گزاری کر کے زنجیروں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں اس قرآن پاک میں نازل فرمائیں تاکہ انسان نصیحت پکڑے۔

منجملہ ان کے اللہ تعالیٰ نے اور بھی کئی پاکیزہ اصول بیان فرمائے۔ ابرار کی صفات کے طور پر فرمایا "وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ" وہ غریب پروری کرتے ہیں۔ یہ اصول ایک طرف دنیوی ترقی کا زینہ ہے تو دوسری طرف قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔ محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلانا، ان کے ساتھ ہمدردی کرنا کمال درجے کا اصول ہے۔ اسی طرح ایک اور اصول بیان فرمایا "وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ" یعنی اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہو۔ یہ بہت بڑا وظیفہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ" اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ نیز فرمایا "وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" خدا تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ تاکہ نجات حاصل کر لو۔ اسی طرح تسبیح بیان کرنے کا اصول بھی بتلا دیا۔ یہ سب شریعت یا وسط ہے۔ تو گویا اس سورۃ میں مبدا، معاد اور وسط تینوں چیزوں کا ذکر آ گیا ہے۔

غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے

تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے۔ سبحان اللہ کہنا یعنی اللہ تعالیٰ ہر عیب، نقص، ضعف، کمزوری، اولاد اور تمام چیزوں سے پاک اور مبرا ہے۔ سبحان اللہ کا لفظ جگہ جگہ قرآن پاک میں آتا ہے۔ جیسے "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" یا پھر "وَسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا" یعنی صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ خدا تعالیٰ کو منزہ اور مبرا سمجھنا اس کی توحید کا تقاضا ہے۔

اسی طرح نماز کا اصول بتایا "وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ" اور رات کو اپنے رب کے لیے سجدہ کرو۔ اگلی سورۃ میں رکوع کا ذکر بھی آئے گا۔ سجدہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا آخری اور انتہائی فعل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی تعظیمی فعل نہیں۔ اسی لیے اللہ کے سوا غیر کو سجدہ کرنا حرام ہے۔

ایک صورت میں کفر ہے اور دوسری میں حرام ہے۔ اگر غیر اللہ کو سجدہ تعظیم کے لیے کیا تو کفر لازم آیا۔ اور اگر بغیر تعظیم کے محض ہو اوری میں کیا یا رواج کے طور پر سجدہ کیا، تو بھی حرام کا مرتکب ہوا۔ لہٰذا کسی انسان یا کسی اور چیز کے سامنے سجدہ روا نہیں۔ یہ اصول "فَاسْجُدُوْا لَهٗ" میں واضح کیا گیا ہے۔

قرآن پاک کا خلاصہ

سورۃ دہر درمیانے درجے کی سورۃ ہے۔ اس سے پہلے بڑی بڑی سورتیں تھیں، اور اس کے بعد بالکل چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی آرہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں دین کا خلاصہ اور قرآن پاک کی تعلیمات کو مجملاً بیان فرمادیا، مبدا، شریعت اور معاد کے تمام اصول واضح کر دیے۔ قرآن پاک نازل فرما کر تمام پروگرام سمجھا دیے۔ نماز صرف اللہ کی تعظیم اور اس کے ذکر کے لیے ہے۔ فرمایا "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ"۔ ہر سورۃ میں آپ کو قرآن پاک کا خلاصہ ملے گا کہ کیا کرنا چاہیئے، کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ کن چیزوں سے بچنا ضروری ہے جیسے ناشکر گذاری، شرک، کفر اور معصیت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت کی تلقین کی گئی۔ عقیدہ درست کرو۔ مبدا اور معاد کو سمجھو، نماز پڑھو، تسبیح کرو۔ رب کا نام یاد کرو، انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کے ساتھ احسان کرو تاکہ اللہ کے ہاں تروتازگی اور سرور حاصل ہو۔ یہ تمام اصول اس سورۃ مبارکہ میں بتلا دیے گئے ہیں۔

انسان کا اختیار اور اضطرار

فرمایا یہ تذکرہ اور نصیحت ہے "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ پکڑے۔ اس میں جبر و اکراہ نہیں بلکہ یہ انسان کے اپنے فائدے کی بات ہے ہاں البتہ اتنا ضرور بتا دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والا راستہ پکڑو گے تو کامیاب و کامران ہو جاؤ گے۔ اگر ناشکری کا راستہ پکڑو گے، تو جہنم میں جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک فعل میں مختار بنایا ہے اس پر دین ٹھونسا نہیں جائے گا۔ بلکہ اگر وہ اپنے اختیار اور ارادے سے ایمان لائے تو اسے قبول کیا جائے گا، جو کام انسان اپنے ارادے سے کرتا ہے اسی پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ جبر و اکراہ یا اضطراری صورت میں کیے گئے فعل پر باز پرس نہیں ہوتی کیونکہ ایسی حالت میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ رعشہ کا مریض جس کا ہاتھ خود بخود کانپتا رہتا ہے اگر اس سے کوئی برتن گر کر ٹوٹ جائے تو قابل مؤاخذہ نہیں۔ البتہ کوئی تندرست اور صحیح سلامت شخص اپنے اختیار اور ارادے سے کوئی نقصان کرے

گا۔ تواس سے مؤاخذہ ہوگا، تاوان وصول کیا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا یہ انسان کے اپنے ارادے اور خواہش پہ منحصر ہے۔ کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے

اگر انسان یہ سمجھنے لگ جائے کہ وہ ہر طرح سے خود مختار ہے۔ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ انسان خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ خود انسان کو اور اس کے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ انسان کا کام کسب ہے۔ جیسے فرمایا مَا کَسَبْتُمْ کام تو انسان کرتا ہے۔ مگر اس میں نفع ڈالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ کسب کا معنی یہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی طاقت انسان کو دی ہے اس کے مطابق انسان عزم کرے۔ صحیح راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ فہم و بصیرت عطا کر دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی" ہم اُسے اُدھر ہی جانے کی توفیق دے دیتے ہیں، بھٹکتا پھرے۔ بہر حال توفیق دینا اللہ کا کام ہے "وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ" نیک کام کی بھی توفیق منجانب اللہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص برا ارادہ کرتا ہے تو بھی توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ خالق اللہ کی ذات ہی ہے۔ انسان کو صرف کسب کی حد تک اختیار ہے۔

فرمایا یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انسان کو بالکل ہی خود مختار بنا دیا ہے، بلکہ انسان کو اختیار ایک خاص حد تک دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کی مثال انسان کے سانس جیسی سمجھو کہ سانس لینے میں اختیار بھی پایا جاتا ہے اور اضطرار بھی۔ انسان اپنے اختیار سے سانس کو چھوٹا بڑا کر سکتا ہے۔ جوگی مشق کر کے پندرہ پندرہ منٹ تک سانس روکے رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تین تین اور چھ چھ ماہ تک سانس روکے رکھتے ہیں اور زندہ بھی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں اصل سانس پہ اختیار حاصل نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ انسان سویا ہوا ہوتا ہے مگر اُس کی سانس غیر ارادی طور پہ جاری رہتی ہے۔ گویا اصل پہ اختیار حاصل نہیں الغرض کسی چیز کی مشیت انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جو فعل انسان اپنے عزم اور ارادہ سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پہ مؤاخذہ ہے۔

نیک و بد کا انجام

فرمایا وَمَا تَشَآءُوْنَ اور تم نہیں چاہو گے اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ مگر یہ کہ اللہ چاہے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ یعنی وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔ اور یہ سارا نظام کمال حکمت سے قائم کیا ہے۔ اگر کوئی شخص برا کام کر رہا ہے

تو اللہ نے اپنی حکمت کے ساتھ اس میں ایسا مادہ رکھا ہے۔ کہ وہ اللہ کے عطا کردہ اختیار کو خراب کر کے دوسرا راستہ اختیار کر رہا ہے۔ اُسے اس کا نتیجہ لازمی بھگتنا پڑے گا۔

فرمایا یُدْخِلُ مَنْ یَّشَاءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت یعنی بہشت میں داخل کرتا ہے۔ اور چاہت اُسی کے لیے ہوگی جو اس کے عطا کردہ اختیار کو درست طور پر استعمال کرے گا۔ مشیت الٰہی اُسی کے حق میں ہوگی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ اس بات کو یوں واضح کیا گیا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا "جو ہماری طرف آنا چاہتے ہیں۔ ہم ضرور اُن کے لیے راستہ واضح کر دیتے ہیں اور جسے صحیح راستہ کی ضرورت ہی نہیں، ہدایت کا خواہشمند ہی نہیں تو ہم کہتے ہیں، جدھر تمہارا جی چاہے، چلے جاؤ۔ ہم اُسی طرف کی توفیق دیتے رہیں گے۔ یہی نہیں بلکہ جب وہ غلط راستے پر پختہ ہو جاتے ہیں تو "طَبَعَ اللہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ" اللہ تعالیٰ اُن کے بغض و عناد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے "خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ" وہ کفر و شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ صحیح راستے کی طرف آنے کی اُن میں خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ ایسے ظالموں کے لیے عذاب الیم تیار کیا گیا ہے۔ ظالم سے مراد وہی کافر اور مشرک ہیں جیسا فرمایا اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ "شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ نیز فرمایا وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ کافر ہی ظالم ہیں انہی لوگوں کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔

سورۃ المرسلٰت

۷۷ (مکیۃ)

سُورَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ مرسلٰت مکی ہے۔ اور یہ پچاس ۵۰ آیتیں اور اس سورۃ میں دو ۲ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: قسم ہے ان ہواؤں کی جو چھوڑی گئی ہیں نرمی سے ﴿۱﴾ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو تیز چلتی ہیں ﴿۲﴾ اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلاتی ہیں ﴿۳﴾ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو پھاڑ کر جدا کر دیتی ہیں ﴿۴﴾ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو نصیحت کی بات ڈالتی ہیں۔ ﴿۵﴾ عذر دور کرنے کے لیے یا مجرمین کو ڈرانے کے لیے ﴿۶﴾ بے شک جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے ﴿۷﴾ پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے ﴿۸﴾ اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ﴿۹﴾ اور جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا ﴿۱۰﴾ اور جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا ﴿۱۱﴾ کس دن کے لیے مہلت دی گئی ہے ﴿۱۲﴾ فیصلے کے دن کے لیے ﴿۱۳﴾ اور آپ کو کس نے بتایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے ﴿۱۴﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۱۵﴾

وجہ تسمیہ، نزول اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ المرسلات ہے۔ اس کی پہلی آیت میں مرسلات کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین[1] کا خیال ہے۔ کہ یہ مکمل سورۃ مکی ہے یعنی ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض مفسرین[2] کا خیال ہے۔ کہ اس کی بعض آیات مدنی زندگی میں بھی نازل ہوئیں۔ تاہم راجح خیال یہی ہے کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں[3]۔ کہ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ منیٰ میں مقیم تھے۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک غار میں تشریف فرما تھے۔ ہم آپ کے ارد گرد جمع تھے، اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اور ہم اسے تازہ بتازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے سُن رہے تھے۔ اور اس کو یاد کر رہے تھے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

اس سورۃ کی چھوٹی چھوٹی پچاس ۵۰ آیتیں ہیں۔ دو ۲ رکوع، ایک سو اکیاسی ۱۸۱ الفاظ، اور آٹھ سو سولہ ۸۱۶ حروف ہیں۔

موذی جانور کو مارنے کا حکم

اسی منیٰ کے قیام کا ذکر ہے[4]۔ کہ کسی غار میں سے پتھروں کے درمیان سے سانپ نکلا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُسے مارنے کا حکم دیا۔ فرمایا اگر تم ایسے موذی جانور کو نہیں مارو گے، تو وہ تم پر حملہ کر کے تمہیں ہلاک کر دے گا۔ اسی لیے حدیث شریف[5] میں آتا ہے۔ کہ پانچ چیزیں موذی ہیں انہیں حرم میں بھی قتل کر دو اور احرام کی حالت میں بھی ہلاک کر دو۔ جب اور جہاں بھی موقع ملے انہیں مارنے میں تامل نہ کرو۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ اور بچھو بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد کی تعمیل میں سانپ کو مارنا چاہا، مگر وہ بھاگ کر کسی سوراخ میں گھُس گیا اور اپنی جان بچا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وُقِيَتْ شَرَّكُمْ كَمَا وُقِيتُمْ شَرَّهَا یعنی وہ تمہارے شر سے بچا لیا گیا۔ جس طرح تم اُس کے شر سے بچا لیے گئے۔ شر اضافی چیز ہے۔ ویسے سانپ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور وہ بھی اپنے جسم میں جان رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے مصلحت اور حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ کائنات میں اُس کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انسان کی نسبت اس کا وجود شر پر مشتمل ہے۔ اس کا شر تو یہی تھا کہ مارا جاتا

---

[1] روح المعانی ص ۱۶۹/۲۹، در منثور ص ۳۰۲/۶ [2] تفسیر اتقان ص ۱۷/۱ [3] بخاری ص ۷۳۴/۲

[4] بخاری ص ۷۳۴/۲، نسائی ص ۳۱/۲ [5] مسلم ص ۳۸۱/۱، نسائی ص ۳۱/۲

تو شر میں مبتلا ہوتا کیونکہ جان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے شر میں مبتلا ہوتا ہے اور تمہارا اس کے شر سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر وہ کسی کو کاٹ ڈالتا، تو تم شر میں مبتلا ہو جاتے۔ لہذا تم اس کے شر سے محفوظ رہے اور وہ تمہارے شر سے بچا رہا۔

حضرت عبداللہؓ اور حضرت عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام کی خواہش تھی آپ کے چچا یعنی عبداللہؓ کے باپ حضرت عباسؓ مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی عزت بخشی۔ حضور علیہ السلام نے اُن کے لیے اور اُن کی اولاد کے لیے خصوصی دعا مانگی۔[1] چنانچہ آپ خطبہ میں ہمیشہ ان کے لیے دعائیہ جملہ سنتے ہیں۔ یہ آپ کی دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اولاد میں ساڑھے چھ سو سال تک خلافت قائم رکھی۔ دنیوی لحاظ سے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا جو اُن کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے خلافت کی یہ دولت عباسیوں سے لے کر سلجوقیوں کو دے دی۔ اور پھر یہ امانت ترکوں کے پاس آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا[2] کہ اگر قریش میں دو اشخاص بھی صاحبِ صلاحیت ہوں گے تو حکومت انہیں میں رہے گی مگر معلوم ہوتا ہے کہ حالات بگڑ چکے تھے انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۶۵۶ یا ۶۵۷ ہجری میں تاتاریوں نے حملہ کیا۔ اور عباسیوں کی خلافت ختم ہو گئی۔ اِس حملے میں ایک کروڑ مسلمان مارا گیا، تمام کتب خانے درہم برہم ہو گئے۔ انہیں دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ تاتاری بڑے وحشی قسم کے لوگ تھے مگر خدا کی قدرت ایک دو نسلیں بھی نہ گزری تھیں کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اسلام کی دولت سے مالامال کر دیا۔

ام فضلؓ

الغرض انہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے[3] کہ اُن کی والدہ اور آپ کی چچی ام فضلؓ جو کہ نہایت پارسا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ہیں، ان کے سامنے حضرت عبداللہؓ نے سورۃ مرسلات کو تلاوت کیا، تو وہ کہنے لگیں یٰبُنَیَّ لَقَدْ ذَکَّرْتَنِیْ بِقِرَاءَتِکَ ھٰذِہِ السُّوْرَۃَ یعنی اے بیٹے! یہ سورۃ تلاوت کر کے تم نے مجھے یاد دلایا ہے۔ کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو آخری سورۃ سُنی، وہ یہی سورۃ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مغرب کی نماز میں تلاوت فرمایا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک کا کوئی حصہ نہیں سن سکی حتیٰ کہ آپ

---

[1] ترمذی صـ ۵۳۹، [2] مسلم صـ ۱۱۹/ ج۲، بخاری صـ ۴۹۷/ ج۱ [3] بخاری صـ ۱۰۵/ ج۱، مسلم صـ ۱۸۷/ ج۱

رحلت فرما گئے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں۔ کہ مغرب کی نماز میں مختصر تلاوت کا حکم ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس نماز میں تخفیف ہی فرماتے تھے۔ حضرت ام فضل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے نماز مغرب میں پوری سورۃ پڑھی مگر یہ ہوسکتا ہے۔ کہ کسی موقع پہ پوری سورۃ پڑھی ہو اور کسی موقع پر اس کا کچھ حصہ بہر حال یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

اگلی اور پچھلی آپس میں

یہ سورۃ اور اس سے پہلی اور اس کے بعد والی سورتوں کا آپس میں ربط ہے۔ اس سے پہلے سورۃ جن میں منکرین کو تنبیہ کی گئی تھی۔ کہ دیکھو اتم انسان ہونے کے باوجود خدا تعالےٰ کا کلام نہیں سمجھتے، حالانکہ جنات حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے قرآن پاک سن کر ایمان لے آئے۔ مگر ملک عرب اور خاص طور پہ مکہ کے باشندے ہم جنس انسان ہونیکے باوجود ایمان نہیں لائے، وہ کفر و شرک میں ہی ڈوبے ہوئے ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ گویا اس انداز میں کفار کو تنبیہ تھی۔

اس کے بعد سورۃ مزمل میں اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تکمیل کا ذکر فرمایا "یَاأَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ" یعنی اے نبی علیہ السلام رات کو قیام کریں اور خدا کی بارگاہ میں مناجات کریں، نماز پڑھیں تاکہ نفس کی تکمیل ہو اور پھر اسی تکمیل نفس کے اعتبار سے قیامت کا ذکر فرمایا۔ اس سے اگلی سورۃ مدثر میں دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے کا حکم دیا گیا "یَاأَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ" یعنی اے لحاف اوڑھنے والے۔ آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور مخلوق خدا کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں، خبردار کریں۔ وہاں پر اس اعتبار سے قیامت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اگلی سورۃ قیامت میں بھی خاص طور پر قیامت کا ہی ذکر ہے۔ اور اس سورۃ میں انسان کے مختلف نفوس کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی انسان میں تین قسم کے نفوس پائے جاتے ہیں نفس لوامہ، نفس مطمئنہ اور نفس امارہ۔ فرمایا وہاں ہر نفس، نفس لوامہ بن جائے گا۔ انسان خود اپنے آپ کو ملامت کرے گا۔ کہ افسوس میں نے ایمان کیوں نہ قبول کیا۔ نیکی کا راستہ کیوں نہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے قیامت کا ذکر ہے۔

اس کے بعد سورۃ دہر میں ابرار اور فجار کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ کہ دونوں قسم

لہ شرح معانی الآثار صفحہ ۱۴۵ جلد ۱ تا ۱۴۷

کے لوگوں کا کیا انجام ہوگا۔ اور قیامت کے روز کیا معاملات پیش آئیں گے۔ ابرار کے انعامات کا خاص طور پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ منکرین کا شکوہ کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے کا بیان ہے۔

سورۃ کا موضوع

سورۃ مرسلات کا مرکزی نقطہ یا موضوع (SUBJECT) نبیوں کے وقت مقرر کرنے کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ یعنی جب نبیوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا، اور وہ اپنی امتوں کے ہمراہ حاضر ہوں گے جیساکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّھَدَآءِ" (نبی اور شہید (گواہی دینے والے) لائے جائیں گے "وَقُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ" اور ان کے درمیان حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ تو گویا اس سورۃ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے وقت مقرر کئے جانے کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ یعنی اس قیامت والے دن کی تفصیلات بیان ہو رہی ہیں۔ جس دن تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں حاضر ہونگی اور اس دن تکذیب کرنے والوں کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ ان مکذبین نے اللہ تعالےٰ کی جس جس نعمت کا انکار کیا تھا۔ اس کا نام لے لے کر کہا گیا ہے "وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ" یعنی اس دن مکذبین کے لیے تباہی وبربادی ہے۔ اس آیت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سورۃ الرحمٰن میں خدا تعالےٰ کی مختلف نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد پوری سورۃ میں اکتیس ۳۱ مرتبہ اس آیت کو دہرایا گیا ہے "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ"۔

مختلف اعتبارات سے قیامت کا ذکر

اس سے اگلی سورۃ میں کاشتکاروں کی ذہنیت کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ جس طرح وہ بوتے ہیں، پھر کاٹتے ہیں اور فصل آتی ہے۔ اس کا ذکر کر کے قیامت کا حال بیان ہوا ہے۔ اس سے اگلی سورۃ میں ایک نہایت ہی گہری (DEEP) بات کا ذکر ہے۔ دانش وحکمت کی رو سے قانونِ جذب وکشش کے پیشِ نظر قیامت کا ذکر ہے۔ پھر اس کے بعد سورۃ عبس میں انسان کے رشتہ داروں اور متعلقین کے اعتبار سے قیامت کا بیان ہے۔ پھر اس سے اگلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ کائنات پہ قیامت کے کون سے اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے بعد انسان کے باطن پر قیامت کے اثرات کا ذکر ہے۔ اور پھر تاجروں کے نقطہ نظر سے قیامت کا حال ہے الغرض بے شمار موضوعات کے اعتبار سے افراد کی مختلف کیفیتوں کے پیشِ نظر قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہوا کی اہمیت

اس سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم اٹھا کر قیامت کا حال بیان کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا قسم ہے چھوڑی ہوئی ہواؤں کی۔ پہلی پانچ آیات کے الفاظ مرسلات، عاصفات، ناشرات، فارقات اور ملقیات کے متعلق مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ بعض[1] نے ان الفاظ سے ہوائیں مراد لیا ہے، جب کہ دیگر مفسرین نے ان سے فرشتے مراد لیا ہے۔ عام تفسیر میں ان الفاظ کا معنیٰ ہوائیں ہی کیا گیا ہے۔

عرفاً کا معنیٰ اپے درپے یا مسلسل ہے۔ عرف کا لفظ گھوڑے کی گردن کے بالوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جس کی جمع اعراف آتی ہے۔ گھوڑے کی گردن کے بال آپس میں جڑے ہوئے اور پے در پے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں اعراف کہا جاتا ہے۔ عرب اپنی بہادری پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ثُمَّتَ قُمْنَا اِلٰی جُرْدٍ مُسَوَّمَۃٍ
اَعْرَافُهُنَّ لِاَیْدِیْنَا مَنَادِیْلُ

ہم نے گوشت بھون کر کھایا کھڑے ہو گئے اور گھوڑے کی گردن کے بالوں سے ہاتھ صاف کر لیے کہ ہمارا بہترین رومال یہی تھا۔ گویا عرب اپنی بہادری اور جفاکشی کا ذکر کر رہا ہے۔ کہ کھانا کھانے کے بعد وہ پانی سے ہاتھ نہیں دھوتے بلکہ گھوڑے کی گردن کے بالوں سے ہی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ الغرض عرف کے لغوی معنیٰ گھوڑے کی گردن کے بال ہیں اور اس جگہ پر اس سے مراد ہوائے مسلسل ہے۔

ہوا کے عناصر

ہوا ایک لطیف چیز ہے۔ جو ہر ذی جان کی حیات کے لیے ضروری ہے۔ ہوا بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے اور اس میں بہت سے عناصر شامل ہیں۔ اس میں وہ لطیف عُنصر آکسیجن بھی موجود ہے۔ جو حیاتِ انسانی اور خون کی صفائی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ہر سانس کے ساتھ آکسیجن انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے جس کے ذریعہ خون صاف ہوتا ہے اور انسان کو تازہ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اسی سانس کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ انسانی جسم سے باہر نکلتی ہے، جو کہ ثقیل اور دخانی گیس ہے۔ اگر یہ گیس انسان کے جسم میں رُک جائے تو دم گھٹ جائے۔ چنانچہ سعدی صاحبؒ گلستان کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔ انسان کو ہر سانس کے ذریعے دو نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں[2]۔ کہ چوبیس گھنٹے میں انسان کو چوبیس ہزار نعمتیں سانس کے ذریعے حاصل ہوتی

---

[1] درمنثور ص ۳۰۳/ج ۶، تفسیر ابن کثیر ص ۴۵۲/ج ۴ و ص ۴۵۹، روح المعانی ص ۱۶۹/ج ۲۹، تفسیر کبیر ص ۲۶۵/ج ۳۰ [2] کتاب الروح ص

ہیں۔ انسان تو صرف سانس کی ان نعمتوں کا ہی شکر ادا نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ آنکھ، کان، قلب، دماغ اور دیگر تمام اعضائے ظاہرہ اور باطنہ کا شکریہ ادا کرے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ بیشک انسان اپنے رب کا ناشکر گذار ہے۔

ہوا کے خواص

ہوا جب آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ خصوصاً مشرق یا شمال کی جانب سے تو نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا[1] کہ اللہ تعالی نے میری مدد مشرقی ہوا کے ذریعے فرمائی غزوہ خندق کے موقع پر جب مشرقی ہوا چلی تھی۔ تو کفار کے خیمے اکھڑ گئے تھے۔ وہ درہم برہم ہو گئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ قوم عاد کو اللہ تعالی نے مغرب کی گرم ہواؤں کے ذریعے ہلاک کیا۔ تاہم جب یہی ہوا آہستہ آہستہ چلتی ہے تو اس کے ایک ایک جھونکے کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔ موسم گرما میں ہم ہوا کے لیے طرح طرح کے مصنوعی طریقے اختیار کرتے ہیں کبھی دستی پنکھوں کا سہارا لیتے ہیں کبھی بڑا سا پنکھا چھت میں باندھ کر زیادہ مقدار میں ہوا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مختلف نوع کے بجلی کے پنکھوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ مگر قدرتی طور پر چلنے والی ہوا خاص طور پر صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے مقابلے میں مصنوعی طریقوں سے حاصل کردہ ہوا کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہی ہوا جب ساٹھ ستر میل کی رفتار سے چلتی ہے، تو طوفان برپا کر دیتی ہے درختوں کو اکھاڑ دیتی ہے۔ چھتوں کو اڑا دیتی ہے، عمارتوں کو گرا دیتی ہے۔ اور انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر حضور علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ رات کو طوفان آنے والا ہے۔ ریگستانی علاقے میں سخت ہوا چلے گی۔ حضور علیہ السلام نے اعلان کیا[2] کہ رات کو سخت آندھی آنے والی ہے۔ کوئی آدمی کھڑا نہ ہو۔ اپنی چیزوں کو بھی سنبھال کر رکھیں اور جانوروں کو بٹھائے رکھیں۔ اتفاق سے صحابہؓ میں سے ایک شخص اس حکم پر عمل نہ کر سکا۔ شاید وہ بھول گیا یا اُسے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد پہنچا ہی نہیں۔ جونہی وہ آندھی کے دوران اٹھ کر کھڑا ہوا تو آندھی نے اُسے اٹھا کر طئی کے پہاڑوں میں پھینک دیا جو کہ وہاں سے سینکڑوں میل دور تھے۔ وہ بیچارہ ایک ماہ کا سفر طے

۱؎ مسلم صفحہ ۲۹۵/۱ج ۔ ۲؎ مسلم صفحہ ۲۴۶/۲ج

کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہوا اتنی تند و تیز تھی۔ ریگستانی علاقوں میں تو ہوا کے حملے اور بھی سخت ہوتے ہیں۔ ریت کے تودے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اونٹ ان تودوں میں دب کر رہ جاتے ہیں

ہوا اور قیامت میں باہمی ربط

اسی ہوا کی مختلف کیفیتوں کی مثال دے کر آگے قیامت کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ فرمایا آج جو تمہارے گرد و پیش میں چھوٹے چھوٹے خوشگوار واقعات پیش آ رہے ہیں، اور جن کاموں پر تم خوش ہو رہے ہو یہی امور آگے چل کر قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے جس طرح نرم ہوا آندھی کی شکل اختیار کر کے طوفان برپا کر دیتی ہے۔ اسی طرح جن امور پہ آج خوش ہو رہے ہو، یہی کام قیامت کے روز طوفان برپا کر دیں گے، حالات الٹ پلٹ ہو جائیں گے اور سخت مشکل وقت ہو گا۔

تند و تیز ہوائیں

پہلے فرمایا تھا وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا قسم ہے چھوڑی ہوئی ہواؤں کی جو آہستہ آہستہ چلتی ہیں اس کے بعد فرمایا فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو تیز چلتی ہیں، یعنی جب آندھی آتی ہے اور سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو ابھارنے والی ہیں اٹھا کر۔ جو گرد و غبار کو اٹھاتی ہیں یا تیز چل کر بادلوں کو اڑا دیتی ہیں فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا قسم ہے پھاڑنے والی ہواؤں کی۔ جو بادلوں کو پھاڑ کر جدا جدا کر دیتی ہیں۔ اور انہیں جدھر لیجانا مقصود ہوتا ہے، اس کے مطابق بادلوں میں تحریک و تخریب پیدا کر دیتی ہیں فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نصیحت کی بات ڈالتی ہیں۔ ہوا کے تغیر و تبدل پر اگر انسان غور کرے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرے تو یہی ہوائیں اس کے لیے نصیحت کا باعث بن سکتی ہیں۔ گویا یہ نصیحت لانے والی ہوائیں ہیں۔

آیات کا مفہوم ایک دوسرے انداز سے

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ ان الفاظ سے مراد ہوائیں نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ چنانچہ اس انداز سے وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا کا مطلب یہ ہو گا، قسم ہے اُن فرشتوں کی جن کو بھیجا گیا ہے عُرْفًا نیکی لانے کے لیے۔ فرشتے نیکی کا پیغام الٰہی لاتے ہیں اور مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ فرشتوں کی قسم اٹھا کر قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا۔ کہ اس کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ رسول حاضر ہوں گے، اُن کی امتیں حاضر آئیں گی حساب کتاب ہو گا، لہٰذا تکذیب سے بچ جاؤ، ورنہ اُس دن تباہی و بربادی

۱۔ روح المعانی صفحہ ۱۶۹ جلد ۲۹، تفسیر کبیر صفحہ ۲۶۵ جلد ۳۰ وغیرہ۔

کا شکار ہو جائیں گے۔ اسی طرح فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا۔ کا مطلب ہو گا۔ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو ہلاک کرنے، موت طاری کرنے یا انقلاب لانے کے لیے تیزی سے چلتے ہیں۔ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا کا معنی یہ ہو گا قسم ہے اُن فرشتوں کی جو اللہ کے حکم سے بانٹتے ہیں اور جدا جدا کرتے ہیں۔ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا۔ اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو نصیحت کی بات ڈالتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لا کر اور انقلاب برپا کر کے انسان کے لیے نصیحت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

عذر کا ارتفاع

فرمایا یہ نصیحت عُذْرًا یعنی عذر دور کرنے کے لیے ہے۔ تاکہ کوئی کافر، مشرک یا گنہگار کل کو عذر پیش نہ کر سکے کہ اُسے کوئی سمجھانے والا نہیں آیا یا اُس کے سامنے کوئی نشانی ظاہر نہیں ہوئی۔ نیز یہ نصیحت اس لیے بھی ہے کہ اَوْ نُذْرًا تاکہ مجرمین کو ڈرایا جا سکے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے "مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ" کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ حالانکہ "فَقَدْ جَآءَکُمْ بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ" تمہارے پاس خوشخبری دینے والا بھی آ گیا ہے۔ اور ڈرانے والا بھی آ گیا ہے۔ یہ تند و تیز اور تلخ ہوائیں بمنزلہ نذیر کے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول اور اُن کے قائم مقام بھی نذیر ہیں بہت سے حوادثات بھی نذارت کا کام دیتے ہیں۔ تاکہ کوئی شخص یہ عذر نہ کر سکے کہ اس کے پاس ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے عذر کو رفع کر دیا ہے۔

وقوعِ قیامت

ان چیزوں کی قسم اٹھانے کے بعد فرمایا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ واقع ہونے والا ہے۔ یعنی قیامت برپا ہونے والی ہے اور جو کام تم دنیا میں کرتے ہو یا جو اعتقاد رکھتے ہو اُس کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے۔ اگر تم نے دنیا میں نیکی کا راستہ اختیار کیا ہے تو اُس کا بھی بدلہ ملنے والا ہے۔ اور اگر کفر کا راستہ اختیار کیا ہے۔ تو اس کے انجام کو پہنچنے والے ہو۔ یہ سب کچھ قیامت کو پیش آئے گا۔

قیامت کب آئے گی۔ یہ دن کیسا ہو گا۔ فرمایا فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ جب ستارے مٹا دیے جائیں گے۔ دوسری جگہ یوں فرمایا، جب ستارے میلے ہو جائیں گے، گدلے ہو جائیں گے یا درہم برہم ہو جائیں گے۔ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔ دراڑیں بن جائیں گی اور عالم بالا کی چیزیں نظر آنے لگیں گی۔ انسان کی نگاہ بھی تیز ہو جائے گی۔ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ اور جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی

تو یہ ذرہ ذرہ ہو جائیں گے۔ ان کو گرد و غبار بنا کر اُڑا دیا جائے گا۔ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ اور قیامت کا دن وہ ہوگا۔ جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ اُس مقررہ وقت پر اللہ کے نبیوں کو حاضر کیا جائے گا۔ اُن کی امتوں سے باز پرس ہوگی۔

یوم الفصل

فرمایا لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ کس دن کی مہلت دی گئی ہے۔ یعنی وہ کون سا دن ہے جب تک کے لیے مجرمین کو مہلت دی گئی ہے۔ کہ اُس دن اُن سے لازمی باز پرس ہوگی۔ پھر خود ہی فرمایا لِیَوْمِ الْفَصْلِ فیصلے کے دن کے لیے انہیں مہلت دی گئی ہے۔ حقیقی فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ فصل کا لغوی معنیٰ جدا جدا کرنا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں۔ کہ حقیقت میں سب چیزوں کو جدا جدا کرنے کا وقت قیامت ہی ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ ہوگا۔ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے جج کے فیصلے کو بھی سو فیصدی درست نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کئی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی تو ہر چیز جدا جدا کر دی جائے گی۔ کوئی بات غلط نہیں ہوگی۔ نیکی اور بدی الگ الگ کر دی جائے گی۔ نیکوکار اپنے مرتبے کو پہنچیں گے۔ اور بدکار اپنے انجام کو پائیں گے۔ لہٰذا حقیقت میں جدائی اور تفصیل کا دن قیامت کا دن ہی ہوگا۔

فرمایا وَمَا اَدْرٰىكَ اور آپ کو کس نے بتلایا مَا یَوْمُ الْفَصْلِ کہ فیصلے کا دن کیا ہے۔ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ اس دن تباہی و بربادی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی توحید، اُس کے انبیاء اس کی کتابوں اور قیامت کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔ نہ پوچھو کہ اس دن ان کا کیا حشر ہوگا۔

درس دوم ۲ (آیت ۱۶ تا ۴۰)

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع ۲۱

ترجمہ:- کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا ﴿۱۶﴾ پھر ہم ان کے پیچھے پچھلوں کو لگاتے ہیں ﴿۱۷﴾ ہم مجرمین کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں ﴿۱۸﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۱۹﴾ کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا ﴿۲۰﴾ پھر ہم نے اس کو ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا ﴿۲۱﴾ ایک مقررہ مدت تک ﴿۲۲﴾ پھر ہم نے اندازہ کیا پس ہم خوب اندازہ کرنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانیوالوں کے لیے ﴿۲۴﴾ کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا ﴿۲۵﴾ زندوں کو اور مُردوں کو ﴿۲۶﴾ اور ہم نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ رکھ دیے ہیں اور ہم نے تمہیں پیاس بجھانیوالا پانی پلایا ﴿۲۷﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۲۸﴾ چلو اس چیز ——— کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے ﴿۲۹﴾ چلو تین شاخوں والے سائے کی طرف ﴿۳۰﴾ نہ گھنی چھاؤں والا ہوگا اور نہ تپش سے بچائے گا ﴿۳۱﴾ بیشک وہ محل جتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں پھینکے گا ﴿۳۲﴾ گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ——— ہیں ﴿۳۳﴾

اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۳۴) یہ وہ دن ہے جس دن لوگ بولیں گے نہیں (۳۵) اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں (۳۶) اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۳۷) یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے اکٹھا کیا ہے تمہیں اور تم سے پہلوں کو بھی (۳۸) پھر اگر تمہارے پاس کوئی داؤ پیچ ہے تو اُسے مجھ پر آزما لو (۳۹) اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۴۰)

تکذیب کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ مبارکہ میں قیامت کا ذکر اس لحاظ سے کیا ہے کہ اللہ کے تمام نبی اور رسول اُس دن وقت مقررہ پہ حاضر ہوں گے۔ اُن سب کی امتیں بھی حاضر ہوں گی۔ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی اور ہلاکت ہے۔ نیز دنیا میں جو انعامات انسانوں کو عطا کئے گئے ہیں، اُن کا تذکرہ ہے۔ اور اُن انعامات کے پیش نظر قیامت کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے والی مختلف کیفیتوں کو بیان فرمایا ہے۔ اور اس کی نشانیوں کو جھٹلانے والوں کے لیے وعید سنائی ہے۔ بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تکذیب کی۔ اُس کے ساتھ شرک کیا۔ اور جب اُن کے پاس رسول آئے تو انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ ہم تمہیں نبی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے۔ تو ان لوگوں نے اُن کو بھی جھٹلایا۔ ان کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے بعث بعد الموت کی خبر دی کہ ہم تمہیں دوبارہ زندہ کریں گے "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ" اور یہ بھی کہا "وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ" کہ یہ ہمارا پکا وعدہ ہے۔ اور یہ پورا ہو کر رہے گا۔ مگر مشرکین اور کفار نے روز قیامت کو بھی جھٹلا دیا۔ انہوں نے کہا کہ قیامت وغیرہ کچھ نہیں۔ "إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ" یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ کبھی کسی کو مر کر واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اسی کے ساتھ شریعت کے جو قوانین ہیں اُن کو بھی شامل کر لیں کہ ایسے لوگوں نے ان قوانین کو تسلیم نہ کیا۔ یہ سب تکذیب کی مختلف صورتیں ہیں۔

ہلاکت کی مختلف صورتیں

ایک مرتبہ ہلاک کر دینے کے بعد قیامت کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے طور پہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ" کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا "ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ" پھر ہم اُن کے پیچھے پچھلوں کو لگاتے ہیں۔ اگلوں کو ہلاک کرنے کا مطلب محض عذاب کے طور پہ ہلاک کرنا ہی نہیں بلکہ طبعی موت بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جو لوگ

آج سے پچاس یا سو برس پہلے موجود تھے، وہ اب نہیں ہیں۔ وہ ہلاک ہو گئے اور اُن کی جگہ موجودہ لوگوں نے لے لی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد یہ لوگ بھی نہیں رہیں گے اور دوسرے لوگ ہوں گے۔ تو ہلاکت کا یہ سلسلہ مسلسل ہے۔ جسے ہم دیکھ رہے ہیں اور جس سے کوئی بھی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ ہلاکت کا آخری سرا مجرمین پر ختم ہو گا جن پر قیامت قائم ہو گی۔ یہ اس وقت ہو گا، جب ہر طرف کفر و شرک غالب ہو گا۔ اور اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔

اگلوں کو ہلاک کرنے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ہم نے نافرمانوں کو مختلف طریقوں سے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دیا کسی پر طوفان بھیجا کسی کو پانی میں ڈبویا۔ کسی پر آگ برسائی اور کسی پر تند و تیز آندھی بھیج دی۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ عرب اور دوسرے مجرم کس بات پر غرور کر رہے ہیں۔ قوم تبع جو بڑے ساز و سامان والے، مہذب اور شائستہ لوگ تھے، سلطنتوں کے مالک تھے انہیں بھی اللہ نے ہلاک کر دیا۔ اسی طرح ہم ان مجرمین کو بھی ہلاک کر دیں گے، چنانچہ قریش مکہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں تباہ کیا۔ بڑے بڑے سرداروں کو میدانِ بدر میں جمع کیا۔ اور پھر اُن کے سارے سرغنے ہلاک کر دیے گئے اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔ فرمایا تباہی اور بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے جس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ہم مجرمین کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہے

پیدائش کے مختلف مدارج

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے مختلف مدارج بیان کر کے اُن پر وقوعِ قیامت کی دلیل قائم کی۔ فرمایا۔ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرۂ آب سے پیدا نہیں کیا۔ مھین حقیر، محنت "خدمت اور مشقت کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ انسان معمولی لباس میں محنت مزدوری کرتا ہے لہٰذا ماء مہین یعنی حقارت والا مادہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ ایک تو وہ بذاتہٖ ناپاک چیز ہے اور دوسرے یہ کہ پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے اور پیشاب بلاشبہ ناپاک شے ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ پھر ہم اس قطرۂ آب کو چھپے ہوئے ٹھکانے یعنی رحم میں پہنچاتے ہیں۔ قرار کے معنی سکون والی جگہ کے ہیں۔ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ اور ایک مقررہ وعدہ تک یعنی ایک خاص مدت تک ٹھہراتے ہیں۔ فَقَدَرْنَا پھر ہم اندازہ کرتے ہیں۔ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ اور ہم خوب اندازہ کرنے والے ہیں۔ کہ کس کو کیسا بنانا ہے، یعنی کس وقت اور کس شکل و صورت میں تیار کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

تک یہ قطرۂ آب اسی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ بستہ خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ عمل دوسرے چلے میں مکمل ہوتا ہے۔ تیسرے چلّے میں یہ بستہ خون گوشت میں تبدیل ہوتا ہے۔ اور پھر چوتھے چلّے میں اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور روح انسانی کا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے۔ فرشتے رجسٹرلے کر حاضر ہوتے ہیں[1]۔ اور عرض کرتے ہیں۔ کہ اے پروردگار! اس شخص کے متعلق ہم کیا لکھیں۔ بہ شقی ہے۔ یا سعید، نیک بخت ہوگا یا بد بخت۔ اس کی عمر اور روزی کتنی ہوگی اور اس کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ بتاتے ہیں اور فرشتے رجسٹر میں درج کر لیتے ہیں۔

الغرض مقصد یہ ہے۔ کہ انسان کو حقیر قطرۂ آب سے پیدا کر کے اُسے عظیم الشان ہستی بنایا سماعت و بصارت سے نوازا، عقل و شعور عطا کیا تو اس کے لیے قیامت کا انکار کیونکر ممکن ہے۔ وہ قیامت کی تکذیب کس بنا پہ کرتا ہے۔ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہے۔ اس طرح گویا انسان کی تخلیق اور پہلی قوموں کے حالات کے پیش نظر قیامت کی حقیقت سمجھائی گئی۔ مجرمین کا حال بیان کر کے اُس پہ قیامت کی دلیل قائم کی۔ انسان کی توجہ اپنی پیدائش کی طرف دلائی گئی "فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" یعنی انسان ان تمام حوادثات پہ غور کرے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پہ ایمان لائے۔ تو اُسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو مالک الملک یہ تمام امور سر انجام دے سکتا ہے۔ وہ قیامت بھی برپا کر دے گا۔

زمین کے فوائد

اس کائنات میں انسان کے لیے پیدا کردہ انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اے انسان! ذرا غور تو کر، کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ کفاتا کا معنی سمیٹنا، جمع کرنا یا اپنے اندر ملا لینا ہے۔ کس کو سمیٹنے والی! فرمایا اَحْيَاءً وَّ اَمْوَاتًا یہ زمین زندوں کو بھی سمیٹتی ہے اور مُردوں کو بھی۔ مگر انسان کا کردار یہ ہے کہ زمین جیسی کارآمد شے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس پر گندگی پھینکتا ہے۔ اُس کو اکھیڑتا ہے، کھودتا ہے۔ مگر زمین انسان کے لیے زندگی کا ٹھکانا مہیا کرتی ہے۔ اسی پہ چلتا ہے۔ اسی پہ مکان بناتا ہے۔ سڑکیں اور نہریں چلاتا ہے کاشتکاری کرتا ہے، کارخانے لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت اس طرح بنائی ہے۔ کہ انسانی زندگی

---

[1] بخاری ص ۹۷۶/۲ ، مسلم ص ۳۳۳/۲

کا ہر مفاد زمین سے وابستہ ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو انسان کی کوئی بھی ضرورت پوری نہ ہو۔ پھر یہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی انسان کی آرام گاہ زمین ہی ہے۔ سورۃ عبس میں واضح طور پہ ارشاد ہے "ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ" ہم نے انسان کو موت دی اور اُسے قبر میں داخل کر دیا۔ گویا یہ زمین انسان کی زندگی میں بھی اس کی خدمت گار ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی اُسے جگہ فراہم کرتی ہے۔

مُردے کو دفن کرنا فطرت کے عین مطابق ہے

معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کو دفن کرنا طبعی امر ہے۔ غیر مذاہب کے لوگ اپنے مُردوں کے ساتھ مختلف سلوک کرتے ہیں۔ جو کسی طور پہ بھی فطرت کے مطابق افعال نہیں ہیں۔ مثلاً مُردوں کے ساتھ نہایت تذلیل کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہندو یا بدھ مت والے مُردوں کو جلا ڈالتے ہیں۔ جس پہ دلیل یہ قائم کرتے ہیں۔ کہ اس طریقہ سے فضا خراب نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ فعل مردے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بلکہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ برخلاف اس کے اگر مردے کو دفن کر دیا جائے تو نہ بدبو پیدا ہوتی ہے اور نہ فضا خراب ہوتی ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سامنے سرسوتی نے اعتراض کیا[1]۔ کہ مسلمان مردے کو زمین میں دفن کر کے زمین کو خراب کر دیتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا۔ کہ ذرا یہ تو بتاؤ۔ کہ اگر کوئی شخص کہیں لمبے سفر پہ جا رہا ہو تو وہ اپنی اولاد کو دشمن کے سپرد کر کے جائے گا یا دوست کے۔ سرسوتی نے جواب دیا۔ کہ یقیناً وہ دوست کے سپرد کر کے جائے گا۔ تو آپ نے فرمایا کہ انسان کی روح جب جسم سے علیحدہ ہوتی ہے۔ تو وہ اپنے جسم کو زمین کے سپرد کر کے جاتی ہے۔ جو کہ بمنزلہ شفیق ماں کے ہے۔ برخلاف اس کے آگ دشمن ہے جو جلا ڈالتی ہے۔ اور زمین سے روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے انسان کی خوراک اور دوسری ضروریات پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا مردے کو زمین کے سپرد کرنا گویا دوست کے سپرد کرنا اور انسانیت کی عزت و تکریم کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ" ہم نے اسی مٹی سے تم کو پیدا کیا "وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ" اور اسی میں واپس لوٹائیں گے۔ "وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى" اور پھر اسی میں سے دوسری بار تمہیں نکالیں گے۔ چونکہ زمین زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں انسان کی خدمت کرتی ہے۔ لہٰذا مردے کو دفن کرنا فطرت کے عین مطابق ہے۔

---

[1] انتصار الاسلام صفحہ ۴۴ طبع کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔

مردوں کے متعلق مجوسیوں کا طریق کار بھی غیر فطری ہے۔ وہ اونچا مقبرہ بناتے ہیں۔ اور مردے کو اوپر بیجا کر رکھ دیتے ہیں۔ چیلیں اس کا گوشت نوچ لیتی ہیں اور ہڈیاں نیچے گر پڑتی ہیں۔ جس سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ اور سارا ماحول مکدر ہوتا ہے۔ انسان کی کس قدر تذلیل ہے کہ اس کے مردہ جسم کو پرندوں کے حوالے کر دیا جائے۔ کہ وہ اس کا گوشت نوچ کر کھا جائیں۔ باعزت طریقہ یہی ہے۔ کہ اسے زمین کے اندر رکھ دیا جائے۔ کِفت کا یہی معنیٰ ہے۔

جنات کے شر سے حفاظت

حدیث شریف میں[1] آتا ہے اَکْفِتُوْا یعنی برتن کے اوپر کوئی چیز رکھ دیا کرو۔ اور کچھ نہ ہو، تو اللہ کا نام لے کر ایک تنکا یا لکڑی ہی رکھ دو، تاکہ شیاطین اس میں چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ یا کم از کم برتن، ہانڈی وغیرہ کو الٹ دو۔ تاکہ ان میں غلط چیزیں داخل نہ ہو سکیں۔ ایک اور روایت میں[2] آتا اَکْفِتُوْا صِبْیَانَکُمْ مغرب کے وقت اپنے بچوں کو گھروں میں روک کر رکھو۔ باہر نہ جانے دو، کہ اس وقت شیاطین اور جنات پھیل جاتے ہیں۔ ایک افراتفری کا عالم ہوتا ہے، اور اس کے برے اثرات بچوں پہ پڑتے ہیں جانور بھی ان برے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا خوب اندھیرا ہونے تک بچوں کو روک لو اس کے بعد بے شک جانے دو۔ گویا کفت کا معنیٰ روکنا، سمیٹنا، حفاظت کرنا ہے۔

پہاڑوں کے فوائد

زمین کے بعض خواص بیان کرنے کے بعد فرمایا وَجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ ہم نے زمین پر بڑے بوجھل پہاڑ رکھے ہیں۔ بڑے بڑے اونچے پہاڑوں میں انسان کے لیے بے شمار فوائد جمع کیے ہیں۔ یہ ہمالہ اور قراقرم جیسے بلند و بالا پہاڑ انسانی زندگی کے لیے لاتعداد فوائد اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے درخت ہیں۔ پتھر ہیں معدنیات ہیں۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے میدانی زندگی پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں۔ تو میدانی زندگی بھی تلخ ہو جائے۔ الغرض انسانی زندگی کے لیے بے شمار مفاد پہاڑوں سے وابستہ ہیں۔

میٹھا پانی نعمت ہے

اونچے اونچے پہاڑوں سے پانی کے چشمے نکلتے ہیں۔ پھر وہ دریا اور نہروں کی صورت میں میدانی علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ضروریات زندگی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ درختوں اور فصلوں کے علاوہ انسانی زندگی کے استعمال کے لیے میٹھا پانی میسر آتا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا

---

[1] مسلم ص۱۷۱ ج۲، ترمذی ص۲۷۳، [2] بخاری ص۴۶۷ ج۱

وَاَسْقَیْنٰکُمْ مَّآءً فُرَاتًا ہم نے تمہیں پیاس بجھانے والا پانی پلایا۔ فرات کا معنی میٹھا، خوشگوار اور پیاس بجھانے والا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام جب میٹھا پانی نوش فرماتے تو کہتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَقَانَا مَآءً عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا یعنی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے ہمیں میٹھا پانی پلایا اور اسے ہمارے گناہوں کی بدولت کڑوا نہیں بنایا۔

مدینہ طیبہ[2] میں عام طور پر کھاری پانی میسر تھا۔ میٹھا پانی دور والے کنوؤں سے لانا پڑتا تھا۔ بئر رومہ کا پانی میٹھا تھا۔ مگر وہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور وہ مسلمانوں کو وہاں سے بھرنے نہیں دیتے تھے چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے پینتیس ۳۵ ہزار درہم میں وہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اسی لیے حکم ہے[3] کہ پانی کا بے جا استعمال نہ کیا جائے۔ وضو اور غسل میں بے تحاشا پانی نہ بہایا جائے۔ بلکہ میٹھے پانی کی قدر کرنی چاہیئے۔ جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے۔ یا کھاری پانی ملتا ہے۔ ان لوگوں کو میٹھے پانی کی قدر و قیمت اچھی طرح معلوم ہے۔

تین شاخوں والا سایہ

فرمایا وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ اُس دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوْنَ یعنی جس چیز کو تم جھٹلاتے تھے۔ اس کے انجام کی طرف چلو۔ پھر حکم ہو گا اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو۔ لَّا ظَلِیْلٍ نہ گہری چھاؤں والا ہو گا وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ اور تپش سے بچائے گا۔ گویا ایک قسم کا دھواں ہو گا جس کی تین شاخیں ہوں گی اور وہ میدان حشر میں پھیل جائے گا۔ خاص خاص لوگ اس کی گرفت میں آئیں گے۔

تین شاخوں کے متعلق امام بیضاویؒ[4] فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے اعمال تین قوتوں پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی قوت وہمیہ، قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ۔ انسان کے تمام افعال انہیں تین قوتوں میں سے کسی نہ کسی سے نکلتے ہیں۔ دھوئیں کی تین شاخوں سے مراد یہی تین قوتیں ہیں۔ ہر قوت سے نکلے ہوئے

۱؎ ابن کثیر ص ۲۹۶/۴ بحوالہ ابن ابی حاتم ۲؎ ترمذی ص ۵۳۱ ۳؎ نسائی ص ۳۳ ابن ماجہ ص ۳۴
۴؎ تفسیر بیضاوی ص ۴۰۶/۲ مطبع منشی نولکشور۔

فعل کا بدلہ اُس کے مطابق دیا جائے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ میدانِ حشر کے دوران دوزخ سے ایک گردن نکلے گی، جو دو سو سال کی مسافت سے ہر اُس شخص کو پکڑ لے گی جو دنیا میں اللہ کے ساتھ شرک کرتا تھا، غرور اور تکبر میں مبتلا تھا یا جو ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا تھا۔

فرمایا یہ تین شاخوں والا دھواں جس کا نہ سایہ ہوگا اور نہ وہ تپش سے بچا سکے گا اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ وہ محل جتنی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آگ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ عربوں کے ذوق کے مطابق اس کی تشبیہ ایسی ہوگی كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ جیسے زرد رنگ کے اونٹ ہوتے ہیں۔ ایسی بڑی بڑی چنگاریاں اس دھوئیں سے نکلیں گی۔ ایسا خوفناک منظر ہوگا۔ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ہلاکت اور تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔

فرمایا هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ یہ وہ دن ہے۔ جس دن لوگ بولیں گے نہیں۔ میدان حشر میں کئی قسم کے معاملات پیش آئیں گے۔ کبھی ایسی دہشت طاری ہوگی، کہ کسی شخص کو بولنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ نبی بھی کوئی بات کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ ایسا زبردست معرکہ ہوگا۔ اور ایسے موقع پہ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ انہیں یہ اجازت بھی نہیں ہوگی کہ کوئی عذر یا معذرت ہی پیش کر سکیں۔ تاکہ اپنے آپ کو اللہ کے غضب سے بچا سکیں۔ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے۔

یوم الفصل

ارشاد ہوتا ہے۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ یہی فیصلے کا دن ہے۔ جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ اور سارے امتیوں کو بھی جمع کیا جائے گا جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ یعنی تمہیں بھی اور تم سے پہلوں کو بھی اکٹھا کیا جائے گا۔ نوع انسانی، جنات اور یاجوج ماجوج کے تمام افراد جمع ہونگے کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوگی بڑی تنگی ہوگی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی اے اللہ میں تجھ سے دنیا کی تنگی اور قیامت کی تنگی سے پناہ مانگتا ہوں اور قیامت کی تنگی کا یہ حال ہوگا کہ ایک آدمی کو صرف اس قدر جگہ میسر ہوگی جس پہ اُس کے قدم ٹک سکیں، اتنی بھیڑ ہوگی، کیونکہ تمام اگلے پچھلے لوگ اس دن اکٹھے ہوں گے۔ بڑی تکلیف ہوگی۔ بھوک اور پیاس ہوگی۔ پسینے چھوٹیں گے۔ جیسے جیسے کسی کے

لہ تفسیر عزیزی صد۱۰۱ تا ۱۰۱ پ ۲۹ درمنثور صد ۳۰۵ ۶۷

اعمال ہوں گے، ان کے مطابق ان کی حالت ہو گی۔ ان حالات میں فرمایا فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ۔ اگر تمہارے پاس کوئی داؤ پیچ ہے تو اُسے آزما کر دیکھ لو۔ دنیا میں تو بڑے بڑے حیلے بہانے کرتے تھے۔ دیکھیں آج تمہارا کون سا داؤ کام آتا ہے۔ فرمایا وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ یاد رکھو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ آج بھی سمجھ جاؤ۔ قیامت کی تکذیب سے باز آجا ورنہ تمہارا انجام نہایت برا ہو گا۔

(آیت ۴۱ تا ۵۰)

درس سوم ۳

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

ع ۲
۲۲

ترجمہ: بیشک متقی لوگ سایوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۱﴾ اور پھلوں میں ہوں گے جس قسم کے وہ چاہیں گے ﴿۴۲﴾ کھاؤ اور پیو خوشگوار اس کے بدلے ۔ جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾ بیشک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۴﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۴۵﴾ کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ تھوڑے دنوں تک بے شک تم مجرم ہو ﴿۴۶﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۴۷﴾ اور جب انہیں کہا جاتا ہے رکوع کرو تو یہ لوگ رکوع نہیں کرتے ﴿۴۸﴾ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۴۹﴾ پھر یہ (مکذبین) اس کلام کے بعد کونسی بات پر ایمان لائیں گے ﴿۵۰﴾

متقین کے لیے انعامات

اس سورۃ میں قیامت کا ذکر اس اعتبار سے ہے ۔ کہ اللہ کے نبیوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا ۔ تمام انبیاء اور ان کی امتیں حاضر ہوں گی ، حساب کتاب ہوگا ۔ اور اسدن فیصلہ کیا جائے گا ، اسی لیے اسے یوم الفصل سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس دن تکذیب کرنے والوں کا برا حال ہوگا ۔ ان کی تباہی اور بربادی کی بار بار وعید سنائی گئی ہے

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ ترہیب کے ساتھ ساتھ ترغیب کا پہلو بھی ہے ۔ فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ بے شک متقین یعنی بچنے والے ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق اَلْمُتَّقِيْنَ مِنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ وَالنِّفَاقِ وَالْمَعَاصِيْ یعنی

لہ تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس ص ۳۷۸ و ۳۷۹

متقین سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو شرک، کفر، نفاق اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ ایسے لوگ اُس دن فِی ظِلٰلٍ سایوں میں ہوں گے وَّعُیُوْنٍ نیز نہروں اور چشموں میں ہوں گے۔ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ اور پھلوں میں ہوں گے جس قسم کے وہ چاہیں گے۔ جو لوگ دنیا میں تقویٰ اختیار کرتے تھے، اُن کے لیے آرام و راحت کے یہ سامان ہوں گے۔

سائے کا مفہوم

جیسا کہ حدیث شریف[1] میں آتا ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ ہوگا۔ دوسری روایت میں آتا ہے۔ کہ پل صراط سے گزرتے وقت نیک لوگوں پر اُن کی نیکیوں کا سایہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[2] ہے اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ صَدَقَتُهٗ یعنی دنیا میں کیا ہوا صدقہ غرباء و مساکین پر خرچ کیا ہوا مال قیامت کے دن ایسے لوگوں کے لیے سایہ بن جائے گا۔ یہ سایہ انہیں پل صراط سے گزرتے ہوئے بھی حاصل ہوگا۔ اور قیامت کی سختی اور تلخی میں بھی مومن کے حق میں فائدہ مند ہوگا۔

جب مومن لوگ بہشت میں پہنچیں گے۔ تو وہاں بھی سائے ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے درختوں کے گھنے سائے ہوں گے۔ اگرچہ وہاں تپش نہیں ہوگی۔ مگر انسان کی تنوع پسند طبیعت بعض اوقات روشنی سے سائے میں جانا پسند کرے گی اس لیے بہشت میں سائے بھی ہوں گے۔ یہ سائے درختوں کے ہوں گے یا محلات کے ہوں گے۔ اس لیے جمع کا لفظ ظلال ذکر کیا ہے۔

عیون سے مراد اُبلتے ہوئے چشمے اور نہریں ہیں، فواکہ سے مراد ہر قسم کے پھل ہیں۔ جو بھی جنتی خواہش کرے گا۔ انسان مختلف انواع کی چیزیں پسند کرتا ہے۔ کبھی میٹھے پھل کی خواہش کرے گا، کبھی کھٹے کی اور کبھی کھٹ مٹھے کی۔ یہ تمام چیزیں حسب خواہش وہاں میسر ہوں گی۔

نیز کہا جائے گا، كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کھاؤ اور پیو، هَنِيْٓـئًا خوشگوار یعنی اشیائے خورد و نوش نہایت خوشگوار قسم کی ہوں گی، ان میں بدہضمی، گرانی، ثقل، ہیضہ یا تخمہ قسم کی کوئی علامت نہیں ہوگی۔ بہشت میں کھانے کی وجہ سے پیٹ میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہوگی۔ جو چیز جتنی بھی کھائیگا وہ لطیف بخار کی شکل میں فوراً ہضم ہو جائیگی نہ فضلہ ہوگا نہ پیٹ میں کوئی تکلیف ہوگی بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اسکے بدلے جو تم کیا کرتے تھے فرمایا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ یعنی ہم نیکی کرنیوالوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ اعلان ہوگا کہ یہ تمام انعامات تمہارے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہیں۔

---
[1] ترمذی ص۲۰۸ [2] مسند احمد ص۲۳۳ ج۴

مکذبین کی مذمت

اس مقام پر زیادہ تر مکذبین کی مذمت مقصود ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ رسولوں کے لیے وقت مقرر فرمائیں گے اور لوگوں کو جمع کیا جائے گا، تو اس دن مکذبین کا برا حال ہو گا۔ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ تباہی اور ہلاکت ہے اُس دن مکذبین کے لیے۔ وہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ فرمایا کُلُوۡا وَتَمَتَّعُوۡا کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ قَلِیۡلًا تھوڑے دنوں تک اِنَّکُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ بے شک تم مجرم ہو اس چند روزہ زندگی میں بیشک کھا پی لو اور مزے اڑا لو۔ مگر آئندہ کے لیے تمہیں حبس دوام یا سزائے موت ہے۔ جس طرح دنیا میں آخری سزا سنائے جانے کے بعد حکم ہوتا ہے۔ کہ حسبِ خواہش کھا پی لو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ اس دنیا میں عیش و آرام کر لو، آخرت میں تمہیں سخت سزا ملنے والی ہے۔ سورۃ حجر میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَیَتَمَتَّعُوۡا" آپ چھوڑ دیں اُن کو کہ کھالیں اور نفع اٹھالیں یہ آگے دائمی سزا میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ فرمایا "قُلۡ تَمَتَّعۡ بِکُفۡرِکَ قَلِیۡلًا اِنَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ" اِن کافروں سے کہہ دیجیے کہ "فائدہ اٹھا لو اپنے کفر کے ساتھ۔ کیونکہ آخر کار تو دوزخ میں جانے والا ہے"۔ اِنَّکُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ تم مجرم ہو تم نے تقویٰ کا راستہ نہیں پکڑا۔ تم نے کفر و شرک کا راستہ اختیار کیا۔ معاصی اور جرائم میں ملوث ہوئے۔ تم مجرم ہو۔ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے خرابی ہے۔

یہ لوگ بے نماز تھے

اور اب حال یہ ہے۔ کہ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ جب انہیں کہا جاتا ہے۔ اِرۡکَعُوۡا رکوع کرو یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے جھک جاؤ۔ لَا یَرۡکَعُوۡنَ تو یہ لوگ نہیں جھکتے۔ اس مقام پر رکوع کا ذکر ہے۔ سورۃ ن میں سجدہ کا بیان ہے۔ رکوع کا ذکر دنیا کے لیے ہے اور سجدے کا بیان آخرت کے موقع پر ہے۔ حقیقت میں رکوع و سجود سے مراد نماز کی ادائیگی ہے۔ یعنی نماز پڑھو۔ اور اس کے لیے پہلے نماز کی شرائط پوری کرو۔ نماز کی اولین شرط ایمان باللہ ہے۔ اس کے بعد طہارت ہے، اور اس کے بعد نماز کی ادائیگی ہوتی ہے۔ جس کے اہم ارکان رکوع و سجود ہیں۔ اسی لیے فرمایا وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ یعنی جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔

سجدہ انتہائی تعظیمی فعل ہے اور رکوع اس سے کم تر۔ مگر اس میں بھی عاجزی پائی جاتی ہے سورۃ مدثر کی ابتداء میں یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ انسان کے حق میں سب سے اہم ترین بات اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سب سے بڑا جرم تکبر ہے۔ ابلیس نے تکبر کیا۔ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ

یعنی اس نے اللہ کے حکم کا انکار کیا اور تکبر کیا۔ اللہ کے سامنے عاجزی کی صورت یہ ہے۔ کہ اس کی بڑائی بیان کی جائے۔ اسی لیے حکم ہوا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" اُس کے سامنے خشوع کرو رکوع و سجدہ سے یہی مراد ہے۔

رکوع اور سجدے کی حقیقت

شاہ عبدالعزیز رح تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں۔ کہ رکوع کا مطلب اللہ تعالیٰ کی امانت کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے پشت کو جھکا دینا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو مستقیم القامت بنایا ہے۔ یہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ جانوروں کی طرح ہر وقت رکوع کی حالت میں نہیں ہوتا۔ مگر اس پر انسان کو مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ رکوع کرکے ـــــــ گھوڑے یا گائے کی مانند اپنی پشت کو اس طرح جھکا دیتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جو بھی بوجھ اس پشت پر ڈالنا پسند کریں، اس کے لیے تیار ہوں۔ رکوع کی یہی حقیقت ہے۔ کہ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے۔ انسان کے ذمہ فرائض میں سے ایک اہم فریضہ خدا کے حضور عاجزی کرنا ہے۔ اسی طرح سجدہ انتہائی تعظیمی فعل ہے۔ اسی لیے اللہ کے سوا غیر کے سامنے سجدہ حرام ہے۔ سجدۂ عبادت قطعی طور پر ازل سے لے کر حرام چلا آرہا ہے۔ اور تعظیمی سجدہ ہماری امت پر حرام ہے۔ یہ پہلی امتوں میں روا تھا۔

کیا وجہ ہے۔ کہ نماز میں رکوع ایک ہوتا ہے اور سجدے دو ہوتے ہیں ایک وجہ تو ظاہر ہے۔ کہ انتہائی تعظیمی فعل یعنی سجدے کو مکرر لایا گیا ہے۔ ایک دفعہ سجدہ کیا۔ اٹھ کر دوبارہ سجدہ کیا۔ اس کی حکمت مفسرین کرام یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ پہلا سجدہ اپنی جان کو پیش کرنے کے لیے ہے۔ پہلے سجدہ کے موقع پر انسان یہ تصور کرتا ہے۔ کہ اے پروردگار! میں گنہگار ہوں۔ میری جان حاضر ہے۔ اگر تو چاہے تو میری گردن کاٹنے کا حکم دے دے۔ اس پہلے سجدے میں جان کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا گیا۔ پھر دوبارہ سجدہ کیا تو اپنے مال اور لواحقین کی قربانی بھی پیش خدمت کر دی۔ یعنی اے مولا کریم! میری جان بھی تیرے حکم پر فدا ہے۔ اور میرا مال اور اعزہ و اقارب بھی تیری راہ میں حاضر ہیں۔

سورۃ مدثر میں گزر چکا ہے۔ کہ جنتی لوگ مجرمین سے پوچھیں گے "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" تمہیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا۔ تو وہ جواب دیں گے "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ" ہم نماز نہیں

ـه تفسیر عزیزی صـ۳۰ پارہ ۲۹ ـه عنوان انقلاب یعنی تفسیر سورۃ فتح از امالی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی صـ۱۳۱

پڑھتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے سامنے خشوع وخضوع اور عاجزی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ رکوع وسجود سے کتراتے تھے۔ لہٰذا دوزخ کے مستحق ٹھہرے۔ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اس دن ہلاکت اور تباہی ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے اس سورۃ کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ یعنی اے مکذبین اگر اس کتاب الٰہی پر ایمان نہیں لاتے۔ تو پھر اور کون سی کتاب آئے گی جس پر تم ایمان لاؤ گے، قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا آخری پروگرام ہے۔ اس کے بعد کوئی پروگرام، کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر اس کتاب پر ایمان نہیں لاؤ گے تو دولت ایمان سے محروم رہ جاؤ گے کیونکہ اس کے بعد کوئی اور کتاب نہیں ہے۔

ابن ابی حاتمؒ کی روایت میں آتا ہے[1] کہ جب یہ آیت تلاوت کریں۔ تو یوں کہیں اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِمَآ اَنْزَلَ یعنی ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جس کو اللہ نے نازل کیا۔ یا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز[2] رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ یہ الفاظ آہستہ سے کہیں خواہ تلاوت نماز کے دوران کریں یا بغیر نماز کے۔ ہر حالت میں اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِمَآ اَنْزَلَ یا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ کہیں یہ مستحب ہے۔

(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

---

[1] ابن کثیر ص ۴۶۱ ج ۴ [2] تفسیر عزیزی ص ۲۵۶، ۳۰۲ پارہ ۲۹

حج پر جانے والے خواتین و حضرات کے لیے انمول تحفہ

احکام حج

مع

زیارات مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ

مرتب

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

اس کتاب میں حج کی تعریف' فضیلت' اس کا حکم اور اقسام کا بیان ہے۔ حج قران' تمتع' افراد اور بدل کے احکام و مسائل' شرائط حج' حدود میقات' حدود حرم' مسائل احرام وحرم' طواف وسعی کا طریقہ اور حج میں پیش آمدہ جدید مسائل کا حل قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اس وقت موجود زیارات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے بلکہ بہت سی چیزوں کو نقشوں سے سمجھایا گیا ہے۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عازمین حج اور زائرین کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے جو کہ صرف ۱۸ روپے میں دستیاب ہے۔

ناشر : ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم' گوجرانوالہ' پاکستان

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ کی

مایہ ناز اور مقبول عام تفسیر

معالم العرفان فی دروس القرآن

مکمل طبع ہو گئی ہے

اللہ رب العزت کے کلام پاک کو عوام کے اذہان کے قریب کرنے لیے مفسرین کرام نے بے شمار کوششیں کی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ یہ تفسیر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم اور مبارک کوشش ہے۔ رواں دواں اور آسان اردو زبان میں قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ اور سہل انداز میں مستند تفسیر' ضروری مسائل کی توضیح' ضروریات وقت' زمانہ و ماحول کی خرابیوں کی نشاندہی اور ان کا علاج' قرآن کریم کی آیات سے اور پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بیان کردہ تفسیر اور صحابہ کرامؓ' ائمہ کرامؒ اور جمہور مفسرین کی اختیار کردہ توضیحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرک و بدعت اور مذاہب باطلہ اور نظامات فاسدہ کا مختصر طریق پر بہتر رد اس تفسیر کا خاص امتیاز ہے۔ اعلیٰ کتابت و طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کی قیمت ۳۱۵۵ روپے ہے۔

علماء' طلباء' خطباء' اور عوام الناس کے لیے بے حد مفید اور معلومات افزا ہے۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن' فاروق گنج گوجرانوالہ' فون ۲۱۸۵۳۰

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ (مکتبہ دروس القرآن)

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ